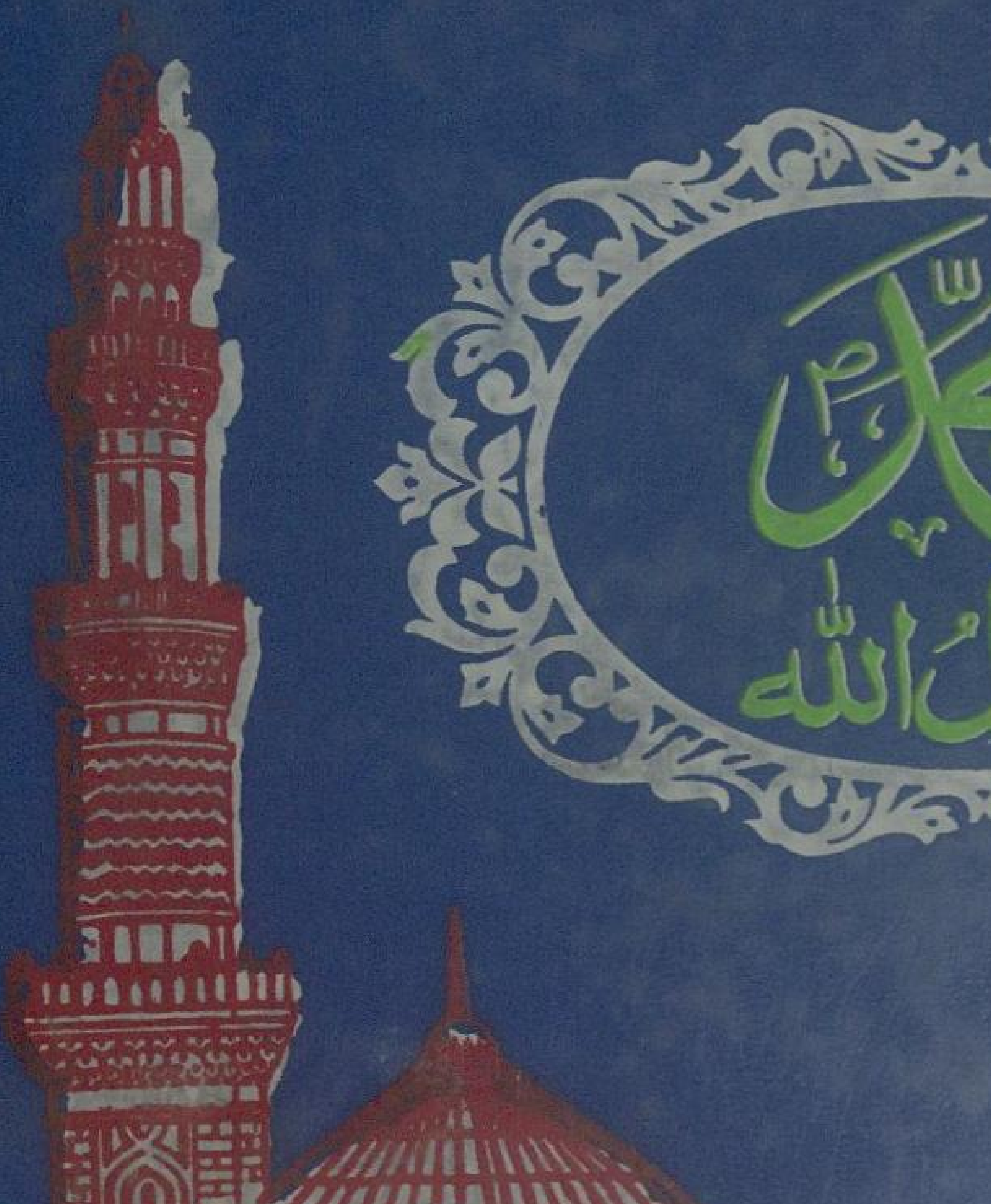
محمد ﷺ

رسول اللہ



مکتبہ عالیہ لاہور

محمد

رسول الله

باسمہ تعالیٰ

محمد رسول اللہ ﷺ

تالیف:

آر، وی، سی باڈلے

ترجمہ:

سید محمد امین زیدی

مکتبہ عالیہ لاہور

محمد رسول اللہ

تالیف : آر، وی، سی باڈلے
ترجمہ : سیّد محمد امین زیدی

ناشر : محمد جمیل النبی
طابع : الطاف حسین
اہتمام : محمود عاصم
تزئین : غلام سرور راہی
سرورق : بشیر آرٹسٹ
کتابت : غضنفر علی

/۰۰

TECHNICAL SUPPORT BY CHUGHTAI PUBLIC LIBRARY

Masood Faisal Jhandir Library

۱۹۷۸ء

مکتبۂ عالیہ : ایبک روڈ (انارکلی) لاہور

مطبوعہ : منظور پریس لاہور

نذر

ماطالبِ خدائیم، بردینِ مصطفائیم
بردرگہش گدائیم، سلطانِ ما محمدؐ

درباغ و بوستانم دیگر مجو معینی
باغم بس است قرآں، بستانِ ما محمدؐ

(خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ)

"گر قبول افتد زہے عزّ و شرف"۔

محمد امین زبیری
(مترجم)

فہرست

نقشہ جات

فہرست مضامین

کرنا اور ہمت بندھانا۔ آغازِ اسلام میں حضرت خدیجہؓ کی دینی خدمات۔

پانچواں باب:

اذیتیں ۱۳۲

(۶۱۲ تا ۶۱۹ء)

نئے دین کے خلاف قریش کا پروپیگنڈا۔ نزولِ وحی اور قرآن پر مختلف اعتراضات۔ شروع کے چند ایمان لانے والے۔ مسلمانوں پر بیجا سختیاں اور مظالم۔ آپ کے چچا ابی لہب اور اُس کی بیوی اُمِّ جمیل کی دشمنی۔ آپ کی صاحبزادی رقیہؓ کی طلاق اور حضرت عثمانؓ سے شادی۔ اسلام کی علانیہ تبلیغ کا حکم فاران کی پہاڑی پر پہلا تبلیغی خطبہ۔ بنی ہاشم اور اپنے عزیز و اقارب کے سامنے اسلام پیش کرنا۔ دوستوں اور پرانے ساتھیوں کی مخالفت اور استہزا۔ معجزوں کا مطالبہ اور آپؐ کا جواب عمرو بن العاص کی ہجویہ شاعری۔ ابوجہل اور دوسرے لوگوں کے تمسخر اور ایذا رسانیوں میں اضافہ۔ حضرت حمزہؓ کا اُس کو سزا دینا اور ایمان لے آنا۔ حضرت عمرؓ کا قبول اسلام اور دین اسلام کی تقویت۔ اسلام دشمنی میں مزید اضافہ اور مسلمانوں کی حبشہ کو ہجرت۔ قریش کا غیظ و غضب۔ مسلمانوں کا شعب ابی طالبؓ میں پناہ لینا۔ قریش کا محاصرہ اور تین سال تک اقتصادی اور سماجی مقاطعہ۔ مسلمانوں کی رہائی۔ حضرت خدیجہؓ اور آپؐ کے چچا ابوطالبؓ کا انتقال اور آپؐ کے مصائب میں اضافہ۔

چھٹا باب:

اسلامی عقائد و تعلیمات ۱۶۴

اسلام کے معنی۔ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ اسلام کے چیدہ چیدہ اصول اور تعلیمات۔ اہلِ کتاب ہوتے ہوئے یہود اور عیسائیوں سے سمجھوتہ کیوں نہ ہو سکا۔ عیسائیوں کے مختلف فرقے اور متضاد عقیدے۔ مسلمان اور مفتوحہ علاقے۔ اسلام میں حضرت عیسیٰؑ کا مرتبہ اور احترام۔ یہودیت اور عیسائیت کی اچھی تعلیمات دینِ اسلام میں۔ تعددِ ازدواج اور اسلام۔ اسلام میں خدا اور بندے کا رشتہ۔

ابو ایوبؓ انصاری۔ مدینہ میں پہلا قیام۔ مسجد نبویؐ کی جگہ کا انتخاب اور اسکی تعمیر۔ مسجد کی سادگی۔ مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ میں برادرانہ تعاون یا سلسلہ مواخات۔ اپنے اور اہل خانہ کی رہائش کے لئے کچے حجروں کی تعمیر مدینہ میں حکومت۔ اور دولت کے باوجود درویشانہ رہن سہن۔ آپ کا کھانا اور لباس۔ گھوڑے، سانڈنیاں اور دوسرے جانور رکھنے کا شوق۔ مسلمانوں کو سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین۔ اذان کی ابتدائ۔ بلالؓ حبشی اسلام کے پہلے مؤذن۔ مسلمانوں کے لئے اخلاقی اور معاشرتی آداب اور شہری اور مدنی زندگی کے قواعد وضع کرنا۔ عرب جیسی قوم کا اطاعت گزار اور متحد بنا دینا حضرت محمد صلعم کا ایک ناقابل یقین اور عظیم معجزہ۔ حضرت عائشہ رضؓ کی رخصتی۔ مغربی سوانح نگاروں کی نکتہ چینی اور اسکا جواب۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شادی۔

(غزوۂ بدر ۶۲۴ء)

جہاد کا حکم۔ غیر مسلموں کے اعتراضات۔ صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کی بہیمانہ کاروائیاں۔ اس کے برعکس سلطان صلاح الدین ایوبی اور دوسرے مسلمان فاتحین کا محکوموں سے سلوک۔ ماہ رجب میں عبداللہ بن جحشؓ کا ایک قریشی کارواں پر حملہ اور قدیم روایت کی خلاف ورزی۔ جنوری ۶۲۴ء میں ابو سفیان کے تجارتی قافلے کی واپسی اور اہل مکہ سے مدد مانگنا۔ ابوجہل کا ایک ہزار کا لشکر لیکر بدر پہنچنا۔ کارواں کا بچ نکلنا۔ اکابر قریش کا واپسی کا مشورہ اور ابوجہل کا جنگ پر اصرار۔ جہاد کا نظریہ اور اس کے دور رس نتائج۔ بدر کا معرکہ اور قریش کی شکست۔ قریش کے قیدی اور فدیہ پر رہائی۔ مال غنیمت کی تقسیم کے متعلق فرمان الٰہی۔ فتح بدر کی اہمیت۔

جنگ بدر اور تاریخ اسلام۔ حضرت رقیہؓ کا انتقال۔ بدر کی خبر سُن کر ابی لہب کی اچانک موت۔ اُس کے لڑکے عتبہ کا شیر کے ہاتھوں مارا جانا۔ مسلمانوں کی غیر متوقع فتح پر یہودیوں کی جھنجھلاہٹ۔ اسلام دشمنی میں اضافہ اور شرارتیں۔ یہودیوں کی جلاوطنیوں کی مختصر تاریخ اور یثرب میں اُنکی آمد۔ مدینہ کے عرب قبائل بنو اوس و خزرج سے اقتدار کی جنگ۔ عبداللہ بن ابی کو مدینہ کا متفقہ سردار بنا لینے کی تجویز۔ رسول اللہ صلعم کے مدینہ آجانے سے عبداللہ بن ابی کی امارت مدینہ سے محرومی اور اُس کا ردِ عمل۔ آنحضورؐ کی صلح جوئی اور یہودیوں سے تحریری معاہدہ۔ قبلہ کی تبدیلی اور یہودیوں کا اشتعال۔ اسماء بنت مروان اور ابوافک کی آپؐ کی شان میں ہجو گوئی اور ان کا قتل۔ یہودیوں کے قبیلہ بنو قینقاع کی بدعہدی اور اُن کا مدینہ سے اخراج۔ کعب بن اشرف ایک اور یہودی شاعر کا مکہ جاکر قریش کو اشتعال دلانا اور اُس کا قتل۔ بدر کی شکست پر ابوسفیان کا غم و غصہ اور مدینہ کے نواح پر حملے۔ جوابی طور پر مسلمانوں کا قریش کے تجارتی قافلوں کی ناکہ بندی کرنا اور ایک بڑے قافلے کو لوٹ لینا۔ حضرت حفصہؓ سے نکاح۔ آپؐ کی دوسری صاحبزادی اُمِ کلثوم کی حضرت عثمانؓ سے شادی۔

بارہواں باب:

دوسری لڑائی (غزوۂ اُحد۔ ۶۲۵ء) ۳۰۴

بدر کے ایک سال بعد ابوسفیان کا تین ہزار کا لشکر لے کر روانہ ہونا۔ ہندہ اور دوسری قریشی عورتوں کی جنگ میں شمولیت۔ دشمن کو مدینہ سے باہر روکنے کا فیصلہ۔ اسلامی لشکر کی تعداد۔ جبل اُحد کے دامن میں دونوں لشکروں کی صف بندی۔ جنگ کا آغاز اور قریش کے لشکر کی پسپائی۔ سخت احکام کے باوجود مسلمان تیر اندازوں کا اپنی جگہ چھوڑ دینا۔ خالد بن ولید کا عقب سے اچانک حملہ اور قریش لشکر کا لوٹ آنا۔ اسلامی لشکر میں افراتفری اور شدید جانی نقصان۔ حضرت حمزہؓ کی شہادت۔ حضرت محمدؐ کا زخمی ہو جانا اور آپ کے قتل کی افواہ سے

مسلمانوں میں بد دلی اور سراسیمگی۔ مسلمانوں کا دوبارہ جمع ہونا اور پہاڑی پر مورچہ جما کر دفاع جاری رکھنا۔ قریشی لشکر کی مکہ کو واپسی۔ دوسرے روز حضرت محمدؐ کا مدینہ واپس آنا۔ ابو سفیان کے لشکر کا تعاقب اور اُسے مکہ کی طرف فرار پر مجبور کر دینا۔ مدینہ واپس آنے پر مسلمانوں کو اُن کی نافرمانی پر تنبیہہ اور اطاعت رسُول اور پختگی ایمان کی تلقین۔

تیرہواں باب:

مدینہ کا محاصرہ ۳۲۴

(غزوۂ خندق - ۶۲۷ء)

قریش کی ایک اور جنگ کی تیاری۔ خیبر کے یہود۔ بنو غطفان اور دوسرے عرب قبائل کا قریش کا ساتھ دینا۔ ابو سفیان کا دس ہزار کے لشکر سے مدینہ پر حملہ۔ مسلمانوں کے لشکر کی تعداد۔ اسلحہ اور سامان کی کمی۔ مدینہ کے دفاع کے لئے غیر محفوظ اطراف میں خندق کھودنا۔ عقب میں یہودی قبیلہ بنو قریظہ اور عبداللہ بن ابی کی موجودگی اور بدعہدی اور غداری کا خطرہ۔ بنو غطفان کو قریش سے علیحدہ کرنے کی تجویز۔ قریش کے حملے اور اُنکی ناکامی۔ عمرو بن عبدود اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا معرکہ۔ ابو سفیان کی ریشہ دوانیاں اور بنو قریظہ کی بدعہدی۔ سعد بن معاذ رضؓ کی ناکام صلح جوئی۔ ابو سفیان کا بڑا حملہ۔ قریش اور بنو قریظہ میں ایک دوسرے کے خلاف شکوک اور بے اعتمادی۔ بنو قریظہ کا باقاعدہ جنگ میں شرکت سے گریز۔ قریشی لشکر میں بے اطمینانی اور ابو سفیان کی مایوسی۔ موسم کی خرابی بارش اور طوفان۔ طوفان کی شدت اور بددلی کے سبب قریش اور اُن کے حمایتی قبائل کا کیمپ اُٹھا کر مدینہ سے فرار۔ بنو قریظہ کو غداری کی سزا دینے کا فیصلہ۔ اُن کے قلعہ کا محاصرہ۔ یہودیوں کا ہتھیار ڈالنا، اور سعد بن معاذ کو ثالث مقرر کرنا۔ یہودیوں کا قتل۔ حضرت محمد صلعم پر ظالم ہونے کا الزام اور تورات سے اُس کا جواب۔

چودھواں باب:

حضرت عائشہؓ کا ہار ۳۴۶

(۶۲۷ عیسوی)

عرب عورتوں کے متعلق اہلِ مغرب کا غلط قیاس۔ حضرت عائشہؓ پر بہتان تراشی۔ عبداللہ بن اُبی کا کردار۔ حضرت عائشہؓ کی بریت اور عورتوں پر غلط الزام لگانے والوں کی سزا کے متعلق آیت کا نزول۔ عورتوں پر بُہتان تراشی، شادی اور طلاق کے متعلق وضع قوانین۔ شادی اچھے معاشرے کی اساس۔ اسلام سے پہلے عرب میں عورت کی حیثیت۔ مغرب کے مقابلہ میں اسلام میں عورت کا مقام اور حقوق۔ عورت سے اچھے سلوک کی ہدایات۔ اہلِ کتاب عورتوں سے شادی کی اجازت۔ بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنے پر پابندی۔ حضرت محمدؐ کے کھانے اور لباس کی سادگی۔ سُرمہ، عطر اور خضاب کا استعمال۔ کھانے کا طریقہ اور دُعا۔ دُودھ سے رغبت۔ آپؐ کا اصطبل۔ سواری کا شوق۔ آپؐ کے مکانات، غلام اور کاتب یا سیکرٹری۔

پندرھواں باب:

قُرآن ۳۶۰

قرآن کے متعلق مغرب والوں کی لاعلمی۔ قرآن کے لُغوی معنی۔ سُورتوں یا ابواب کی تعداد۔ سُورتوں کا عنوان اور نفسِ مضمون۔ اکثر آیات و احکامات کا آغاز لفظ "قُل" سے ہونا کلامِ الٰہی ہونے کی دلیل۔ پہلے پہل قرآنی آیات، بھیڑ کے شانے کی ہڈیوں، سیپ، لکڑی یا پتھر کی تختیوں، کھالوں، کھجور کی شاخوں اور کپڑے کی پٹیوں پر محفوظ کی گئیں۔ خلیفہ اول کے عہد میں زید بن ثابتؓ کا قرآن کو جمع کر کے کتابی صورت دینا اور اُس کا مستند نُسخہ قرار دیا جانا۔ حضرت حفصہؓ کی تحویل، حضرت عثمانؓ کے عہد میں اس نُسخہ کی مزید نقلیں تیار کر کے مختلف گورنروں کو بھیجنا۔ قرآن ہی ایسی کتاب ہے جو آج تک بلا تحریف و ترمیم جُوں کی تُوں موجود ہے۔ دُنیا میں قرآن کے تمام نُسخے حضرت حفصہؓ والے قرآن ہی کی نقلیں ہیں۔ سُورتوں کی ترتیب۔ اسلام کے شروع دور کی سُورتوں

پر شاعرانہ رنگ کا غلبہ۔ حضرت محمدؐ کے اختیار و اقتدار کے ساتھ ساتھ سورتوں کے لب و لہجہ میں بتدریج تبدیلی۔ شاعرانہ صفات کے باوجود قرآن مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور مدنی ضوابط کا ایک مجموعہ اور عبادات اور دعاؤں اور قدیم مذہبی واقعات اور قصص کی ایک جامع کتاب ہے۔ ترجمے قرآن کو اس کے الفاظ کی عظمت و سحر اور غنائیت سے محروم کر دیتے ہیں۔ قرآن کا الہامی ہونا۔ قرآن پہلی مرتبہ انبیائے سلف کے واقعات کو تاریخ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ قرآن اور حضرت عیسےٰؑ۔ قرآنی سورتوں سے چند نمونے۔

سولہواں باب:

صلح حدیبیہ ۳۸۰

(۶۲۸ عیسوی)

جانوروں سے اچھے برتاؤ کے لئے ہدایات اور قاعدے وضع کرنا۔ ۶۲۷ء میں قریش کے متعدد چھوٹے حملے۔ ستمبر ۶۲۷ء میں قریش کے ایک بڑے قافلے کو لوٹنا۔ قیدیوں میں آپؐ کے داماد ابو العاصؓ کا شامل ہونا۔ اُن کی رہائی اور قبولِ اسلام۔ رومن شہنشاہ ہرقل کے دربار میں پہلی سفارت۔ ۶ھ کے اختتام کے قریب عمرے کے لئے پندرہ سو مسلمانوں کے ساتھ مدینہ سے روانگی۔ حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ۔ حضرت عثمانؓ کی صلح جوئی کی کوشش۔ اُن کے قتل کی افواہ اور بیعت رضوان۔ قریشی سفیروں سے مذاکرہ۔ فریقین میں معاہدہ اور صلح کی شرائط۔ معاہدے کی شرائط سے مسلمانوں میں مایوسی۔ حضرت اُم سلمہؓ کا کردار۔ سورۂ فتح کا نزول۔ ابو بصیر کا قریش کے کاروانوں کا راستہ مسدود کر دینا۔ قریش کا وفد اور نو مسلموں کی مدینے سے جبراً واپسی کی شرط کی تنسیخ۔ معاہدہ حدیبیہ حضرت محمدؐ کا عظیم سیاسی کارنامہ۔

سترھواں باب:

سفارتیں۔ غزوہ خیبر ۴۰۱

سفیروں کا انتخاب۔ آپؐ کی مُہر۔ شہنشاہ ہرقل۔ شہنشاہ خسرو۔ قبیلہ بنو حنیفہ

کے سردار۔ گورنر مصر اور شاہ حبش کے ہاں سفارتیں بھیجنا اور اسلام کی دعوت دینا۔ شہنشاہ خسرو کی بے ادبی اور تادیبی کارروائی کی دھمکی۔ شاہ حبش کے ہاں سفیروں کی مدارات اور مسلم مہاجرین سے اچھا سلوک۔ حبش میں مقیم حضرت اُمِّ حبیبہ رض کا رسول اللہ سے نکاح اور شاہ حبش کی وکالت۔ مصر کے گورنر کا آپ کو تحائف بھیجنا اور دو قبطی کنیزیں خدمت میں پیش کرنا۔ حضرت ماریہ قبطیہ رض آپ کی کنیزی میں۔ آپ کی دوسری ازواج کی خفگی اور آپ کی ناراضگی۔ حضرت خدیجہ رض کے متعلق آپ کے تأثرات۔ حضرت محمدؐ کی ذہنی صلاحیتیں۔ فوج کی جدید تشکیل۔ نئے ہتھیار اور تربیت۔ خیبر کا محلِ وقوع اور یہودیوں کا خطرہ۔ خیبر کی مہم۔ مسلم خواتین کی پہلی بار جنگ میں شرکت۔ یہودیوں کا زبردست مقابلہ۔ فتح میں تاخیر۔ قلعہ قاموص پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فیصلہ کن حملہ۔ یہودی سردار مرحب سے مقابلہ۔ مسلمانوں کی فتح۔ حضرت صفیہ رض آپ کی زوجیت میں۔ ایک یہودی عورت زینب کا آپ کو زہر دینا۔ مدینہ کو فتحمند واپسی۔ مسلم مہاجرین اور حضرت اُمِّ حبیبہ رض کی حبشہ سے آمد۔

اٹھارہواں باب:

ایفائے معاہدہ (عمرۂ قضا) اور جنگِ موتہ ۴۲۲

معاہدہ حدیبیہ کے مطابق فروری ۶۲۹ء میں حضرت صلعم کا ارادہ عمرہ۔ دو ہزار سے زائد مسلمانوں کے ساتھ مدینہ سے روانگی۔ سربرآوردہ قریش کا مکہ سے باہر چلا جانا۔ عوام کا کعبہ کے گرد پہاڑیوں پر ڈیرے جما لینا۔ مسلمانوں کا بیت اللہ میں داخلہ اور مناسک کی ادائیگی۔ حضرت بلال رض کا کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دینا اور کعبہ کے بتوں کا اُن کے پاؤں تلے ہونا۔ بتوں کے غضب سے محفوظ رہنے، اذان کے سحر اور اسلامی شعائر سے اہل مکہ کا متاثر ہونا۔ عمرے کے بعد مدینہ کو واپسی۔ حضرت میمونہ رض سے شادی۔ خالد بن ولید، عمرو بن العاص اور کعبہ کے متولی عثمان بن طلحہ کا مدینہ جا کر قبول اسلام۔ ایک

اسلامی سفیر کا فلسطین میں قتل۔ زیدؓ بن حارثہ کی سرکردگی میں تین ہزار کے لشکر کی روانگی۔ خالد بن ولید کا پہلی بار اسلامی لشکر میں شریک ہونا۔ مُوتہ (فلسطین) کے مقام پر دو لاکھ رومن فوج سے مقابلہ۔ اسلامی لشکر کا زبردست جانی نُقصان سالارانِ لشکر زیدؓ بن حارثہؓ، جعفرؓ طیّار اور عبداللہؓ بن رواحہ کی شہادت۔ خالد بن ولید کی سالاری اور اسلامی لشکر کو بچا کر نکال لانا۔ حضرت خالدؓ کو سیف اللہ کا خطاب۔ عمرو بن العاص کی سالاری میں شام کی طرف ایک اور مہم کی روانگی۔ مسلمانوں کی کامیابی۔ اس مہم میں حضرات عمرؓ، ابُو بکرؓ اور ابُو عبیدہؓ جیسے صحابہ کبار کا عمرو بن عاص کی ماتحتی میں لڑنا اور اسلامی ڈسپلن کی مثال قائم کرنا۔

اُنیسواں باب:

ابُو سفیان کی دستبرداری ۴۴۳

(فتح مکّہ۔ جنوری ۶۳۰ء رمضان ۸ ہجری)

مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلہ بنو خزاعہ پر قریش کے حلیف بنی بکر کا حملہ۔ قریش کی شمولیت اور معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی۔ مکّہ والوں کو غلطی کا احساس۔ ابُو سفیان کا صلح جوئی کے لئے مدینہ جانا اور ناکامی۔ دس ہزار اسلامی لشکر کی روانگی۔ غیر معروف راستوں سے سفر اور لشکر کی نقل و حرکت کی رازداری لشکر کا اچانک مکّہ پہنچنا اور شہر کا محاصرہ۔ ابُو سفیان کا رات کے وقت مکّہ سے نکلنا۔ حضرت عباسؓ سے مُلاقات خود کو حضرت محمدؐ کے سپرد کر دینا اور ایمان لے آنا۔ اسلامی فوجوں کا مکّہ میں داخلہ۔ صفوان بن اُمیّہ، سہیل بن عمرو اور عکرمہ بن ابوجہل کی خالد بن ولید کے سواروں سے جھڑپ اور فرار۔ حضرت محمدؐ کا بیت اللہ میں تشریف لے جانا۔ کعبہ کے تمام بُتوں کو توڑ دینا۔ کعبہ کی کُنجیاں عُثمان بن طلحہ اور زمزم کی تولیت حضرت عباسؓ کو لوٹانا۔ اہلِ مکّہ کے لئے عام معافی کا اعلان اور ان کا قبولِ اسلام۔ ہندہ کا معافی مانگنا اور مسلمان ہو جانا۔ عکرمہ بن ابوجہل کی واپسی اور قبولِ اسلام۔ مکّہ کے گرد و نواح کے بُتوں کا خاتمہ۔ شہر مکّہ پر خصوصی توجہ اور اہلِ مدینہ کا شکوہ اور حضرت محمدؐ کی یقین دہانی۔ کعبہ کے بُتوں سے پاک ہو جانے

پر حضرت محمدؐ کی شکر گزاری اور اطمینان۔

بیسواں باب:

فوج کی تشکیل

۴۶۴

(غزوات حنین، طائف اور تبوک ۶۳۰-۶۳۱ء)

فتح مکہ کا ردِ عمل۔ وادیٔ طائف کے قبائل کا اجتماع اور جنگی تیاری۔ اسلامی لشکر کی روانگی۔ حنین کی تنگ گھاٹی میں خالد بن ولید کے ہراول سواروں کا پھنس جانا۔ دشمن کا دونوں جانب سے اچانک حملہ۔ بدّو سواروں کی بوکھلاہٹ اور فرار۔ دیکھا دیکھی ساری سپاہ کا بھاگ اٹھنا۔ حضرت محمدؐ کا میدان میں ڈٹ جانا اور بھاگتی فوج کو مجتمع کر کے ہاری ہوئی لڑائی جیتنا۔ مکمل فتح اور غنیمت کی فراوانی۔ آپکی دایہ حلیمہ سعدیہؓ اور اُن کی لڑکی کا قیدیوں میں شامل ہونا۔ طائف کا محاصرہ۔ حنین کی غنیمت کی تقسیم اور اہلِ مدینہ کا اعتراض۔ حضرت محمدؐ کا جواب۔ مدینہ کو واپسی۔ شام کی سرحد پر رومن فوجوں کے اجتماع کی خبریں۔ جہاد کا اعلان اور مقابلہ کی تیاری۔ منافقین کا پروپیگنڈہ۔ کچھ مسلمانوں کا جہاد میں شامل نہ ہونا۔ چالیس ہزار فوج اور باربرداری کے ساتھ جُھلستے ہوئے صحرا کو طے کر کے تبوک پہنچنا۔ کافی دیر قیام کے باوجود رومن فوج کا سامنے نہ آنا۔ اس دوران میں گردونواح کے قبائل اور سرداروں کا اطاعت اختیار کرنا۔ معاہدے کرنا اور شمالی سرحدوں کو محفوظ بنانا۔ مدینہ کو فتح و ظفر کے ساتھ واپسی۔ مہم میں شامل نہ ہونے والوں کا اخلاقی اور سماجی بائیکاٹ۔ عبداللہ بن اُبی کی وفات۔ طائف کے وفد کی آمد اور اطاعت۔ ابوسُفیان اور مغیرہ بن شعبہ کا طائف جاکر وہاں کے بڑے بُت "اللّات" کو توڑنا۔ حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج بنا کر بھیجنا۔ سُورۂ براءت کا نزول اور آئندہ سے حرم میں غیر مسلموں کے داخلے پر پابندی۔

اکیسواں باب :

حجتہ الوداع ۴۹۰

(۶۳۲ عیسوی)

اسلام میں عیسائیوں سے سلوک ۔ مصر، اومان، یمن، حضرموت اور شمال اور جنوب کی خود مختار ریاستوں سے وفود کی آمد ۔ مشرق بعید میں اشاعت اسلام میں حضرموت کے لوگوں کی خدمات ۔ حضرت محمدؐ کا نبی آخر الزمان اور اسلام کا آخری دین ہونا ۔ مسیلمہ کذاب اور نبوت کا دعویٰ ۔ اُس کا پیغام اور آپؐ کا جواب ۔ مارچ ۶۳۲ء میں حج کے لئے چالیس ہزار مسلمانوں کے ساتھ روانگی مناسکِ حج کا تعین اور اُنکی ادائیگی ۔ آپؐ کا آخری حج و بصیرت افروز خطبہ اور معاشرتی اصلاحات ۔ دین اسلام کے تکمیل کے متعلق آیت کا نزول مکہ میں مختصر قیام ۔ حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی قبروں پر حاضری ۔ مدینہ کو واپسی ۔

بائیسواں باب :

وفات ۵۱۰

(جون ۶۳۲ء)

مسلمانوں کا نظریہ حیات اور موت سے بے خوفی ۔ شام کے خلاف مہم بھیجنے کی تیاری اور اسامہؓ بن زید کی سالاری ۔ اسلامی افواج میں سالاری کا معیار ۔ آپؐ کی علالت اور اُس کے اسباب ۔ جنت البقیع میں اہل قبور کے لئے دعا ۔ بخار میں تیزی اور آپؐ کا حضرت عائشہؓ کے حجرے میں منتقل ہونا ۔ اُسامہؓ کے لشکر کو روک لینے کی خبر سن کر خفگی کا اظہار اور مسجد میں آکر خطبہ دینا ۔ زیدؓ بن حارث اُسامہؓ بن زید ۔ ابی بکر صدیقؓ اور انصار مدینہ کی تعریف ۔ اُن سے حُسنِ سلوک کی ہدایات اور اپنی عنقریب وفات کی طرف اشارہ ۔ بیماری میں شدت ۔ حضرت ابی بکرؓ کو نماز پڑھانے کی ہدایت ۔ طبیعت کی بحالی

پر ایک مرتبہ پھر مسجد میں جاکر وعظ و نصیحت کرنا اور بتانا کہ موت سے کسی کو مفر نہیں اور یہ کہ آپ کی وفات سے ان کے ایمان اور اسلام میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیئے۔ اتحاد، محبت، اخوت اور نیک اعمال کی تلقین۔ آپ کی وفات۔ حضرت عمرؓ اور دوسرے بہت سے لوگوں کا یقین نہ کرنا۔ حضرت ابی بکرؓ کا آکر آپؐ کی وفات کی تصدیق کرنا۔ رنج و غم کا منظر حضرت محمدؐ کی جانشینی کا سوال۔ اہلِ مدینہ کا اجتماع۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا متفقہ طور پر خلیفہ منتخب ہو جانا۔ آپ کی تدفین مسجد نبوی میں بیعت اور بحیثیت خلیفہ تقریر۔

کتابیات :- ۵۲۳

● ● ●

تعارف

مسٹر باڈلے کی کتاب THE MESSENGER پہلے پہل ۱۹۶۴ء میں میری نظر سے گذری اُس وقت صرف چند ابواب ہی دیکھ سکا کیونکہ ایک کرم فرما سے عاریتاً دو تین روز کے لئے لی تھی۔ اس کے بعد مصروفیات کے سبب اس طرف توجہ نہ دے سکا۔ ۱۹۷۳ء میں لاہور کے مختلف ناشران اور کتب فروشوں سے دریافت کیا کہ یہ کتاب کہیں دستیاب ہو تو خرید سکوں لیکن اس میں مایوسی ہوئی۔ چنانچہ لائبریری سے لے کر پڑھی۔ اب کی دفعہ اطمینان سے مطالعہ کیا تو مصنف کے اسلام کے متعلق تاثرات، اس کے انوکھے انداز بیان اور دلنشیں پیرائے نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ اس کا ترجمہ کرنا ضروری سمجھا تاکہ دوسرے لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں اور خصوصاً ہمارے وہ نوجوان جو مغربی تعلیم حاصل کر کے رسولِ کریمؐ کی عظمت سے لاعلم اور اسلام جیسے عملی نظام حیات سے دور اور بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ میری یہ ناچیز کوشش پیش خدمت ہے۔

لاہور کے کتب خانوں میں مصنف کی صرف دو کتابیں دستیاب ہوئیں۔ ایک تو یہی جس کا ترجمہ پیش خدمت ہے اور جو ۱۹۵۴ء میں لاہور کے ایک ادارے اورینٹالیا ORIENTALIA کے اشرف ڈار صاحب نے طبع کرائی۔ اور دوسری "اندرونِ الجیریا" ALGERIA FROM WITHIN ہے۔ ان دونوں کتابوں میں نہ تو خود مصنف نے اپنے متعلق کچھ لکھا ہے اور نہ ہی ناشران نے مصنف کا کچھ احوال دیا ہے۔ چنانچہ مصنف کے حالات کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنے کے لئے میں برٹش کونسل کے کتب خانے گیا۔ معلوم ہوا کہ چونکہ مصنف انگریز نہیں ہے۔ اس لئے اس کی کوئی تصنیف وہاں موجود نہیں۔ مصنف کی اکثر تصانیف امریکہ سے شائع ہوئی ہیں۔ اس خیال

سے امریکن سنٹر کے کتب خانے کا بھی چکر لگایا لیکن انہوں نے بھی یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ چونکہ مصنف امریکن نہیں ہے۔ اس لئے اس کی کوئی کتاب ان کے ہاں نہیں۔ البتہ دوسری مرتبہ برٹش کونسل والوں کی امداد و عنایت سے لندن کے ٹائمز کی مطبوعات میں سے ایک کتاب تذکرہ مصنفین میں جس کا نام THE AUTHORS AND WRITERS WHO'S WHO. (مطبوعہ ۱۹۶۳ء) ہے، چند سطور مصنف کے حال اور تصنیفات کے متعلق مل گئیں۔

مصنف نے اپنی کتابوں میں اپنا نام آر۔ وی۔ سی۔ باڈلے لکھا ہے۔ پورا نام رونالڈ وکٹر کورٹنے باڈلے[1] ہے۔ مصنف کے متعلق صرف اتنے ہی حالات معلوم ہو سکے کہ وہ ۱۸۹۲ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ انگلستان میں ایٹن (ETON) کے پبلک سکول میں تعلیم پائی اور رائل ملٹری کالج سینڈ ہرسٹ سے فوجی کمیشن حاصل کیا۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے کچھ وقت ہندوستان میں گذارا اور یہاں ہی کشمیر میں ایک شکاری مہم کے دوران اسلام سے روشناس ہوا جس کا ذکر اس نے اس کتاب کے پیش لفظ میں کیا ہے۔ جنگ عظیم اول ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء میں برطانوی فوج میں خدمات انجام دیں اور لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچا۔ فوج سے کب ریٹائر ہوا اس کا کچھ علم نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اور حالات بتاتے ہیں کہ مصنف جنگجوئی اور فوجی خدمات کی نسبت کتب بینی اور سیاحت کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ سفید اقوام (جس میں انگریز بھی شامل ہیں) کے ہاتھوں پسماندہ اقوام کے استحصال کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ جس کی جھلکیاں اس کی دوسری کتب کے علاوہ اس کتاب کے صفحات میں بھی جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ چنانچہ بقول خود جنگ عظیم کے بعد کے زمانے کی بے کار اور بے نتیجہ الجھنوں سے اکتا کر عرب چلا گیا اور وہاں پر صحرا نشینوں کے درمیان سات سال تک انہی کی طرح خیموں میں رہا۔ انہی کی طرح کا لباس پہنا اور ان کا دوست بن کر انہی کی طرح کی جفاکشانہ زندگی گذاری۔ اس طویل قیام کے دوران اسے وہاں کے صحرا نشین اور قصباتی عربوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہاں رہ کر اس نے رسولِ اکرمؐ کے حالات زندگی، وہاں کا ماحول اور اسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور اس دوران میں اپنے ذہن میں مواد اکٹھا کرتا رہا۔

1- RONALD VICTOR COURTENEY BODLEY

مصنف کے سیّاحی کے شغف اور مطالعے اور مشاہدے کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی کتاب "اندرون الجیریا"[1] ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں اس کی تصنیف کردہ ہیں۔

1. ADMIRAL TOGO
2. INDISCREET TRAVELS EAST.
3. A JAPPANESE OMELET.
4. A DRAMA OF THE PACIFIC.
5. INDISCRETIONS OF A YOUNGMAN.
6. THE LILAC TREE.
7. OPAL FIRE.
8. YASMINA.
9. GERTRUDE BELL.
10. FLIGHT INTO PORTUGAL.
11. WIND IN THE SAHARA.
12. THE WARRIOR SAINT.
13. IN SEARCH OF SERENITY.
14. THE GAY DESERTERS.

پیش نظر کتاب THE MESSENGER پہلے پہل ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن پاکستان سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اصل ایڈیشن پاکستان میں نایاب ہے۔ اس تصنیف و تالیف کے شغل کے علاوہ مصنف عرصہ تک امریکہ کے مشہور رسائل "CORONET" "SPHERE" اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے اداروں سے بھی بحیثیت قلمی معاون منسلک رہا۔

مصنف نے اس کتاب میں رسولِ کریم ؐ کو ایک روحانی پیشوا اور ایک مافوق الفطرت آدمی کی بجائے ایک زیرک، مخلص، انسانیت کا ہمدرد اور خداداد صلاحیتیں رکھنے والے

1- ALGERIA FROM WITHIN

عملی انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ آپؐ نے نبی ہونے کے باوجود لوگوں کو قائل کرنے کے لئے معجزے نہیں دکھائے۔ آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ تو یہ تھا کہ آپؐ بغیر کسی معجزے کے اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔ آپؐ سب سے پہلے اور آخری نبی تھے جنہوں نے اپنی زندگی میں لاتعداد خداؤں کو پوجنے والی قوم اور بت پرست عرب کو ایک واحد خدا کا پرستار بنا دیا۔ یہ شرف اور کامیابی کسی اور نبی یا پیغمبر کو نصیب نہیں ہوئی — مصنف نے اس کتاب میں اسلامی اصولوں کو سراہا ہے اور عیسائیوں اور یہودیوں کے اعتراضات کا انہی کی الہامی کتابوں سے جواب دیا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ انگلستان اور امریکہ والوں نے اس کتاب کو پسند نہیں کیا اور مذکورہ بالا تذکرہ مصنفین میں مسٹر باڈلے کی تصنیفات میں پیش نظر کتاب THE MESSENGER کا نام نہیں ملتا۔

مصنف نے نبی اکرم صلعم کی ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر جانچا ہے اور آپؐ کے ہر اقدام کو عقل و دانش پر مبنی قرار دیا ہے۔ عیسائی نوجوانوں کو مطمئن کرنے کے لئے رسول اکرمؐ کے بعض اقدامات پر خود ہی اعتراضات کئے ہیں اور خود ہی عقلی دلائل یا انجیل و توریت کے حوالوں سے ان کو صحیح ثابت کیا ہے۔ بعض باتیں اتنے مدلل طریقے پر اور ایسے دلنشین پیرائے میں سمجھائی ہیں کہ شاید بعض مسلمان عالم بھی اتنی اچھی طرح بیان نہ کر سکے ہوں۔ مصنف خود کہتا ہے کہ اس نے یہ کتاب علمائے مشرق یا طلبائے علوم دین سے زیادہ یورپ کے ان لوگوں کے لئے لکھی ہے جو آنحضورؐ کے متعلق متعصب عیسائی پادریوں اور دیگر مغربی سیرت نگاروں کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں پڑھ کر آپؐ کی شخصیت کے متعلق غلط خیالات ذہن نشین کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کے لکھنے کا اصل مقصد آنحضورؐ کے متعلق ایسے غلط خیالات کا ازالہ ہے۔ کتنا قابل قدر اور نیک خیال ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کا شرف ایک عیسائی فرد کو حاصل ہوا۔

مصنف ایک برطانوی فوجی افسر ہونے اور ہر قسم کی آسائشیں مہیا ہونے کے باوجود بہت سادہ اور ملنسار طبیعت کا مالک ہے۔ عرب میں بھی اور الجیریا میں بھی وہ اپنے یورپین ساتھیوں سے کٹ کر زیادہ وقت صحرا نشین لوگوں اور قبائلی سرداروں کے ساتھ

گذارتا ہے۔ بعض اوقات اپنے مذہب کے متعلق ان کی تلخ باتیں بھی سنتا ہے لیکن ان میں اپنا اعتماد پیدا کر کے اور اُن کا دوست بن کر رہتا ہے۔ اُن کے ساتھ ایک ہی پیالے میں ان کے دستور کے مطابق کھاتا ہے۔ اُنہی کا سا لباس پہنتا ہے اور اُن کے ساتھ ہی تپتے ہوئے صحراؤں اور چاندنی راتوں میں اونٹوں پر سفر کرتا ہے۔ طبیعت میں سیری اور استغنا ہے۔ کسی سے خوف کھائے بغیر سچی بات کہتا ہے خواہ وہ مسلمانوں سے متعلق ہو یا عیسائیوں سے، انگریزوں کے متعلق ہو یا دوسری یورپین اقوام کے بارے میں۔ وہ اپنی کتاب "اندرون الجیریا" کے پیش لفظ میں لکھتا ہے:

"کسی وقت میرے ذہن میں دنیاوی عزت وجاہ اور لمبے چوڑے خطابات کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ یہ عزت و سربلندی یورپ کے دارالخلافوں اور حکمرانوں کے تقرب یا میدان جنگ میں ہی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن اب مجھے پتہ چلا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ دنیاوی عزت اور خطابات تو محنت سے کمائی ہوئی دولت سے خریدے جا سکتے ہیں اور میدان جنگ کے ہیرو بھی کچھ عرصہ کے بعد لوگوں کی نظروں کے سامنے سے گذر جاتے ہیں اور کوئی ان کی طرف توجہ نہیں دیتا۔"

اس کتاب کے مطالعہ کے سلسلہ میں قارئین سے چند گذارشات کروں گا:

۱:- کتاب کا مطالعہ کرنے سے پہلے مصنف کا لکھا ہوا پیش لفظ اور مقدمہ ضرور پڑھا جائے۔ اس سے کتاب لکھنے کا مقصد اور اس کے محاسن معلوم ہو جائیں گے۔

۲:- خیال رہے کہ مصنف ایک عیسائی ہے اور لاکھ وہ مسلمانوں اور عربوں میں عرصے تک رہا ہو پھر بھی بعض اوقات ایک آدھ بات نادانستہ طور پر اس کے قلم سے ایسی نکل جاتی ہے جو ہمارے اعتقادات کے خلاف ہوتی ہے لیکن اہل مغرب کے لئے وہ صرف محاورے یا روزمرہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے لئے ہمیں اسے کچھ نہ کچھ رعایت دینی ہوگی۔

۳:- مصنف یورپین اور عیسائی ہے اور اس کے مخاطب بھی یورپ کے لوگ ہیں۔ اس کا مغربی ادب اور عیسائیت کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے۔ اس لئے اس کتاب میں اکثر حوالے مغربی ادب یا انجیل و توریت سے تعلق رکھتے ہیں۔

۴:۔ مصنف نے جگہ جگہ قرآنی آیات کا انگریزی ترجمہ دیا ہے اور بعض اوقات ایک ہی جگہ موضوع کے مطابق کئی کئی سورتوں کے ٹکڑے یا آیات جمع کر دی ہیں۔ یہ بتائے بغیر کہ یہ قرآن کی کون کون سی سورتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ میں نے کوشش کر کے اکثر جگہ اصل قرآنی آیات تلاش کر کے لکھ دی ہیں تاکہ مطلب زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آ سکے۔

۵:۔ اسی طرح مصنف نے کتاب میں کوئی حواشی نہیں دیئے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لئے میں نے مختلف کتابوں، تواریخ، ناولوں اور انسائیکلوپیڈیا وغیرہ سے تلاش کر کے حواشی کا اضافہ کر دیا ہے۔

۶:۔ بعض جگہ مصنف سے تاریخی اور واقعاتی غلطیاں ہوئی ہیں یا ان میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ کئی تواریخی ماخذ اور معتبر سیرتوں کو سامنے رکھ کر صحیح واقعات حواشی میں بتا دیئے گئے ہیں یا روایتوں کا اختلاف واضح کر دیا گیا ہے۔

۷:۔ مصنف نے اس کتاب میں عیسائیوں کو مسلمانوں کے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عیسائیوں کا مسلمانوں اور عیسائیوں سے اختلافات صرف غلط فہمی اور لاعلمی کے سبب ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں جگہ جگہ قرآن اور مسلمانوں کی نظر میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کا عزّ و وقار بیان کر کے عیسائیوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اسلام کا غیر جانبداری سے مطالعہ کریں۔

۸:۔ "حیاۃ محمدؐ" مولفہ ڈاکٹر محمد حسین ہیکل کے تمام حوالے مولانا محمد وارث کامل کے ترجمے "سیرۃ الرسول" سے دیئے گئے ہیں۔

نامناسب نہ ہوگا کہ اس سلسلہ میں مصنف کے تاثرات سے جو سرورِ کائناتؐ اور اسلام کے متعلق اس کتاب میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔ چند اقتباسات پیش کئے جائیں تاکہ قارئین کو اس کتاب اور مصنف کے خیالات کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔

۱:۔ مصنف اپنے صحرا کے قیام کے بارے میں لکھتا ہے "   میں وہاں قرآن کو عرب کے پرعظمت لحن لہجہ میں سنتا تھا اور مسلمان نہ ہونے کے باوجود اس مذہب کے سحر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا جو عاجز بندے اور اس کے خالق کو آمنے سامنے لاکھڑا کرتا ہے۔" (پیش لفظ)

۲:۔ "بہت بعد میں جب میں نے حضرت محمدؐ کی سیرت پر کتابیں پڑھیں تو بڑی مایوسی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم اپنے ایک دوست کی زندگی کے حالات پڑھ رہے ہیں جو ایسے لوگوں نے لکھے ہیں جنہوں نے ان کو کبھی قریب سے نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ مسلمان مصنفین بھی قریبی اور ذاتی تاثر پیدا کرنے میں ناکام دکھائی دیتے ہیں"۔ "ان سوانح عمریوں میں حضرت محمدؐ عام طور پر خالی دیوار کی ایک تصویر نظر آتے ہیں۔ جو خالی اور بے جان ہو"۔ (مقدمہ)

۳:۔ "جہاں ہمیں حضرت موسیٰؑ، کنفیوشس اور مہاتما بدھ کے زمانے کی تاریخ نہیں ملتی اور حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے صرف کچھ حالات معلوم ہیں وہاں حضرت محمدؐ کی ساری زندگی واضح اور صاف ہے۔ یہاں ابہام اور پراسراریت کی بجائے ہمیں صحیح تاریخ ملتی ہے"۔ (مقدمہ)

۴:۔ "چنانچہ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں حضرت محمدؐ کو اس طرح پیش کر دوں جیسے آپؐ واقعی تھے۔ یعنی ایک سادگی پسند انسان، عظیم شخصیت کے مالک، اپنے لوگوں کا بھلا چاہنے والے، روحانی فیضان رکھتے ہوئے بھی آپؐ جو کچھ کرتے تھے منطقی سوچ کے ساتھ کرتے تھے۔ آپؐ کے عادات و خصائل درویشی کی حد تک سادہ تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ آپؐ دنیا کے انسان بھی تھے۔ آپؐ کے بچے بھی تھے۔ آپؐ گھوڑوں کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ بڑے خوش مذاق تھے۔ آپؐ کو اپنے دینی رہنما اور قائد ہونے کا احساس ضرور تھا لیکن آپؐ میں دکھاوا نہ تھا۔ آپؐ نے کبھی درباداری کا رکھ رکھاؤ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور کبھی کسی کو یہ تاثر نہ دیا کہ آپؐ کوئی مافوق البشر انسان یا روحانی صفات کے حامل تھے"۔

(مقدمہ مصنف)

۵:۔ "جب میں پہلے پہل عربوں میں جا کر رہا تو سب سے زیادہ محکم تاثر جو میں نے ان سے لیا وہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی ہمہ وقت موجودگی تھا۔ وہ کوئی کام بھی انشاء اللہ الحمدللہ یا اللہ وکیل کہے بغیر نہیں کرتے۔ وہ اسے صحرا میں بھی ہر وقت اپنے قریب موجود سمجھتے ہیں"۔ (چھٹا باب)

۶:۔ "عیسائیوں سے آپ کی مصالحت اس لئے نہ ہو سکی کہ انہوں نے اپنے سیدھے سادے مذہب کو غیر ضروری اور ناقابل فہم باتوں میں الجھا لیا تھا۔ مثلاً تثلیث تجسیم وغیرہ وغیرہ۔۔

ان کے ہاں برگزیدہ ہستیوں اور حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی شبیہوں کی تعظیم کعبہ اور اس کے تین سو ساٹھ خداؤں کی پرستش سے کم نہ تھی۔ یہ باتیں توحید کے اصول کے سراسر منافی تھیں۔" (چھٹا باب)

۷:۔ اسلام میں کوئی پادریت یا ملائیت نہیں۔ مسلمانوں میں علمائے دین، مبلغ اور مسجدوں کے امام ضرور ہیں لیکن خدا اور بندے کے درمیان کوئی کڑی نہیں.... ایک مسلمان اپنے رب سے ایسی ہی مودبانہ یگانگت اور جانے پہچانے انداز میں ہمکلام ہوتا ہے جیسے ایک بیٹا اپنے باپ سے..... مسلمانوں میں جمعہ کا دن عیسائیوں کے اتوار کے دن کی طرح فیشن کے مظاہرے یا آپس میں مل بیٹھنے یا گپ شپ کرنے کا ذریعہ نہیں اور پچھلے چھ دن کی روحانی کمی پوری کرنے کے لئے ہفتہ میں صرف ایک دن گرجاؤں میں جمع ہو جانے والی بات نہیں۔" (چھٹا باب)

۸:۔ "اسلام ہی وہ واحد نظام زندگی ہے جہاں اشتراکیت یا مساوات اپنے صحیح معنوں میں رائج ہے۔ اسلام میں امیروں کی دولت میں غریبوں کا بطور حق حصہ ہوتا ہے۔"

(چھٹا باب)

۹:۔ "کسی موقعہ پر بھی مسلمان سفید فام اقوام کی طرح صرف ان ہی علاقوں کے پسماندہ لوگوں کی امداد کے لئے نہیں گئے جہاں ان کی سخاوت بیش بہا دولت کمانے کا ذریعہ بنے۔ اسلامی فوجوں نے کبھی مفتوح قوموں کو غلام نہیں بنایا۔ البتہ انہیں اسلام کی پیش کش ضرور کی اور جو مسلمان ہو گئے وہ ان کے برابر کے بھائی بن گئے۔"

(چھٹا باب)

۱۰:۔ "معجزے حضرت عیسیٰؑ سے دو ہزار سال قبل اور دو ہزار سال بعد بھی رونما ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ حضرت محمدؐ کے غار حرا کے واقعات پر ہنستے اور مذاق اڑاتے ہیں انہیں لازم ہے کہ وہ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کا کوہ طور پر اور حضرت عیسیٰؑ کا گیلیلی کی پہاڑیوں پر پیش آمدہ واقعات پر بھی مذاق اڑائیں۔" (پانچواں باب)

۱۱:۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ غیر تعلیم یافتہ عرب اور قریش کے خنجروں سے بچ نکلنے والے ابوبکرؓ

عمرؓ اور علیؓ کرم اتنی تھوڑی سی مدت میں مشرق کی ایک وقت کی عظیم الشان اور طاقتور سلطنتوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والے بن جائیں گے۔ شام، کلدانیہ، مصر، میڈیا اور ایران کے ممالک ان غیر معروف جلاوطنوں کو خراج ادا کریں گے اور ان مملکتوں کے حکمران، ان کے سپہ سالار اور مذہبی رہنما (بقول ان کے) ان غیر شائستہ، مفلوک الحال اور بے خانماں لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان کے در پر حاضری دیں گے جو آج اپنے مدنی میزبانوں کی چٹائیوں پر بڑی شکر گزاری کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔" (نواں باب)

۱۲۔ "حضرت محمدؐ کے عہد کے مسلمانوں کی آئندہ نسلیں جن ممالک میں بھی گئیں عربی تہذیب و تمدن کی مشعل روشن کر کے وہاں کے لوگوں کو اس وقت نشاۃ ثانیہ عطا کی جبکہ یورپ ابھی زمانۂ وسطیٰ کی تاریکیوں کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا اور دمشق، فیض (مراکش)، سیول، غرناطہ اور قرطبہ (سپین) میں فن تعمیر کے شاہکار بالواسطہ نتائج ہیں۔ اس روایت کے جس کا آغاز حضرت محمدؐ نے ۶۲۳ء میں مدینہ میں مسجد تعمیر کر کے کیا تھا۔" (دسواں باب)

۱۳۔ "جنگ بدر کی حیثیت آج کے سپاہی کی نظر میں اور اس وقت کے کسی ایرانی، یونانی یا رومن سپاہی کی نظر میں بھی ایک بڑی جھڑپ سے زیادہ نہیں تھی۔ اگر ساتویں صدی عیسوی میں اخبارات بھی ہوتے تب بھی حضرت محمدؐ کی یہ فتح کوئی شہ سرخی نہ بناتی لیکن بایں ہمہ اس چھوٹی سی فتح کے اثرات تاریخ اسلام اور ساری دنیا پر اتنے ہی اہم تھے جتنے شہنشاہ قسطنطین کے ہاتھوں میلویا کے پل پر میکنٹیس MAXCNTIUS کی تباہی یا چالون کے مقام پر سفاک ہنوں کے بادشاہ اٹیلا ATTLLA کی شکست۔" (گیارہواں باب)

۱۴۔ "حالانکہ جنگ احد سے واپسی پر آپؐ زخمی تھے۔ جسم میں اکڑاؤ تھا بہت تھکے ہوئے تھے۔ عمر بھی چھپن سال ہو چکی تھی لیکن آپؐ فوراً گھوڑے پر سوار ہو گئے اور قریش کے تعاقب میں اس طرح روانہ ہوئے گویا کسی ہارے ہوئے دشمن کے تعاقب میں جا رہے ہوں ..... یہ ایک بے مثال جنگی چال تھی اور شاندار نفسیاتی قدم جو ایک تباہ شدہ فوج کا حوصلہ بحال کرنے کے لئے کسی بڑے سے بڑے جنرل کے ذہن میں بھی شاید ہی کبھی آیا ہو۔" (بارہواں باب)

۱۵:۔ "قرآن ایک معرکۃ الآرا صحیفہ ہے۔ یہ حضرت محمدؐ کو منعکس کرتا ہے بلکہ درحقیقت یہ ہی محمدؐ ہے ...... اصل اہم بات یہ ہے کہ قرآن ہی صرف ایسی کتاب ہے جس کی عبارت بارہ سو سال سے زیادہ عرصہ گذرنے پر بھی بغیر کسی اضافے اور تحریف کے جوں کی توں موجود ہے۔ نہ تو یہودی مذہب میں اور نہ ہی عیسائیت میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جو اس کی ذراسی بھی ملتی جلتی مثال پیش کر سکے۔"

۱۶:۔ "شروع زمانے کی سورتوں پر خصوصیت سے شاعرانہ انداز غالب ہے۔ آیات میں اثر آفرینی ہے اور قدرتی مناظر کا ذکر زیادہ ہے ...... پھر جب حضرت محمدؐ کے اختیار و اقتدار کا آغاز ہوتا ہے تو سورتیں خبردار کرنے کا لہجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ عبارت زیادہ سادہ مبنی بر حقیقت اور احکام الہٰی کے ابلاغ سے متعلق ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسے مبلغ کی زبان معلوم ہوتی ہے جس کا مشن لوگوں کو تبدیل مذہب پر آمادہ کرنا ہو۔ اور جوں جوں اسلام ترقی کرتا ہے۔ سورتوں کی ہیئت بدلتی جاتی ہے۔ مکہ کا مبلغ بتدریج ایک قانون ساز جنگی قائد اور مطلق العنان حکمران بن جاتا ہے اور لوگوں سے اطاعت کا خواہاں ہوتا ہے سورتوں میں سے شاعرانہ تخیل بڑی حد تک کم ہو کر پس منظر میں چلا جاتا ہے۔"

گوئٹے کا کہنا ہے۔

"جب ہم قرآن کو پڑھتے ہیں تو پہلی مرتبہ تو یہ مایوس کر دیتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، حیرت میں ڈال دیتا ہے اور آخر میں تعریف کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔" (پندرھواں باب)

۱۷:۔ "اگرچہ یہ کوئی بڑا نقصان نہ بھی ہو تب بھی ترجمے سے قرآن کے حسن و خوبی میں بڑی کمی آ جاتی ہے۔ اپنے اسلوب بیان اور مضمون کے علاوہ قرآن کی خوبی بڑی حد تک اس کے حسن الفاظ میں مضمر ہے۔ قرآن بھی عربی سے کسی اور زبان میں ترجمہ ہو جانے کے سبب اپنی ترتیل اور لحن کا وجدانی زیروبم کھو بیٹھتا ہے۔ جس شخص نے کسی عرب کو اپنے اثر آفریں لحن میں قرآن پڑھتے نہیں سنا یا کسی مسجد کے مینار سے اذان کی سحر انگیز آواز نہیں سنی وہ یہ اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ قرآن کے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں ترجمے اصل

میں کس چیز سے محروم ہیں " (پندرہواں باب)

۱۸:- "ان شاعرانہ وغنائی صفات کے باوجود قرآن مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور مدنی ضوابط کا ایک مجموعہ اور اجتماعی عبادات اور دعاؤں اور قدیم مذہبی واقعات وقصص کی کتاب ہے اور یہ سب کچھ ایک ہی کتاب میں ہیں۔ اس قرآن میں معرفت الٰہی کی وہ روح بھی موجود ہے جس نے سیدھے سادے گلہ بانوں تاجروں اور عرب کے خانہ بدوش لوگوں کی کایا پلٹ کرکے ان کو جنگجوؤں، سلطنتیں قائم کرنے والوں، بغداد، قرطبہ اور دہلی جیسے شہروں کی تعمیر کرنے والوں، عالموں اور حکمرانوں اور ریاضی دانوں میں تبدیل کر دیا۔" (پندرہواں باب)

جہاں تک اس کتاب کے نام کا تعلق ہے مصنف کا کہنا ہے کہ گو بہت سی جگہ آپؐ کو نبی کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے لیکن آنحضورؐ کا مسلّمہ لقب "رسول اللہ" ہے پھر چونکہ یہ لقب اس کتاب کے انگریزی نام THE MESSENGER کا بھی صحیح ترجمہ ہے۔ اس لئے اس ترجمہ کا نام "رسول اللہ" ہی رکھا گیا ہے۔

آخر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اُن حضرات کا شکریہ ادا کروں جنہوں نے اس سلسلہ میں میری امداد کی ہے۔ بخصوصی طور پر پروفیسر سید جلیل حسین صاحب نقوی۔ صدر شعبہ فارسی، ایم۔ اے۔ او کالج لاہور جنہوں نے متعدد کتابیں فراہم کیں، قیمتی مشورے دیئے اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وقت نکال کر ترجمے اور حواشی کی نظر ثانی کی۔ اگر نقوی صاحب کی امداد اور مشورے شامل حال نہ ہوتے تو شاید اس کتاب کی تکمیل نہ ہو سکتی۔ بعد ازاں میرے مشفق دوست ریاض النبی خاں صاحب، اسسٹنٹ سیکرٹری بورڈ آف ریونیو پنجاب، میرے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس ترجمہ کو پہلی بار میرے ساتھ پڑھا اور قیمتی مشورے دیئے۔

سب سے آخر میں پروفیسر سید وقار عظیم صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے بے حد عدیم الفرصتی کے باوجود اس ترجمے کو زبان وبیان کے اعتبار سے دیکھا۔

لاہور یکم فروری ۱۹۷۵ء

محمد امین زیدی
مترجم

پیش لفظ

(مصنف)

حضرت محمدؐ کا مشن کیا تھا پہلے پہل اس کی جھلک میں نے کشمیر کے بلند و بالا پہاڑوں میں دیکھی۔ یہ پہلی جنگ عظیم سے پہلے کا ذکر ہے جب ایک سفید فام کا مقامی لوگوں سے ملنا جلنا کسرِ شان سمجھا جاتا تھا۔ بایں ہمہ مجھے اپنے شکاری کا یہ رویہ بڑا دلچسپ معلوم ہوا کہ وہ نماز کے وقت سب کام چھوڑ کر مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا۔ وہ تھوڑی سی انگریزی بھی جانتا تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد میں نے اس سے پوچھنا شروع کیا کہ وہ اتنی فرض شناسی سے کس خدا کی پرستش کرتا ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرانی ہوئی کہ یہ تو اسی مذہب کا خدا تھا۔ جس میں مجھے بپتسمہ دیا گیا تھا یعنی عیسائیت کا اور مزید حیرانی اس وقت ہوئی جب میں نے اس مضبوط اور جفاکش شکاری کو بڑے جانے پہچانے انداز میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور جان بپتسمی (یوحنا) کے نام لیتے سنا اور یہ بھی کہ یہ سب اس کے مذہب کے پیغمبر بھی تھے۔ اس وقت میں صرف اتنا ہی معلوم کر سکا۔ پھر کچھ تو اپنے مغربی ساتھیوں کے عام متعصبانہ رویہ کے سبب جو وہ اس ملک کے باشندوں کی ہر انجانی بات اور خصوصاً ان کے مذہبی عقائد کے خلاف رکھتے تھے جس پر ہم حکومت کرتے تھے اور کچھ جنگ عظیم اوّل کے چھڑ جانے کے باعث میری توجہ اس موضوع سے ہٹ گئی جس کا میں شاید مطالعہ کرتا۔

کافی عرصہ تک میں اس طرف کوئی توجہ نہ دے سکا۔ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ مجھے دس سال تک اسلام یا مسلمانوں کے متعلق کچھ سوچنے کا خیال نہ آیا۔ پھر جنگ کے بعد کے زمانہ کی بیکار اور بے نتیجہ الجھنوں سے اُکتا کر میں صحرائے عرب کے ریگستانوں میں عربوں کے درمیان رہنے کے لئے چلا گیا

اور سات سال تک ان کے ساتھ رہا۔

وہاں پر اونٹ کے بالوں کا بنا خیمہ میرا مسکن، خانہ بدوش میرے دوست اور تاحدِ نظر پھیلی ویرانی میرا ملک تھا۔ میرے کشمیری شکاری نے جس چیز کی جھلک دکھائی تھی وہ اب میرے سامنے بڑی تفصیل سے پھیلی ہوئی تھی۔ میں وہاں پر قرآن کو عرب کے پُرعظمت مکّی[1] لہجہ میں سنتا تھا مسلمان نہ ہونے کے باوجود میں اُس مذہب کے سحر کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا جو عاجز بندے اور اس کے خالق کو صحرا میں آمنے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ وہاں پر میں نے حضرت محمدؐ کی شخصیت کے متعلق سنا جنھوں نے چند آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کے حریف قبائل کو متحد کر کے انہیں دنیا کی ایک عظیم ترین سلطنت کی اساس اور بنیاد کے طور پر استعمال کیا۔ میں نے ان کے متعلق سنا کہ وہ ایک پرتپاک اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ جنھوں نے دنیادار بت پرستوں کو سچا موحد مُردوں کے دوبارہ اٹھائے جانے اور آخرت کی زندگی پر ایمان رکھنے والا بنا دیا۔ وہاں میں نے ایسی قوم دیکھی جس کے ننانوے فی صد افراد اپنے مذہب پر بڑے خلوص سے عمل پیرا تھے۔ اس لئے کہ وہ اس پر ایمان رکھتے تھے۔

ماہ و سال گزرنے کے ساتھ ساتھ حضرت محمدؐ کے متعلق میری معلومات میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے لئے میں نے کوئی بالارادہ مطالعہ نہیں کیا۔ کیونکہ مجھے یاد نہیں کہ صحرا کے قیام کی ساری مدت میں میں نے قرآن کے سوا اللہ کے رسول کے متعلق چھپا ہوا ایک لفظ بھی کہیں پڑھا ہو۔ میں نے اپنی معلومات زیادہ تر پڑاؤ کی آگ کے کنارے کاروانوں کے ساتھ طویل سفر میں یا راتوں کو چرتے جانوروں کے گلوں کی دیکھ بھال کے دوران آپس کی بات چیت سے حاصل کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صحرا کے قیام کے بہت دیر بعد کہیں جا کر میں نے حضرت محمدؐ کے متعلق پڑھنا شروع کیا اور جب میں نے ایسا کیا تو مجھے بے حد مایوسی ہوئی۔

ان کتابوں میں حضرت محمدؐ کی تعلیمات اور نظریات کی سادگی جس کی صحرانشین لوگوں میں بڑی تقدیس ہے۔ روایت، دینی اختلافات اور سیاست کے سمندروں میں غرق ہو گئی معلوم

---

[1] مکّہ کی عربی زبان اور لہجہ سارے عرب ہی میں نہیں بلکہ ساری اسلامی دنیا میں مستند ترین مانے جاتے ہیں۔

ہوتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم اپنے ایک دوست کی زندگی کے حالات پڑھ رہے ہیں جو ایسے لوگوں نے لکھے ہیں جنہوں نے اس کو کبھی قریب سے نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ مسلمان مصنفین بھی وہ قریبی اور ذاتی تاثر پیدا کرنے میں ناکام دکھائی دیتے تھے۔ البتہ ان کتابوں میں چند مستثنیات بھی تھیں۔ حضرت محمدؐ کی بعض سوانح عمریاں واقعی ادب کے شہ پارے ہیں لیکن اکثریت ایسی نہیں۔ جو لوگ کتابیات میں دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے میں نے ان کتابوں کی فہرست بھی شامل کر دی ہے جو میں نے اس سلسلہ میں پڑھیں لیکن جہاں ان کتابوں نے ان باتوں کی تصدیق کی یا ان کو مربوط کر دیا جو میں نے خانہ بدوش عربوں سے سنی تھیں وہاں حضرت محمدؐ کی اس سوانح عمری کے متعلق میرے بنیادی تاثرات وہی ہیں جو میں نے کشمیر کی برفانی چوٹیوں اور صحرا کی سنہری ویرانیوں میں حاصل کئے تھے۔

ہو سکتا ہے اس کتاب کے نام کے متعلق بھی بعض لوگ کچھ وضاحت چاہیں۔ بہت سے لوگ حضرت محمدؐ کو نبی کہتے ہیں اور اگرچہ یہ عربی لفظ 'نبی' بہت جگہ استعمال ہوا ہے (گو اس کے معنی مکمل طور پر مترادف یونانی[1] لفظ کے عین مطابق نہیں)، لیکن صحیح نہیں ہے۔ حضرت محمدؐ کا مسلّمہ لقب "رسول اللہ" یا "پیغمبر خدا" ہے۔ جن لوگوں نے مسلمانوں کی کسی مسجد کے میناروں سے کسی مؤذن کی اذان سنی ہے تو انہیں یاد آجائے گا کہ اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہے۔

[2] "لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ"

چنانچہ اسی مناسبت سے میں نے اپنی کتاب کا نام THE MESSENGER. (رسول اللہ (سیرت حضرت محمدؐ) رکھا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ عربی بول چال کا لفظی اور سادہ ترجمہ کروں۔ اس کی شعریت و غنایت میرا موضوع نہیں ہے۔ قرآنی آیات —— مارمے ڈیوک پکتھال MARMA DUKE PICKTHALL اور جے۔ ایم۔ راڈویل J.M.RODWELL. کے انگریزی تراجم سے لی گئی ہیں۔

---

[1] مصنف نے یہ مترادف لفظ یونانی زبان میں لکھا ہے۔

[2] اذان کے صحیح فقرے "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" اور "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا الرَّسُوْلُ اللّٰه" ہیں۔

جو لوگ حضرت محمدؐ کے متعلق تاریخ کو روایات سے علیحدہ کرتے ہیں میں ان کی خدمت میں عرض کروں گا کہ تمام عظیم ہستیوں کے واقعات زندگی میں روایت کو ہمیشہ کافی دخل رہا ہے۔ روایت کا نہ اقرار کیا جا سکتا ہے اور نہ انکار، درحقیقت بعض اوقات یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ صحیح بات کیونکر صحیح ہے اور روایت کیسے روایت ہے۔ علاوہ ازیں تمام مذاہب میں بہت سی ایسی باتیں موجود ہیں جو صرف روایات ہی نہیں بلکہ محض کہانیاں ہیں۔ علمائے دین ان کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہونے کے سبب ان کو دین سے خارج نہیں کرتے۔ چنانچہ جہاں اصولی طور پر میں نے حقائق بیان کئے ہیں وہاں ایسے واقعات کے متعلق جہاں مجھے ان کے تاریخی ہونے کا یقین نہیں ہے۔ میں نے "کہا جاتا ہے" کے الفاظ کا اضافہ کر کے واقعہ بیان کر دیا ہے۔

آر۔ وی۔ سی۔ باڈلے
(R.V.C.BODLEY)

ایسٹ ہینے
(EAST HANNEY)
برک شائر
اکتوبر ۱۹۵۴ء

مقدمہ

(مصنف)

یہ کتاب علمائے مشرق اور علم دین کے طلباء سے زیادہ ان لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ جو حضرت محمدؐ اور اسلام کے متعلق کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس موضوع پر جو چلتا لکھ دیا ہے یا حضرت محمدؐ کی زندگی یا تعلیمات کے کسی جزو یا حصے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے بلکہ اس کے برعکس جو مواد اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے وہ شاید جزئیات کے لحاظ سے حضرت محمدؐ کی بہت سی سوانح عمریوں سے کہیں زیادہ گرانقدر ہو۔ اسی طرح اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے کہ ایسے شخصیت کی زندگی کے حالات جن سے سوانح نگار ذاتی طور پر واقف نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ صحیح اور حقائق پر مبنی ہوں اور اسی طرح ایک کٹر اور جوشیلے مسلمان کی جانبداری یا ایک متعصب عیسائی کی غلط بیانیوں سے بھی اجتناب کیا گیا ہے۔ غیر مستند روایتوں یا قصوں اور اختلافی باتوں کو بھی ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ کیونکہ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بغیر کسی معقول وجہ کے دوسرے بڑے مذاہب کے بانیوں کے مقابلے میں حضرت محمدؐ کے متعلق لوگوں میں زیادہ غلط فہمیاں رواج پا گئی ہیں۔

جہاں ہمیں حضرت موسیٰؑ، کنفوشس[1] اور مہاتما بدھ[2] کے زمانے کی معاصرانہ تاریخ نہیں ملتی اور حضرت عیسٰیؑ[3] کی زندگی کے ایک حصے کے بھی صرف کچھ حالات معلوم ہیں (کیونکہ ان کی شروع

---

[1] کنفوشس۔ چین کے ایک بڑے مفکر اور اسی نام کے مذہب کے بانی (۵۵۱ تا ۴۷۹ ق-م)

[2] مہاتما بدھ۔ سدھارتھ یا گوتم نام۔ چھٹی صدی قبل مسیح کی ایک ہندو ریاست کے شہزادے اور بدھ مت کے بانی۔

[3] حضرت عیسٰیؑ۔ آپ نے صرف ۳۳ سال عمر پائی۔ آپ کی پیدائش اور عمر کے آخر تین سال کے علاوہ آپ کی زندگی کے بقیہ حصہ کے مستند سوانح نہیں ملتے۔

کی تیئس ۲۳ سالہ زندگی کا، جس نے آپ کو آخری تین سالوں میں ہونے والے عروج کے لئے تیار کیا، کچھ حال معلوم نہیں) وہاں حضرت محمدؐ کی ساری زندگی بالکل صاف اور واضح ہے۔

یہاں (حضرت محمدؐ کے متعلق) ابہام اور پراسراریت کی بجائے ہمیں صحیح تاریخ ملتی ہے۔ ہم حضرت محمدؐ کے متعلق بھی اتنا ہی کچھ جانتے ہیں جتنا کہ ان اشخاص کے بارے میں جو ہمارے زمانہ سے بہت قریبی دور میں گزرے ہیں۔ آپؐ کی ظاہری زندگی، آپؐ کی جوانی، آپؐ کے عزیز رشتے دار، آپؐ کے عادات و خصائل نہ تو داستانی ہیں اور نہ ہی کہی سنی باتیں اور نہ ہی نبی مبعوث ہو جانے کے بعد آپؐ کی روحانی زندگی کسی گمنام اور الجھے ہوئے ذہن کے مبلغ کے دھندلے اور مبہم خیالات کی حامل تھی۔ بلکہ اس زمانے میں ہمیں ان سے ایسا صحیفہ ملا ہے جو اپنی اصل اور اپنے تحفظ میں بے مثال ہے اور جس کے مستند ہونے میں آج تک کوئی شخص کبھی کوئی معقول قسم کا شک پیدا نہیں کر سکا۔

یہ صحیفہ جسے قرآن کہتے ہیں، آج بھی اسی طرح موجود ہے جیسا کہ وہ پہلی مرتبہ حضرت محمدؐ کی نگرانی میں لکھا گیا تھا۔ گو اس وقت آیات وقت اور موقعہ کے مطابق بھیڑ کی کھال کے ٹکڑوں، کھجور کے پتوں، ہڈیوں اور چمڑے کے بوسیدہ ٹکڑوں پر لکھی گئی تھیں لیکن اصل سورتیں اور آیات محفوظ کر لی گئی تھیں۔ اور قرآن کا یہ تحفظ پرانے اور نئے عہد ناموں کی طرح ان کے مصنف (حضرت عیسیٰؑ) کی وفات کے صدیوں اور قرنوں بعد نہیں ہوا بلکہ حضرت محمدؐ کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ نے ہی قرآن کے بکھرے ہوئے مسودوں کو جمع کرایا، دوبارہ لکھوایا اور انہیں مجلد کرایا اور یہ مستند نسخہ حضرت محمدؐ کی ایک بیوہ حضرت حفصہؓ[1] کے پاس حفاظت سے رکھوا دیا گیا۔

حضرت محمدؐ کی وفات کے چودہ سال بعد ۶۴۶ء میں حضرت عثمانؓ خلیفہ ثالث اور رسول اللہ کے ایک برگزیدہ صحابی اور ہمعصر نے قرآن کے دیگر تمام نسخوں کو جو سرگرم اور جوشیلے مسلمانوں نے اپنے حافظے سے مرتب کر لئے تھے ضائع کرا دیا۔ صرف حضرت حفصہؓ والا نسخہ باقی رہنے دیا گیا اور بعد کے تمام نسخے اس ہی سے نقل کئے گئے۔ اس کے بعد سے اب تک نہ اس میں کوئی اضافہ ہوا ہے اور نہ کمی۔

---

[1] حضرت حفصہؓ۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب کی صاحبزادی اور رسول کریمؐ کی ایک زوجہ مطہرہ

یہ قرآن نہ تو روایات کا مجموعہ ہے اور نہ ہی ان باتوں کا تذکرہ ہے جو حضرت محمد صلعم سے منسوب ہوں بلکہ یہ تو صرف بہ حرف ان وحیوں کا اصل متن ہے جنہیں آپؐ اپنی زندگی میں نزول کے ساتھ ساتھ ہونوں اور مہینوں لکھاتے رہے۔ اس میں حضرت محمدؐ کے ذہنؔ کامل کا صحیح پر تو نظر آتا ہے۔ گو کہیں کہیں اس کی آیات سخت اور خود تردیدیؔ ہیں لیکن اکثر و بیشتر ولولہ انگیز، اثر آفریں اور غنائیہ ہوتی ہیں اور مجموعی طور پر یہ عظیم نظریات بڑی بلند فکری کے حامل ہوتے ہیں۔

لیکن اگر یہ قرآن نہ بھی آتا تب بھی حضرت محمدؐ کے زمانے کے حالات جاننے کے لئے ہمارے پاس ایسے اور ذرائع موجود ہیں جو عرب لوگوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ان لاکھوں سالوں میں جو ہمارے زمانے سے بہت پہلے گزر چکے ہیں نسلِ انسانی جسمانی یا عملی طور پر بالکل نہیں بدلی اور ذہنی طور پر بھی شاید ہی کوئی تبدیلی ہوئی ہے اس طرح ان قدیم زمانوں کے لوگوں کے جذبات، خوشیاں اور رنج اور سیاسی اور گھریلو مسائل قریب قریب بالکل ہمارے جیسے ہی ہوں گے۔

مغربی ممالک کے لوگوں کا خیال ہے کہ تہذیب ایک ایسا بڑھتا ہوا سیلاب ہے جو اس دنیا کے وجود میں آنے کے وقت سے ہی آہستہ آہستہ پھیلتا رہا ہے۔ یہ نظریہ غالباً صحیح نہیں ہے اس کے برعکس یہ ایک ایسا جوار بھاٹا ہے۔ جو بڑھتا اور پھیلتا رہتا ہے لیکن ایک خاص سطح پر پہنچ کر اترنا شروع ہو جاتا ہے۔ بایں ہمہ اگر قدیم بابل یا یونان کا کوئی باشندہ دوبارہ جی اٹھے تو موجودہ زمانے کے ساتھ چلنا مشکل ہو جائے گا۔ صدیوں کے خیال اور رواج کے فرق کی اس خلیج کو جو ان زمانوں اور اس زمانے میں حائل ہے پاٹا نہیں جا سکتا۔ یہ بات اکثر ازمنہ اور ادوار پر صادق آتی ہے۔ ان ادوار پر بھی جو یونان اور بابل کے زمانوں سے قریب کے ہیں اور جن میں صرف چند صدیوں کا فرق ہے لیکن ان میں ایک زمانہ ایسا بھی ہے جو اس اصول سے مستثنیٰ ہے۔ اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں جو حضرت محمدؐ کے اور ہمارے درمیان گزرا ہے ان لوگوں کے اخلاف میں بہت ہی کم تبدیلی

لہ ذہن کامل۔ مصنف کا اشارہ رسول اللہ کی طرف معلوم ہوتا ہے لیکن جیسا کہ قرآن سے صاف ظاہر ہے یہ تو سارا کا سارا کلام ربانی ہے جو وحی کے ذریعہ آپ پر نازل ہوا اور جس کا اعتراف مصنف نے اس سے پہلے فقرے میں خود کیا ہے۔

ٹ یہ مصنف کا ذاتی خیال ہے۔

آئی ہے جنہوں نے پہلے پہل مذہب اسلام کو اختیار کیا اور اس کو نجات کا واحد ذریعہ جانا بہ نسبت اس عرصے کے جو جنرل واشنگٹن[1] اور جنرل آئزن ہاور[2] کے درمیان گزرا ہے۔

ایک ساتویں صدی کا مسلمان اگر اب بھی جی اٹھے اور عرب کے اس خطے میں واپس پہنچ جائے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے تو اسے کوئی حیران کن تبدیلی محسوس نہ ہوگی۔ خانہ بدوش عرب اُن کے سیاہ خیمے، اونٹوں پر سوار مسافر اور بحیرہ قلزم کی طرف سے صحرا عبور کرنے والے حاجی اب بھی ویسے ہی ہیں جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ ان لوگوں کے لباس اور ان کے خدوخال بھی وہی ہیں۔ وہ دیکھے گا کہ آج کے ایک عرب اور تیرہ سو یا تین ہزار سال پہلے کے عرب کے چہرے مہرے اور جسمانی ساخت پر اس تمام عرصے میں اس قسم کا کوئی ارتقائی عمل نہیں ہوا۔ جس نے اینگلوسیکسن ANGLO-SAXON اور لاطینی نسل کے لوگوں کو بدل کر رکھ دیا۔ طرزِ لباس میں بھی مشکل سے ہی کوئی تبدیلی ہوئی ہے بلکہ ساتویں صدی کا مسلمان مکہ کے ارد گرد جانور چرانے والے قبیلوں کو بھی پہچان لے گا جن کے نام بھی وہی ہوں گے جو حضرت محمدؐ کے زمانے میں ہوتے تھے۔ اور قبیلے کے لوگوں میں وہ ایسے اشخاص کو بھی دیکھے گا۔ جو خود اس کے وقت کے لوگوں کی بلاواسطہ اولاد ہیں۔ اگر ایک ٹرک کھڑکھڑاتا اور گرد اڑاتا پاس سے چلا جائے یا کوئی ہوائی جہاز گڑگڑاہٹ پیدا کرتا ہوا سر پر سے گزر جائے تو یہ دوبارہ زندہ ہونے والا عرب بڑی آسانی سے ان انوکھی باتوں کو کسی جن سے منسوب کر دے گا۔

گو رسولِ خدا کے زمانے کے لوگوں کی لکھی ہوئی کوئی کتابیں نہیں ملتیں لیکن کئی کتابیں ان لوگوں کی لکھی ہوئی موجود ہیں آپ کے متعلق جن کی معلومات اوّلین اور تقریباً ذاتی ہیں۔ ان میں سے بعض آج بھی دستیاب ہیں۔ ہم لوگوں کے لئے جو آج کل موجود اور زندہ لوگوں کی سوانح عمریاں

---

[1] جنرل جارج واشنگٹن۔ اٹھارھویں صدی میں جنگ آزادی کا امریکی سپہ سالار اور بعد میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کا پہلا صدر (۱۷۸۹ تا ۱۷۹۷ عیسوی)۔

[2] جنرل آئزن ہاور۔ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ تا ۱۹۴۵ء) کا امریکی جنرل، اتحادیوں کا سپہ سالار اعلیٰ SUPREME COMMANDER اور بعد میں امریکہ کا صدر (۱۹۵۳ء تا ۱۹۶۰ عیسوی) رہا۔

پڑھنے کے عادی ہیں یہ کتابیں کچھ زیادہ دقیع نہیں معلوم ہوں گی۔ یہ دستور البتہ نیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک بھی سوانح عمریاں وفات کے بعد ہی لکھی جاتی تھیں۔

حضرت محمدؐ کے بہت سے عزیز اور رشتہ دار آپؐ کے بعد زندہ رہے اور انہوں نے اپنی یادداشتیں سینہ بہ سینہ اپنی اولاد کو منتقل کر دیں۔ آپؐ کے خلفاء نے آپؐ کی سیاسی، فوجی اور مہماتی روایات کو بغیر کوئی وقفہ دیئے قائم رکھا۔ وہ تمام عرب جنہوں نے ہسپانیہ فتح کیا اور فرانس کے نصف حصہ تک بڑھتے چلے گئے تھے، ایسے لوگوں کو جانتے تھے جنہوں نے رسول اللہ کو خطبہ دیتے سنا تھا۔

وہ خانہ بدوش لوگ جن کے ساتھ میں نے صحرا میں قیام کیا تھا حضرت محمدؐ کو کوئی دور پار کا آدمی یا مافوق البشر ہستی نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ عیسائیوں کا حضرت عیسائی کے متعلق خیال ہے۔ ان کے نزدیک وہ ایک ایسی خیالی مخلوق نہ تھے جسے وہ نہ چھو سکتے ہوں یا ان سے مختلف لباس پہنتے ہوں یا کسی ایسی سرزمین اور ایسے لوگوں میں رہتے ہوں جنہیں وہ نہ دیکھ سکتے ہوں ان کے ذہنوں میں ایسی کوئی کیفیت بھی نہ تھی جس کے باعث بالٹی مورؔ[1] کی ایک بوڑھی خاتون نے حضرت عیسیٰؑ کے سولی پر چڑھائے جانے کے واقعہ کے متعلق یہ کہہ دیا تھا۔

"یہ تو اب بڑی پرانی بات ہو چکی ہے۔ خیال ہے ایسا نہیں ہوا ہوگا"

میرے عرب میزبان تو اپنے بانیٔ دین کے متعلق اس طرح باتیں کرتے تھے گویا وہ انہیں ذاتی طور پر جانتے ہوں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ آپؐ بھی بکریاں چراتے تھے۔ انہی کی طرح کا لباس پہنتے تھے۔ ان کے جیسے ہی اونٹوں پر سواری کرتے تھے۔ اور ان کا کھانا پینا بھی بالکل انہی کا سا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ وہ خود کرتے ہیں آپؐ بھی وہی کرتے تھے۔ ان خانہ بدوشوں کی نظر میں حضرت محمدؐ اب بھی ایسے ہی ایک زندہ اور چلتا پھرتا پیکر تھے۔ جیسے خود ان میں کا کوئی فرد۔

چنانچہ میرے لئے اس تیرہ سو سال پہلے کا منظر بیان کرنا اس سے کہیں زیادہ آسان ہے۔

---

[1] بالٹی مور (BALTI MORE) امریکہ کا ایک شہر

جتنا جامعہ آکسفورڈ[1] کے ایک معلم کے لئے ملکہ ایلزبتھ[2] کے عہد کے کسی شخص کی زندگی کے واقعات بتانا۔
اور یہ اس سے بھی زیادہ آسان ہے جتنا ایک امریکی مورخ کے لئے جنگ آزادی امریکہ سے قبل کے حالات لکھنا۔ اور میرے لئے یہ اتنا مشکل نہیں جتنا کہ حضرت محمدؐ کے اکثر سوانح نگار خیال کرتے ہیں

ان سوانح نگاروں کی بیشتر تعداد انداز بیان، علم وفضل اور سوانح نگاری کی تکنیک میں مجھ سے بہت بڑا درجہ رکھتی ہے لیکن مجھ میں ایک خوبی ایسی ہے جو ان میں سے کسی میں نہیں۔ کیونکہ خواہ وہ مغربی ممالک کے لوگ ہوں یا مشرق کے ان میں سے کسی نے بھی ایسی زندگی نہیں گزاری۔ جو حضرت محمدؐ اور ان کے ساتویں صدی کے پیروکاروں جیسی ہو لیکن مجھے بیسویں صدی کے پہلے نصف میں ایسا کرنے کا موقع ملا ہے۔

حضرت محمدؐ پر قلم اٹھانے والوں میں سے خواہ وہ ایشیائی ہوں یا یورپی یا امریکی، کوئی بھی صحرائے عرب کے اس بے آب وگیاہ خطوں میں نہیں گیا جہاں اللہ کے رسول نے دین اسلام کی بنا ڈالی

مغربی ممالک کے لوگوں نے یہ تجربہ اس لئے نہیں کیا کہ وہ خود کو عربوں کی اس طرز زندگی میں نہیں ڈھال سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک وہ اس سرزمین پر کئی سال تک خانہ بدوشی کی زندگی نہ گزاریں، وہ اپنے اس تکلیف دہ تجربے کا کوئی مفید مقصد حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

مشرقی لوگوں کے لئے ایسا کرنا شاید اور مشکل ہوتا۔ مشرق کے وہ لوگ جو تصنیف وتالیف کو اپنا مشغلہ بناتے ہیں عام طور پر شہری زندگی کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ نخلستانوں یا شہروں میں رہتے ہیں۔ وہ صحرائی زندگی کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور خانہ بدوشوں سے ان کا ملنا جلنا نہیں ہوتا۔ وہ غالباً صحرا میں اونٹ کے بالوں سے بنے خیموں میں مہینوں گذارنے کو اتنا ہی مشکل سمجھتے ہوں جتنا بحر روم کو تیر کر پار کرنا۔

چنانچہ ان تمام سوانح عمریوں میں ایک خاص کمی نظر آتی ہے۔ وہ نامکمل ہیں۔ کیونکہ ان میں آپؐ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا جائزہ نہیں لیا گیا۔ ان سوانح عمریوں میں حضرت محمدؐ عام

---

[1] آکسفورڈ۔ برطانیہ کی ایک مشہور یونیورسٹی اور جامعہ

[2] ملکہ ایلزبتھ۔ انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ ELIZABETH اول (۱۵۵۸ تا ۱۶۰۳ عیسوی)

طور پر خالی دیوار کی ایک تصویر نظر آتے ہیں۔ جس کا صرف ایک ہی رُخ دکھائی دیتا ہے وہ روحانی ہو یا مادی یا خیالی جو کچھ بھی ہے وہ خالی اور بے جان سی نظر آتی ہے۔ پس منظر ہوتا ہی نہیں۔ تصویر محض ایک سیاہ خاکہ یا پرچھائیں معلوم ہوتی ہے جو ایک میلے بھورے رنگ کے کارڈ بورڈ پر چپکا دی گئی ہو۔ بایں ہمہ حضرت محمدؐ کی تصویر سپاٹ نہ تھی اس کے بہت سے رُخ اور پہلو تھے اور اس کا پس منظر اور ماحول بے کیف اور بے رنگ ہرگز نہ تھا۔

ایک مصنف جس کی لکھی ہوئی حضرت محمدؐ کی سوانح عمری میں نے پڑھی کو نیو انگلینڈ[لے] سے باہر جانے کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا جہاں وہ انجیل کا درس دیتا تھا۔ ایشیا اور افریقہ کا تو کیا ذکر جو اس کے لئے جنت اور دوزخ سے بھی دور تھے۔ اس کے باوجود اس نے رسول اللہ کی زندگی پر تین سو صفحات کا ایک بڑا مفصل جائزہ لکھ ڈالا۔ اس مصنف نے اپنے جدید طرز بیان الہامی کتابوں کا نہایت اچھا عالم ہونے اور عربی کی بھی شد بد رکھنے کے باوجود اس بات سے حیران کن حد تک لاعلمی کا اظہار کیا ہے کہ حضرت محمدؐ کا طریق زندگی کیا تھا اور آپؐ کس دین کی تبلیغ کرتے تھے۔

اپنی ساری کتاب میں اس نے اپنے موضوع یعنی حضرت محمدؐ کو (نعوذ باللہ) جھوٹے نبی کے علاوہ کسی اور طرح سے خطاب نہیں کیا۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ (نعوذ باللہ) اس جھوٹے نبی، کے فوری جانشینوں نے کس طرح دنیا کا اتنا بڑا حصہ فتح کر لیا جو رقبے میں ریاستہائے متحدہ امریکہ سے تین گنا بڑا تھا اور وہ نبی نوع انسان کو ایک ایسی تہذیب دے گئے جو آج بھی زندہ ہے۔

جارج سیل SALE جس نے اٹھارھویں صدی عیسوی میں قرآن کا ایک بہت اچھا ترجمہ کیا اور جس سے آپؐ کے متعلق صحیح معلومات رکھنے کی توقع کی جا سکتی تھی مذکورہ بالا کتاب کے دیباچے میں لکھتا ہے:۔

"مورخین ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ مشہور شہر جو ادب اور تجارت میں دوسروں سے ممتاز تھے ہومر[کے] کی جائے پیدائش ہونے کے متعلق ایک

لے نیو انگلینڈ۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ایک ریاست۔

کے ہومر HOMER سات سو قبل مسیح کا مشہور یونانی رزمیہ گو شاعر ODYSSEY-ILYAD اس کی دو مشہور تصنیفات ہیں۔

دوسرے سے جھگڑتے تھے .... ایسا دعویٰ ضرور قابل تعریف تھا کیونکہ اس سے بے مثال قابلیت کے لئے اس زمانے کے لوگوں کی قدر دانی کا اظہار ہوتا تھا لیکن جب ہم حضرت محمدؐ کے کردار کا بغور جائزہ لیتے ہیں تو تصویر دیکھ کر سخت ذہنی صدمہ ہوتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ ان کی جائے پیدائش کو کیوں نہ ذہنوں سے فراموش کر دیا گیا۔ ایسے ظالم شخص کے پیدا ہونے پر ہر ملک کی نگاہیں شرم سے جھک جانی چاہئیں لیکن عربوں کے دلوں میں (نعوذُ باللہ) اس 'بڑے فریبی' کی ہمیشہ سے اتنی عزت و تکریم رہی ہے کہ انہوں نے اس جگہ کو بھی جہاں اس نے پہلا سانس لیا۔ مشتبہ یا مشکوک نہیں رہنے دیا۔"

اور اسی طرح کی اور باتیں ہیں۔ اس پر یہ ہی تبصرہ ہو سکتا ہے کہ نیو انگلینڈ کے پادری کی لکھی ہوئی حضرت محمدؐ کی اس سوانح عمری سے کچھ اقتباس پیش کیا جائے۔

"ایک ایسا ظالم اور "فریبی" (نعوذ باللہ) کسی طرح سے ایک ایسے مذہب کی تخلیق کر سکتا تھا جس کے پیروکاروں کی تعداد آج تیس (۳۰) کروڑ ہے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کی طرح رُو بہ تنزل ہونے کی بجائے ہمیشہ سے زیادہ مضبوط اور طاقتور ہے اور دین میں داخل ہونے والوں کی تعداد میں روزانہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔"

ایک اور بات جو (نعوذ باللہ) جھوٹے نبی، پر لعنت ملامت کرنے والے لوگ نظر انداز کر جاتے ہیں یہ ہے کہ شروع شروع میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں اختلاف رائے نہ ہونے کے برابر تھا۔ دین کی تبلیغ کے آغاز میں اگر حضرت محمدؐ کو کوئی عیسائی بھی کہہ دیتا تو شاید آپ بُرا نہ مناتے، مصائب کے دور میں آپؐ کی درخواست پر نجاشی (شاہ حبش) نے جو اس وقت ایک عیسائی سلطنت کا حکمران تھا مسلمانوں کو پناہ دی۔ درحقیقت جیسا کہ اس کتاب میں آگے چل کر معلوم ہوگا یہ صرف ایک اتفاقی امر تھا کہ اسلام موریتیوں اور رکو رتھیقیوں جیسا ایک گمنام عیسائی فرقہ نہیں بنا۔ عیسائیوں سے بگاڑ آپؐ کی عمر کے اُواخر سے پہلے شروع نہیں ہوا اور اس اختلاف نے شدت اس وقت اختیار کی جب عیسائیوں نے صلیبی جنگوں کا آغاز کیا۔ اس وقت کے بعد سے یہ غلط فہمیاں بڑھتی ہی گئیں۔ یہاں تک کہ حضرت محمدؐ کا نام ایک

طرح سے خدا کی شان میں گستاخی اور کفر کا مترادف بن گیا۔ شیکسپیئر[1] کے ہمعصروں کے نزدیک ہر جھوٹا مذہب محمدیت یا میمیٹری MAMMETRY تھا اور خصوصیت سے ایسا مذہب جس میں بت پرستی ہوتی ہو۔ ماضی قریب میں لفظ محامت MAUMET بتوں کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ 'محامری' اور بعد کا ممری MUMMERY اسی مادے سے مشتق ہیں۔

ان ادوار میں بعض مشہور روایات عجیب و غریب تھیں۔ بمثال کے طور پر بارھویں صدی کی ایک نظم میں حضرت محمدؐ کو ایک ایسا امیر دکھایا گیا ہے جو عیسائیت کے مذہبی ادارے سے منسلک ہو گئے تھے۔ بعدازاں انہیں کارڈینل بنا دیا گیا لیکن پوپ منتخب نہ ہونے کے سبب انتقامی طور پر انہوں نے اپنے ایک الگ مذہب کی بنا ڈالی۔

یہ عقیدہ کہ حضرت محمدؐ کا تابوت آسمان اور زمین کے درمیان میں معلّق ہے کچھ عرصہ پہلے تک بھی مانا جاتا تھا اور بعض مورّخ[2] تو بڑی ڈھٹائی سے یہ کہتے ہیں کہ آپؐ مکہ میں دفن ہوئے بعض نے یہاں تک کہا ہے کہ (نعوذ باللہ) آپؐ کی موت شراب کی زیادتی کے سبب ہوئی اور یہ کہ آپ کے جسم کو سور کھا گئے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمدؐ نے سور کا گوشت نجس اور حرام قرار دے دیا تھا اور اپنے مقلّدین کو شراب چھونے تک سے منع کیا تھا اور آپؐ کا جسدِ مبارک مدینہ میں اب بھی اسی جگہ ہے جہاں آپؐ کو تیرہ سو سال قبل دفن کیا گیا تھا۔

حضرت محمدؐ اور پہاڑ کی کہاوت کا ساتویں صدی کے عرب سے کوئی تعلق نہیں۔ غالباً سب سے پہلے اس کا ذکر بیکن (BACON)[3] نے اپنے مضمون OF BOLDNESS میں ۱۵۹۷ء میں کیا۔

اور بعض اوقات ہمیں جان سیلڈن جیسے مصنفین بھی ملتے ہیں جس نے عرب کے اس

MARONITES - CORINTHIANS عیسائیوں کے دو غیر معروف فرقے۔

[1] SHAKESPEARE (۱۵۶۴ء تا ۱۶۱۶ء) انگریزی زبان کا مشہور شاعر اور مشہور ڈرامہ نویس

[2] غالباً یہ مورخین مغربی ہی ہوں گے۔

[3] فرانسس بیکن (۱۵۶۱ تا ۱۶۲۶ء) ایک مشہور انگریز فلسفی اور مدبر

مذہب کے متعلق تحقیق کرنے کی تکلیف گوارا کی۔ سترھویں صدی کے اس عالم کا کہنا ہے :۔

"وہ بتوں اور شبیہوں کو محمت اور ان کی پرستش کو محمتری یعنی محمدؐ اور محمدیت کہتے ہیں۔ کتنے تنفر پھیلانے والے نام ہیں حالانکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ ترکوں (مسلمانوں) کے مذہب میں بت پرستی منع ہے۔"

لیکن ایسے مبنی بر حقیقت بیان شاذ و نادر ہی ملتے ہیں ورنہ عام یقین یہ ہی تھا کہ حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد وجود میں آنے والے تمام مذاہب خود ساختہ اور جھوٹے تھے۔

ایسے سوانح نگار بھی ہیں جو غلو کی حد تک پہنچ گئے ہیں اور حضرت محمدؐ کو الوہیت کا درجہ دیتے ہیں۔ حضرت محمدؐ کی آخری وقت کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ تھی :۔

"یا اللہ۔ میری قبر کبھی مرکز پرستش نہ بنے۔"

آپؐ کو یقینی طور پر تکلیف ہوتی اگر آپؐ کو یہ معلوم ہو جاتا کہ آپؐ کے بعد مصنفین آپؐ کے نام پر آپ کے گرد توہمات کا ہالہ بنا دیں گے۔

اب آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ حضرت محمدؐ کے سوانح نگاروں میں کیا نقائص ہیں۔ وہ یا تو آپؐ کو عقیدت کی حد تک مانتے ہیں یا بالکل نہیں مانتے۔ دونوں میں جذبات کی شدت ہے کم یا زیادہ بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے آپؐ کے سوانح حیات غیر جانبداری سے لکھے ہیں۔ لیکن عملی طور پر کسی نے بھی وہاں کی سرزمین اور آب و ہوا اور عادات و رسوم کا جائزہ نہیں لیا۔ جو کسی شخص کے طریق زندگی اور اس کی بود و باش پر بڑا اثر ڈالتے ہیں۔

چنانچہ میں نے یہ کوشش کی کہ اس کتاب میں حضرت محمدؐ کو اس طرح پیش کروں جیسے وہ واقعی تھے۔ ایک ایسے ہی عرب جن کی طرح کے بہت سے عربوں کو میں نے صحرا میں دیکھا تھا۔ ایک سادگی پسند انسان لیکن عظیم شخصیت کے مالک، اپنے لوگوں کا دل سے بھلا چاہنے والے، ایک ایسے انسان جو روحانی فیضان رکھتے ہوئے بھی جو کچھ کرتے تھے منطقی طور پر سوچ کر کرتے تھے اور مردوں اور عورتوں کی کمزوریوں سے درگزر کرنے والے تھے اور جو کسی طرح بھی خدا یا دیوتا نہیں تھے۔

'محمدی'، یا 'محمدیت' کی اصطلاحیں حضرت محمدؐ یا آپؐ کے پیروکاروں نے کبھی استعمال

نہیں کیں۔ اپنے آقا کی بیحد عزت وتکریم کے باوجود مسلمانوں نے ایسے ناموں کو ہمیشہ رد کیا۔ حضرت محمدؐ کے لائے ہوئے دین کے اختیار کرنے والے کے لئے صرف لفظ "مسلم" ہی واحد اور صحیح ترین اصطلاح ہے جس کے معنی اللہ کی رضا کے لئے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا ہیں۔

حضرت محمدؐ کے عادات وخصائل درویشی کی حد تک سادہ تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ آپؐ دنیا کے انسان بھی تھے اور وہ بھی کوئی بہت پرانی دنیا کے نہیں۔ بلکہ اگر آپؐ اس زمانے میں بھی موجود ہوتے تو آپؐ کسی مجلس میں بھی کوئی اجنبیت محسوس نہ کرتے خواہ وہ مغربی لوگوں کی ہوتی یا مشرق والوں کی۔ آپؐ بھی اسی طرح محبت کرتے تھے جیسے ہم کرتے ہیں، آپؐ کے بچے بھی تھے، آپؐ گھوڑوں کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے، آپؐ اپنے جوتے خود گانٹھ لیتے تھے اور اپنے کپڑوں کی بھی خود ہی مرمت کر لیتے تھے۔ آپؐ بڑے خوش مذاق بھی تھے، آپؐ کو اپنے رہنما اور لیڈر ہونے کا ضرور احساس تھا لیکن آپؐ میں دکھاوا نہ تھا اور نہ کبھی آپؐ نے اپنے ہاں درباداری کا رکھ رکھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آپؐ نے کبھی کسی کو یہ تاثر نہ دیا کہ آپؐ کوئی مافوق البشر انسان یا روحانی صفات کے حامل تھے۔

میں اب اپنے پہلے بیان کی طرف لوٹتا ہوں۔ ازمنہ تاریخ کی صدیوں میں بنی نوع انسان میں شاید ہی کوئی تبدیلی آئی ہو۔ انہوں نے زندگی کی الجھنوں میں اضافہ ضرور کر لیا ہے لیکن اپنے خدوخال اور اپنی قدیم جبلت اور فطرت کو ذرا نہیں بدلا۔ اس لئے صرف اس وجہ سے کہ یہ کتاب اللہ کے رسول اور بانی اسلام کے متعلق ہے اس کو عام پڑھنے والے کی دلچسپی سے خارج نہیں سمجھنا چاہئے۔ حضرت محمدؐ کی سوانح عمری بھی ایسی ہی ہے۔ جیسے تاریخ یا ناول کی کسی اور مشہور شخصیت کی۔ اس میں بھی ڈرامہ، آویزش، مخالفتیں اور حیرت انگیز واقعات اور مہم جوئی جیسے وہ تمام عناصر موجود ہیں جو ایک اچھی داستان کے لوازم ہیں۔

چنانچہ اس کتاب کے قاری کو اپنے ذہن سے اسلام، مسلمان، ساتویں صدی اور عرب کو بھلا دینا چاہئے اور صرف یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ ایک ایسے شخص کے حالات پڑھ رہا ہے جو بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے میدان میں آیا اور اپنے راستے میں ہر ممکن قسم کی رکاوٹوں کے باوجود اپنے نیک مقصد میں کامیاب ہوا۔ حضرت محمدؐ اور کسی اور شخص کی حیرت انگیز

کامیابی کی کہانی میں صرف ایک ہی فرق ہے۔ یعنی اس کا ماحول اور پس منظر، اور یہ ہی آپؐ کی کامیابیوں میں سنسنی اور دلکشی کا اضافہ کرتا ہے۔

آپؐ کی سوانح عمری میں کوئی بات حیرت انگیز طور پر نئی نہیں، اگر کچھ نئی باتوں کا اضافہ کیا ہے تو وہ یہ دکھانے کے لئے کہ کس طرح واقعات اور حالات نے آپؐ سے بعض ایسی باتیں کرائیں جن کا مغربی لوگوں کو علم نہیں۔ میرے لئے ان باتوں کے جاننے کا سبب میرا عربوں کے ساتھ عرصہ تک رہنا اور ان سے دوستی ہے ؛

پہلا باب

مکّہ

(چھٹی صدی عیسوی)

صحرائے عرب کی ویرانیوں میں گھرا ہوا اسلام کا مقدس شہر مکّہ، یمن اور شام کے درمیان ایسی سرزمین میں واقع ہے جسے تند ہواؤں اور بارش کی شدید کمی نے ناکارہ بنا دیا ہے۔ ایک وحشت ناک[1] وادی نے جس کے دونوں طرف نوکیلے اور بے آب و گیاہ پہاڑوں کے سلسلے چلے گئے ہیں، اس کے محل وقوع کو اتنا الگ تھلگ اور نظروں سے اوجھل کر دیا ہے کہ جب تک ایک زائر اچانک اس کی گلیوں کے اندر ہی نہ جھانکنے لگے اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ مکّہ پہنچ گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اس مقدس شہر کے رازوں کو ناپاک دنیا سے محفوظ رکھنے میں مسلم عقیدے[2] کا بڑا ساتھ دیا ہے۔

پتھریلی سیاہ اور تقریباً ایک جیسی اونچائی کی بہت سی پہاڑیوں سے گھری ہوئی یہ ایک غیر دلکش اور بڑی ناموافق جگہ ہے۔ ہر طرف میلوں ان خشک پہاڑیوں کا سلسلہ ختم

---

[1] ملاحظہ ہو منسلکہ نقشہ نمبر ۱

[2] مسلم عقیدے اور دستور کے مطابق غیر مسلموں کا مکّہ میں داخلہ بند ہے — اور یہ پابندی رسول کریم کے زمانے سے ہی لگی ہوئی ہے۔ حیاۃ محمدؐ کے مصنف ڈاکٹر محمد حسین ہیکل کے بیان کے مطابق اسلام سے پہلے بھی اہل کتاب کو مکّہ میں داخلے کی عام اجازت نہ تھی۔ سوائے ان محنت مزدوری کرنے والوں کے جو اپنے دین کے متعلق وہاں کوئی بات نہ کریں۔ یہ ہی وجہ تھی کہ مکّہ میں یہودی اور عیسوی نہ ہونے کے برابر تھے۔

ہوتا نظر نہیں آتا اور نہ ہی چمکدار اور خیرہ کن صحرا کا خاتمہ دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی آگ برسانے والی تمازت چین لینے دیتی ہے۔ جلتے آسمان کے نیچے چھوٹی کنکریوں اور چمکاتی پتھروں سے سلگتے کوئلوں کی طرح دھواں اٹھتا معلوم ہوتا ہے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ کہیں کہیں کانٹے دار ببول کے سوا ہر قسم کی جاندار شے اس ویرانے میں جل کر ختم ہو گئی ہے۔ مکمل ویرانی ہے۔ نہ تھمنے والی ہوا کی سائیں سائیں کے سوا اور کوئی آواز نہیں سنائی دیتی۔ سطح زمین کی یکسانیت کی اکتاہٹ توڑنے والی صرف ایک ہی شے ہے اور وہ ہیں غصے میں بپھرے جنوں کی طرح زمین سے اٹھتے اور بل کھاتے بگولے۔ یہاں سراب بھی نہیں کہ مسافروں کا کھجوروں کے درختوں اور سرسبز باغات کے نظر فریب نظاروں سے ہی دل بہلائیں اللہ کے نبی کے اس مقدس شہر میں کوئی شے پیدا نہیں ہوتی۔ دن کی جھلستی اور چلچلاتی دھوپ سے امن صرف رات کو ہی مل سکتا ہے۔

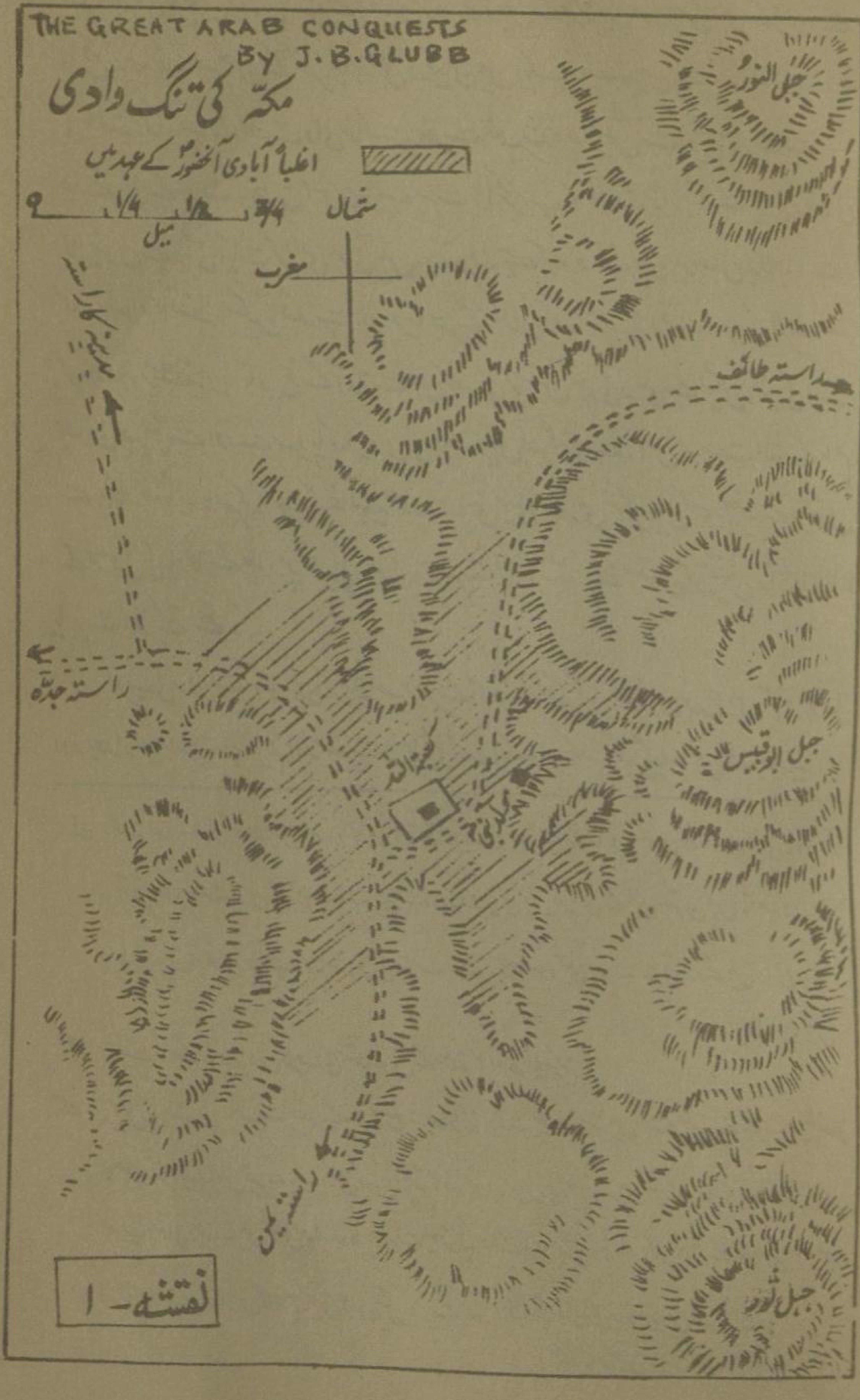
شہر کا اپنا رنگ بھی وہی ہے جو اردگرد کے علاقے کا — ہر طرز اور ہر سائز کے پتھر سے بنے ہوئے مکانات ٹھسا ٹھس بھرے اور مکھیوں کے چھتے کے خانوں کی طرح آپس میں جڑے وادی کے عمودی بازوؤں پر اوپر ہی اوپر چلے جاتے ہیں۔ یہاں وہاں آبادی سے علیحدہ کوئی عمارت کسی پہاڑی کی چوٹی پر ہوا کی رگڑیں کھا کر چمکتی ہوئی کسی چٹان پر کھڑی ایسی معلوم ہوتی ہے کہ اسے بستی سے نکال پھینکا گیا ہے اور وہ پھر اسی گڈمڈ آبادی میں دوبارہ گھس جانے کے انتظار میں ہے۔

شہر کے عین درمیان میں مسجد الحرام[1] یا بیت اللہ ہے۔ اس میں ستونوں والا ایک بڑا صحن ہے۔ صحن میں بہت سے متبرک قبے[2] اور یادگاریں ہیں۔ بیت اللہ کے معنی ہیں

---

[1] ملاحظہ ہو نقشہ ۱

[2] قبے — مصنف کے عرب میں قیام کے دوران (یعنی جنگ عظیم اول کے بعد) یہ قبے موجود تھے لیکن سعودیوں کے اقتدار کے فوراً بعد (غالباً ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۸ء کے درمیان) ان کے عقائد اور صحن کو وسیع کرنے کی ضرورت کے تحت بہت سے قبے گرا دیئے گئے۔ اب نہیں ہیں۔ مقام ابراہیم اور چاہ زمزم جیسی یادگاریں البتہ موجود ہیں۔


THE GREAT ARAB CONQUESTS
By J. B. GLUBB
مکّہ کی تنگ وادی
اغلباً آبادی آنحضورؐ کے عہد میں
0 1/4 1/2 3/4
میل
شمال
مغرب
جبل النور
راستہ طائف
مدینہ کا راستہ
راستہ جدہ
جبل ابو قبیس
راستہ یمن
جبل ثور
نقشہ - ۱

اللہ کا گھر، جو عربوں کی روایات کے مطابق روئے زمین کے مرکز میں اور عرش الٰہی کے عین نیچے واقع ہے۔ خانہ کعبہ صحن کے تقریباً بالکل درمیان میں ایک نشیب میں ہے۔ یہ ایک بغیر دریچے کی مکعب نما، سپاٹ چھت والی خاکستر پتھر سے تعمیر شدہ چالیس فٹ[1] اونچی عمارت ہے — چائے دانی کے غلاف کی طرح اس پر ایک بہت بڑا کمخواب کا غلاف پڑا رہتا ہے۔ جس پر طلائی کلابتوں سے قرآنی آیات کڑھی ہوتی ہیں۔ یہ غلاف جسے کسوہ کہتے ہیں ہر سال بدلا جاتا ہے۔ کعبہ اسلام کا نقطہ ماسکہ[2] یا قبلہ ہے اور دنیا بھر کے مسلمان روزانہ پانچ وقت اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ تاریخ کے آغاز سے ہی کعبہ کی پرستش ہوتی رہی ہے لیکن اس کی ابتدا بھلائی جا چکی ہے اور بے سروپا کہانیوں کی دھند میں کھو گئی ہے۔ اس کو بیت اللہ کے نام سے پکارا جاتا یہ ظاہر کرتا ہے کہ غالباً یہ عمارت اپنی پہلی بھدی شکل میں کسی پیغمبر نے فرشتوں کے نزول کی یادگار کے طور پر تعمیر کی ہوگی۔ حضرت یعقوبؑ اپنے ستون کو بیتھل[3] BETHYL یا بیت اِل کہتے تھے۔

عرب کی روایات بتاتی ہیں کہ پہلا کعبہ حضرت آدمؑ نے تعمیر کیا۔ طوفانِ نوح میں تباہ ہو گیا اور بعد ازاں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے ایک اور کعبہ تعمیر کیا۔ اس کے بعد یہ

---

[1] کعبۃ اللہ - لمبائی شمالاً جنوباً ۲۴ ہاتھ (دو ہاتھ کا ایک گز) چوڑائی شرقاً غرباً ۲۳ ہاتھ اور اونچائی ۲۷ ہاتھ (تقریباً ۴۰ فٹ) اس کی چھت دوہری ہے اور درمیان میں لکڑی کے تین ستون ہیں۔ کعبہ کا دروازہ پانچ ہاتھ اونچائی پر ہے اور مشرق کی جانب ہے۔ حجر اسود بھی جنوب مشرقی کونے میں واقع ہے۔ (جارج سیل)

[2] نقطہ ماسکہ - چاروں طرف کی شعاعوں کے ملنے کا نقطہ یا مرکز

[3] بیتھل یا بیت ال - حضرت یعقوبؑ بیئر سبع سے حاران کی طرف چلے۔ راستہ میں رات کو ٹھہرے۔ خواب میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ نظر آیا۔ کہا میں تیرے باپ اسحٰقؑ اور ابراہیمؑ کا خدا ہوں۔ میں یہ زمین تیری نسل کو دوں گا اور تو مشرق و مغرب و شمال و جنوب میں پھیل جائے گا۔ حضرت یعقوبؑ جاگے تو جو پتھر سرہانے لگایا تھا اسے کھڑا کیا ۔۔۔ اس کو خداوند کا نشان بنا کر اس کا نام بیتھل (ال بیتل یا بیت اللہ) رکھا۔ یہ کنعان کی سرزمین میں تھا۔ (عہد نامہ عتیق - پیدائش۔

بت پرستوں کے قبضہ میں چلا گیا جنہوں نے اس کی نقلیں (مختلف مقامات) پر تعمیر کیں یہاں تک کہ حضرت محمدؐ تشریف لے آئے اور اس کو قدیم کی طرح دوبارہ خدائے واحد کی عبادت کے لئے وقف کر دیا۔

کعبہ کی بیرونی دیوار کے ایک تیز کنارے والے گوشے میں حجر اسود نصب ہے۔ حجر اسود درحقیقت کئی ٹکڑوں کا مجموعہ ہے۔ صحیح طور پر بارہ جنہیں سیاہ سیمنٹ سے آپس میں جوڑ کر چاندی کے ایک حلقہ میں کسا ہوا ہے۔ یہ سارا ایک بیضوی شکل کا ہے اور تقریباً سات اِنچ اس کا قطر ہے۔ یہ پتھر یا ٹکڑے کس چیز کے بنے ہوئے ہیں آج تک کوئی اس کی تحقیق نہیں کر سکا۔

ایک باوثوق روایت کے مطابق یہ پتھر بہشت سے لایا گیا تھا۔ اور حضرت جبرائیل نے لا کر حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کو اس وقت دیا تھا جب کہ وہ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے۔ اس وقت یہ برف کی طرح سفید تھا لیکن اس کا موجودہ رنگ (سیاہ) ان کروڑوں گنہگاروں کے چومتے رہنے کا نتیجہ ہے۔ جو ہر سال مکّے میں حج کے لئے آتے ہیں۔ لیکن اس بات سے اس کی ساخت کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ایسا کرنے میں بڑی دقّت یہ ہے کہ لوگوں کی بہت بڑی اکثریت جو مکّہ جاتی ہے اس سیاہ پتھر کو عقیدتاً تقدس کا نشان سمجھتی ہے۔ اور وہ لوگ اس کی ارضیاتی تاریخ کے متعلق کوئی توجہ نہیں دیتے۔ جن سیاحوں نے اس پتھر کو تجسّس اور تقدس دونوں نظروں سے دیکھا ہے ان کے خیالات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ مکّہ کے مشرق میں واقع ابوقبیس کی پہاڑیوں کی چٹان کا ٹکڑا ہے۔ دوسروں کا خیال ہے کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ اس کی اصل آتش فشانی ہے۔

مختلف ادوار میں اس موضوع کے سبب پیدا شدہ مختلف الخیالی اور بحث مباحثے کے باوجود مذکورہ بالا باتوں میں سے ایک بھی کسی اہمیت کی حامل نہیں۔ خواہ یہ کسی شئے بنا ہو یہ حقیقت ہے کہ یہ پتھر ایک طویل عرصے سے وہاں موجود ہے میکسمس ٹائرلیس MAXIMUS TYRIUS دوسری صدی عیسوی میں لکھتے ہوئے بتاتا ہے کہ عرب لوگ ایک ایسے خدا کی پرستش کرتے ہیں جس کا مظہر انہوں نے ایک مستطیل عمارت کی شکل میں بنایا ہوا ہے۔ جس میں ایک سیاہ پتھر لگا ہوا ہے۔

آج حجرِ اسود کی تعظیم روایت کی خاطر بھی اتنی ہی کی جاتی ہے جتنی دوسری باتوں کے سبب۔ حضرت محمدؐ کی تعلیمات اختیار کر لینے سے پہلے عرب جنون کی حد تک بت پرست تھے۔ کعبہ کا اندرونی حصہ خاکستری رنگ کے پتھر سے بھدّے طریقے پر تراشے ہوئے ہر قسم کے بتوں سے پٹا پڑا تھا اور ان میں وہ پتلے بھی تھے۔ جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ حضرت مریمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کعبہ کی بغیر دریچے کی اس مقدس عمارت میں تین سو ساٹھ پتھر کے بھدّے بت بے ترتیبی سے ہجوم کئے ہوئے تھے۔

خانہ کعبہ کے گرد سات نسبتاً چھوٹی عمارتیں[1] بھی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم چاہ زمزم ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں پر حضرت ہاجرہ[2] نے حضرت سارہ کے اکسانے پر حضرت ابراہیمؑ کے خیموں سے نکال دیئے جانے کے بعد مرنے کا فیصلہ[3] کیا تھا۔ کچھ دیر صحرا میں مارے مارے پھرنے کے بعد وہ مکّہ کی اس پتھریلی وادی میں آنکلی تھیں۔ ان کا زادِ راہ ختم ہو گیا تھا اور پانی کی چھاگل بھی خالی تھی۔ وہ پریشانی اور اضطراب میں پانی کی تلاش میں اِدھر سے اُدھر دوڑتی پھریں۔ اور پھر پیاس سے نیم جان ہو کر وہ جھلسی ہوئی زمین پر گر پڑیں اور اپنے بچے (حضرت اسمٰعیل) کو ایک کانٹے دار ببول کی جھاڑی کے نیچے سرکا دیا۔ پھر سر کو چادر سے ڈھانپ کر زور سے چیخ ماری کہ میں اپنے بچے کو اپنے سامنے مرتا نہیں دیکھ سکتی۔

لیکن اس سے پہلے کہ بظاہر ناگزیر بات ہو جائے ایک فرشتہ ظاہر ہوا اور حضرت ہاجرہ کو بتایا کہ پانی کا ایک چشمہ ان سے چند قدم کے فاصلے پر ہی ہے۔ حضرت ہاجرہ اب چل بھی نہیں سکتی تھیں لیکن وہ سرک سرک کر پانی تک پہنچیں۔ جس نے ان کی اور حضرت اسمٰعیلؑ کی جانیں بچا لیں۔

---

[1] اب یہ عمارتیں موجود نہیں ہیں۔ البتہ چاہ زمزم اور مقام ابراہیم اپنی بدلی ہوئی شکل میں باقی ہیں۔

[2] حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہ حضرت ابراہیمؑ کی بیویاں تھیں۔ حضرت ہاجرہ سے حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے اور حضرت سارہ سے حضرت اسحٰق علیہ السلام۔

[3] یہ واقعہ انجیل سے لیا گیا ہے۔ (باب ۲۱ پیدائش۔ پرانا عہد نامہ)

یہ زمزم وہی چشمہ ہے اور جب حضرت ہاجرہ نے اس کو دیکھا تو اس سے پانی کے اُبلنے کی آواز کے سبب اس کو زمزم کہا اور اگر ہم کتاب پیدائش (انجیل - پرانا عہد نامہ) کی اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو غالباً زمزم دنیا کے قدیم ترین موجود کنوؤں میں سے ایک کنواں ہے۔ عربوں کو اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب یہ اظہر من الشمس ہے کہ مکہ یہاں موجود ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ زمزم یہاں نہ ہو۔

حضرت ابراہیمؑ صحرا نشین تھے اور خیموں میں رہتے تھے۔ اگر کوئی شخص تن تنہا بغیر اونٹ کے صحرا میں نکل کھڑا ہو اور پانی نہ ملے تو اس کے زندہ بچنے کے بہت کم مواقع ہوتے ہیں پانی کے چشمے اور کنویں تو اس وقت بھی اسی طرح موجود تھے۔ جیسے آج ہیں لیکن اگر کوئی شخص چرواہا نہیں ہے یا سطح زمین سے ناواقف ہے تو وہ ان کے قریب ہونے کے باوجود ان کو نہ پا سکے گا اور خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ پریشان اور تھکا ماندہ ہو۔ یہ کہانی بھی پرانے عہد نامے کی اور بہت سی کہانیوں کی طرح کی ایک کہانی ہے۔ اغلباً پانی کے اس کنویں کے سبب ہی مکہ آباد ہوا۔ ایسی اُجاڑ اور ویران سرزمین میں جہاں بھی کنواں ہو قافلے اور چرواہے خود بخود کھنچے چلے آتے ہیں۔ کچھ دیر بعد قافلے اس جگہ رات گزارنے کے لئے ٹھہرنے لگے ہوں گے اور آہستہ آہستہ یہ جگہ تجارتی مرکز بن گئی۔

اگر ہم اس روایت کو صحیح مان لیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرب کی تاریخ نے اُسی وقت سے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ حضرت ہاجرہ کی ڈرامائی جلاوطنی کے کچھ ہی عرصہ بعد حضرت یعقوبؑ کا ایسوع[1] کو محروم الارث کر دینے کا واقعہ بھی کم ڈرامائی نہیں ہے۔ ان

---

[1] ایسوع۔ حضرت یعقوبؑ کے بڑے بھائی تھے۔ انہیں ادوم (سرخ) بھی کہتے ہیں کیونکہ ان کا رنگ سرخ تھا اور جسم پر بڑے بال تھے۔ حضرت اسحٰقؑ بوڑھے اور نابینا ہو گئے تو اپنی گدی (نبوت) ایسوع کو دینی چاہی لیکن ان کی بیوی ربقہ نے اپنے بیٹے یعقوبؑ کو ایسوع کے بھیس میں پیش کر کے دعا لے لی اور حضرت یعقوبؑ جانشین ہو گئے اور ایسوع محروم ہو کر خادم بن گئے لیکن دونوں بھائیوں میں عرصہ تک اختلاف رہا اور حضرت یعقوبؑ بیس سال تک اپنے ماموں کے ہاں رہے۔ (باب ۲۷- پیدائش- پرانا عہد نامہ)

دوالمیوں کے بالواسطہ نتیجہ کے طور پر ایسوع نے مقالہ[1] سے شادی کر لی جو حضرت اسمٰعیلؑ کی بیٹی تھیں۔ اس شادی سے بنی ادوم بنو عمالقہ اور بنو اسمٰعیل قبائل وجود میں آئے جو عرب کے لوگوں کے آباء و اجداد تھے۔

چاہ زمزم سے قریب ہی ایک اور عمارت[2] میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے مقبرے ہیں۔ ایک اور قبہ میں ایک پتھر[3] ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ کعبہ کی از سر نو تعمیر کی نگرانی کرتے تھے۔

مکہ کا حال بیان کرنے میں صیغہ حال اس لئے استعمال ہوا ہے کہ جہاں ساتویں صدی عیسوی کے شہر کے کچھ حصے تا حال موجود ہیں وہاں حضرت محمدؐ کے زمانے سے اب تک اس کی شکل و صورت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

مکانات اب بھی مقامی طور پر دستیاب ہونے والے خاکستری پتھر کے بنتے ہیں، اور مشرق کے دوسرے شہروں کی نسبت زیادہ اونچے ہوتے ہیں۔ ان کی چھتیں سپاٹ ہوتی ہیں اور باہر کی طرف بڑے پردہ دار چھجے اور کٹہرے ہوتے ہیں۔ گلیاں پیچ در پیچ اور تنگ ہوتی ہیں۔ بعض چڑھتی اور بل کھاتی ان پہاڑیوں پر پہنچ جاتی ہیں جو مکہ کو گھیرے ہوئے ہیں

---

[1] مقالہ - ان کو بشامہ اور مہلت بھی کہا گیا ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی بیٹی تھیں اور حضرت ایسوع کی بیوی جب ایسوع حضرت اسحٰقؑ کی جانشینی سے محروم ہو گئے اور حضرت یعقوبؑ کے واپس آ جانے پر بالکل ناامید ہو گئے تو اپنے اہل و عیال و سامان اور جانوروں کے ساتھ وہاں سے چلے آئے اور کوہ شعیر میں رہائش اختیار کر لی۔ (باب ۳۶۔ پیدائش۔ پرانا عہد نامہ) [2] حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے مقابر کا آج کل کوئی نشان موجود نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے مصنف کے عرب میں قیام کے دوران تک موجود ہوں یعنی جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے فوراً بعد، کیونکہ سعودی حکومت نے اپنے دور کے آغاز میں بہت سے مقابر اور قبے گرا دیئے تھے۔ فلپ ہتی کی کتاب HISTORY OF THE ARABS میں ایک تصویر میں یہ عمارتیں اور مقابر نظر آتے ہیں۔ یہ تصویر ۱۹۱۳ء کی ہے۔ [3] اس پتھر اور اس جگہ کو مقام ابراہیم کہتے ہیں۔ اب اس پر بھی قبہ نہیں لیکن اپنی مختصر اور جدید شکل میں قائم اور موجود ہے۔

وہ اب بھی پہلے کی طرح سنسان نہیں ہوئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان بازاروں اور گلیوں میں ہر وقت ہی کسی نہ کسی کام، کسی دوست سے ملنے کی غرض سے یا سفر سے واپس ہوتے ہوئے چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ اب بھی اونٹ اسی شانِ بے نیازی سے کھردری کنکریوں اور سنگریزوں پر آہستہ آہستہ چلتے ہیں اور بوجھ سے لدے گدھوں اور خچروں کو ادھر ادھر دھکیلتے جاتے ہیں۔ گپ شپ اور قہقہوں کے ساتھ خاک بھی ہر وقت اڑتی رہتی ہے اگرچہ بہت سی پرانی عمارتیں ان شدید بارشوں کے سبب تباہ ہو گئی ہیں جو مکہ کی تنگ وادی کے نشیبی حصوں کو طوفانی نالوں میں تبدیل کر دیتی ہیں لیکن ان کی جگہ ویسی ہی نئی عمارتوں نے لے لی ہے۔ البتہ جو عمارتیں طوفانوں کی زد سے بچی رہی ہیں وہ ابھی تک کھڑی ہیں۔ حضرت محمدؐ کی جائے پیدائش[1] اور وہ مکان جہاں آپ شادی کے بعد رہائش پذیر رہے آج بھی زائرین کو اصل مکانات کے طور پر دکھائے جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ تقدس محض خیالی ہو کیونکہ اس خشک آب و ہوا میں عمارتیں دھند اور بارش کے علاقوں کی بہ نسبت بہت زیادہ عرصہ تک شکست و ریخت سے بچی رہتی ہیں۔ چنانچہ قبل از اسلام یا حضرت محمدؐ کے زمانے کا کوئی بت پرست اگر آج بھی مکہ آ جائے تو یقیناً اسے یہاں گلیوں میں ان نشانات کو تلاش کرنے میں ذرا بھی دقت نہ ہو گی جو وہ ہزار دو ہزار سال پہلے یہاں چھوڑ گیا تھا۔

نہ ہی اسے یہاں کی طرز بود و باش میں کوئی فرق محسوس ہو گا۔ دکانیں، اقامت خانے اور مطعم (طعام خانے) بالکل ویسے ہی ہیں جیسے آج سے تیرہ سو سال یا اس سے بھی پہلے تھے۔ چھٹی صدی عیسوی تک مکہ ایک اہم شہر بن چکا تھا۔ وہاں کی عربی زبان

[1-2] ۱-۲ غالباً مصنف کے قیام کے دوران اصل عمارتیں موجود ہوں گی۔ رسول کریم کی جائے پیدائش کی عمارت کو اب بھی "مولدِ نبیؐ" کہتے ہیں لیکن اصل عمارت کی بجائے اب وہاں پر ایک نئی عمارت میں دینی کتب خانہ بنا دیا گیا ہے۔ ایک بڑا ہال ہے جہاں زائرین تھوڑی دیر بیٹھ کر آپ پر درود بھیجتے ہیں اور باہر چلے آتے ہیں۔ اسی طرح قریب کی دوسری آبادیوں میں حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؑ، حضرت امام حسینؑ اور دیگر اصحاب کبار کے مکانات کی جگہ دینی مدرسے یا مساجد تعمیر کر دیئے گئے ہیں۔ ان تبدیلیوں کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔

شائستہ ترین شمار ہوتی تھی اور وہاں کے لوگ اپنے آپ کو سب سے زیادہ مہذب خیال کرتے تھے۔ تاجر اور حاجی وہاں پر سارے عرب سے آتے تھے۔ اب بھی بالکل یہ ہی حال ہے۔ مکہ کی بولی اب بھی مستند زبان شمار ہوتی ہے اور جہاں عرب کے دوسرے شہر فیشن کے مرکز بن گئے ہیں۔ عرب کے دور افتادہ علاقوں اور عرب سے باہر کے قافلے اور حجاج ابھی تک مکے کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ اس وقت کی طرح اب بھی مکہ کے لوگ ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان سے کرایہ اور محصولات شہر میں لوگوں کی تعداد[1] کی بنیاد پر وصول کرتے ہیں۔ زر مبادلہ کی شرح پر سٹہ[2] اجناس کی اجارہ داری اور فصلوں پر جوا اب بھی اسی طرح کھیلا جاتا ہے جیسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔

حضرت محمدؐ مکہ کے ان ہی بت پرست، روپیہ کے لالچی امیر طبقہ کے لوگوں اور اس پُر ہول ویرانے میں رہنے والے شہریوں کے درمیان پیدا ہوئے۔ آپؐ خانہ بدوش نہ تھے اور آپؐ کا روحانی مطمح نظر بھی بدوؤں سے قطعی مختلف تھا۔ لیکن یہ بدوی قبائل ہی تھے جو سب سے زیادہ سرگرم اور راسخ الاعتقاد مسلمان بنے۔ اور یہ صحرا نشین ہی تھے جنہوں نے اسلام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ وہ لوگ جو کبھی عربوں کے درمیان نہیں رہے شاید اس میں کوئی خاص بات محسوس نہ کریں لیکن حقیقت میں یہ حضرت محمدؐ کا ایک ایسا کارنامہ تھا۔ جو قریب قریب ایک معجزہ ہے۔

تمام عربوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مقیم اور خانہ بدوش یعنی نخلستانی یا شہر کے لوگ اور خانہ بدوش یا بدو۔

شہر کے لوگ ہمیشہ سے عالم، تاجر یا حاکم ہوتے آئے ہیں۔ یہ ہی لوگ ہیں جنہوں نے تھوڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ہمیشہ عرب کی سیاسی قسمتوں کی قیادت کی ہے۔

---

[1] مکان دار دو آدمیوں کے کمرے میں چھ اور آٹھ حاجیوں کو رکھتے ہیں اور ہر شخص سے برابر کا کرایہ وصول کرتے ہیں۔ ایک بستر کے بچھانے کی جگہ بھی مشکل سے حصہ میں آتی ہے۔

[2] سٹہ اور جوا، سرکاری طور پر سخت منع ہے۔

ادھر صحرانشین لوگ ہی وہ جنگجو، جہاں گرد اور پیشرو تھے جو اپنی عربی تہذیب کو پھیلانے کی خواہش سے زیادہ مہم جوئی کے شوق میں اسلام کو دنیا کے آخری سرے تک لے گئے۔ خانہ بدوش اور شہری لوگ ایک دوسرے سے ممکن حد تک مختلف ہوتے ہیں لیکن وہ ماں اور باپ کی طرح مل کر ایک واحد وجود بھی رکھتے ہیں۔

لیکن نخلہ یا شہر کے لوگوں کے رہن سہن کا طریقہ صحرا والوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ نخلستان یا نخلہ صحرا کی ویرانی کے درمیان مدینہ کی طرح کا کھجوروں اور پھولوں کا ایک باغ بھی ہو سکتا ہے اور کسی کنوئیں کے گرد بسا ہوا ایک قصبہ بھی، جیسے مکہ۔ کسی قسم کا نخلہ[1] کیوں نہ ہو لیکن وہاں کی اور کسی اور جگہ کی بود و باش میں کوئی مماثلت نہیں۔ ایسے قصبوں کی مثال ایک جزیرے کی سی ہوتی ہے۔ جہاں کے لوگوں کے ہر نوع کے خیالات صرف اسی جزیرے تک محدود ہوتے ہیں۔ ایک نخلے کے رہنے والے امریکہ کے کسی دیہاتی قصبے کے لوگوں کی نسبت زیادہ مقام گرفتہ ہوتے ہیں۔ وہ صحرانشینوں سے کسی بات میں نہیں ملتے جلتے۔

ایک خانہ بدوش جنگجو کے لئے صحرا کی وسعتیں اور اس کے ساتھ اس کے خطرات اور سہولتوں سے محرومی لازمی امر ہیں۔ یہ باتیں اس کی تمام اچھی صلاحیتوں، دیانت داری اور خوش طبعی کو اجاگر کر دیتی ہیں۔ اس کی صحرانوردی اس کو اتنی فرصت ہی نہیں دیتی کہ وہ ایک سیدھے سادے انسان کے علاوہ کچھ اور بھی بن سکے۔ اگر وہ اپنا گھوڑا یا اونٹ کھو بیٹھے، اور نتیجہ کے طور پر اسے بے کار ہو کر بیٹھ جانا پڑے تو اس کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے اور وہ جلد ہی نظروں سے گر جاتا ہے۔ ایک خانہ بدوش شہری سے نفرت نہیں کرتا اور نہ ہی وہ اس سے لڑتا ہے۔ لیکن وہ اس کو اپنے سے کمتر سمجھتا ہے اور اس جیسا نہیں ہونا چاہتا۔

یہ ہی وجہ تھی جس کے باعث خانہ بدوش قبائل پہ حضرت محمدؐ کا تفوق اور اثر اس قدر حیرت انگیز تھا۔

---

[1] نخلہ نخلستان کا مروج مخفف ہے اور صحرا میں کھجوروں یا دیگر پھلوں کے باغات۔ اس کی ملحقہ آبادی اور اسی طرح کسی چشمے یا کنوئیں کے گرد آبادی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ اس کی مثالیں ہیں۔

حالانکہ تمام عربوں میں تقریباً ایک ہی طرح کے اصولوں کی حکومت رائج تھی، وہ ایک ہی بنیادی زبان بولتے تھے اور ایک قسم کی بین العرب وطن پرستی کا جذبہ رکھتے تھے لیکن وہ خود مختار قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک قبیلے کے اپنے مخصوص رسم و رواج اور اپنی بولی تھی اور وہ اپنے مخصوص طرز کے خیموں کی انفرادیت تک کی حفاظت کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ آج بھی یہی دستور ہے۔ اور یہ ہی سبب ہے کہ عرب میں کوئی مرکزی[2] حکومت نہیں ہے۔

ان حالات میں ایک صحرا نشین کا ان قبائل کا حاکم بن جانا اور اس حد تک کہ وہ اس کے نصب العین کے لئے متحد ہو جائیں اور جان تک دے دیں، بڑی حیران کن بات تھی اور پھر یہ کہ یہ شخص ایک شہری ہو جن کو وہ پسند نہیں کرتے اس سے بھی زیادہ عجیب تھا، حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمدؐ کے ظہور تک صحرا نشین لوگ اپنی آزادی کی اتنی کڑی نگہداشت کرتے تھے کہ وہ ہر اس شخص کو، جو اُن پر حکمرانی کا ارادہ رکھتا ہو، نکال باہر کرتے تھے۔

سارے عرب عام طور پر اور صحرا نشین خاص طور پر فطری اور روائتی طور پر مساوات کے قائل ہیں۔ قبیلہ کا سردار اور ایک چرواہا برابری کی سطح پر ملتے ہیں۔ قبائلی اتحاد میں ہر ایک کیلئے برابر کے مواقع ہیں۔ کسی کو دوسرے پر کوئی برتری نہیں جب تک کہ وہ کسی خاص صلاحیت کا حامل نہ ہو۔ عرب کے صحرا ہی دنیا میں ایسی جگہ ہیں جہاں جمہوریت پر صحیح طور پر عمل ہوتا ہے لیکن عرب جہاں ان اصولوں کے اپنے حلقوں میں پابند ہیں وہاں وہ ہمیشہ سے اپنے آپ کو دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ عالی نسب اور شریف سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے پہلی نسل خیال کرتے ہیں۔

عرب کی روایت کے مطابق حضرت آدمؑ اور حضرت حوّاؑ جنت سے نکالے جانے پر سالوں تک زمین پر علیحدہ علیحدہ سرگرداں پھرتے رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو جبل عرفات پر ملایا جو آج کے مکّہ کے قریب ہے۔ حضرت آدم نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ کعبہ کی تعمیر

---

[1] ملاحظہ ہو نقشہ ۲ صفحہ

[2] یہ جنگ عظیم اول کے بعد کی بات ہے۔ اس سے پہلے تمام عرب پر ترکوں کی حکومت تھی۔

تھی۔ چنانچہ عرب کی قدیم آبادی اپنا سلسلہ نسب حضرت آدم کے قریب ترین اخلاف حضرت نوحؑ اور خاص طور پر ان کے بیٹے سام سے ملاتی ہے۔ یہ سام کے پڑپوتے تھے۔ جنہوں نے موجودہ مکّہ کے مقام پر یمن اور حجاز کی سلطنتوں کی بنیاد رکھی اور حضرت ابراہیمؑ، جن کے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ تھے۔ سام کی نسل میں کئی پشت دور اُن کے پڑپوتے تھے۔

بہر حال یہ عرب کی روایت ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کا ذکر عہد نامہ عتیق میں بھی ملتا ہے:۔

"اور خدا نے (حضرت ابراہیمؑ سے) کہا —— اسمٰعیلؑ کے حق میں تیری بات سُن لی ہے۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا۔ اسے برومند کروں گا۔ اس کی نسل بہت بڑھے گی اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔"

(باب ۱۷۔ پیدائش۔ پرانا عہد نامہ)

اور فرشتے نے حضرت ہاجرہ کو صحرا میں بھی اس امر کی تصدیق کر دی تھی جب وہ پیاس سے جاں بلب تھیں۔

"اٹھ، اور بچے کو اٹھا اور اس کو اپنے ہاتھ میں سنبھال۔ کیونکہ میں اسے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔" (باب ۲۱۔ پیدائش۔ پرانا عہد نامہ)

حضرت اسمٰعیل کے ان بارہ فرزندوں کا ذکر کتاب پیدائش (پرانا عہد نامہ) میں بھی ہے کہ وہ اس علاقے میں آباد تھے جو شام جاتے ہوئے حویلہ سے شور تک تھا۔ جس کی نشاندہی حجاز میں مکّہ کے قریب ہوتی ہے۔ اور اسی طرح اس ویران علاقہ کو جہاں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ آباد تھے فاران بتایا گیا ہے۔ اور ان کے اس احوال سے بھی کہ ان میں سے کچھ قصبوں میں آباد تھے اور کچھ خیموں میں، پتہ چلتا ہے کہ وہ عرب تھے۔

اور جن خیموں کا حضرت داؤدؑ زبور PSALMS میں ماتم کرتے ہیں وہ حضرت اسمٰعیلؑ کے دوسرے بیٹے قیدار کے تھے جن سے بہت سے عرب اپنا سلسلہ نسب ملاتے ہیں۔ جرمیاہؑ اسی موضوع پر لکھتے ہوئے ذکر کرتا ہے "اور وہ خوش حال قوم وہاں بے فکری

ؑ جرمیہ (یرمیاہ) پرانے عہد نامے کی ایک جزوی کتاب BOOK OF LAMENTATIONS کا مشہور مصنف

سے رہتی ہے نہ ان کے گھروں میں دروازے ہیں اور نہ ان کو بند کرنے کے لئے اسلاخیں نہ لیٹے، اور وہ اکیلے رہتے ہیں"

اگر ہم عہد نامہ عتیق OLD TESTAMENT پر یقین رکھتے ہیں اور جن قدیم مقامات کا اس میں ذکر ہے وہ عرب کے شہر اور کنویں باور کئے جا سکتے ہیں تو پھر جو کچھ عرب ہمیں بتاتے ہیں وہ بھی یقیناً صحیح ہے۔

حقیقت میں حضرت آدم کے قصے سے قطع نظر عرب کی تاریخ ہمیں انجیل میں مذکور پیغمبروں کے زمانوں سے بھی بہت آگے لے جاتی ہے۔ ان لوگوں کے قبل از اسلام مذہبی عقائد ہی اکیلے اس بات کو ثابت کر دیتے ہیں۔ جہاں عیسائیت اور یہودیت کے خال خال نشان ملتے تھے اور بے شمار بتوں کی پرستش ہوتی تھی وہاں وہ لوگ لنگ کی پوجا بھی کرتے تھے اور اس کے علاوہ وہ سورج اور چاند اور ستاروں کی بھی تعظیم کرتے تھے۔ ہیروڈوٹس دراصل کعبہ کا ذکر نہیں کرتا لیکن اس نے "لات" یا زیادہ صحیح "ال لات" کے متعلق ضرور لکھا ہے کہ وہ ایک دیوی ہے اور عرب کے ان بتوں میں سے ایک ہے جو بغیر دریچے کی مقدس عمارت (کعبہ) میں رکھے ہوئے ہیں۔

لیکن اتنی قدیم روایات کا حامل ہونے کے باوجود چھٹی صدی عیسوی کے اواخر کی اس زوال پذیر دنیا میں عربوں کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی اور امر واقعہ یہ ہے کہ کسی کو بھی کوئی بڑی اہمیت نہ تھی۔ یہ ایک نزع کا دور تھا کیونکہ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا کی بڑی سلطنتیں تباہ ہو چکی تھیں یا ان کی شاہانہ عظمت وسطوت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔

لیکن ابھی تک یونان کی خطابت، ایران کی شان وشوکت اور روما کی عظمت دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی اور تا حال کوئی ان کی جگہ لینے والا نہ تھا۔ یہاں تک کہ کوئی مذہب بھی ایسا نہیں تھا۔

یہودی ساری دنیا میں بکھر کر رہ گئے تھے اور ان کی کوئی مرکزی قیادت نہ تھی۔ وہ حالات

لہ ہیروڈوٹس HERODOTS (۴۸۴ تا ۴۲۵ ق م) مشہور یونانی مورخ ہے جسے CICEORO علم تاریخ کا باوا آدم کہتا ہے۔ وہ بابائے علم انسانی بھی تھا۔


نقشہ ۔ ۲
سلطنت ہائے فارس و بازنطینہ (روم)
۶۰۰ عیسوی
سلطنت بازنطینہ
سلطنت فارس
شمال
بحر اسود
باسفورس
بحر روم
صحرائے شام
عرب
۲۰۰ ۱۰۰ ۵۰
میل
THE GREAT ARAB CONQUESTS
BY J.B. GLUBB

کے مطابق یا تو برداشت کئے جا رہے تھے یا اذیتیں جھیل رہے تھے۔ ان کا کوئی ملک نہ تھا جسے وہ اپنا کہہ سکیں اور ان کا مستقبل اتنا ہی غیر یقینی تھا جتنا آج[1] ہے۔

پوپ گریگوری[2] اعظم کے اثر سے آزاد عیسائی اپنے کسی وقت کے سیدھے سادے مذہب میں قسم قسم کی پیچ در پیچ تاویلات کر رہے تھے اور ایسا کرتے ہوئے ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے تھے۔

البتہ ایران کی شہنشاہیت میں ابھی کچھ دم باقی تھا اور شہنشاہ خسرو ثانی واقعی اپنی سلطنت کو وسعت دے رہا تھا۔ رومن سلطنت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس نے کپادوشیہ CAPPA DOCIA مصر اور شام پر قبضہ کر لیا۔ (ملاحظہ ہو نقشہ ۲) اور بیت المقدس کو تاراج کر کے وہاں سے مقدس صلیب اٹھا لایا تھا۔ ۶۲۰ء تک جبکہ حضرت محمدؐ ایک سربرآوردہ شخصیت کی حیثیت سے ابھرنے والے تھے اس نے شہنشاہ دارائے اوّل کی عظیم سلطنت کو ایک مرتبہ پھر سے بحال کر دیا تھا۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشرق وسطیٰ کی شان و شوکت قائم رکھنے کے لئے یہ ایک نیا دور ثابت ہوگا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ بازنطینی رومنوں میں ابھی کچھ کس بل باقی تھا چنانچہ جب خسرو کی افواج قسطنطنیہ کی فصیلوں تک پہنچیں تو انہوں نے اپنی پوری قوت لگا کر اسے پسپا کر دیا۔

بدنام تھیوڈورا کا خاوند شہنشاہ جسٹینین[3] JUSTINIAN ۵۶۵ء میں حضرت محمدؐ کی پیدائش سے کچھ پہلے مر چکا تھا۔ اس کے بعد ۶۱۰ء تک کئی غیر اہم حکمران یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے۔ اور اس کے بعد ہرقل[3] HERACLIUS تخت نشین ہوا۔ ہرقل نے اپنے

---

[1] اس کتاب کے لکھنے کے وقت تک یہودیوں کا نہ کوئی اپنا ملک تھا اور نہ سلطنت۔ اسرائیل کا ملک بعد میں ۱۹۴۸ء میں معرض وجود میں آیا۔

[2] گریگوری اعظم (روما کا لاٹ پادری یا پوپ (۵۹۰ تا ۶۰۴ء) اس وقت کے تمام عالم عیسائیت پر اس کا بڑا اثر تھا۔ یہ بہت مشہور پوپ گزرا ہے۔

[3] قسطنطنیہ کے بازنطینی رومن شہنشاہ۔

پیشرودں سے مختلف مزاج پایا تھا چنانچہ اس نے ایرانیوں کے خلاف قدم اٹھانے میں دیر نہ لگائی اور آخر کار انہیں ۶۲۷ء[1] میں شکست دی۔ خسرو نے جتنا علاقہ چھینا تھا اس میں سے بہت سا واپس لے لیا اور مقدس صلیب کو بھی واپس بیت المقدس بھیج دیا۔ لیکن یہ کامیابی دیرپا نہ تھی چند ہی سال بعد اسے مسلمانوں کی یلغار کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جنگ مختصر رہی لیکن شدید تھی۔ صحرائے عرب کے مجاہدوں نے اللہ اکبر کا جنگی نعرہ لگا کر رومنوں کے عقابی پرچم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاک میں ملا کر قدموں تلے روند ڈالا۔

دور مشرق میں واقعات کی رفتار کوئی اہم نشانات نہیں چھوڑ رہی تھی۔ ہندوستان بہت سی چھوٹی چھوٹی غیر اہم ریاستوں اور راجواڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ جو آپس میں ہی سیاسی اور جنگی طاقت آزمائی کر رہی تھیں۔

چینی معمول کے مطابق آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریبان تھے سوئی خاندان آیا اور چلا گیا اور اس کی جگہ تانگ خاندان نے لے لی جو تین صدیوں تک حکمران رہا۔

جاپان میں پہلی مرتبہ ایک ملکہ تخت پر بیٹھی لیکن بدھ مت جڑ پکڑ رہا تھا اور جاپانی خیالات اور عقائد پر اثر انداز ہو رہا تھا۔

یورپ کے ممالک آہستہ آہستہ جرمن فرانسیسی سلطنت کا حصہ بنتے چلے جا رہے تھے۔ جس میں فرانس۔ شمالی اٹلی اور دریائے رائن کے مشرق میں موجود روس و پولینڈ کی سرحدوں تک کے ممالک شامل تھے۔ شاہ کلووس[2] CLOVIS مر چکا تھا اور میروونگی خاندان کے آخری بادشاہ داغبرٹ DAGOBERT کی تاجپوشی عنقریب ہونے والی تھی۔

اسپین اور انگلستان غیر اہم چھوٹی ریاستیں تھیں۔

---

[1] نقشہ ملاحظہ ہو (نقشہ ۲)

[2] شاہ کلووس (۴۶۵ تا ۵۱۱ء) فرانسیسی سلطنت کے میروونگی MEROVINGIAN خاندان کا بانی۔ اس نے گاتھوں کو شکست دے کر اسپین میں دھکیل دیا اور پیرس کو اپنا دار الخلافہ بنایا۔

اسپین پر وسی گاتھ VISIGOTHS لوگوں کا تسلط تھا جنہیں حال ہی میں فرانس کے ان علاقوں سے نکال دیا گیا تھا جہاں کبھی وہ شمال میں دریائے لوائر LOIRE تک کے علاقوں پر قابض تھے۔ وہ یہودیوں کو مسلسل اذیتیں دے رہے تھے جن کو نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کے حملے کے لئے، جو ایک صدی سے بھی کم میں ہونے والا تھا، راہ ہموار کرنے میں بڑا کام کرنا تھا۔

جزائر برطانیہ چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ رومنوں کو واپس گئے ڈیڑھ سو سال گزر چکے تھے اور ان کی جگہ نارڈک NORDIC (شمال مغربی یورپ) لوگوں نے لے لی تھی۔ انگلستان خود سات علیحدہ علیحدہ بادشاہتوں میں تقسیم تھا۔ اور اسکاٹ لینڈ میں جنگجو پکٹ PICTS رہتے تھے لیکن سینٹ کولمبا ST-COLUMBA کی حالیہ آمد کے سبب ان کے بادشاہ نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا اور اس طرح وہاں کے لوگوں کو مہذب دنیا سے میل ملاقات کا موقعہ فراہم کر دیا تھا۔ ویلز کے ڈروئڈ DRUIDS تا حال اپنی قدیم رسومات کے پابند تھے اور آئرلینڈ والوں کی اکثریت اسی طرح رہتی تھی جیسے وہ آج رہتے ہیں۔ البتہ وہاں کے باقی ماندہ لوگ عیسائیوں کی ایک ذہین خانقاہی جماعت کے مقلد تھے اور یورپ میں کیلٹک عقیدے کے مراکز قائم کرنے کے لئے وہاں پر اپنے مبلغ بھیجتے تھے۔

شمالی افریقہ کی تاریخ بازنطینی رومنوں سے وابستہ تھی۔ بالی سیریس[2] BALISARIUS نے ونڈلوں کو نکال دیا تھا اور بحر روم کے جنوبی کناروں پر ایک خاموش بے چینی مسلط تھی۔ یہ خاموشی عساکر اسلامی کی آمد کے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔

اگرچہ یورپ والوں نے ابھی تک امریکہ کے براعظموں پر قدم نہیں رکھا تھا لیکن وہاں جو لوگ آباد تھے۔ ان کی اپنی ایک تہذیب تھی۔ حضرت محمدؐ کے ظہور کے وقت وہاں

---

[1] گاتھ - قدیم جرمن نژاد قوم جن کی سلطنتیں اٹلی، جنوبی فرانس اور اسپین میں تھیں۔ اسپین میں آٹھویں صدی تک حکمران رہے۔

[2] بالی سیریس BALISARIUS شہنشاہ جسٹینین کا مشہور جنرل GENERAL (۵۰۵ تا ۵۶۵ء) اس نے گوتھ اور ونڈلوں کو شکست دی اور ایرانیوں کو بھی ہرا دیا۔

ایک قوم مایا MAYA[1] فنِ تعمیر۔ نجوم اور ریاضی میں بڑی ترقی یافتہ تھی۔ امریکہ کے انتہائی شمال میں براعظم ایشیا کی آبنائے بیرنگ[2] کے دوسری طرف ہجرت کا سلسلہ جاری تھا۔ نئے آنے والے پہلے سے آباد شدہ لوگوں سے لڑکر ان کو اور مشرق کی طرف دھکیل رہے تھے وہاں کے اصلی باشندوں میں لنگ کی پوجا، جنسی بے راہ روی اور جنسی ظلم و ستم کی رسومات ان لوگوں کی طرح شد و مد سے جاری تھیں، جن کی زندگی چند روزہ رہ گئی ہو۔

بحرِ جنوبی کے جزیروں کے رہنے والے لوگ اپنے مونگے کے جزیروں میں قناعت کی زندگی بسر کر رہے تھے بالکل ان لوگوں کی طرح جن کو ابھی تک سفید فام قوموں نے نہیں بگاڑا ہے۔

درحقیقت جہاں تک انسانی ذہنیت کا تعلق ہے اس وقت کی اور آج کی دنیا میں بہت کم فرق ہے سلطنتوں کی تباہ کاری اور بادشاہت کی ہوس چھٹی صدی عیسوی میں بھی لوگوں کو اسی شد و مد سے ایک دوسرے کو مار ڈالنے پر اکساتی تھی جس طرح بیسویں صدی کے وسط میں کبھی ایک ملوکانہ تمدن کے نام پر اور کبھی دوسری ملوکانہ تہذیب کے نام پر قتلِ عام، گردن زنی اور مظالم کی شکل و صورت حضرت محمدؐ اور ہرقل کے زمانے میں بھی ایسی ہی تھی۔ جیسے آج پائس دوازدہم اور شاہ جارج ششم کے دور میں۔ نسلِ انسانی نے اپنے کام و دہن کے ان معمولات کے علاوہ نہ تو پچھلے دو ہزار سال میں کوئی سبق سیکھا اور نہ ہی آئندہ پندرہ سو سال میں اس سے کچھ زیادہ سیکھنے کی توقع ہے۔

بایں ہمہ یہ دور جنگوں اور مذہبی جھگڑوں کے ہنگاموں کے درمیان ایک قسم کا وقفہ تھا اور ایک ایسے خیال کے بیج بونے کا، جو ایک دل پذیر اور مثالی عقیدے کی طرف رہنمائی کرے، ایک نہایت سازگار لیکن ساتھ ہی ساتھ نازک موقعہ تھا لیکن یہ تجربہ کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا تھا جو ایک مؤثر شخصیت، ہمت اور مکمل خود اعتمادی کا حامل ہو۔ ایسے لوگوں کو جو ہمیشہ سے جنھتے بندیوں، انفرادی آزادی اور مذاہب الٰہیہ سے بیزاری میں پلے بڑھے ہوں صرف وہ ہی جیت لینے میں کامیاب ہو سکتا تھا جو ان سے محبت اور اپنائیت سے پیش آتا ہو اور ساتھ ساتھ بے پناہ استقلال اور عزم کا مالک ہو۔

اس کتاب میں ہم اسی شخصیت کا حال بیان کر رہے ہیں۔

---

[1] MAYA وسطی امریکہ اور جنوبی میکسیکو کی ایک قوم جو یورپ کے طالع آزماؤں سے پہلے وہاں آباد تھی اور ایک بڑی ترقی یافتہ تہذیب کی مالک تھی۔ [2] آبنائے بیرنگ، الاسکا اور شمال مشرقی سائبیریا (روس) کے درمیان ایک تنگ آبنائے ہے۔

دوسرا باب

حضرت محمدؐ کا بچپن

۵۷۰ عیسوی

چند ناقابل یقین روایتوں سے قطع نظر حضرت محمدؐ کی ولادت کے متعلق کوئی ابہام یا شک و شبہ نہیں۔ آپؐ دنیا میں اسی طرح آئے اور پیدا ہوئے جیسے دوسرے عام انسان۔ آپؐ کے والدین خوشحال مکّی تھے اور قریش نامی ایک مشہور قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ قریش کی اکثریت تجارت پیشہ تھی۔ چنانچہ ان ہی کی طرح حضرت محمدؐ اور ان کے آباؤ اجداد بھی تجارت کرتے تھے۔

حضرت محمدؐ کے والد کا نام عبداللہ تھا۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ مکّہ کے حسین ترین، بےحد مقبول اور نہایت قابلِ احترام جوان تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ان کی نسبت آمنہؓ بنت وہب سے ہوئی تو مکّہ کی بہت سی حسین دوشیزاؤں کے دل ٹوٹ گئے۔

حضرت عبداللہ کے گیارہ بھائی اور کئی بہنیں تھیں۔ ان میں چار بھائیوں کو دنیا کے اس عظیم انقلاب میں جو حضرت عبداللہ کی اس شادی سے ہونے والے بچے کے سبب ظہور میں آنے والا تھا نہایت اہم کردار ادا کرنا تھا۔ ان چار کے اسمائے گرامی ابوطالب، ابولہب،

(یہ دونوں حضرت عبداللہ کے ہم سن) اور العباسؓ اور حمزہؓ تھے (یہ دونوں کافی چھوٹے تھے)
ان کے والد عبدالمطلب مکّہ کی ایک ممتاز اور نامور شخصیت تھے اور اُن کے والد کا نام ہاشم تھا۔

حضرت محمدؐ کے شجرہ نسب کے متعلق یہ چند پشت بتا دینا ہی کافی ہیں۔ حضرت ہاشم کا ذکر کرنے کی صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ ہے مکّہ میں ان کا مرتبہ اور اس کا اثر جوان کے پڑپوتے پر پڑا۔ حضرت ہاشم دولت اور مرتبے دونوں کے مالک تھے۔ وہ ایک معزز تاجر بھی تھے، اور مکّے میں رفادہ کے شعبہ کے سربراہ بھی۔ دوسرے عربوں کی طرح حضرت ہاشم بھی ایک باعمل انسان تھے۔ وہ اس بات کو خوب جانتے تھے کہ مکّہ کس قدر غیر آباد اور ویران مقام تھا اور شدید گرمی اور سخت ناگوار آب و ہوا کے باعث کتنی غیر دلکش جگہ تھی۔ اگر یہ مقام مقدس روایات کا حامل نہ ہوتا تو وہ خود اور دوسرے تمام لوگ کبھی کے اس جگہ کو چھوڑ کر چلے گئے ہوتے اور اس جگہ کو ریت میں دبے ہوئے صدیاں بیت گئی ہوتیں۔ بہر حال چونکہ یہاں کا قیام ناگزیر تھا اس لئے اس جگہ کو بہتر سے بہتر بنانا ضروری تھا۔

گو حج بذاتِ خود ایک معقول ذریعہ آمدنی تھا حضرت ہاشم نے چند دوسرے ذرائع سے بھی شہر کی آمدنی میں اضافہ کیا۔ یہ حضرت ہاشم ہی تھے جنہوں نے اس مقصد کے لئے مکّہ سے ہر سال دو بہت بڑے تجارتی قافلے بھیجنے شروع کئے۔ ایک سردیوں میں یمن اور جنوبی علاقوں کی طرف اور دوسرا گرمیوں میں شام اور دوسرے شمالی ممالک کی جانب ــــ یہ بھی ہاشم ہی تھے جنہوں نے نسبتاً چھوٹے قافلوں کو مکّہ معظمہ میں پڑاؤ ڈالنے اور کچھ دیر ٹھہرنے کی ترغیب دی۔ اس کا سہرا بھی انہی کے سر ہے کہ انہوں نے تجارتی راستوں کو محفوظ بنانے کے لئے بازنطینی رومیوں اور شامی عربوں کے امیروں سے صلح کے عہد نامے کئے اور ساتھ ہی ساتھ ایران اور حبشہ کے ساتھ تجارتی معاہدے بھی کئے۔ یہ بھی وہ ہی تھے جنہوں نے حاجیوں کی حفاظت کا

لہ اس باب کے آخر میں آنحضور کا شجرہ نسب ملاحظہ ہو۔

لہ رفادہ ایک ٹیکس تھا جو مکّہ کے لوگوں سے وصول کیا جاتا تھا اور منیٰ میں نادار حاجیوں کو کھانا کھلانے اور ان کی دوسری ضروریات پر خرچ کیا جاتا تھا۔ یہ عہدہ قریش میں بہت معزز اور باعزت سمجھا جاتا تھا۔

انتظام کیا تاکہ راستوں میں انہیں لوٹ نہ لیا جائے اور یہ کہ جو کچھ وہ اس سلسلہ میں خرچ کریں اس کا معاوضہ انہیں جان و مال کی حفاظت میں مل جائے۔ اس جچی تلی دوراندیشی نے مکّہ کی ترقی میں بڑا کام کیا اور یہ منصوبے قریشی سرداروں کے لئے بھی بڑے فائدہ مند ثابت ہوئے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ان اقدامات نے خود بزرگ سن حضرت ہاشم کی دولت میں بھی بے پناہ اضافہ کر دیا۔

چنانچہ ریت، گرمی اور دوسرے شہروں سے دوری کے باوجود مکّہ کوئی جامد یا دقیانوسی شہر نہ تھا۔ یہاں رونق تھی۔ لوگوں کی آمد و رفت اور گہما گہمی تھی اور قدم قدم پر تقابل تھا۔ بے حد دولت مندی اور بھوکوں مرنے تک افلاس، عیش و عشرت اور زہد و مرتاضی کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ بڑے بڑے ساہوکار تاجروں نے جو مختلف قسم کے تیل، ریشمی کپڑے، عطریات قیمتی جواہرات یا بردہ فروشی کا کاروبار کرتے تھے مکّہ میں آئندہ زمانے کے وینس[1] کی طرح کا ایک امیر طبقہ پیدا کر دیا تھا۔ تجارت اور اس سے حاصل کی ہوئی دولت کو عیاشانہ طریقے پر خرچ کرنے کے علاوہ انہیں اور کسی بات سے کوئی غرض نہ تھی۔ اور یہ روپیہ کمانا بھی کوئی بے کیف دفتری معمول نہیں تھا۔ جوا تمام اہل مکّہ کی فطرت میں داخل تھا۔ وہ اس تجارتی سامان کی فروخت یا دوبارہ فروخت پر جو ابھی ان کے ذہن ہی میں ہوتا تھا یا جو ابھی مالک کے حوالے نہیں کیا گیا، سٹہ لگاتے تھے۔ منڈی میں چیزوں کی قیمتوں کے گھٹنے بڑھنے، یا یمن اور شام سے آنے والے قافلوں کے سامان یا ایسی فصلوں کے بھاؤ تاؤ میں جو ابھی کھلیانوں میں ہی پڑی ہوتیں، ان لوگوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ بڑے بڑے تجارتی ادارے راتوں رات دولت مند یا دیوالیے ہو جاتے تھے اور اس سے تجارتی گہما گہمی میں اضافہ ہوتا تھا۔

مکّہ کے روز و شب میں عورتوں کو بھی بڑا دخل تھا۔ ان میں سے بہت سی ان تجارتی قیاس آرائیوں اور سٹے میں عملی طور پر حصہ لیتی تھیں لیکن ان میں سے اکثریت تاجروں سے ان کے منافع کو خرچ کرا لینے پر ہی اکتفا کر لیتی تھیں۔ البتہ ایسا کرنے میں عرب عورتوں

---

[1] اٹلی کا مشہور شہر جو قدیم زمانے میں تجارت دولتمندی اور شہرت میں بام عروج پر تھا۔

سے ان لوگوں کا انداز محبت بڑا نپا تلا ہوا تھا۔ اور ان کے محبت کے جذبات کا اتار چڑھاؤ منڈی میں نفع نقصان کے مطابق رہتا تھا۔

چھوٹے دکاندار بھی اپنے امیر ہم پیشہ تاجروں کی تقلید کرتے تھے اور آپس ہی میں سٹہ لگاتے تھے اور سادہ لوح بدوؤں کو فریب سے لوٹتے تھے۔ بدو لوگ تجارت پیشہ افراد سے نفرت کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قریش[۱] تو شارک (خونخوار بڑی مچھلی) کا مترادف ہیں۔ اس کی کچھ حقیقت بھی تھی کیونکہ قریش کا مادہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی ہیں بڑی مچھلی۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اپنی بھیڑیں، اونٹ اور اُون فروخت کرنے کے لئے ان ہی سے واسطہ پڑتا تھا۔ غریب لوگ مستقبل میں بہتری کی امید پر اپنی بساط کے مطابق زندگی گزار رہے تھے۔ اور ان کا ذہن ایک ایسے دین یا مذہب کو قبول کرنے کے لئے بڑا سازگار تھا۔ جو انہیں آئندہ کی زندگی میں کچھ بہتری کی امید دلائے۔ کعبے کے خداؤں نے انہیں کبھی کوئی ایسی پیش کش نہیں کی تھی۔ ان کے نزدیک یہ تو امیروں کے زر خرید خدا تھے اور خاص طور پر قریش کے۔

ایک امیر طبقے اور ایک خوشحال قبیلے کا فرد ہونے کے علاوہ حضرت ہاشم کے ذمے مذہبی رسومات کی بجا آوری بھی تھی۔ وہ کعبہ اور اس کے ساتھ دوسرے مقدس مقامات کے متولیوں میں سے ایک تھے۔ یہ ان کا خاندانی فریضہ تھا۔ جو صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ بیت المقدس کے لویوں[۲] کی طرح یہ مقدس اور نفع بخش فائدہ صرف ہاشمیوں کو ہی مل سکتا تھا۔ آج بھی مکہ اور مدینہ کے قاضی القضاۃ جن کا رسول کریم کے خاندان سے ہونا لازمی ہے شہزادگان بنی ہاشم

---

[۱] قریش۔ اکثر لغات میں اس کے معنی نام قبیلہ معروف ہی دیئے ہیں۔ غیاث اور منتخب اللغات میں اسے "قرش" کا تصغیر بھی بتایا ہے جو ایک بہت قوی الجثہ دریائی جانور ہے۔ جس سے باقی سب جانور ڈرتے ہیں۔ مصنف نے غالباً انہی معنوں کے پیش نظر اس کے معنی شارک مچھلی بتایا ہے۔

PHILIP HITTEE نے تاریخ عرب میں منتخب اللغات کے قرش بالفتح مادے کو سامنے رکھا ہے اور قریش کے معنی تاجر بتائے ہیں کیونکہ لغات میں قرش کے معنی "کسب کردن" لکھے ہیں۔

[۲] لوی = بیت المقدس کے علاقے کا ایک قبیلہ۔ یہ کتاب ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

کہلاتے ہیں۔

چنانچہ حضرت ہاشم حضرت محمدؐ کے خاندانی حالات کے سلسلے میں پس منظر کے طور پر اہم ہیں اور اہم تھے۔ وہ اگر ہوتے تو غالباً اپنے پڑپوتے کے مشن کو پسند نہ کرتے۔ وہ یقینی طور پر اس خیال کو ہی بے عزتی تصور کرتے کہ ان کا ایک خلف عرب کی ہر چیز کو بدل کر رکھ دے گا۔ اور اگر وہ یہ جان سکتے کہ ان کے بعد کعبہ کی بے حرمتی ہوگی اور وہ بت جن کے وہ پاسبان اور متولّی تھے توڑ ڈالے جائیں گے تو وہ اسے اپنی تحقیر سمجھتے اور وہ بلاشک وشبہ حضرت محمدؐ کے ایذا دہندوں[1] میں سے ایک ہوتے لیکن وہ ایسی کوئی بات ہونے سے پہلے ہی انتقال کر گئے اور ان کی دولت اور ان کا منصب ان کے چھوٹے بھائی المطلب کو مل گئے۔

المطلب نے بھی حضرت محمدؐ کی زندگی پر کوئی براہ راست اثر نہیں چھوڑا۔ وہ اپنے بھائی کے نقش قدم پر چلتے رہے اور دس سال بعد وفات پا گئے۔ ان کے جانشین ان کے بھتیجے عبدالمطلب ہوئے جو حضرت ہاشم کے ایک صاحبزادے اور حضرت محمدؐ کے دادا تھے۔ ان کے نام کا سابقہ لفظ 'عبد' ہی کیا ان کا سارا نام ہی ایک غلط فہمی کا مرکب تھا۔ وہ اپنے والد (حضرت ہاشم) کی وفات کے وقت اپنی والدہ کے ساتھ مدینہ میں تھے۔ وہ سِن بلوغ تک وہاں ہی رہے۔ یہاں تک کہ ان کے چچا المطلب ان کو اپنے ساتھ مکّے لے آئے۔ یہاں یہ بات مشہور ہوگئی کہ وہ المطلب کے غلام ہیں اور 'عبد' ان کے نام کا سابقہ بن گیا۔ بعد میں غلطی کا ازالہ ہونے پر بھی یہ سابقہ اور ان کے چچا کا نام مل کر ان کا نام بنا رہا۔ ان کا اصل نام شیبا تھا۔

حضرت عبدالمطلب ایک اچھے عرب کی تمام صفات کے حامل تھے اور اپنے والد اور چچا کی طرح وہ بھی تاجر تھے لیکن وہ ساتھ ہی ساتھ ایک جنگجو بھی تھے۔ حضرت محمدؐ کی پیدائش سے کچھ ہی عرصہ پہلے اہل حبش[3] نے عرب پر چڑھائی کر دی۔ ان کے ساتھ ہاتھی اور ہر قسم کا جدید ترین اسلحہ اور

---

[1] یہ مصنف کا اپنا خیال ہے۔

[2] عبدالمطلب، حضرت ہاشم نے ایک شادی یثرب (مدینہ) میں عمر و خزرجی کی بیٹی سلمہ سے بھی کی تھی۔ حضرت عبدالمطلب ان کے بطن سے تھے اور آپ سن بلوغ کو پہنچنے تک مدینہ میں اپنی والدہ کے ساتھ ہی رہے۔ آپ کے چچا بعد میں آپ کو مکّہ لے آئے اور اپنا جانشین بنایا۔ جناب سلمہ ایک بڑی تاجر خاتون تھیں اور مدینہ میں بڑی معزز شمار ہوتی تھیں۔ حیاۃ محمد (محمد حسین ہیکل)

[3] یہ یہی وہ واقعہ ہے جس کا سورۃ فیل میں ذکر ہے۔

جنگی سامان تھا جو عربوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ حضرت عبدالمطلب نے ایک لشکر سے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور دشمن کو ملک سے باہر نکال دیا۔

لیکن حضرت عبدالمطلب کی شہرت کی بڑی وجہ زمزم کی دوبارہ دریافت ہے جو ہر وقت کی اڑتی ہوئی ریت کی تہوں کے نیچے دب کر بے نشان ہو گیا تھا۔ کعبہ کے متولی کی حیثیت سے ان کا فرض حاجیوں کے لئے پانی فراہم کرنا بھی تھا۔ مکّہ کے باہر کے چشموں سے اتنا پانی دستیاب کرنا ایک مرحلہ تھا۔ عبدالمطلب اتنا جانتے تھے کہ کعبے اور زمزم کا محل وقوع قریب قریب ایک ہی ہونا چاہیئے اور اگر مکّہ شہر کے آباد ہونے کے متعلق روایات صحیح ہیں تو کعبہ اور زمزم دونوں کو بالکل اسی جگہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے کھدائی شروع کرا دی اور آخرکار ایک روز چاہ زمزم کو تلاش کر لیا گیا۔ اس کھدائی کے دوران انہیں دو طلائی غزال، چند تلواریں اور زرہیں بھی ملیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ نوادرات بنی جرہم[1] کے آخری بادشاہوں کے تھے جو تیسری صدی عیسوی سے آخر تک مکّہ کے حکمران تھے۔

کچھ بحث وتمحیص اور بڑے دیوتا ہُبل (جو سرخ سنگ یشب کی ایک ٹھوس چٹان سے تراشا گیا تھا) کے سامنے دعاؤں اور شگون لینے کے بعد یہ نوادرات تو کعبہ میں بطور نذر چڑھا دیئے گئے اور چاہ زمزم حضرت عبدالمطلب کو دے دیا گیا۔ یہ ہی وہ چاہتے تھے۔ اس سہل الحصول اور تاریخی روایات کے حامل ذریعہ آب رسانی کے سربراہ ہونے نے ان کی تمام مشکلات ہی حل نہیں کر دیں بلکہ ان کا وقار بھی بلند کر دیا اور اس بات کی کہ یہ پانی کچھ کڑوا اور کھاری[2] تھا انہوں نے پروا نہیں کی بلکہ ان کا خیال تھا کہ جب اسی پانی نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی جانیں بچائیں تو شاید یہ حاجیوں کے لئے بھی بہت مفید

---

[1] بنی جرہم۔ ایک قدیم قبیلہ تھا جو حضرت اسمٰعیلؑ کے وقت یا اس کے کچھ دیر بعد سے ہی مکّہ کے قریبی علاقے میں آباد تھا۔ پھر یہ طاقتور ہو گئے اور مکّہ پر حکومت کرنے لگے اور جیسا کہ بیان کیا گیا ہے تیسری صدی عیسوی کے آخر تک مکّہ کے حکمران تھے۔

[2] مصنف نے لکھا ہے کہ آب زمزم میں EPSOM SALT (ہاضم نمکیات) کی آمیزش ہے۔

ثابت ہوگا۔

حضرت عبداللہ حضرت عبدالمطلب کے چہیتے بیٹے تھے۔ وہ اپنے والد کی دولت اور عزت وجاہ کے وارث ہوتے لیکن وہ حضرت آمنہ سے شادی ہونے کے تھوڑے دن بعد ہی مدینہ میں انتقال کر گئے۔ جہاں وہ تجارت کے سلسلہ میں گئے تھے اور وہ اپنے ہونے والے فرزند کو نہ دیکھ سکے جو ان کے انتقال کے چند ماہ بعد اگست[1] ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے۔

کچھ وجوہات کی بنا پر غالباً اس سبب سے بھی کہ ابھی آپ کے دادا حیات تھے، حضرت محمدؐ والد کے ورثہ میں وہ کچھ نہ پا سکے جس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ حقیقت میں جو کچھ حضرت عبداللہ نے ورثہ میں چھوڑا وہ ایک چھوٹا سا مکان، پانچ اونٹ، چند بکریاں تھیں اور ایک حبشی کنیز جس کا نام برکہ[2] تھا۔ یہ اثاثہ کسی کو زندگی میں قدم رکھنے کے لئے بالکل ناکافی تھا اور ایک ہاشمی وارث کے لئے تو مایوس کن تھا۔

بہر حال حضرت عبداللہ اس جگہ چلے گئے تھے جہاں اللہ تعالیٰ نے ایسے تمام لوگوں کو رکھا ہے جو اس وقت تک اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔ اب حضرت آمنہ اور حضرت محمدؐ کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ خاندان کی کفالت میں آجائیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی منشائے ایزدی تھا۔ حضرت آمنہ کے بچہ پیدا ہونے کے سات روز بعد حضرت عبدالمطلب نے اس کی خوشی میں ایک ضیافت کا اہتمام کیا۔ قریش میں سے تمام رشتہ دار اور مکہ کے تمام معززین مدعو کئے گئے۔ اگر وہ بصیرت

---

[1] تاریخ پیدائش۔ سر جان گلب نے اپنی کتاب "عربوں کی عظیم فتوحات" میں صحیح تاریخ ۲۶ اگست ۵۷۰ء دی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے "حیاۃ محمدؐ" میں ۲۰ اگست ۵۷۰ء بتائی ہے۔ بعض کے نزدیک آپ اپریل ۵۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ عام الفیل کے حساب سے کثرت رائے ۱۲ ربیع الاول اور دوشنبہ (پیر) کے متعلق ہے سیرۃ النبی میں مولانا شبلی نے ۹ ربیع الاول، روز دوشنبہ مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء پر اجتہاد کیا ہے ان اختلافات کے باوجود ایک بات پر سب متفق ہیں کہ عام الفیل کے حساب سے ربیع الاول کا مہینہ، دوشنبہ کا دن اور تاریخ ۸ تا ۱۲ ربیع الاول تھی (مترجم)

[2] ان کی کنیت اُمّ ایمن تھی اور یہ اسی نام سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔

رکھتے ہوتے اور اس کے مستقبل کے متعلق کچھ جان سکتے تو شاید ان میں سے بہت سے خوشی سے اسی وقت اس بچے کا گلا گھونٹ دیتے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی صاحب بصیرت نہ تھا اور جب یہ سرخ چہرے والا بچہ کھانے کے بعد نقل اور شیرینی کے ساتھ مہمانوں میں لایا گیا تو سب اسے دیکھ دیکھ کر مسکرائے اور خوشی کا اظہار کیا۔

بچے کا پیدائشی نام قحطان تھا لیکن پوتے سے نوازے جانے پر کعبہ کے خداؤں کا شکرانہ ادا کرنے کے بعد حضرت عبدالمطلب نے اس کا محمدؐ کے نام سے تعارف کرایا۔ سارے مہمان حیران رہ گئے۔ عرب اس نام سے ناواقف تو نہیں تھے لیکن شاذ ہی رکھا جاتا تھا۔ ان میں سے آخر ایک نے خاندانی نام رکھنے کی رسم ترک کرنے کا سبب دریافت کر ہی لیا۔ حضرت عبدالمطلب[1] نے جواب میں کہا اللہ تعالیٰ نے جس کو زمین پر پیدا کیا ہے اسے آسمان پر محمود کرے اور عزت دے۔ یہ بظاہر مبہم سا جملہ غالباً لفظ "محمدؐ" کے معنی کی وضاحت کرتا تھا جس کے لغوی معنی ہیں محمود یا تعریف کیا گیا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بوڑھے عبدالمطلب صاحب بصیرت تھے اور مستقبل میں دیکھ سکتے تھے۔ بہر حال وجہ کچھ ہی ہو بچے کا نام "محمدؐ" قرار پا گیا۔ ایک ایسا نام جو اب تک مختلف صورتوں میں ان لاکھوں اور کروڑوں بچوں کا رکھا جا چکا ہے جو اس دین میں پیدا ہوئے، جو حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ کے اس عظیم فرزند کو قائم کرنا اور تمام دنیا میں پھیلانا تھا۔

بہر حال اس وقت کسی کے ذہن میں کوئی ایسا خیال نہ تھا۔ حضرت عبدالمطلب نے اپنے پوتے کے لئے اپنی پسند کا ایک تصوّراتی نام منتخب کیا تھا۔ ان کی اپنی شخصیت اتنی اہم تھی کہ جو چاہتے کر سکتے تھے۔ ادھر حضرت محمدؐ ایک ایسے بچے تھے جو اس دنیا میں کسی شے کو اپنا نہیں کہہ سکتے تھے۔ سوائے ایک ماں، چند اونٹ، چند بکریوں اور ایک وفادار حبشی لونڈی کے، اور ان کی والدہ بھی ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ شوہر کی وفات نے

---

[1] حضرت عبدالمطلب نے جواب دیا۔ "میری خواہش ہے کہ یہ بچہ خدا و مخلوق کے نزدیک آسمان پر بھی محمود ہو اور زمین پر بھی" (حیات محمدؐ)

حضرت آمنہ کو بے حد مغموم اور رنجیدہ کر دیا تھا اور اس سبب سے ان کا دودھ بھی ترش اور خشک ہو گیا تھا۔ ادھر مکہ کی مضرت رساں آب و ہوا بھی بچہ کی صحت پر بُرا اثر ڈال رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت محمدؐ سوائے اپنے بلند اور ارفع نام کے کبھی کسی اور بات پر فخر نہ کر سکیں گے اور اس کی بھی توقع کم ہی تھی۔ اگر بچے کی خوراک کا جلد کوئی بندوبست نہیں کیا گیا تو باپ کے بعد اس کا مر جانا بھی یقینی تھا۔ چنانچہ چند روز تک آپ کے چچا ابو لہب کی لونڈی ثویبہؓ[1] نے دودھ پلایا لیکن یہ ایک عارضی بندوبست تھا۔

شہر میں شدید گرمی کے باعث اہل مکہ کا یہ دستور تھا کہ خوشحال گھرانے کے بچوں کو دودھ پلوانے کے لئے وہ انہیں بدوی قبیلوں میں بھیج دیتے تھے۔ ایسی بدوی عورتیں جو ہمیشہ کھلی فضا میں رہنے کے سبب تندرست توانا ہوتی تھیں۔ سال میں دو مرتبہ مکہ شہر میں آتی تھیں اور امیر ماؤں کو اپنی خدمات پیش کرتی تھیں لیکن حضرت آمنہ امیر نہ تھیں۔ ادھر صحرا کی یہ عورتیں کسی کو مفت دودھ نہ پلاتی تھیں۔ یہاں تک کہ کسی بلند پایہ خاندان کے بچے کی دایہ گیری کی عزت حاصل کرنے کے لئے بھی وہ ایسا نہیں کرتی تھیں۔ حضرت آمنہ مایوس ہو گئیں۔ لیکن آخر کار انہیں سعدیہ قبیلہ کی ایک عورت جس کا نام حلیمہؓ تھا مل گئیں اور وہ حضرت محمدؐ کی پرورش کے لئے رضامند ہو گئیں۔ چنانچہ وہ لوگ ایک صبح اس بچہ کو جسے ایک دن تمام عرب کا حکمران بننا تھا، لے کر بنو سعد کی چراگاہوں کی طرف روانہ ہو گئے اور اس طرح حضرت محمدؐ بچپن ہی سے ایک صحرا نورد بن گئے۔

آپ پانچ سال تک بدوؤں کے سیاہ خیموں میں رہتے رہے۔ بنو سعد عرب کا ایک قدیم ترین قبیلہ تھا۔ وہ لوگ کافی طاقتور تھے اور ان کی چراگاہیں بھی بڑی وسیع تھیں۔ صحرا کے ان ہی بادیہ نشینوں کے درمیان آپ نے بولنا سیکھا اور چلنے کے لئے پہلے قدم اٹھائے، کسی کو کیا معلوم تھا کہ کسی وقت یہ ہی لوگ پہلے آپ سے جنگ آزما ہوں گے۔ پھر اطاعت اختیار کریں گے اور آخر کار آپ کے نام کو دنیا کے ان حصوں میں لے جائیں گے۔ جن کا نام بھی

---

[1] ثویبہ:۔ آپ کے چچا حضرت حمزہ بھی آپ کے ہم عمر ہی تھے۔ چنانچہ ثویبہ نے حضرت حمزہ کو بھی کچھ عرصے دودھ پلایا۔ اس طرح وہ آپ کے چچا بھی تھے اور رضاعی بھائی بھی۔

ان میں سے کسی نے اس وقت نہیں سنا تھا۔

حضرت محمدؐ کی ذہنی نشو و نما غیر معمولی نہیں تھی اور آپؐ اپنی عمر سے زیادہ کی بات نہیں کرتے تھے لیکن آپؐ کا دماغ اور جسم دونوں مستعد اور چاق و چوبند تھے۔ آپؐ اپنے ہمعصروں سے زیادہ جلدی چلنا سیکھے اور بولنا بھی نسبتاً آسانی سے سیکھ لیا۔ آپؐ کا ذہن چرواہوں کے عام بچوں سے زیادہ صاف اور واضح تھا۔ اور یہ معمول کے خلاف نہ تھا کیونکہ بہتر سے بہتر بدوی لوگ بھی شہریوں جتنے تیز فہم نہیں ہوتے۔ جونہی آپؐ کچھ بڑے ہو گئے آپ نے گدھے پر سواری شروع کر دی اور ایک چھوٹی کمان سے تیر چلانا بھی سیکھ لیا جو آپؐ کے رضاعی والدین نے آپ کو بنا دئے تھے۔

حضرت محمدؐ نے یہ تمام وقت صحرا کی کھلی فضا میں گذارا۔ خانہ بدوشوں کے ساتھ جو ہمیشہ نئی چراگاہوں کی تلاش میں گھومتے پھرتے ہیں آپؐ کا خیمہ شاید ہی کسی جگہ چند روز سے زیادہ رہتا ہو۔ آپؐ کی خوراک سادہ اور وہی ہوتی جو صحرا میں میسر آ سکتی تھی۔ یعنی اونٹنی کا دودھ چاول، کھجوریں اور کبھی کبھی بکری یا ہرن کا گوشت۔ کبھی کبھار صحرائی پرندے بھی مل جاتے تھے۔ آپؐ صبح ہوتے ہی اٹھ بیٹھتے اور رات کو جلدی ہی سو جاتے تھے۔ بدوؤں کی طرح آپ نے بھی آفتاب کی تعظیم، بارش کے لئے شکرانہ ادا کرنا اور آندھیوں اور بگولوں اور جھلستی سموم میں چہرے کو کپڑے سے ڈھانپ لینا سیکھ لیا تھا۔ آپؐ کو صحرا نشینوں کی قدیم اور پرانی کہانیاں بھی یاد ہو گئی تھیں اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کے اصول سے بھی واقف ہو گئے تھے۔ آپؐ نے وہاں پر جھگڑوں اور قضیوں کے فوری فیصلے بھی دیکھے اور قبیلہ میں سے کسی کو نکال دینا بھی جو سزائے موت کے مترادف ہوتا تھا اور چرواہوں اور شتربانوں کے ساتھ ان کے ریوڑوں اور گلوں کی نگہبانی بھی کی۔

جتنا عرصہ حضرت محمدؐ نے خانہ بدوشوں کی جفاکشانہ زندگی کے مکتب میں گذارا اس نے آپؐ کے مزاج اور طبیعت پر گہرا اثر چھوڑا۔ صحرا کا نقش انمٹ تھا کسی وقت کا صحرا نورد خواہ آئندہ زندگی میں کتنا ہی مقیم اور پابند کیوں نہ ہو جائے وہ کھلی فضا کی آزادی سیاہ خیموں کے گھر اور موسم کی اچانک تبدیلیوں سے مقابلے کو ہرگز نہیں بھول سکتا۔

حضرت محمدؐ کی آئندہ زندگی میں اس بدوی فطرت کا مظاہرہ بار بار ہوا۔

گو سعدیہ قبیلے کے بدو علانیہ طور پر یہ کہتے تھے کہ جب سے حضرت محمدؐ ان کے مہمان بن کر آئے ان کے دن پھر گئے ہیں لیکن دائی حلیمہ نے یہ مناسب خیال کیا کہ اب بچے کو اس کی ماں کے پاس پہنچا دینا چاہئے۔ چنانچہ جب آپؐ چھ[1] سال کے ہو گئے تو وہ آپؐ کو لے کر مکہ گئیں اور حضرت آمنہ کے سپرد کر دیا۔ حضرت آمنہ بچے کو پا کر بہت خوش ہوئیں اور اس کی صحت مند اٹھان کو دیکھ کر اظہار مسرت کیا۔ پھر انہوں نے طے کیا کہ بچے کو یثرب (مدینہ) لے جا کر اپنے عزیزوں سے مل آیا جائے تا کہ وہ بھی بچے کو دیکھ لیں۔ یثرب[2] (مدینہ) مکہ سے تقریباً دو سو میل دور ایک نخلستانی قبضہ تھا۔ یہاں ہی ان کے شوہر کا سات سال پہلے انتقال ہوا تھا۔ لیکن انہیں کیا علم تھا کہ ایک دن یہی شہر ان کے بیٹے کے نام پر مدینۃ النبی یعنی نبی کا شہر کہلائے گا۔ پر فریب صحرا میں یہ ایک طویل اور تھکا دینے والا سفر تھا۔ راستے میں باری باری کبھی سخت جمے ہوئے ریت کی تنگ گھاٹیاں عبور کرنا ہوتیں اور کبھی پتھریلے ویران اور لق و دق میدان سے گزرنا ہوتا تھا۔ بہر حال حضرت آمنہ اور برکہ[3] نے اپنے لئے ایک اونٹ اور زادِ راہ کا انتظام کیا اور ٹہنیوں کا گتھا ہوا ایک کجاوہ مع ایک سائبان لیا۔ جس میں وہ بچے کے ساتھ دھوپ سے محفوظ ہو کر بیٹھ سکیں۔ یہ انتظام کر کے وہ ہفتہ وار مکے سے شمال کی طرف جانے والے قافلوں میں سے ایک قافلے کے ساتھ ہو گئیں۔

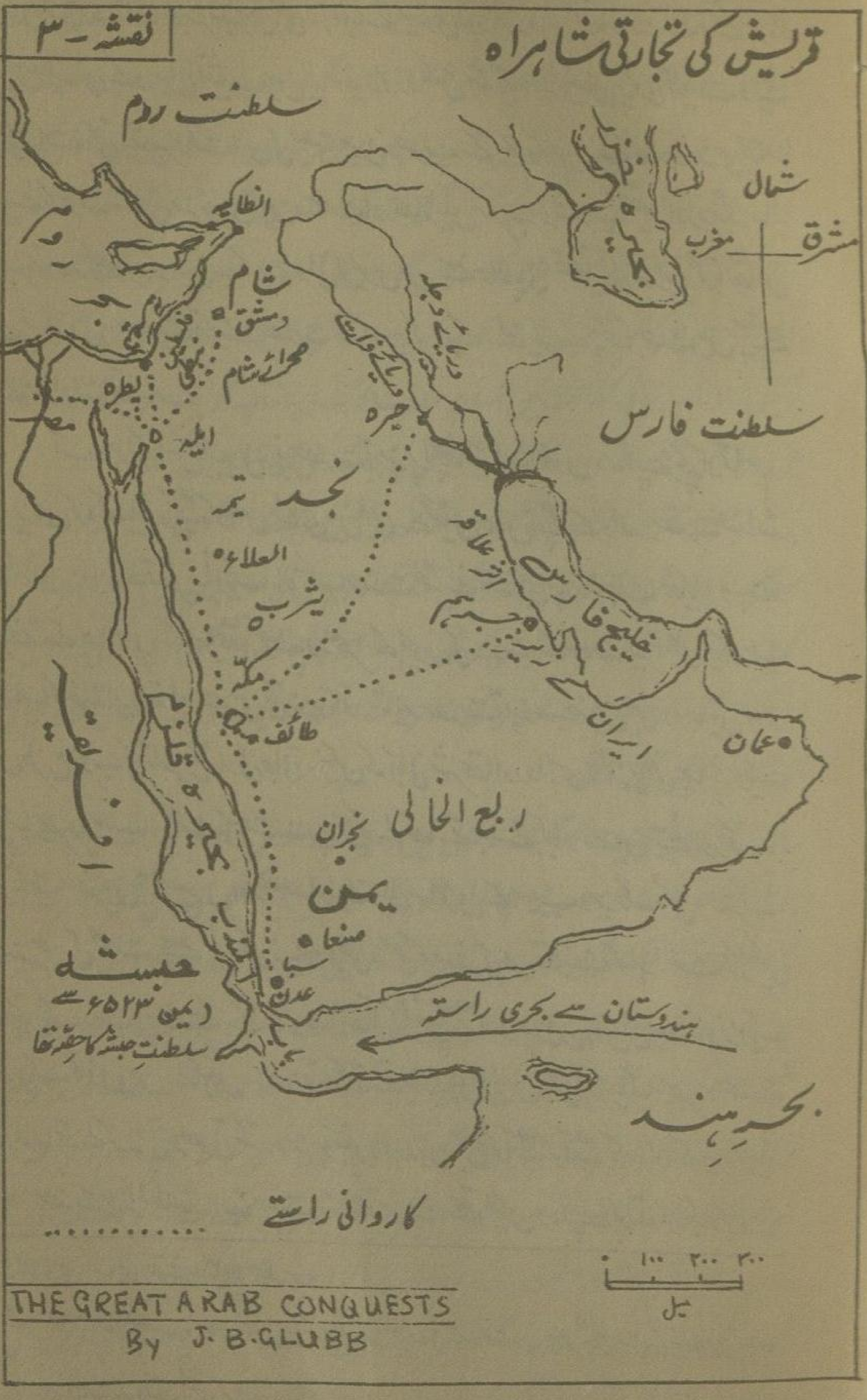
یثرب میں اتنا ہی آرام اور آسائش تھی جتنی صحرا اور مکہ میں تکلیف، چٹیل میدانوں نوکیلی پہاڑیوں اور جھلستی دھوپ میں خاکستری رنگ کے تپتے ہوئے مکانوں کی بجائے

---

[1] آپ پورے پانچ سال تک قبیلہ بنو سعد میں رہے۔ (حیات محمدؐ)

[2] یثرب:۔ مدینہ منورہ کا قدیم نام۔ رسول کریم کے وہاں پر تشریف لے جانے کے بعد سے مدینۃ النبی یا مدینہ منورہ کہلاتا ہے۔

[3] برکہ:۔ آپ کے والدین کی کنیز، جن کی کنیت ام ایمن تھی۔ بعد میں آپ نے ان کا نکاح اپنے سابق غلام اور منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہ سے کر دیا۔ اسامہؓ ان کے بطن سے تھے۔


نقشہ - ۳
قریش کی تجارتی شاہراہ
سلطنت روم
شمال
مشرق
مغرب
انطاکیہ
شام
دمشق
صحرائے شام
ایلہ
دریائے فرات
دریائے دجلہ
حیرہ
سلطنت فارس
نجد
تیمہ
العلاء
یثرب
مکہ
طائف
خلیج فارس
عمان
ربع الخالی
نجران
یمن
صنعاء
سبا
عدن
حبشہ
(یمن ۵۲۳ء سے
سلطنت حبشہ کا حصہ تھا
ہندوستان سے بحری راستہ
بحر ہند
کاروانی راستے
۱۰۰ ۲۰۰ ۳۰۰
میل
THE GREAT ARAB CONQUESTS
By J. B. GLUBB

یہاں نسبتاً ٹھنڈک اور سرسبزی تھی۔ لہلہاتے کھیتوں اور کھجوروں کے باغات سے ڈھکے ہوئے وسیع میدان کے درمیانی نشیب میں یہ سفید اور دلکش شہر آباد تھا۔ یہاں پر کوئی تکلیف دینے والی بات نہ تھی۔ نہ ہر وقت دن کی جلتی ہوئی دھوپ کے رحم و کرم پر رہنے کا ڈر اور نہ ہی پیاسا مرنے کا خوف۔ اس سرزمین میں درخت اور جھاڑیاں سرسبز و شاداب تھیں اور ہر جگہ سایہ میسر تھا اور کھیتوں کو سیراب کرنے والی نالیوں میں بہنے والا پانی قلقل کی صدا پیدا کرتا تھا۔ ان تین مسافروں (حضرت آمنہ، حضرت محمدؐ اور برکہ) کے لئے یثرب پہنچنا جنت میں پہنچنے کے مترادف تھا۔

آب و ہوا کی اس تبدیلی نے حضرت آمنہ پر اچھا اثر کیا۔ انہوں نے اپنے بچہ کو تمام عزیزوں کو دکھایا اور آپؐ کو اس مکان میں بھی لے گئیں جہاں آپؐ کے والد (حضرت عبداللہ) کا انتقال ہوا تھا۔ تقریباً ایک ماہ تک حضرت محمدؐ نے ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھایا، اپنے رشتے کے بھائیوں کے ساتھ کھیلے اور صحرا کے بچوں کی عادت کے خلاف تیرنا بھی سیکھ لیا۔ اگر آپ کا خاندان ابتداء سے ہی مکی نہ ہوتا تو شاید حضرت آمنہ مدینے میں ہی رہ جاتیں اور اس طرح عرب کی تاریخ بدل جاتی۔ لیکن مکہ آبائی شہر تھا اور واپسی ناگزیر تھی چنانچہ ایک مرتبہ پھر وہ سب اونٹ کی پشت پر ہچکولے کھاتے ہوئے کجاوے میں بیٹھے اور مکہ روانہ ہو گئے۔ سفر میں آندھیوں اور جھلسا دینے والی ہواؤں کے سبب دیر لگ گئی، حضرت آمنہ جن کی صحت پہلے ہی کچھ زیادہ اچھی نہ تھی، سفر کی ان تکلیف کو برداشت نہ کر سکیں چنانچہ ایک رات وہ راستے کے کنارے انتقال کر گئیں۔ برکہ (ام ایمن) ان کی میت کو نزدیک کے ایک گاؤں میں لے گئیں۔ جسے ابوا[1] کہتے تھے اور وہاں انہیں دفن کر دیا گیا۔ پھر وہ حضرت محمدؐ کو ساتھ لے کر روتی دھوتی مکہ روانہ ہو گئیں اور وہاں پہنچ کر آپؐ کو آپؐ کے دادا کے سپرد کر دیا۔ حضرت عبدالمطلب اب بہت بوڑھے[2] ہو چکے تھے لیکن وہ اپنے پوتے کو دیکھ کر خوش

---

[1] اسی باب میں نقشہ نمبر ۳ ملاحظہ ہو۔

[2] حضرت عبدالمطلب۔ عام الفیل یا مکہ پر ابرھہ کی چڑھائی کے وقت آپ کی عمر (۷۰) ستر سال کی بتائی جاتی ہے۔ اور وفات کے وقت (۸۰) اسّی سال کے تھے۔ "سیرت الرسول" ترجمہ حیاۃ محمدؐ"

ہوئے۔ دو سال تک یہ قابلِ احترام بزرگ اور یہ نوخیز لڑکے مل کر گھر کو سنبھالتے رہے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اب وہ زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکیں گے تو اپنے صاحبزادے ابوطالب کو بلایا اور حضرت محمدؐ کو ان کی سپردگی میں دے دیا۔ کچھ دیر بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ حضرت محمدؐ کو ایک مرتبہ پھر اپنا گھر تبدیل کرنا پڑا۔ آپؐ کی زندگی بہت ہی شدید قسم کے تضاد اور تبدیلیوں کا تسلسل بنتی جا رہی تھی، صحرا کے سیاہ خیمے، ماں کا معمولی سا گھر، یثرب کے باغات اور دادا کا ہر طرح کی آسائشوں والا مکان، یہ سب تبدیلیاں یکے بعد دیگرے بڑی تیزی سے آئیں۔ اور اب چچا کی کفالت میں آنے پر حضرت محمدؐ نے اپنے آپ کو ایک طرح کے تجارتی ادارے میں پایا جس کے ساتھ کعبہ کے مقدس فرائض کی بجا آوری بھی شامل تھی۔

حضرت عبدالمطلب نے کعبہ کے مقدس فرائض اپنے دو لڑکوں میں تقسیم کر دیئے تھے سقایہ یا چاہ زمزم کی سربراہی اور اس کے کھاری پانی کی حاجیوں میں تقسیم حضرت عباسؓ کو دی اور رفادہ (غریب حاجیوں کو کھانا وغیرہ بہم پہنچانے کا ٹیکس) کی وصولی اور اس کا انتظام حضرت ابوطالب کے سپرد کیا۔ شہر والے ایسے حاجیوں کو خدا کا مہمان سمجھ کر تواضع کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

صحرا میں حضرت محمدؐ ایسے ماحول میں رہے تھے۔ جہاں مظاہر قدرت کی پرستش ہوتی تھی۔ ستارے، سورج، چاند اور صحرائی طوفانوں کی تعظیم کی جاتی تھی۔ حضرت آمنہ کے ساتھ جتنا وقت گزارا اس میں غالباً آپؐ نے کبھی مذہب کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ لیکن دادا کے گھر پر رہ کر آپؐ نے جو رسومات دیکھیں وہ آپ کی سمجھ سے بالاتر تھیں بلکہ کچھ خوف پیدا کرنے والی تھیں۔ لیکن اب حضرت ابوطالب کے ساتھ رہ کر آپ کو عقائد اور مذہبی سیاست کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آپؐ تمام رسومات کو گہری نگاہ سے دیکھتے تھے اور لوگوں کی توہماتی کہانیوں کو سنتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے ان تمام باتوں کا صحرا نشینوں کے زیادہ سیدھے سادے خیالات اور عقائد سے مقابلہ کیا ہو لیکن ان باتوں میں کبھی آپؐ نے گہری دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ اب آپ دس سال سے کچھ ہی اوپر تھے اور اب آپؐ کے پاس کعبہ کے بتوں کا چاند سورج سے مقابلہ کرنے

کی بجائے سوچنے اور سمجھنے کے لئے اور بھی معاملات تھے۔ آپؐ اس وقت بھی بچوں کے ساتھ اسی طرح کھیلتے تھے۔ جس طرح سے دوسرے بچے ہمیشہ کھیلتے آئے ہیں۔ غالباً آپؐ نے ان بچوں کو وہ باتیں بتائی ہوں گی جو آپ نے صحرا میں رہ کر سیکھی تھیں اور اسی طرح آپ نے بہت سی وہ باتیں معلوم کی ہوں گی جو شہر کے بچے ہی جان سکتے تھے۔

لیکن آپؐ کو قرار نہ تھا۔ مکّہ کے ایک بچے کی حیثیت سے آپؐ نے کافی دنیا دیکھ لی تھی اور یہاں گلیوں اور اونچی اونچی عمارتوں کے درمیان اپنے آپ کو گھرا ہوا محسوس کرتے تھے۔ مکّہ کے گرد کی پہاڑیوں نے آپ کی نظر سے صحرائے عرب کے وسیع پھیلاؤ کو چھپایا ہوا تھا۔ باہر کی دنیا سے آپؐ کے رابطہ کا ذریعہ صرف کارواں تھے۔ جب بھی قافلے مکّے میں آتے حضرت محمدؐ ان کے استقبال کے لئے وہاں موجود ہوتے۔ آپؐ ان لوگوں کے تپتے ہوئے چہروں کو حیرت سے دیکھتے جو اتنے طویل صحرائی سفر کے خطرات کا مقابلہ کرتے تھے اور جب کوئی قافلہ روانہ ہونے کے لئے تیار ہوتا تب بھی آپؐ وہاں موجود ہوتے اور ان عربوں کے اس بے نیازانہ انداز پر رشک کرتے کہ وہ کس طرح بے خوف و خطر ایک انجانی دنیا کے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی آپؐ ان تاجروں اور شتربانوں سے بات چیت بھی کرتے اور ان سے چمکتے ہوئے صحرا کے دوسری طرف کی دنیا کے متعلق کافی معلومات حاصل کرتے کہ وہاں کے شب و روز کیسے ہیں۔ جوں جوں آپؐ کی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا توں توں آپؐ کا باہر جانے اور ان چیزوں کو بچشم خود دیکھنے کا اشتیاق بڑھتا گیا۔ آپؐ چاہتے تھے کہ خواہ آپ شتربان، تاجر یا سامان فروخت کرنے والے گماشتے ہی کیوں نہ بن جائیں لیکن کسی طرح باہر چلے جائیں اور ایک دن آپؐ کی یہ تمنّا پوری ہو گئی۔

حضرت ابو طالب کی مکّہ کے مقدس مقامات کے ایک متولی ہونے کے علاوہ اور بھی مصروفیات تھیں۔ وہ ایک جدید ترین کپڑے کی ایک بڑی دکان بھی چلاتے تھے اور عطریات کا بھی کاروبار تھا۔ قبل از اسلام کے عرب کپڑے کے بڑے شوقین تھے، اور بھینی بھینی خوشبو والے عطریات کو بہت پسند کرتے تھے۔ اپنے لئے بھی اور اپنی عورتوں کے لئے بھی۔ اس لئے حضرت ابو طالب کی تجارت بازار اور حرم دونوں جگہ تھی لیکن ان کی

کاروباری مصروفیات دکان تک ہی محدود نہیں تھیں۔ وہ فطری طور پر ایک سوداگر تھے، اور تجارتی قافلوں میں بھی بڑی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ جس کا آغاز ان کے دادا حضرت ہاشم نے کیا تھا۔ اکثر اوقات وہ خود قافلہ سالار ہوتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب حضرت ابوطالب ایک قافلے کو لے کر روانہ ہو رہے تھے۔ تو حضرت محمدؐ کا دل چاہا کہ وہ بھی کچھ دن کے لئے ان خاک آلود گلیوں سے نجات پائیں اور یہ دیکھیں کہ شمال اور جنوب کے ممالک کیسے ہیں۔

قافلوں کا آنا اور جانا اہل مکہ کی زندگی میں کافی اہم واقعات تصور کئے جاتے تھے۔ شوہروں چاہنے والوں، بیٹوں اور بھتیجوں کو خوش آمدید کہنے یا رخصت کرنے کے ہنگامے کے علاوہ ان میں مالی منفعت بھی ہوتی تھی۔ قریب قریب مکے کے ہر فرد کا کسی نہ کسی صورت میں کچھ نہ کچھ روپیہ ان ہزاروں اونٹوں، سینکڑوں افراد گھوڑوں اور گدھوں میں لگا ہوتا تھا جو کھالیں کشمش اور چاندی کی سلاخیں لے کر باہر جاتے تھے اور تیل عطریات اور مصنوعات شام اور مصر اور ایران سے اور گرم مصالحے اور سونا جنوب کی طرف سے لے کر آتے تھے، حضرت محمدؐ کا ان قافلوں میں کوئی اثاثہ نہیں لگا تھا لیکن اس کے باوجود ان کی دلچسپی کسی طرح سے کم نہ تھی۔

ایک صبح آپؐ حضرت ابوطالب کے ساتھ قافلوں کے پڑاؤ کی جگہ پر معمول سے کچھ زیادہ اشتیاق لے کر گئے۔ منڈی کے چوک میں بلبلاتے اونٹوں، خاموش گدھوں اور چلبلے اور تیز طرار گھوڑوں کے سبب ایک شور سا مچا ہوا تھا۔ عرب، شامی، ایرانی، حبشی اور عبرانی مختلف زبانوں میں بولتے ہوئے ایک دوسرے سے دھکم پیل کر رہے تھے۔ ابھی صبح کا اجالا ہونے میں کچھ دیر تھی اس لئے جلتی ہوئی مشعلیں جوش و خروش کے اس منظر میں اور اضافہ کر رہی تھیں۔ حضرت ابوطالب کی آمد اس بات کا نشان تھا کہ لوگ سامان کی آخری دیکھ بھال کر کے رستے اور تنگ کس لیں اور روانگی کے لئے تیار ہو جائیں جونہی حضرت ابوطالب اونٹ پر سوار ہونے لگے حضرت محمدؐ نے اچانک چچا کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہمرکابی کی اجازت چاہی۔ آپؐ کی التجا اتنی پرخلوص تھی کہ شفیق چچا مسکرا دیئے اور حضرت محمدؐ کو اپنے اونٹ پر بٹھا لیا اور قافلے کو روانگی کا اشارہ کر دیا۔ اس طرح حضرت محمدؐ بن عبداللہ

مکہ کی پناہ گاہ سے تیسری مرتبہ باہر جا رہے تھے۔

چند لمحے بعد ارغوانی صبح سارے صحرا میں پھیل گئی اور جونہی قافلہ آہستہ آہستہ مکہ کے پیالہ نما نشیب سے ابھرا جانوروں نے صبح کی ٹھنڈی ہوا میں گہرا سانس لیا اور حضرت محمدؐ نے جب اس نئے دن کو طلوع ہوتے دیکھا جو آپ کو ایک نئی دنیا کے قریب لے جا رہا تھا تو خود بھی کھلی ہوا میں خوشی اور اطمینان کا سانس لیا۔

اس پہلے سفر نے حضرت محمدؐ پر ایک گہرا نقش مرتسم کیا۔ صحرا کے چرواہوں کے ساتھ آپؐ کی صحرا نوردی آپؐ کو کہیں زیادہ دور نہیں لے گئی تھی اور آپؐ ہمیشہ ایسے علاقوں میں ہی رہے جہاں کنویں اور چھوٹی جھاڑیاں ہوتی تھیں لیکن اب آپؐ نے خود کو ایک وسیع صحرا میں پایا جہاں راستے کی ذرا سی غلطی کا نتیجہ پیاس سے مر جانا تھا۔ صحرا کی سطح بھی بالکل سمندر کی طرح وسیع اور ناپید اکنار تھی اور افق کے کنارے تک کوئی چٹان، جھاڑی یا درخت نظر نہ آتا تھا۔ ہوا اور دھوپ سے کوئی بچاؤ نہ تھا۔ یہ چقماق والی اور سبزے سے عاری پتھریلی سرزمین تھی جو ازمنہ تاریخ سے پیشتر کی آگوں سے جل کر سیاہ ہو گئی تھی اور ہمیشہ اڑتی اور رگڑتی ریت سے ہر کنکری ٹوٹ ٹوٹ کر چھوٹی اور چکنی ہو گئی تھی۔ شتربانوں کا کہنا تھا کہ یہ جنوں اور مافوق الفطرت مخلوق کا مسکن ہے اور صرف وہ ہی ان ابدی خاموش میدانوں میں رہ سکتے ہیں۔

سفر سست اور تھکا دینے والا تھا۔ اونٹوں کی روایتی چال کو تیز تر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شام کے وقت ایک جیسے اکتا دینے والے نظارے کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ گذشتہ رات جہاں سے چلے تھے وہاں ہی ہیں۔ اس لئے اس وقت بڑا اطمینان محسوس ہوا جب ایک شام چکا چوند پیدا کرنے والی ویرانی پیچھے رہ گئی اور جلد ہی کارواں اس علاقہ میں داخل ہو گیا جسے اب شرق اردن کہتے ہیں اور ایک جگہ پر جسے بُصریٰ[1] کہتے تھے پہلا طویل مقام کیا گیا۔

---

[1] بُصریٰ۔ آج بھی اردن کے شمال میں شام کی جنوبی سرحد پر واقع ہے اور بصرہ سے بالکل مختلف جگہ ہے جو عراق میں کویت کی سرحد کے نزدیک ہے۔ (ملاحظہ ہو نقشہ ۳)

بُصریٰ ایک تجارتی منڈی تھی جہاں یونانی تاجر عربوں سے سامان کے بدلے سامان کا تبادلہ کرتے تھے۔ صحرا کی کچی کھالوں، طائف کے نخلستانوں کی کشمش اور بنی سلیم کی کانوں کی چاندی کے عوض وہ کمخواب اور ریشمی کپڑا، گرم مصالحے، عطریات اور جواہرات دے جاتے تھے۔ یہاں پر ہر جگہ مصروفیت اور قہقہے تھے۔ گرمی اور پیاس کے تکلیف دہ سفر کے بعد یہاں پہنچنا ایسا تھا جیسے کوئی ڈراؤنے خواب سے جاگا ہو۔ حضرت محمدؐ دوسروں کی نسبت زیادہ خوشی محسوس کر رہے تھے۔ ہر چیز بالکل نئی اور غیر متوقع تھی۔ آپؐ مختلف قسم کے لوگوں سے بھی ملے۔ ایسے لوگ جن کی طرح کے لوگوں سے اس سے پہلے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور ایسے بھی جن کے خیالات ان لوگوں سے بالکل مختلف اور نئے تھے جن سے آپؐ کو اب تک واسطہ پڑا تھا۔

بُصریٰ کی منڈی کے نزدیک ہی نسطوری مسیحیوں کی ایک خانقاہ تھی وہ لوگ حضرت ابوطالب کو جانتے تھے اور انہوں نے ان کی اور ان کے بھتیجے کی تواضع اور آؤ بھگت کی۔ ایک راہب نے جس کا نام بحیرہ تھا۔ حضرت محمدؐ میں خاص دلچسپی لی۔ آپؐ کے متجسس ذہن، علم حاصل کرنے کے شوق اور آپؐ کے واضح خیالات نے اُسے بڑا متاثر کیا۔ بحیرہ[لہ] نے آپؐ کو عیسائیت

لہ سر ولیم میور۔ ڈریپر۔ مارگولیوس کہتے تھے کہ بحیرہ نے آپ کو عیسائیت کے اسرار و حقائق سکھائے اور اسلام کے تمام عمدہ اصول ان ہی نکتوں کے شروح و حواشی ہیں لیکن یہ سب غلط ہیں۔ روایت یہ ہے کہ بحیرہ قافلہ کو دیکھ کر خانقاہ کے باہر آیا اور حضرت ابوطالب کو بتایا کہ میں اس بچے میں وہ تمام نشانیاں دیکھتا ہوں جو آنے والے نبی مرسل میں ہوں گی تم اسے شام نہ لے جاؤ اگر یہودیوں نے دیکھ لیا تو آپؐ کے لئے خطرہ ہو سکتا ہے۔ بحیرہ نے یہ بھی بتایا کہ جب تم گھاٹی سے اتر رہے تھے تو اس نے دیکھا کہ راستے کے درخت اور پتھر جب سجدے کے لئے جھک گئے تھے۔ (سیرۃ النبی) کتب تواریخ میں مذکور ہے کہ راہب نے آپ میں وہ تمام نشانیاں دیکھیں جو عیسائیوں کی کتابوں میں لکھی تھیں اور اہل قافلہ کو نصیحت کی کہ وہ آپ کو شام نہ لے جائیں۔ مبادا یہودی علامات نبوت دیکھ کر آپؐ کو گزند پہنچائیں۔ البتہ آپ نے وہاں پر مسیحی پیشواؤں کے وعظ سنے۔ کتب سماویہ، مجوسیت اور مسیحیت کے بارے میں بھی بہت کچھ سنا۔ سفر کے دوران مناظر قدرت دیکھے۔ مدین اور وادی القریٰ اور دیار ثمود سے گزرے۔ اقوام سابقہ کی اللہ کی نافرمانی کا حشر دیکھا۔ سرسبز باغات دیکھے اور سینکڑوں نئی باتیں آپ کے علم میں آئیں اور آپ کے ذہن نے ان کو محفوظ کر لیا۔ دل میں آپؐ ضرور سوچتے تھے کہ ان کی تہ میں کیا حقیقت مضمر ہے۔ (حیاۃ محمدؐ)

کے متعلق کچھ باتیں بتائیں۔ بت پرستی کی مذمت کی۔ حضرت محمدؐ نے بڑی توجہ سے سنا۔ جو باتیں یہ شخص آپ کو بتا رہا تھا آپؐ کے لئے بالکل نئی اور انوکھی تھیں اور جو کچھ اب تک بتایا جاتا رہا تھا اس سے بالکل مختلف تھیں۔ ایک اور شخصیت جس نے اس سے پہلے اس قسم کی کچھ باتیں بتائی تھیں آپؐ کی حبشی دایہ برکہ تھی لیکن عیسائیت کے متعلق اس کی معلومات تحریف شدہ تھیں۔ اس لئے جو کچھ اس نے بتایا آپؐ اسے اچھی طرح نہیں سمجھ سکے۔ جو کچھ آپ نے اب سنا وہ بہت واضح اور صاف تھا۔ بتوں اور قدرتی مظاہر کی پرستش کے عقائد نے آپ کو اس طرح متاثر نہیں کیا تھا اور یہ خیال بڑا قوی۔ سچا اور مستقبل میں رہنمائی کرنے والا نظر آتا تھا۔

یہ بات قرین قیاس بھی نہیں کہی جا سکتی کہ اس وقت حضرت محمدؐ کسی مذہب یا اس کو اپنانے کے طریقوں کے متعلق کوئی خاص خیالات رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادھیڑ عمر تک کسی ایسی بات کا پتہ نہیں چلتا جہاں آپؐ نے کعبہ کے بتوں کی پرستش کے متعلق کسی سنجیدہ خیال یا رائے کا اظہار کیا ہو لیکن دوسری طرف آپؐ نسطوری راہب (بحیرہ) کی بتائی ہوئی باتیں بھی نہیں بھولے تھے۔ وہ سب آپؐ کے ذہن میں محفوظ تھیں اور جب وقت آیا تو آپؐ نے عیسائیت کی ان بنیادی باتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

یہ راہب بھی واحد شخص نہیں تھا جس نے اس وقت آپؐ کے ذہن میں ایک نیا خیال پیدا کیا ہو۔ مکّہ کے نواح کے میلوں میں عکاظ کا میلہ سب سے بڑا میلہ ہوتا تھا۔ آپس میں ایک دوسرے سے وسیع اختلافات کے باوجود یہاں پر توحید پرست یہودی اور عیسائی، بت پرست عرب اور آتش پرست ایرانی جمع ہوتے تھے۔ میلہ شروع ہوتے ہی دشمنی اور رقابت عارضی طور پر ختم ہو جاتی تھی۔ مذہبی رواداری کی ہر ایک سے توقع کی جاتی تھی۔ ذاتی جھگڑے ختم کر دیئے جاتے تھے۔ قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جاتا اور اولمپک کھیلوں کی سی فضا میں ہر قسم کے اختلافات بھلا دیئے جاتے تھے۔ کسی حد تک تجارت بھی ہوتی تھی لیکن میلے کی سب سے بڑی کشش مختلف النوع تماشے ہوتے تھے۔ وہاں پر ہر قسم کی تفریح مہیا ہوتی تھی — گھوڑ دوڑ۔ شاعری کے مقابلے۔ شراب نوشی اور رقص و سرود سے لے کر مذہبی وعظ و

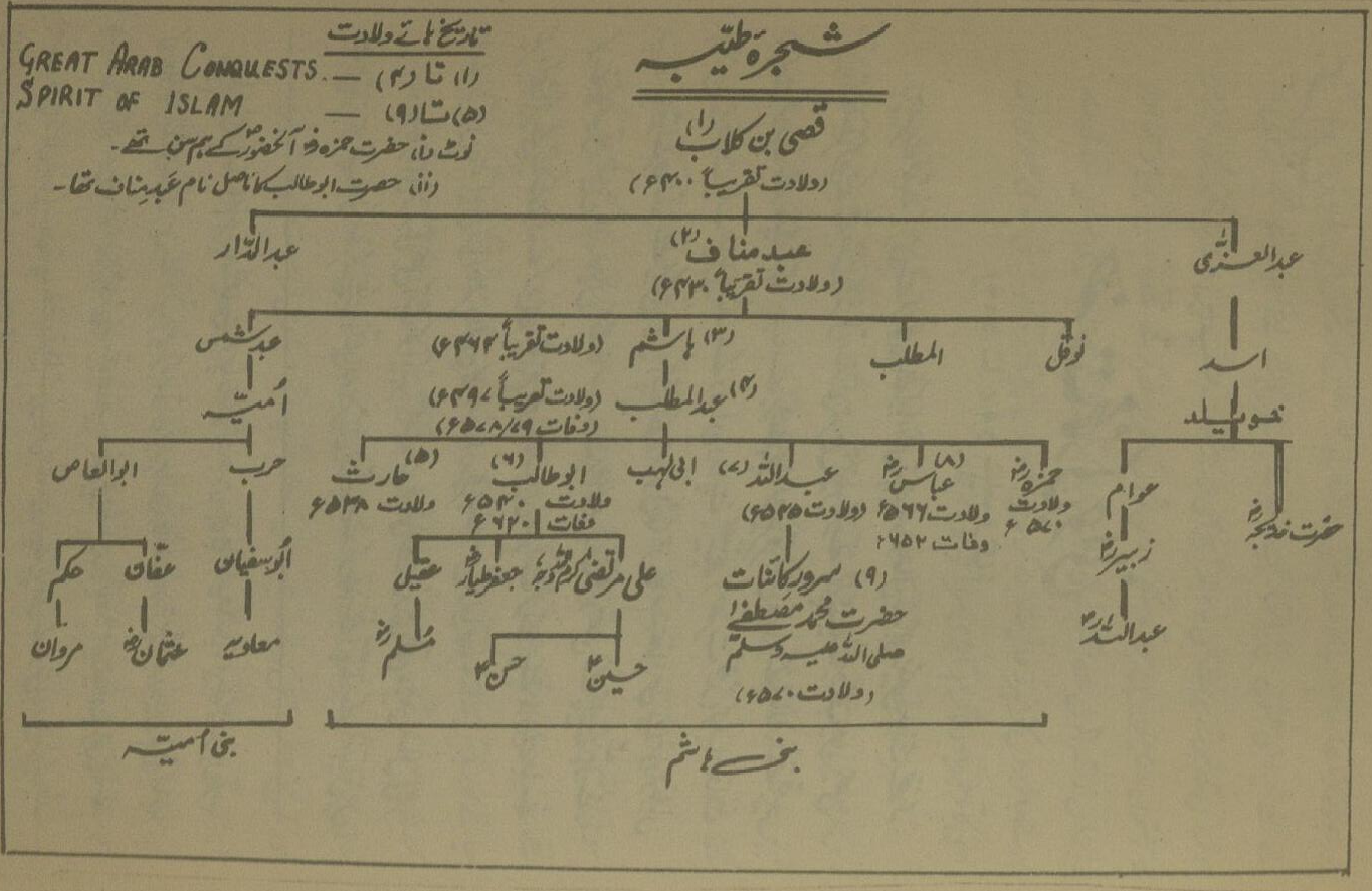
نصیحت تک، مذہبی تبلیغ کرنے والوں میں نجران کا عیسائی بشپ قسؔ ابن ساعدہ بھی ہوتا تھا۔ روزانہ اپنے بلند قامت اونٹ کی پشت سے وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کرتا اور گھنٹوں دنیا کی بے ثباتی اور آنے والی زندگی کے انعام و اکرام کا ذکر کرتا۔ حضرت محمدؐ نے اس کی تقریروں کے صرف کچھ حصے سنے لیکن بعد کے سالوں میں آپؐ نے بھی اپنے اونٹ کی پشت سے لوگوں کو بسا اوقات خطاب کیا اور آپؐ کے خطباتؔ میں اس عیسائی مبلغ کی بہت سی نصیحتیں شامل ہوتی تھیں۔

حضرت ابوطالب نے اس قسم کی باتیں پہلے بھی سنی تھیں لیکن وہ کبھی متاثر نہیں ہوئے۔ انہوں نے کبھی اس پر دھیان ہی نہیں دیا کہ یہ سب کچھ کیا ہے اور ان کا خیال تھا کہ ان کے بھتیجے بھی اُن ہی کی طرح کبھی اس پر زیادہ توجہ نہ دیں گے۔ اس خیال میں وہ کسی حد تک صحیح تھے۔ حضرت محمدؐ بھی عام لڑکوں کی طرح تھے اور اگر اس میں آپؐ نے کبھی ضرورت سے زیادہ اثر لیا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپؐ کے لئے ایک بالکل نئی بات تھی۔ اب پہلی مرتبہ آپؐ نے نئی دنیا کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ ایک ایسی سرزمین جہاں دھوپ تکلیف دہ نہ تھی اور بارش ایک معجزہ نہ تھا جس کے لئے یہاں سب دعائیں کرتے تھے اور وہ بھی معمولی بارش سے زیادہ کا تصور نہ ہوتا تھا۔ وہاں آپ نے

لہ اسلام کوئی نیا دین نہیں بلکہ پہلے ادیان اور دین ابراہیمی کی تکمیل ہے جس طرح حضرت موسیٰؑ کے لائے ہوئے دین کی تمام اچھی باتیں عیسائیت میں ضم ہو گئیں اسی طرح یہودیت اور عیسائیت کے تمام اچھے اصول اسلام میں اختیار کر لئے گئے لیکن یہ سب کچھ قرآن میں موجود ہیں۔ آنحضورؐ نے عیسائی مبلغوں یا یہودیوں سے نہیں سیکھا۔ اسی طرح آنحضورؐ کے خطبات میں پہلے مذاہب کی اچھی نصائح کا شامل ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن ان کا ماخذ قرآن ہے۔ انجیل یا توریت نہیں۔ آپؐ قسؔ بن ساعدہ اور دوسرے مبلغین کی تقریریں سنتے۔ ان کے دین کو بت پرستوں کے مشرب سے کہیں اچھا سمجھتے لیکن آپؐ کو ان پر بھی کامل اعتماد نہ تھا۔ آپؐ ان باتوں پر گھنٹوں غور کرتے۔ گویا آپؐ کو قدرت ایام طفولیت سے ہی اس طرح منصب رسالت کے لئے تیار کر رہی تھی۔ (حیاۃ محمدؐ)

سرسبز گھاس اور درخت دیکھے اور یہ بھی کہ آرام سے زندگی گذارنے والے اُن لوگوں سے زیادہ تعمیری کام کرتے تھے جن کی زندگی ہمیشہ ہی قدرتی آفات کا سامنا کرتے گزرتی تھی۔ وہاں آپؐ نے لوگوں کو حج، روپیہ اور کعبہ کی سیاست کے علاوہ اور موضوعات پر بھی باتیں کرتے سنا۔

حضرت محمدؐ کسی اسکول یا مکتب میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے لیکن حقیقت میں آپؐ ان لوگوں سے زیادہ اچھی تعلیم حاصل کر رہے تھے جو اپنا وقت مکتب یا مدرسہ میں بیٹھ کر گزارتے ہیں اور آپؐ کو کسی مکتب میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش بھی نہ تھی۔ آپؐ نے مہم جوئی کا ذائقہ چکھ لیا تھا۔ اور مزید کے خواہاں تھے۔ اگر کسی شخص کی یہ تمنا پوری ہوئی تو وہ حضرت محمدؐ تھے۔ مکّہ کے بت خانے کے ہاشمی متولیوں کے وارث ؎


شجرۂ طیبہ
تاریخ ہائے ولادت
GREAT ARAB CONQUESTS. — (۱) تا (۴)
SPIRIT OF ISLAM — (۵) تا (۹)
نوٹ (i) حضرت حمزہؓ آنحضورؐ کے ہم سن تھے۔
(ii) حضرت ابوطالب کا اصل نام عبدِمناف تھا۔
قصی بن کلاب (۱)
(ولادت تقریباً ۴۰۰ء)
عبدالدار
عبد مناف (۲)
(ولادت تقریباً ۴۳۰ء)
عبدالعزیٰ
عبد شمس
ہاشم (۳)
(ولادت تقریباً ۴۶۴ء)
المطلب
نوفل
اسد
امیہ
عبدالمطلب (۴)
(ولادت تقریباً ۴۹۷ء)
(وفات ۷۹/۵۷۸ء)
خویلد
حرب
ابوالعاص
حارث (۵)
ولادت ۵۳۸ء
ابوطالب (۶)
ولادت ۵۴۰ء
وفات ۶۲۰ء
ابی لہب
عبداللہ (۷)
(ولادت ۵۴۵ء)
عباس رضؓ (۸)
ولادت ۵۶۶ء
وفات ۶۵۲ء
حمزہ رضؓ
ولادت ۵۷۰ء
عوام
حضرت خدیجہ رضؓ
ابوسفیان
عفان
حکم
عقیل
جعفر طیارؓ
علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ
(۹) سرور کائنات
حضرت محمد مصطفیٰ
صلی اللہ علیہ وسلم
(ولادت ۵۷۰ء)
زبیر رضؓ
عبداللہ رضؓ
معاویہ
عثمان رضؓ
مروان
مسلم رضؓ
حسن ؑ
حسین ؑ
بنی امیہ
بنی ہاشم

تیسرا باب

حضرت محمدؐ کی جوانی

(۵۸۶ تا ۵۹۷ عیسوی)

حضرت محمدؐ نے تیزی سے لڑکپن طے کیا۔ ابھی آپؐ سولہ سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ آپؐ اتنا سفر کر چکے تھے جتنا اکثر مکّی ساری عمر میں نہیں کرتے۔ آپؐ ایک[1] جنگ میں بھی شرکت کر چکے تھے۔ آپؐ کے سب سے بڑے چچا الزبیر قریش کے سالار تھے قبیلہ ہوازن کے خلاف ایک طویل جنگ کے دوران وہ اپنے بھتیجے (حضرت محمدؐ) کو بسا اوقات اپنے ساتھ لے جاتے تھے لیکن وہاں آپؐ کے ذمہ کوئی خاص کام نہ تھا اس لئے خود کو نمایاں کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ وہاں آپؐ کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ دشمن کے پھینکے[2] ہوئے تیر اکٹھا کر کے چچا کے حوالے کر دیں۔ تاہم اس جنگ میں شرکت کر کے اپنے مدرسے جانے والے لڑکوں سے کہیں زیادہ عمر والوں کا ایک اور تجربہ حاصل کر لیا تھا۔

ادھر کاروانی زندگی بھی آپؐ کو ایک صحت مند خوشی عطا کر رہی تھی۔ بیس سال کی عمر سے پیشتر ہی آپؐ کافی سفر کر چکے تھے اور ہر میل جو آپ طے کرتے تھے آپؐ کے اشتیاق میں

۱؎ ۲؎ اس جنگ کا نام حرب الفجار ہے جو چار سال تک جاری رہی چونکہ یہ جنگ پناہ کے مہینوں میں عرب کی روایت کے خلاف ہوئی اس لئے حرب الفجار کہلائی۔ یہ قبیلہ ہوازن (طائف) اور قریش کے درمیان ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں آپ کے ایک سے زیادہ چچا شریک تھے اور آپ نے خود بھی جنگ میں باقاعدہ حصہ لیا اور تیر بھی چلائے بعثت سے چند سال بعد ایک دن آپ نے خود فرمایا: "میں اس جنگ میں اپنے چچاؤں کے دوش بدوش شریک جنگ تھا۔ میں نے تیر بھی چلائے۔" (حیاۃ محمدؐ)

اور اضافہ کرتا تھا۔ تمام عرب کا سفر۔ یمن[1] سے شام اور فلسطین اور شمال میں ایران کی جانب۔ آپؐ کے لئے ایسا ہی معمول بن گیا تھا۔ جیسے آپؐ کے ہمعصر حج کے لئے کعبہ جاتے تھے۔ ٹرکوں اور موٹروں کے ہوتے ہوئے بھی یہ سفر آج بھی بڑے مشقت طلب ہیں۔ حضرت محمدؐ کے زمانے میں یہ ہفتوں اور مہینوں میں ہوتے تھے اور ان لوگوں کو جو یہ سفر کرتے تھے شدید ترین موسم اور ڈاکوؤں اور قزاقوں سے مقابلے کی سکت پیدا کرنا ہوتی تھی اور اپنے قیمتی سامان سے لدے ہوئے جانوروں کو بخیر و عافیت لے کر منزل مقصود پر پہنچنا ہوتا تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں کسی کا تاجر یا سوداگر ہونا بڑی مردانگی کا کام تھا۔

حضرت محمدؐ نے جلد ہی چچا کے علاوہ دوسرے تاجروں کی نمائندگی کا کام بھی سنبھال لیا۔ اس عرصہ میں وہ اپنی محنت اور دیانت کے لئے مشہور ہو گئے۔ اور ابھی آپؐ پچیس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ آپؐ مغربی عرب کے ایک نہایت سرگرم اور ہوشیار تجارتی نمائندے بن گئے تھے۔

البتہ جہاں آپؐ دوسرے تجارت پیشہ لوگوں سے مختلف تھے وہ یہ بات تھی کہ آپؐ سوتی، ریشمی کپڑے، شکر اور چاول کی خرید و فروخت کے علاوہ اور باتوں میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ جب دن کا کام ختم ہو جاتا تو آپؐ منڈی کے چوک میں یا کسی دوست کے مکان میں بیٹھ جاتے اور باتیں سنتے۔ وہاں گوئیے، داستان گو، اور شاعر ہوتے۔ بعض فلسفی لوگ آپس میں بحث مباحثہ کرتے اور مذہبی لوگ اپنے اپنے دین کی تبلیغ کے لئے وعظ و نصیحت کرتے تھے۔

سفر کے بعد سفر ہوتے رہے اور حضرت محمدؐ ایشیا کے اِن علاقوں کے مذاہب، روایات اور تاریخ کا علم حاصل کرتے رہے۔ اس کے علاوہ آپؐ نے دنیاوی فراست بھی حاصل کی جو ایسے لوگوں کا معمول اور خاصہ ہوتا ہے جو ہر وقت سفر میں رہتے ہیں خواہ وہ سفر اونٹوں پر ہو یا بیل گاڑی میں یا موجودہ زمانے کی شورلیٹ کاروں میں جو شخص بھی آپؐ کی سوانح حیات کا مطالعہ کرتا ہے آپؐ کی عقل سلیم مشعل کی طرح نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے حضرت محمدؐ

---

[1] نقشہ نمبر ۳

ہمیشہ اپنے سے آگے آنے والے زمانہ کی شخصیت ہونے کا تاثر دیتے ہیں۔ کئی مواقع ایسے آتے ہیں جہاں آپؐ کے فتوے اور فیصلے اور روزانہ کے مسائل کا حل اپنے جدید ہونے پر حیران کر دیتا ہے۔ زندگی کے متعلق آپؐ کا تمام تر نظریہ اس زمانے اور ان لوگوں سے بہت آگے نظر آتا ہے جن میں آپؐ رہتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمدؐ کے بیرونی مقامات اور وہاں کے لوگوں سے تعلقات نے آپ کو غور و فکر کا موقعہ دیا۔ دوسرے انبیاء کے برعکس آپؐ کے خیالات صرف مذہب اور روحانیت تک ہی محدود نہ تھے۔ آپؐ نے دنیا اور اس کے مسائل کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھا تھا۔ چنانچہ جب آپؐ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے لگے تو آپ نے مذہب کی تعمیر میں واقفیت اور عملی زندگی کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ آپؐ نے اپنے لوگوں کو اپنے پیشرو ایونجلیسٹ[1] حضرات کی طرح نجات کے انجانے راستوں پر ڈال دینے کی غلطیوں سے احتراز کیا۔ حضرت محمدؐ کے راستے اور طریق کار وہی تھے جو ایک سفری گماشتے کے ہوتے تھے اور ان کے جانے پہچانے تھے۔ آپؐ نے اپنی اُمت کو انہی راستوں پر ڈالا۔ لیکن کارواں کے ساتھ اللہ کو بھی شامل کر دیا اور جنت کو اس کارواں کی آخری بڑی منڈی قرار دیا۔

لیکن جہاں حضرت محمدؐ کا ذہن اور جسم بتدریج پختہ ہو گئے وہاں آپؐ کچھ زیادہ سرمایہ جمع نہ کر سکے۔ غالباً آپؐ کو تنخواہ ملتی تھی اور کچھ کمیشن بن جاتا تھا لیکن آپؐ کو خوشحال نہیں کہا جا سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ روپیہ اور دولت آپؐ کے لئے کوئی کشش بھی نہیں رکھتے تھے اور ایسے مواقع بھی آئے جب آپؐ دوسروں کے ساتھ مل کر سفر کرتے کرتے اکتا جاتے اور تنہائی کے خواہاں ہوتے لیکن چونکہ گزراوقات کے کسی ذریعہ

---

[1] ایونجل EVANGEL انجیل لکھنے والے چار عیسائی بزرگ میتھیو MATHEW مارک MARK لوقا LUCAS اور جان (یوحنا) ان چاروں نے علیحدہ علیحدہ انجیل لکھی ہیں۔ یہ چاروں عیسائیت میں بڑے محترم بزرگ شمار ہوتے ہیں۔

کے بغیر آپؐ اس خواہش کی تکمیل نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے کبھی کبھی آپؐ عارضی طور پر جانور چرانے کے کام پر لگ جاتے تھے۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ کی طرح آپؐ بھی صحرا میں طویل وقفوں کے لئے غائب ہو جاتے۔ ہفتوں ہو جاتے، ریوڑ کو ہانکتے رہنے کے علاوہ آپؐ کے ذہن میں اور کوئی بات نہ آتی۔ سالوں بعد اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا۔

"تحقیق اس دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا جس نے گلہ بانی نہ کی ہو۔"

لیکن خواہ دمشق میں عطریات یا قالینوں کی تجارت ہو یا صحرا کی خاموشیوں میں بھیڑ بکریوں کی رکھوالی۔ آپؐ کے کردار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپؐ کی دیانت داری، آپؐ کی صداقت اور نیک صفات ہمیشہ بے داغ رہیں۔ بہت پہلے سے ہی آپؐ کے دوست آپؐ کو 'الامین' کہہ کر خطاب کرتے تھے جس کے معنی امانت دار اور لائق اعتماد ہیں۔ عورت کا جادو بھی آپؐ پر نہیں چل سکا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ عفت اور پاکدامنی[1] کے متعلق آپؐ کے کوئی مخصوص نظریات تھے۔ بس عورتوں سے آپؐ کو کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن مجالس اور نجی صحبتوں میں آپؐ بڑے گھل مل کر شریک ہوتے۔ بڑے حاضر جواب تھے اور آپؐ کی خوش گفتاری نے آپؐ کو بڑا ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ لباس کے معاملہ میں بھی آپؐ ہمیشہ قاعدے اور قرینے کا بڑا خیال رکھتے تھے۔

سفر کے دوران اور کیمپ میں تو آپ کو حالات سے مطابقت کرنا پڑتی تھی لیکن گھر پر آپؐ اپنی شکل و صورت درست رکھنے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ آپؐ سر پر بڑی احتیاط سے عمامہ باندھتے اور اس پر تیلسان یا بڑا رومال ڈال لیتے تھے جو عمامہ کے ساتھ پیشانی کے کچھ حصے کو بھی ڈھانپ لیتا تھا۔ آپؐ کی قبا اور عبا دونوں بہت صاف ستھری ہوتی تھیں۔ اور گو بعد میں آپ نے سبز، زرد اور سرخ رنگ کی قبائیں بھی زیب تن کیں لیکن آپؐ کا بنیادی لباس ہمیشہ سفید ہی رہا۔

میلے دانت والوں سے آپؐ کو ایک خاص قسم کی وحشت ہوتی تھی۔ آپؐ کے اپنے

---

[1] اس وقت بھی آنحضورؐ کے نزدیک عفتؔ اور حیا عورت کا سب سے بڑا زیور تھے۔

دانت بے حد چمکدار لیکن کچھ غیر معمولی تھے۔ گو سب برابر اور ایک جیسے تھے لیکن وہ آرے کے دندانوں کی طرح ایک دوسرے سے الگ تھے لیکن صرف یہ بات کہ آپؐ کے دانت قدرتی طور پر اچھے تھے کافی نہیں تھی بلکہ ان کو صاف ستھرا رکھنے کا آپ کو بے حد خیال تھا۔ آپؐ جہاں بھی جاتے خلال اپنے ساتھ رکھتے تھے اور چند خلال تو آپؐ ہمیشہ اپنے بستر کے قریب ہی رکھتے تھے اور ان کو لئے بغیر کبھی سفر نہ کرتے تھے۔

آپؐ کے مضبوط سفید دانت آپؐ کے باقی اعضاء اور جسم سے مطابقت رکھتے تھے آپؐ کا قد میانہ جسم سڈول اور مضبوط، شانے چوڑے اور کولہے پتلے تھے۔ آپؐ کی ہڈیوں پر ضرورت سے زیادہ گوشت نہ تھا بلکہ اس کے خلاف دبلے پن کی طرف مائل تھے۔ آپؐ ایک ایسے شخص کی طرح تیز تیز چلتے تھے جو جانتا ہو کہ اسے کہاں جانا ہے اور وہاں جلد از جلد پہنچنا چاہتا ہو۔ آپؐ کا سر بڑا اور خوبصورت اور گردن صراحی دار اور پتلی تھی۔ آپؐ کے بال چمکدار، سیاہ اور گھنگریالے تھے۔ آپؐ لمبے بال رکھتے تھے اور بعض اوقات تو وہ لہراتی ایال کی طرح شانوں تک پہنچتے تھے۔ آپؐ کی پلکیں گھنی اور آنکھیں بڑی، سیاہ اور ہر وقت گردش کرنے والی تھیں۔ آپؐ کی داڑھی جو بعد میں عمر کے ساتھ بڑھتی گئی، سیاہ اور گھنگریالی تھی۔ مونچھیں کتری ہوئی ہوتی تھیں اور آپؐ کا خوبصورت دہن، جو ایک تازہ پکے اور ترشے ہوئے انار کی طرح سرخ تھا، صاف نظر آتا تھا۔ ناک عرب کے شرفا کی طرح پتلی اور سامی النسل ہونے کے سبب آگے سے کچھ خمدار تھی۔ آپؐ کا چہرہ کتابی اور گلاب کی مانند تھا اور جلد بالکل عورتوں کی جلد کے مانند نرم اور صاف تھی۔ اور تمام عربوں کی طرح آپؐ کے ہاتھ پاؤں چھوٹے اور خوبصورت تھے۔

البتہ دو باتوں میں حضرت محمدؐ جسمانی طور پر دوسرے لوگوں سے مختلف تھے۔ ایک تو یہ کہ خوبصورت محراب دار بھنووں کے درمیان، جو ایک دوسری کی طرف بڑھتی نظر آتی تھیں لیکن ملتی نہ تھیں، خون کی ایک رگ بڑی نمایاں تھی اور جب کبھی آپؐ خفا ہوتے تو وہ سیاہ پڑ جاتی اور تیزی سے دھڑکنے لگتی۔ دوسرے یہ کہ آپؐ کی پشت کے درمیان شانوں سے ذرا اوپر ایک بڑا لہسن تھا جو کبوتر کے انڈے جتنا بڑا تھا۔ مسلمان اِسے

مُہرِ نبوت[1] کہتے ہیں۔ حضرت محمدؐ نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ آپؐ کو نظر نہ آتی تھی اور اگر کبھی اس کا ذکر بھی کیا تو نبوت سے اس کا کوئی تعلق نہیں بتایا۔

جب کبھی آپؐ ہنستے تو دل کھول کر ہنستے تھے۔ آپؐ خوش ہوتے تو اپنی خوشی کو نہ چھپاتے لیکن آپؐ کا سب سے بڑا حسن آپ کی مسکراہٹ میں پوشیدہ تھا اور مسکرانے میں آپؐ کے دہن و رخسار کے سکڑنے کا انداز اتنا دلفریب تھا کہ آپؐ کا سخت ترین دشمن بھی آپؐ سے جھگڑنے سے پہلے ایک دفعہ تو رُک جاتا تھا۔

آپؐ کا مصافحہ بھی اتنا ہی حقیقی اور پر تپاک ہوتا جتنی آپ کی ہنسی۔ آپؐ بڑھائے ہوئے ہاتھ کو بڑی گرمجوشی سے پکڑنے اور چھوڑنے میں کبھی پہل نہ کرتے۔ آپؐ نے ساری زندگی میں کسی دوست سے بے وفائی نہیں کی۔ بچوں اور جانوروں سے دلی لگاؤ تھا۔ جب آپؐ چلتے تو چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیاں ہمیشہ آپؐ کے گرد جمگھٹا کر لیتے تھے۔ آپؐ نے اپنے پیروکاروں کو بے زبان جانوروں سے بدسلوکی کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔

لیکن اس تپاک اور گرمجوشی کے باوجود آپؐ کم گو تھے۔ یعنی آپؐ میں عربوں کی وہ اچھی صفت موجود تھی کہ صرف اس وقت بات کی جائے جب کرنے کے لئے کوئی بات موجود اور گفتگو ضروری ہو۔ آپؐ نے فرمایا کہ اچھے مسلمان کی خوبی یہ ہے کہ غیر ضروری باتوں پر بحث و تمحیص سے بچے۔

لیکن ان تمام صفات اور ایک اچھے خاندانی پس منظر کے باوجود پچیس سال کی عمر تک

---

[1] طبری نے ابو زیدؓ سے روایت کی ہے کہ مُہرِ نبوت بالوں کا ایک گچھا تھا جو دونوں شانوں کے درمیان تھا۔ ابو زیدؓ نے اس لہسن یا نشان کو چھو کر اور دبا کر بھی دیکھا تھا۔ ابو نضرۃ سے مروی ہے کہ مُہرِ نبوت ابھرے ہوئے نرم بال تھے۔ دونوں شانوں کے درمیان) تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب کے مؤلف نے لکھا ہے کہ بحیرہ کے راہب نے جہاں اور نشانیاں دیکھیں وہاں آپؐ کے شانوں کے درمیان اس نشان کو دیکھ کر بھی آپؐ کے نبی آخرالزماں ہونے کی تصدیق کی اور آپؐ کو یہودیوں سے بچائے رکھنے کے لئے کہا لیکن مصنف کے قول کے مطابق یہ آپؐ کے نبی ہونے کی کوئی بڑی نشانی نہ تھی

ایسے کوئی آثار نہیں تھے کہ حضرت محمدؐ کبھی بھی ایک قابلِ اعتماد سفری گماشتے یا کسی ایسے گلے بان سے زیادہ کچھ بن سکیں گے۔ جس پر یہ اعتماد کیا جا سکے کہ وہ مالک کے ریوڑ کے ساتھ صحرا میں غائب نہیں ہو جائے گا۔ اہلِ مکہ کی نظر میں آپؐ ایک خوش خلق باصلاحیت اور ایک بلند تر درجہ کے نوجوان تھے جن کے اخلاق اکثر لوگوں سے بہت اچھے تھے۔ آپؐ کے ایک دوست کا کہنا ہے کہ آپؐ پردہ میں رہنے والی ایک دوشیزہ سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔ کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا کہ کبھی کوئی غیر معمولی کام آپؐ سے عمل میں آیا ہو اور غالباً یہ اس لئے کہ اب تک آپؐ کو کبھی کوئی نمایاں کام کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور مندرجہ ذیل واقعہ جو آپؐ کی عقل و فراست کی ایک مثال کے طور پر اکثر پیش کیا جاتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ حضرت محمدؐ اپنے شہر والوں کے مقابلے میں زیادہ سمجھ بوجھ کے مالک تھے۔

ایک مرتبہ مکے کی پہاڑیوں پر سخت بارشوں کے سبب بے پناہ سیلاب نے کعبہ کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔ اس کی بنیادیں ہل گئیں اور اس کے ایک بڑے حصّے کی ازنو تعمیر ناگزیر ہو گئی[1]۔ کچھ سنجیدہ غور و فکر کے بعد چند منتخب قریش نے کدال اور پھاوڑے سنبھالے اور کام شروع کر دیا۔ ایسا کرنے میں کوئی غضبِ الٰہی ان پر نازل نہیں ہوا اور حجرِ اسود کو بھی اس کی جگہ سے نکال لینے میں کوئی آفت نہ آئی۔ لیکن جب اس کو دوبارہ اس کی جگہ پر رکھنے کا مرحلہ آیا تو ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ یہ عزت کسے ملنی چاہیے۔؟ کعبہ کے اس مقدس ترین نشان کو چھونے اور اس کو اس کی جگہ پر دوبارہ رکھنے کی خصوصی سعادت کا مستحق کون ہو؟

جب اس جھگڑے کا کوئی اطمینان بخش حل تلاش نہ کر سکے تو کسی نے تجویز پیش کی کہ جو

---

[1] ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک خاتون نے کعبہ کی دیوار کے نزدیک بخورات جلائے اور کعبہ کے غلاف میں آگ لگنے کے سبب سارا کعبہ جل گیا اور دیواروں میں شگاف پڑ گئے۔ اس وقت کعبہ پر چھت نہ تھی۔ لیکن اجماع اس پر ہے کہ شدید سیلاب کے سبب کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچا تھا۔

(مترجم)

بھی بیت اللہ کے صحن میں سب سے پہلے[1] داخل ہو اس سے مشورہ طلب کیا جائے۔ اس پر سب متفق ہو گئے اور سب کی نگاہیں دروازے پر لگ گئیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد حضرت محمدؐ چلتے پھرتے وہاں آ نکلے۔ فوراً سب نے آپ کو خوش آمدید کہا اور معاملہ آپؐ کے سامنے پیش کر دیا۔ ایک لمحہ سوچنے کے بعد آپؐ نے اپنی چادر یا عبا اتاری اور زمین پر پھیلا دی۔

"اس کو (حجر اسود) اٹھا کر میری چادر پر رکھ دو۔" آپؐ نے تجویز پیش کی "پھر آپ میں سے ہر ایک اس کا کونا پکڑے اور سب مل کر اسے اٹھا لیں۔ اس طرح آپ سب حجر اسود کو اس کی جگہ پر رکھنے کی سعادت میں شریک ہو جائیں گے۔" لوگوں نے ایسا ہی کیا اور جب پتھر کو کعبہ کی دیوار تک لے آیا گیا۔ تو اس سے پہلے کہ کوئی اور جھگڑا شروع ہو جائے۔ آپؐ نے حجر اسود کو اٹھا کر اس کی خالی جگہ میں پیوست کر دیا۔

خواہ یہ حل کتنا ہی آسان کیوں نہ تھا۔ اس نے حضرت محمدؐ کو اکابر قریش کی نظروں میں بلند کر دیا۔ عرب بڑی جلدی طیش میں آجاتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ حجر اسود کے اس معمولی جھگڑے پر لڑائی[2] ہو جاتی اور پھر قتل و خونریزی تک نوبت پہنچ جاتی۔ حضرت محمدؐ نے اس سے بچا دیا۔

بایں ہمہ ایک طرح سے آپؐ کی زندگی ایک گمنامی کا سا معمول بنتی جا رہی تھی اور

---

[1] تجویز یہ تھی کہ کل صبح جو سب سے پہلے حرم میں داخل ہو اس کے فیصلے کو تسلیم کر لیا جائے۔ حسن اتفاق سے دوسری صبح آنحضرت سب سے پہلے کعبہ کے صحن میں داخل ہوئے۔ اہل مکہ نے فوراً یہ معاملہ آپؐ کی ثالثی کے لئے پیش کر دیا۔ (سیرۃ النبی۔ حصہ اوّل)

[2] جھگڑا شروع ہو کر تلواریں کھنچ گئی تھیں اور کئی دعویداروں نے دستور کے مطابق خون کے پیالے میں انگلیاں ڈبو کر قسمیں کھائی تھیں کہ وہ کسی دوسرے کو ہاتھ نہ لگانے دیں گے۔ چار روز تک جھگڑا چلتا رہا۔ یہ دیکھ کر پانچویں روز اکابر نے ثالثی کی تجویز پیش کی اور رسول اللہ نے سب کو اس سعادت میں شامل کر کے یہ خون آشام جھگڑا خوش اسلوبی سے ختم کر دیا۔

(سیرۃ النبی۔ حصہ اوّل)

اس گمنام معمول سے ابھرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ لیکن جب آپؐ پچیس سال کے ہو گئے تو ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا جس نے نہ صرف آپؐ کی ساری زندگی بدل کر رکھ دی۔ بلکہ بالواسطہ طریقہ پر ساری دنیا پر دور رس اثرات مرتب کئے۔

اس وقت مکہ میں ایک ادھیڑ عمر کی خاتون حضرت خدیجہؓ بنت خویلد رہتی تھیں زیادہ صحیح طور پر کہا جائے تو وہ چالیس سال کی تھیں۔ وہ قبیلہ قریش سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور چار پشت پہلے یک جدی ہونے کے رشتہ سے حضرت محمدؐ کی بنت عم بھی تھیں۔ ایک نسل پہلے سے تعلق رکھنے کے سبب وہ اپنے نوجوان رشتہ داروں سے واقف نہ تھیں۔ ان کے دو شوہر[1] فوت ہو چکے تھے اور دونوں نے ان کے لئے اپنے تجارتی ساہوکارہ ادارے وراثت میں چھوڑے تھے جنہیں حضرت خدیجہؓ نے ملا کر ایک ادارہ بنا لیا تھا۔ دونوں اداروں کا یہ ادغام بڑا کامیاب رہا اور نئے انتظام کے تحت اُس نے بڑی ترقی کی تھی۔

حضرت خدیجہؓ کے تجارتی طریقہ ہائے کار بالکل جدید تھے۔ وہ معتبر قریشی تاجروں کو روپیہ قرض دیتی تھیں۔ جس کے بدلے میں وہ اپنی پسند کے سودوں میں ان کی حصہ دار بن جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے بنک میں چھوٹی رقوم جمع کرنے والے لوگوں کا روپیہ بھی تجارتی کاروانوں میں لگاتی تھیں اور جب یہ قافلے تجارتی مہم سے واپس آتے تو منافع کی تقسیم سرمایہ کاری کے مطابق کر لی جاتی۔ علاوہ ازیں حضرت خدیجہؓ اپنے ان ملازمین کو بھی جو شہری اداروں میں کام کرتے یا سفر میں ساتھ جانے والے ہوتے اپنے تجارتی منصوبوں کی سرمایہ کاری میں حصہ دار بنا لیتی تھیں۔ اس طرح سے وہ لوگ ایک ہی وقت میں ان کے ملازم بھی ہوتے تھے اور ان کے سرمایہ کار اور حصہ دار بھی۔ چنانچہ ادارے کے ہر منصوبے کی کامیابی میں جس کا وہ بیڑا اٹھاتا تھا۔ ادارے کے صدر اور مہتمم سے لے کر متصدی اور غریب شتربانوں تک ہر ایک کے لئے دلچسپی اور فائدہ تھا۔

لیکن کاروباری خاتون ہونے کے باوجود حضرت خدیجہؓ کے حسن و جمال[2] میں کوئی

---

[1] ان کے نام ابوہالہ اور عتیق بن عائذ مخزومی تھے۔ (تفہیم القرآن جلد اوّل) [2] حسن و جمال کے ساتھ ساتھ حضرت خدیجہؓ نہایت شریف النفس اور پاکیزہ اخلاق بھی تھیں۔ چنانچہ قبل از اسلام بھی لوگ آپ کو طاہرہ کہتے تھے۔ لوگوں کا یہ خیال آپؓ کی عزت و عظمت کا آئینہ دار تھا۔ (سیرۃ النبی۔ حصہ اوّل)

فرق نہیں آیا تھا۔ عربوں کے معیار کے مطابق تو وہ بوڑھی ہو چکی تھیں لیکن حقیقت میں وہ اتنی ہی جوان تھیں جتنا وہ محسوس کرتی تھیں۔ اور کسی وقت بھی اس خیال سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اب فربہی کی طرف مائل تھیں لیکن ان کی جلد تاحال تروتازہ، بال سیاہ اور چمکدار اور آنکھیں بڑی اور جلدی جلدی جھپکنے والی تھیں۔ ان کے گہرے رنگ کا لباس اور قیمتی چادر ان کے مرتبے کے مطابق ہوتے تھے۔ فیروزہ جڑے چاندی کے زیورات جو وہ ہاتھوں، کانوں اور گردن میں پہنے ہوتی تھیں ان کی خوش ذوقی کا ثبوت تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ابھی تک جسمانی طور پر پرکشش ہونے کے ساتھ ساتھ بہت دولت مند بھی تھیں۔ کمی صرف ایک صحیح قسم کے مرد کی تھی۔

حالانکہ حضرت خدیجہؓ کا ذہن بھی آپ کے جسم کی طرح فعال اور مستعد تھا لیکن پھر بھی انہیں تجارت میں تجربہ رکھنے والے ایک ایسے قابلِ اعتماد اور مستعد شخص کی ضرورت تھی جو ان کے کاروبار کی نگہداشت کر سکے۔ انہیں خصوصیت سے ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو ان کے تجارتی کاروانوں کا اہتمام وانصرام سنبھال سکے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ بہت محتاط بھی تھیں کیونکہ وہ اپنی دولت اور بے شمار اونٹ اور خچر کسی ایسے شخص کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ جو انہیں لے کر شام یا مصر میں غائب ہو جائے۔ اور پھر اس کا پتہ بھی نہ چلے۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک وہ اپنے ادارے کا کام خود ہی سنبھالتی رہیں۔

حضرت خدیجہؓ کے ایک بھتیجے خزیمہ تھے۔ جو قریب قریب حضرت محمدؐ کے ہم عمر تھے اور وہ کئی تجارتی مہموں میں حضرت محمدؐ کے ساتھ سفر میں جا چکے تھے اور دوسرے لوگوں کی طرح جن کا ان سے سابقہ پڑا تھا، وہ بھی حضرت محمدؐ کی اہلیت اور دیانت داری کے مداح تھے اور انہوں نے اپنے اس دوست کا حضرت خدیجہؓ سے بھی ذکر کیا تھا۔

اسی زمانے میں حضرت ابوطالب نے اپنے بھتیجے کو مشورہ دیا کہ وہ اب اپنے تعلقات کا دائرہ بڑھائیں۔ اور کوشش کریں کہ انہیں شہر کے بڑے اداروں میں سے کسی ایک کی نمائندگی مل جائے۔ چنانچہ جب آپؐ کو حضرت خدیجہؓ سے

رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیا گیا تو آپؐ نے اُن سے ملاقات کی درخواست کی۔

آپؐ کی کاروباری اہلیت کے بارے میں جو اچھی رائے حضرت خدیجہؓ کے دل میں ان کے بھتیجے نے قائم کر دی تھی آپ کے خوبصورت خدوخال اور حسین مسکراہٹ نے بھی یقینی طور پر اس کو اور مستحکم کرنے میں برابر کا کام کیا اور جب آپ نے کہا کہ آپ یہ ملازمت فوری طور پر اختیار نہیں کر سکتے تو وہ آپ سے اور زیادہ متاثر ہوئیں۔ حضرت محمدؐ جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے۔ خواہ معاملہ تجارت کا ہو یا جنگ کا یا مذہب کا۔ آپؐ ہمیشہ کافی سوچ بچار سے کام لیتے تھے۔ ساہوکار بیوہ خاتون کو جواب دینے سے پہلے آپؐ نے چچا سے مشورہ کیا۔ حضرت ابوطالب اپنے بھتیجے کے لئے یہ ہی بات تو چاہتے تھے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ حضرت خدیجہؓ حضرت محمدؐ کو ان کی موجودہ آمدنی سے دگنا دینے کو تیار ہیں تو فوری طور پر یہ ملازمت قبول کر لینے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ حضرت محمدؐ حضرت خدیجہؓ کی ملازمت میں آ گئے[۱] اور ایسا کر کے گویا آپؐ نے تمام عرب کی بادشاہت تک لے جانے والے زینہ کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔

پہلی دفعہ حضرت خدیجہؓ نے حضرت محمدؐ کے ساتھ سفر میں اپنے بھتیجے اور اپنے ذاتی حبشی غلام میسرہ کو بھیجا۔ وہ ایک سمجھدار خاتون تھیں اور اس بات کا یقین کر لینا چاہتی تھیں کہ انہوں نے ذاتی جذبات سے مغلوب ہو کر کہیں کوئی بے عقلی کا کام تو نہیں کیا ہے لیکن انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہ پڑی۔ کیونکہ آپؐ نے اپنے فرائض اس خوش اسلوبی سے انجام دیئے اور اپنے نئے مالک کے لئے اتنی نفع بخش سوداگری کی کہ انہیں آپ کی تنخواہ میں اور اضافہ کرنا پڑا اور چند ماہ بعد آپ کو اپنے تمام کاروانوں کا سربراہ مقرر کر دیا۔

آئندہ دو سال تک حضرت محمدؐ حضرت خدیجہؓ کے نمائندے کی حیثیت سے ان تمام

---

[۱] صاحب "حیات محمدؐ" کے بیان کے مطابق حضرت ابوطالب نے حضرت خدیجہؓ کے پاس جا کر یہ معاملہ خود طے کیا اور حضرت خدیجہؓ آپؐ کو اپنے تجارتی سامان کے ساتھ شام بھیجنے پر تیار ہو گئیں۔ اور آپؐ ان کی ملازمت میں آ گئے۔

مقامات پر سفر پر جاتے رہے۔ جہاں تک اس وقت کارواں جاتے تھے۔ یعنی دمشق[1]، حلب، انطاکیہ، بیت المقدس، بیروت، پامریہ، بعلبک وغیرہ۔ یہ سب آپ کی زد پر تھے، جلدی ہی دوسری ذمہ داریوں کا اضافہ ہوگیا اور آپؐ کو سارے ادارے کا منتظم بنا دیا گیا۔ جب آپؐ سفر میں نہ ہوتے تو دفتر میں ادارے کے انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کرتے اور یہاں ہی حضرت خدیجہ آجاتیں اور اپنے خوش رو سربراہ کی تجاویز سنتیں جو ہمیشہ ان کے تجارتی اداروں سے ہونے والی آمدنی میں اضافہ کا باعث ہوتیں۔

ادارے کے مالی منفعت کے پہلوؤں سے قطع نظر حضرت خدیجہؓ اب ویسے بھی خوش تھیں اور گفتگو کے ایسے مواقع کی منتظر رہتیں۔ وہ اب کارواں کی واپسی کے دن گنتی رہتیں۔ اور بے چینی سے منتظر رہتیں۔ یہاں تک کہ حضرت محمد واپسی کے بعد نہا دھو کر۔ صاف ستھرا سفید لباس پہنے، بالوں اور داڑھی کو سنوار کر خوشبو لگائے آتے اور ان کو رپورٹ پیش کرتے آہستہ آہستہ ان کی دلچسپی تجارت میں کم اور اپنے جواں سال اور حسین مہتمم[2] میں بڑھتی گئی اور اب وہ کارواں کی آمد کی خبر سننے کا گھر یا دفتر میں بیٹھ کر انتظار نہیں کر سکتی تھیں بلکہ اپنے مکان کی اونچی چھت پر چڑھ جاتیں اور خشک پہاڑیوں کی طرف دیکھ کر انتظار کرتیں۔ تاکہ پتھریلی گھاٹی سے آہستہ آہستہ اترتے ہوئے اونٹوں کا پہلا نظارہ کر سکیں۔ زندگی میں

---

[1] نقشہ نمبر ۴

[2] یہاں مصنف نے ناول کی رنگین بیانی سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ حضرت خدیجہؓ نے اب آپؐ میں ایسے آثار دیکھ لئے تھے جس کے سبب انہیں آپؐ کے نبی ہونے کا پختہ یقین ہوگیا تھا۔ میسرہ اور دوسرے ملازم بھی آکر ان مافوق الفطرت واقعات کا ذکر کرتے جو سفر میں آپؐ سے ظہور میں آتے۔ اس طرح حضرت خدیجہؓ جنہوں نے کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا آپؐ کی عقیدت مند ہوگئیں اور آپ سے شادی کر لینے کو عین سعادت خیال کیا۔ ایک روایت کے مطابق ایک مرتبہ جب قافلہ گھاٹی سے اتر کر مکہ میں داخل ہو رہا تھا تو آپ نے چھت پر سے دیکھا کہ ایک ابر کا ٹکڑا مسلسل آپ پر سایہ کئے ہوئے تھا۔

پہلی مرتبہ وہ اپنے دل میں محبت کی کسک محسوس کر رہی تھیں۔

لیکن وہ اپنے ان پریشان کن احساسات سے اپنے محبوب کو کس طرح باخبر کریں؟ یہ خیال انہیں پریشان کر رہا تھا۔ ان کی عمر اب بیالیس سال ہو گئی تھی اور ان باتوں کو خوب سمجھتی تھیں۔ وہ اپنے سے پندرہ سال چھوٹے مرد کے متعلق ایسے شدید جذبات کا اظہار کس طرح کر سکتی تھی اور خصوصاً جبکہ وہ ان کا ملازم بھی ہو۔ ایک ایسا ملازم جس کے پاس ایک درہم بھی ایسا نہ تھا جو خود ان سے نہ کمایا ہو۔ کبھی خیال آتا کہ ان کے خاندان والے سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ اور ان کے بوڑھے چچا اور سرپرست عمر بن اسد اس کے متعلق کیا خیال کریں گے وہ خوب جانتی تھیں کہ وہ اور ان کے علاوہ ہر شخص ان پر ہنسے گا اور کہے گا کہ بڑھاپے میں کیا بے وقوفی کی سوجھی ہے۔ ہر شخص انہیں مشورہ دے گا کہ وہ خوش قسمت تھیں کہ دو امیر شوہروں کو بڑے آرام سے دفن کر چکی ہیں اور یہ کہ اب تیسرا تجربہ نہ کریں اور وہ بھی ایک ایسے نوجوان کے ساتھ جو اُن کا لڑکا معلوم ہوتا ہو۔ جہاں تک ان کے خاندان کا تعلق تھا۔ ان کا ردعمل وہ خوب جانتی تھیں۔ اگر ان میں سے کسی کو اس کا شبہ بھی ہو جائے کہ ان کے ذہن میں کیا ہے تو حضرت محمدؐ کو حاصل کرنے کا جو تھوڑا بہت سا موقعہ ہے۔ وہ بھی کھو دیں گی اس لئے لازم تھا کہ وہ کوئی دوسرا طریقہ سوچیں ایک بڑی مشکل یہ بھی تھی کہ انہیں اس کا قطعی علم نہ تھا کہ حضرت محمدؐ کا ان کے متعلق کیا خیال تھا۔

حضرت محمدؐ کے ذہن میں ایسا کوئی خیال نہ تھا۔ وہ ایسے کام میں لگے ہوئے تھے جو انہیں پسند تھا۔ وہ اچھا خاصہ روپیہ کما رہے تھے اور ان کی محنت اور کامیابی کو سراہا بھی جا رہا تھا۔ حضرت خدیجہؓ ان کے نزدیک بس ایک اچھی مالکہ تھیں۔ وہ ان کی تعریف اور عزت کرتے تھے۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ اس وقت تک

لے اس کا سبب حضرت خدیجہؓ کی آپؐ سے عقیدت تھی۔ بہرحال ڈاکٹر محمد حسین ہیکل بھی 'حیات محمدؐ' میں اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ چند روز بعد خدیجہؓ کی یہ خوشنودی محبت کے سانچے میں ڈھل گئی اور آپؐ سے عقد کی خواہش نے ان کے دل میں گھر کر لیا۔

کسی عورت نے آپؐ کی زندگی میں کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ اور کسی لڑکی سے خود کوئی راہ و رسم بڑھانے کے لئے بیباکی اور جرأت درکار تھی جو آپ میں نہ تھی اور اپنی معزز مالکہ کے ساتھ ایسی کوئی بات کرنا آپؐ کے نزدیک ایسا ہی تھا جیسے آپ یہ خیال کر لیتے کہ آپؐ ایک دن عرب بادشاہ ہو جائیں گے (حالانکہ بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ مالکہ اور ملک عرب دونوں آپؐ کی پہنچ میں تھے۔) حضرت خدیجہؓ آپ کا یہ شرمیلا پن بھانپ گئیں۔ اور خود ہی کوئی قدم اٹھانے[1] کا فیصلہ کیا۔ اس کام کے لئے انہوں نے اپنے غلام میسرہ کی خدمات حاصل کیں۔

میسرہ بہت سے تجارتی سفر میں آپؐ کے ساتھ گیا تھا اور منصبوں میں کافی فرق ہونے کے باوجود دونوں ایک دوسرے سے قریب رہے تھے اور صحرائی سفر کی صعوبتوں میں ساتھ رہنے نے ایک دوسرے کو دوست بنا دیا تھا۔ حضرت محمدؐ اپنی مستقبل کی زندگی کی طرح اسوقت بھی ھر ایک سے بڑی آسانی سے مل لیتے تھے اور کبھی آپؐ کے دل میں یہ خیال بھی نہ آتا کہ وہ دوسروں سے بالاتر یا خاندانی طور پر زیادہ معزز تھے۔ اس لئے میسرہ کو آپؐ سے شادی کے متعلق غیر رسمی بات چیت کرنے میں کوئی رکاوٹ یا شرم نہ تھی۔

میسرہ نے پوچھا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک اٹھائیس سالہ نوجوان جو اتنا قابل اور خوشرو ہو اور اتنے اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہو کبھی شادی نہ کرے۔ آپؐ نے بھی اُسی صاف گوئی سے جواب دیا کہ آپؐ نے اس معاملہ پر کبھی توجہ ہی نہیں کی۔ وہ بے حد مصروف رہے اور یہ اچھا ہی ہوا کہ آپ نے شادی نہیں کی کیونکہ ایک ایسا آدمی جو اپنی ساری عمر سفر میں گزارے اور جس کا تنخواہ یا کمیشن پر گزارہ ہو کس طرح سے ایسا گھر بسا سکتا ہے جس کی ان کی جیسی عمر اور اعلیٰ خاندان والے سے توقع کی جاتی ہو۔ میسرہ نے اس پر جواباً مشورہ دیا کہ پھر دولت[2] سے شادی کر لیں۔ آپؐ اس فقرے کو سمجھ گئے اور محظوظ ہوئے۔ پھر جواب دیا کہ

---

[1] عرب میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ شادی بیاہ کے متعلق خود گفتگو کر سکتی تھیں (سیرۃ النبی۔ حصہ اول)

[2] دولت۔ صاحب حیاۃ محمد (ڈاکٹر محمد حسین ہیکل) نے لکھا ہے کہ ایک روایت کے مطابق شادی کے متعلق یہ سلسلہ جنبانی اور یہ تمام باتیں آپؐ سے حضرت خدیجہؓ کی بہن یا ایک سہیلی نفیسہ نے کیں۔

ایک سفری گماشتہ کس طرح ایک دولت مند عورت سے مل سکتا ہے اور اگر یہ بھی ممکن ہو تو شادی کی تجویز کس طرح کی جاسکتی ہے۔

میسرہ ہنسا اور کہا "اور اگر ایک دولت مند خاتون جو خوبصورت بھی ہو اور اعلیٰ ترین خاندان سے تعلق رکھتی ہو خود آپ سے شادی کی خواہش مند ہو" آپؐ اس پر اور زیادہ محظوظ ہوئے اور پوچھا "اور وہ خواب کی مخلوق کون ہے جو میسرہ کے ذہن میں ہے"

اور آپؐ یہ سن کر حیران رہ گئے جب میسرہ نے بے ساختہ جواب دیا "خدیجہؓ" اور اس سے پہلے کہ حضرت محمدؐ اس حیرانی سے سنبھلیں اس نے مزید کہا "اگر آپؐ اسے مجھ پر چھوڑ دیں تو میں ہر بات کا انتظام کر دوں گا" میسرہ کو آپؐ کو یہ یقین دلانے میں کچھ وقت لگا کہ یہ بات صحیح ہے اور اس کے بعد کچھ وقت آپ نے یہ سوچنے میں لیا کہ آیا تجویز معقول ہے یا نہیں۔ اور جب آپؐ نے فیصلہ کر لیا تو آپؐ کی حضرت خدیجہؓ سے ملاقات کا بندوبست کیا گیا۔

وہ دونوں اس سے پہلے بھی تنہائی میں ملے تھے لیکن ہمیشہ ادارے کے دفتر میں۔ لیکن آج بات چیت حضرت خدیجہؓ کے اپنے رہائشی مکان میں ہوئی۔ حضرت محمدؐ شرمیلے تھے اس لئے حضرت خدیجہؓ نے ساری باتیں خود سمجھائیں اور جب انہوں نے بات ختم کی تو آپؐ نے شکریہ کے ساتھ تجویز کو قبول کر لیا۔ اب فوری شادی کے لئے ہر بات مکمل معلوم ہوتی تھی لیکن ابھی دیر لگنا تھی۔ حضرت محمدؐ کو رضامند کر لیا تھا لیکن خاندان والے ابھی باقی تھے۔

جب ہونے والی دلہن کے چچا اور سرپرست عمرو ابن اسد[1] نے اس مجوزہ رشتہ کے متعلق سنا

---

[1] بہت سے سوانح نگاروں نے عمرو بن اسد کی بجائے حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد کا نام لیا ہے۔ حالانکہ اس واقعہ کے سلسلہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں لیکن صحیح بات یہ ہے کہ خویلد حرب الفجار میں اور اس شادی سے بہت پہلے انتقال کر چکے تھے اور ان کے چچا عمرو بن اسد ان کے سرپرست تھے۔ جب عمرو بن اسد نے اپنی بھتیجی کی رضامندی دیکھی تو وہ اس رشتہ پر کچھ بحث و تمحیص کے بعد رضامند ہو گئے۔ مصنف کا بیان قیاس پر مبنی اور مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ خاندان والے اپنے کسی عزیزہ کی دولت کو دوسرے خاندان میں چلے جانے کی ہمیشہ مخالفت کرتے آئے ہیں ایسا ہی یہاں ہوا ہو گا۔ (طبری۔ طبقات ابن سعد۔ حیات محمدؐ)

تو وہ آگ بگولا ہو گئے اور انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہر بات اس رشتہ کے خلاف جاتی ہے یعنی آپؐ کی عمر۔ آپؐ کا حضرت خدیجہؓ کی ملازمت میں ہونا اور سب سے زیادہ یہ کہ آپؐ کے پاس کوئی اثاثہ نہ تھا۔ ان کے خیال میں یہ شادی حضرت خدیجہؓ کی دولت کو خاندان ہی میں رہنے دینے کی بجائے اس کو منتشر کرنے کا محض ایک ڈھکوسلا تھا۔ خاندان والوں میں پرانی رسم کے مطابق جھگڑے کی بنیاد یہ ہی تھی اور یہ جھگڑے اس وقت سے چلے آ رہے ہیں جب سے مادی قدریں اور قدروں کی علامتیں وجود میں آئیں۔

حضرت خدیجہؓ کو ان سب باتوں کی پہلے سے توقع تھی اور ان اعتراضات کے جواب بھی ان کے پاس موجود تھے لیکن ان کا بوڑھے چچا پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت محمدؐ آخر کار اپنی باقی زندگی بھی سفر میں گزار دیں گے۔

شاید اس پر حیرانی کا اظہار کیا جائے کہ آخر حضرت خدیجہؓ، جو اس وقت بیالیس سال کی تھیں اور بیوہ تھیں ابھی تک اپنے چچا کی سرپرستی میں تھیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عرب میں ایک رسم تھی کہ بغیر خاوند کی لڑکی خواہ وہ کنواری ہو یا بیوہ کسی خاندانی سربراہ کی سرپرستی میں رہتی تھی اور اس کی رضامندی کے بغیر اس کی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت خدیجہؓ کچھ برہم تو ضرور ہوئیں لیکن ناامید نہیں تھیں۔ ان میں اپنے چچا والی ضد بھی تھی اور عورت کی ذہانت اور ہوشمندی بھی۔ انہوں نے سردست اس بات کو یونہی چھوڑ دیا اور معاملہ ٹھنڈا ہونے دیا۔ جب کسی کو اس بات کا خیال نہ رہا اور حالات پرسکون ہو گئے تو انہوں نے ایک ضیافت کا اہتمام کیا۔ اس دعوت پر انہوں نے اپنے چچا سمیت تمام قریبی رشتہ داروں کو بلایا۔ آنحضورؐ کے دو چچا ابو طالب اور حمزہؓ اور قبیلہ قریش کے دوسرے افراد کو بھی دعوت دی گئی البتہ حضرت محمدؐ اور اپنے بھتیجے خزیمہ کو جنہوں نے سب سے پہلے دونوں کا تعارف کرایا تھا تو مدعو کرنا ہی تھا۔ کھانے کا خاص طور پر انتظام کیا گیا تھا اور بڑے اہتمام سے پکایا گیا اور اس کے ساتھ باہر سے آئی ہوئی انگوری[1] اور دوسری شرابیں بھی افراط سے پیش کی گئیں۔

---

[1] گو عرب میں اسلام سے پہلے شراب عام تھی لیکن اس وقت بھی آنحضورؐ اور حضرت خدیجہؓ جیسے مجتنب لوگوں کی مجلس میں شراب کی یہ افراط اور بدمستی قطعاً بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔

جلد ہی ہر شخص ترنگ میں آگیا۔ تقریریں ہو رہی تھیں۔ ایک دوسرے کا جام صحت پیا جا رہا تھا اور بدمست مجمع کی پوری رونق موجود تھی، کھانے والوں میں صرف حضرت محمدؐ اور حضرت خدیجہؓ ہی ایسے تھے جو بالکل شراب نہ پیتے تھے۔

مناسب وقت پر حضرت خدیجہؓ نے خود ایک تقریر کی۔ آپ نے کہا کہ یہ حضرت محمدؐ ہی ہیں جن کی فہم و فراست کے سبب ان کی تجارت کو فروغ ہوا۔ اور یہ ہی وہ شخص ہیں جن کی ہمت اور حوصلے نے ان کی دولت میں اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے آپؐ کی دیانت داری اور عالی نسبی کی بھی تعریف کی۔ آخر کار انہوں نے کہا کہ ایک عورت کے لئے اس سے بڑی عزت اور کیا ہوگی کہ اس کی ایسے شخص سے شادی ہو جائے۔ تمام مہمانوں نے تحسین و آفریں کی شراب کا مزید دور چلا۔ حضرت خدیجہؓ کے ایک چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل جوش میں کھڑے ہو گئے اور حضرت خدیجہؓ نے ابھی ابھی جو کچھ کہا تھا اس کی تائید کی۔ تحسین و آفریں کا ایک اور شور اٹھا اور شراب کا ایک اور دور چلا۔ حضرت ابو طالب اور حمزہؓ نے حضرت خدیجہؓ اور ورقہ سے اتفاق کیا اور اس سے پہلے کہ عمرو بن اسدؓ یہ پوری طرح سمجھ سکیں کہ یہ سب کچھ کس کے متعلق کہا جا رہا ہے۔ انہوں نے بھی اپنی تقریر میں اس کی توثیق کر دی اور حضرت محمدؐ نے فوراً وہ عبا پہنا دی جو رسم کے مطابق ایک داماد اپنے خسر کو شادی کے موقعہ پر دیتا ہے اور ساتھ ہی حضرت خدیجہؓ نے اپنے چچا کے بالوں میں زعفران اور عنبر کی خوشبوئیں لگا دیں۔ حضرت خدیجہؓ کے صحن میں ہر طرف مبارکباد کا شور گونج اٹھا۔ جہاں تک رسم کا تعلق تھا حضرت محمدؐ اور حضرت خدیجہؓ کی شادی کی تکمیل ہو گئی تھی۔

لیکن حضرت خدیجہؓ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ گرمجوش ماحول پیدا کرنے میں شرابؐ کی بہتات کا بھی بڑا دخل تھا۔ اور اس سے بھی واقف تھیں کہ صبح کو اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ چنانچہ جس وقت لوگ ایک دوسرے کی کمر تھپک رہے تھے اور دور چل رہا تھا انہوں نے وکیلوں کو بلا لیا تھا۔ چنانچہ شادی کی دستاویز بھی اسی خوشی اور دوستانہ ماحول میں لکھ لی گئی۔ مہر مقرر ہوا اور ہر ایک معاملہ طے ہو گیا اور مکےؔ کے قانون کے مطابق حضرت محمدؐ اور حضرت خدیجہؓ شوہر اور بیوی قرار دے دیئے گئے۔ جب ضیافت ختم

ہو گئی تو حضرت محمدؐ نے مہمانوں کو رخصت کیا اور خود عرب کے دستور کے مطابق بیوی کے ہاں قیام کیا۔

کہا جاتا ہے کہ دوسری صبح عمرو اٹھے تو سر میں درد تھا اور وہ بڑبڑا رہے تھے[۳] کہ ان کی زیر ولایت خدیجہؓ نے ایک بے حیثیت آدمی سے شادی کر لی جبکہ مکہ میں انہیں ایک سے ایک اچھا شوہر مل سکتا تھا لیکن حضرت محمدؐ کے چچاؤں نے انہیں ٹوک دیا اور جواب میں کہا کہ عبدالمطلب کا پوتا بھی مکہ میں اور مکہ سے باہر کسی سے کم حیثیت نہ تھا۔ بہر حال اب عمرو کچھ خیال کرتے یا نہ کرتے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ شادی قانون کے مطابق ہو چکی تھی اور کوئی بات اب اس اسے فسخ نہیں کر سکتی تھی۔

شادی کی رسومات کے بعد جلد ہی ضیافت ولیمہ دی گئی۔ حضرت محمدؐ نے ایک اونٹ ذبح کیا اور اس کا گوشت غربا میں تقسیم کر دیا۔ حضرت خدیجہؓ نے اپنے اور حضرت محمدؐ کے دوستوں کے لئے ہمہ وقت استقبال کے لئے گھر کے دروازے کھول دیئے۔ چنانچہ شام سے صبح اور صبح سے شام تک رقص و سرود[۴] کی محفلیں جمی رہیں۔ شرکت خدیجہ کے مشہور ادارے کے صدر کے مکان پر اس سے بڑا خوشی کا جشن پہلے کبھی نہیں منایا گیا اور اس سے سب سے زیادہ خوشی اگر کسی کو ہوئی تو وہ خود فربہ اندام میزبان تھیں۔

۱-۲-۳ جیسا کہ اوپر کے حاشیے میں بیان ہو چکا ہے۔ مہمانوں کو شراب پیش کرنے کے امکان سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ اسلام سے پہلے کا ذکر ہے اور شراب عام تھی لیکن آپ کے چچا عمرو بن اسد کو شراب پلا کر رضامند کرنے کا واقعہ غلط ہے۔ صحیح واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت خدیجہؓ کی جانب سے شادی کی خواہش کا اظہار ہوا تو آپؐ نے اپنے چچا سے ذکر کیا تو آپؐ کے چچا (حضرت حمزہؓ اور حضرت ابوطالب) عمرو بن اسد کے پاس گئے اس سے شادی کا پیام دیا تاریخ مقرر ہوئی اور انہوں نے اپنی بھتیجی حضرت خدیجہؓ کی آپ سے شادی کر دی۔ دونوں طرف کے رشتہ دار موجود تھے اور طبقات ابن سعد کے مطابق آپؐ کے چچاؤں میں سے ایک نے (زیادہ اجماع حضرت ابوطالب پر ہے) رسم نکاح ادا کی۔ حضرت عائشہ اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ خود عمرو بن اسد نے آنحضور کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کا نکاح پڑھایا۔

۴ یہاں رنگین بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ (طبقات ابن سعد۔ تاریخ طبری۔ حیات محمدؐ)

میسرہ اور وفادار برکہؓ دونوں ضیافت کے کاموں میں مصروف رہے۔ حلیمہ سعدیہ، آپؐ کی دایہ کو بھی صحرا سے لے آیا گیا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے چالیس بھیڑیں انہیں تحفے میں دیں اور انہیں واپس پہنچایا۔ چلتے وقت حضرت حلیمہؓ نے اپنے اس اعلان کو ایک مرتبہ پھر دہرایا کہ ان کے حضرت آمنہ کے کمزور بچہ کو دودھ پلانے کے ہمدردانہ اقدام نے قبیلہ بنو سعد کے دن پھیر دیئے۔ آخر کار خوشیوں کا ہنگامہ ختم ہوا اور حضرت محمدؐ نے ایک مرتبہ پھر اپنی توجہ اپنی زوجہ کے تجارتی ادارے کے انتظامات سنبھالنے پر مرکوز کر دی ادھر حضرت خدیجہؓ اپنے حسین اور خوشرد شوہر کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتیں۔

یہ ایک بہت ہی مسرت بھری شادی شدہ زندگی کا آغاز تھا۔ حضرت خدیجہؓ حضرت محمدؐ کی محبت میں سرشار تھیں۔ لیکن حضرت محمدؐ کے احساسات بیوی سے زیادہ تر شفقت اور وابستگی کے تھے۔ شاید ایک طرح بیوی کے لئے آپؐ کی محبت اس سے زیادہ گہری تھی جتنا کہ وہ آپؐ کو چاہتی تھیں۔ آپؐ یقینی طور پر حضرت خدیجہؓ کا اتنا خیال رکھتے تھے جتنا اپنی زندگی میں کبھی کسی عورت کا کیا کسی کا بھی نہیں رکھا۔ اپنی اکیس سالہ ازدواجی زندگی میں حضرت خدیجہؓ نے اپنے شوہر کی غیر منقسم توجہ اور محبت پائی۔ خصوصاً ایک ایسے ملک میں جہاں کئی کئی شادیوں کا رواج عام اور جائز تھا۔ حضرت محمدؐ کی بعد کی شادیوں کا سبب کچھ ہی کیوں نہ ہو حضرت خدیجہؓ پہلی خاتون تھیں جو آپؐ کے دل میں بسیں اور ذہنی طور پر آخری بھی وہی تھیں۔

لہ ان کی کنیت اُمّ ایمن تھی اور وہ اسی نام سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔

چوتھا باب

بعثت

(نبوّت)

۵۹۹ تا ۶۱۱ ء

حضرت خدیجہؓ سے شادی کرنے کے بعد آپؐ کی طرزِ زندگی میں جلد کوئی تبدیلی نہ آئی۔ آپؐ بدستور ادارے کے سربراہ رہے اور کاروانوں کے ساتھ سفر پر جانا بھی جاری رہا۔ بلکہ آپؐ کے طویل ترین سفر جو آپؐ نے ایشیائے کوچک کے میلوں اور منڈیوں تک کئے وہ شادی کے بعد ہی ہوئے لیکن اس کے باوجود حضرت خدیجہؓ کے قدیم ادارے نے تجارت میں کوئی مزید ترقی نہ کی بلکہ درحقیقت ادارہ رُو بہ تنزل ہو گیا۔ گو نقصانات زیادہ نہ تھے اور حضرت خدیجہؓ اب بھی مکّہ کے دولت مند تاجروں میں سے ایک تھیں لیکن ان کے تجارت کے طریقے اپنا اثر کھو چکے تھے یا دوسرے لفظوں میں حضرت محمدؐ کا جوش اور ولولہ سرد پڑ گیا تھا۔ آپؐ کو اب اس کام میں دلچسپی نہ رہی جسے آپؐ اب تک صرف اس لئے کرتے رہے کہ آپؐ اس کے لئے مجبور تھے۔

روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہونے پر اب حضرت محمدؐ کو ان تمام باتوں کے سوچنے کا وقت ملنے لگا جو آپؐ کے ذہن میں جمع ہوتی رہی تھیں۔ بعض اوقات جبکہ آپؐ کو قاعدے کے مطابق سودوں کے معاہدوں پر دستخط کرنے یا کاروان ترتیب دے کر روانہ کرنے میں مصروف ہونا چاہئے تھا، آپؐ کی بیوی آپ کو کسی سوچ میں کھویا ہوا پاتیں۔ یہ ایسے شخص کا ذکر نہیں جو اچانک دولت مل جانے سے اپنے فرائض سے غافل ہو گیا ہو۔ حضرت محمدؐ ہرگز سست یا کاہل وجود نہ تھے۔ بچپن سے وفات تک سستی یا کاہلی کبھی آپ کی کمزوری نہ تھی

اس کے برعکس آپؐ کی مثال ایک ایسے فہم و ذکی انسان کی مثال ہے جسے ہمیشہ اپنے فطری رجحان کے خلاف باتوں پر توجہ مبذول کرنے پر مجبور کیا جاتا رہا ہو اور وہ غیر متوقع طور پر آزادی پا لے۔ حضرت خدیجہؓ نے ایک ہوشیار اور زیرک خاتون ہونے کے سبب شوہر کے ذہن میں اٹھتے ہوئے طوفان کو کچھ کچھ بھانپ لیا تھا اور سمجھ دار ہونے کی وجہ سے کبھی آپؐ سے جھگڑا نہ کیا اور آپؐ کو اپنی مرضی پر چلنے دیا چنانچہ اس طرح حضرت خدیجہؓ ایک مرتبہ پھر دین اسلام کی بنیاد رکھنے میں امداد کر رہی تھیں اور ان کے ابنِ عم ورقہ بن نوفل، جنھوں نے شادی کے موقعہ پر ان کی تائید کی تھی، اس معاملہ میں ان کے بڑے سرگرم معاون تھے۔

ورقہ کچھ عجب پُر اسرار سے آدمی تھے۔ گو بظاہر اس میں ان کا کوئی ذاتی فائدہ نہ تھا لیکن وہ حضرت خدیجہؓ کے خاندان کے واحد فرد تھے جنھوں نے حضرت محمدؐ سے شادی کے معاملہ میں ان کی طرفداری کی اور جب حضرت محمدؐ کے ذہن میں ایک روحانی تحریک نے جنم لینا شروع کیا تو وہ ان کی تائید کرنے میں بھی پہلے شخص تھے۔ ان کا اپنا کیا خیال یا عقیدہ تھا اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا وہ ملحد پیدا ہوئے۔ پھر وہ یہودی بن گئے، اور بعد ازاں انھوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ عہد نامہ ہائے[1] عتیق و جدید کا پہلا عربی ترجمہ انہی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہودیوں کی تورات و تالمود اور عیسائیوں کی انجیل کے متعلق حضرت محمدؐ کو زیادہ تر معلومات ان ہی سے ملیں۔ یہ ورقہ سے تبادلہ خیال کرنے اور ان باتوں کا نتیجہ تھا جو آپؐ نے سفر کے دوران حاصل کی تھیں کہ آپؐ دفتر میں کام کرتے کرتے کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتے یا سفر میں اونٹ کی پشت پر پاؤں پھیلا کر کسی خیال میں مستغرق ہو جاتے۔

اس وقت تک آپؐ نے کعبہ کی رسومات کے متعلق کبھی کوئی سنجیدہ قسم کا اعتراض

---

[1] عہد نامہ ہائے عتیق و جدید OLD AND NEW TESTAMENTS

یعنی توریت۔ زبور و انجیل۔ مصنف کا یہ خیال کہ توریت و انجیل کی معلومات آپ کو ورقہ سے ملیں، صحیح نہیں ہے۔

نہیں کیا تھا۔ آپؐ اور آپؐ کی زوجہ روایتی بت پرستوں میں پیدا ہوئے تھے جو اللہ تعالیٰ، الات اور دوسرے دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتے تھے اور یہ کہ وہ پتھر کے تراشے بت تھے فی الوقت آپؐ کے لئے کسی خاص پریشانی کا موجب نہ تھے۔

آپؐ کے دادا چاہتے تھے کہ آپؐ بتوں کی طرف متوجہ ہوں اور یہ ایک کافی اچھا مشورہ معلوم ہوتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمدؐ نے کبھی اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا بھیڑیں چرانے کے ایام کے علاوہ آپؐ کو اس کا زیادہ موقعہ ہی نہیں ملا تھا لیکن اب جبکہ آپؐ کے پاس اُن باتوں کو ذہن میں دہرانے کا کافی وقت تھا جن کے متعلق ورقہ[2] نے آپ کو بہت کچھ بتایا

---

[1] مصنف نے آپ کے لئے CONVENTIONAL IDOLATOR روایتی بت پرست کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ چونکہ آپ روایتی بت پرست خاندان اور لوگوں میں پیدا ہوئے تھے اس لئے بعثت سے پہلے بتوں کو زبان سے بُرا نہیں کہتے تھے ایک جگہ خود کہا ہے کہ دادا کی خواہش کے باوجود آپؐ بتوں میں کوئی دلچسپی نہ لیتے تھے۔ اسی باب میں کچھ آگے چل کر کہتا ہے کہ آپؐ پر بتوں کی لغویت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی اور یہ کہ آپؐ کے روحانی خیالات اور بت پرستی میں مطابقت ناممکن تھی ورنہ بصورت دیگر ان الفاظ کا استعمال صریحاً غلط ہے کیونکہ قرآن اور دیگر آسمانی کتب شاہد ہیں کہ کسی نبی نے بعثت سے پہلے بھی کبھی کسی بُت کو سجدہ نہیں کیا۔ حضرت ابراہیم کا بت شکنی کا واقعہ مشہور ہے۔ اسی طرح حضرت خدیجہؓ بھی کچھ فطرتاً اور کچھ اپنے ابن عم ورقہ کے مواعظ کے سبب بتوں میں کوئی اعتقاد نہیں رکھتی تھیں اور نہ ہی شراب کو ہاتھ لگاتی تھیں۔

[2] اس باب میں خصوصیت سے اور اس کتاب میں مختلف جگہ مصنف نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ بت پرستی کے خلاف اور عیسائیت کے متعلق آپؐ کی معلومات بُصریٰ کے راہب بحیرہ، نجران کے بشپ قس بن ساعدہ کے تبلیغی خطبوں اور ورقہ بن نوفل کی صحبتوں کی مرہون منت تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ بعثت سے پہلے آپؐ ان سے کچھ متاثر ہوئے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہودیت اور عیسائیت اور توریت و انجیل کی تعلیمات کا صحیح علم آپؐ کو بعثت کے بعد قرآن کریم کے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے ذریعہ ہوا۔ اس معاملہ میں آپؐ کسی کے مرہون منت نہ تھے بلکہ ان ادیان کے متعلق بعض صحیح باتیں جو آپؐ کو بتائی گئیں وہ خود عیسائیوں اور یہودیوں کو بھی معلوم نہ تھیں۔

تھا، جو کچھ بُصریٰ کے راہب نے بہت سالوں پہلے کہا تھا، جو کچھ نجران کے بشپ نے مذہبی خطبوں میں کہا تھا اور جو کچھ آپؐ نے ایشیائے کوچک (شام ترکی وغیرہ) میں سنا تھا، تو کعبہ اور اس کے متعلقات میں آپؐ ایک قسم کی کمی محسوس کرنے لگے۔

سورج غروب ہونے کے بعد صحرا کا یہ مقدس مقام (کعبہ) مرغیوں کے ڈربے کا سا منظر پیش کرتا تھا۔ خانہ کعبہ کے اندر مدھم سی روشنی میں تین سو ساٹھ پتھر کے بھدّے بت اور مجسمے بھرے ہوئے تھے۔ وہ عرب کے مختلف اطراف سے لائے گئے تھے۔ کچھ شام اور مصر سے آئے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کے مجسمے جو قدیم عربی نسل کی نشانی سے زیادہ کچھ نہ تھے یہاں آکر کافرانہ پرستش کا حصّہ بن گئے تھے۔ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے مجسمے بھی وہاں تھے جن کے سرو ہاتھوں میں الوہیت کے تیر دیئے ہوئے تھے جو جادو کا نشان یا علامت سمجھے جاتے تھے۔ اس سارے معاملے کی لغویت آپؐ پر روزِ روشن کی طرح آشکار ہو گئی تھی۔ ان مضحکہ خیز اور پتھر کے بھدّے اور بے شکل و صورت بتوں جن میں کچھ تو لنگ کے نشان سے زیادہ نہ تھے اور بعض صرف بے شکل و شباہت پتھر ہی تھے، کی پرستش اور معرفت کے ان خیالات میں جو آپؐ کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے کوئی تطابق پیدا کرنا ناممکن تھا۔ لیکن تاحال اس کا کوئی حل آپؐ کے پاس نہ تھا۔ آپؐ معاملے پر جتنا زیادہ غور کرتے خود کو اتنا ہی الجھا ہوا پاتے۔

کچھ عرصے بعد جو سالوں پر پھیلا ہوا تھا۔ منفی نتائج چھٹ گئے اور ان کی جگہ دوسرے تعمیری اور اصلاح مذہب کے خیالات نے لے لی۔ پہلے پہلے کچھ مبہم اور بعد میں بڑے واضح طریق پر حضرت محمدؐ ان باتوں پر استدلال کرتے رہے اور اس استدلال نے آپؐ کے ذہن میں کچھ ایسی شکل اختیار کر لی۔

حضرت آدمؑ کو یقینی طور پر ایسی بنیادی باتیں ضرور بتائی گئی ہوں گی جو تمام مذاہب کی بنیاد اور اصل ہوں گی۔ یہ لازمی طور پر سادہ اور تصنع سے پاک ہوں گی اور وہ سب ایک واحد خدا کے متعلق ہوں گی۔ کیا وہ خدا اب بھی موجود ہے؟ اگر وہ وہی خدا ہے جس نے کائنات تخلیق کی تو اسے ضرور موجود ہونا چاہئے کیونکہ کائنات خدا کی موجودگی کی بہترین

دلیل ہے ۔ چنانچہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ موجود ہے تو پھر اس کی پرستش ہونی چاہیے اور اس مقدس ترین ذات کو ہی ہر چیز کا منبع اور اصل تصور کرنا چاہیئے ۔ اب بھی اور آئندہ بھی ۔ اور خاص کر مکہ میں اس ذات پاک کے تلاش کرنے میں زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہ ہوگی ۔ وہ خدا اللہ ہی تو ہے ۔ کعبہ کا خدا ۔ وہ خدا جو عرب کے تمام مبہم اور غیر یقینی خداؤں سے، جن کی عرب لوگ پرستش کرتے ہیں، زیادہ عزت والا اور عظیم ہے ۔

ایسا فیصلہ کر کے حضرت محمدؐ عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی اختلافی بات نہیں کر رہے تھے کیونکہ آپؐ کسی ایسے خدا یا دیوتا کو اختیار نہیں کر رہے تھے جو صرف آپؐ کے نظریات کا ہی مظہر ہو ۔ پھر اللہ فونیقیوں کے دیوتا بعل[1] یا یونانیوں کے دیوتا زئیس[2] ZIUS کا نام بھی نہیں تھا ۔ یہ تو 'ال' اور 'الٰہ' کا مرکب تھا ۔ جس کے معنی خدا یا معبود ہیں ۔ جس طرح 'الات' "ال ۔ اِلات" کا مخفف اور خدا کی تانیث کا مظہر ہے ۔ اللہ تعالےٰ، کہ یہ بھی اس کا ایک نام ہے، کا مطلب 'عظیم ترین خدا' ہے ۔ یہ صورتحال تقریباً ایتھنز[3] ATHENS والوں کی سی تھی کہ وہاں سینٹ پال[4] نے ان لوگوں کو بہت سی قربان گاہوں کے ساتھ ایک قربان گاہ کو 'ان دیکھے خدا' کے لئے بھی وقف کرتے دیکھا ۔

یہ خیالات حضرت محمدؐ کے ذہن میں آہستہ آہستہ ایک الجھے ہوئے ریاضی کے سوال کے اعداد کی طرح جمع ہوتے جا رہے تھے لیکن کوئی واضح حل نظر نہیں آتا تھا ۔ آپؐ کوئی عالم نہیں تھے اور ایک سفری گماشتے کا ذہن اپنے اس راستے کو ایک دم نہیں بدل سکتا تھا جس

---

[1] بعل BALL فونیقی قوم کے لوگ بعل (آفتاب) کی پرستش کرتے تھے ۔ چنانچہ سورج دیوتا کے استھان یا شہر کو بعلبک کہا گیا ۔ جو تا حال لبنان میں موجود ہے ۔ اس شہر کا قدیم نام ہیلی پولس HELEPOLIS

[2] زئیس ZIUS یونانی علم الاصنام کا سب سے بڑا دیوتا ۔ کہتے ہیں کہ اس کی آسمانوں اور اجرام فلکی پر حکومت تھی ۔

[3] ایتھنز ATHENS یونان کا ایک قدیم اور تاریخی شہر جو اب بھی یونان کا دارالخلافہ ہے ۔

[4] سینٹ پال ST.PAUL عیسائیوں کے ایک بڑے سینٹ یا مذہبی رہنما ۔

پردہ بیس سال سے چلا آرہا تھا۔ علاوہ ازیں آپؐ کسی نئے مذہب کا اعلان بھی نہیں کر سکتے تھے جب تک کہ اس پر کامل یقین نہ ہو جائے۔ آپؐ ابھی تک ایک روحانی فیضان رکھنے والے مبلغ بھی نہیں بنے تھے۔ زیادہ سے زیادہ آپؐ ایک ایسے سابق تاجر تھے جو اپنے پیشے کے نکات کو خوب سمجھتے تھے لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آپؐ ایک نہایت پاکیزہ خیالات رکھنے والے انسان تھے۔

ان خیالات کو عام نہ کرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ یوں تو حضرت محمدؐ کے بہت سے دوست تھے لیکن قابلِ اعتبار چند ہی تھے۔ آپؐ کی بیوی کے علاوہ ان کی تعداد تین سے زیادہ نہ تھی اور یہ تینوں بھی عمر اور سابقہ زندگی کے لحاظ ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے اور اگر حضرت محمدؐ درمیان میں نہ ہوتے تو وہ شاید کبھی بھی ایک دوسرے سے نہ مل سکتے۔

ان میں سب سے کم عمر حضرت علی کرم اللہ تھے۔ وہ حضرت ابو طالب کے صاحبزادے ہونے کے سبب آپؐ کے چچیرے بھائی بھی تھے۔ اپنے چچا پر سے خاندان کا بوجھ کم کرنے کے لئے آپؐ نے ان کی کفالت اپنے ذمہ لے لی تھی۔ اس وقت وہ ایک خوش مزاج، قوی الجثہ چودہ[1] سالہ لڑکے تھے جو بچپن سے ہی اپنے عم زاد بھائی اور کفیل (حضرت محمدؐ) کو ایک عظیم شخصیت سمجھ کر ان کی عزت کرتے تھے۔

حضرت محمدؐ کے سب سے زیادہ قریبی اور واحد ہم عمر دوست عبداللہ بن عثمان تھے البتہ ان کو اس نام سے کوئی نہیں جانتا۔ لوگ انہیں عام طور پر الصدیق' (صادق۔ سچے) یا پھر زیادہ تر ابوبکر کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے ابوبکرؓ (جوان شتر کے باپ) کی کنیت کب اختیار کی لیکن تاریخ میں وہ اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں اور میں یہ ہی استعمال کروں گا۔

حضرت ابوبکرؓ ایک امیر تاجر تھے اور بڑے غریب ماحول سے ترقی کر کے یہ درجہ اور دولت حاصل کی تھی۔ وہ بہت ہوشیار اور سمجھ دار تھے۔ ان کا قد چھوٹا جسم چھریرا اور سر بڑا

---

[1] بعض نے اس وقت آپ کی عمر دس گیارہ سال لکھی ہے اور یہ ہی زیادہ صحیح ہے۔

عقاب کا سا تھا۔ سرخی مائل چہرے پر چھدری ڈاڑھی تھی۔ حالانکہ آپ اپنی دولت سے مکّہ کی عیاشانہ زندگی میں حصہ لے سکتے تھے۔ حالانکہ آپ شروع سے آخر تک حضرت محمدؐ کے دستِ راست رہے اور اسلام کے پہلے خلیفہ بھی بنے لیکن آپ کے سوچنے کا انداز اور رہن سہن کے طریقے درویشانہ تھے۔

حضرت محمدؐ کے تیسرے گہرے دوست زیدؓ[1] ایک عیسائی نومسلم تھے جنہیں حضرت خدیجہؓ کے ایک بھتیجے شام کے ایک حملے میں پکڑ لائے تھے۔ حضرت محمدؐ نے اس نوجوان میں دلچسپی لی تو حضرت خدیجہؓ نے انہیں ذاتی غلام کی حیثیت سے آپ کو دے دیا۔ زیدؓ اس وقت بیس سال کے تھے چھوٹا قد سیاہ رنگ اور کچھ بدصورت، لیکن ہوشیار اور مالک کے وفادار۔ ایک روز جب ان کے کنبے والے انہیں تلاش کرتے ہوئے زرِ فدیہ لے کر انہیں غلامی سے چھڑانے کے لیے مکہ آئے تو حضرت زیدؓ نے ان سے علانیہ کہہ دیا کہ وہ یہاں ہی خوش ہیں اور گھر واپس جانے سے انکار کر دیا۔ محبت اور وفاداری کے اس اظہار نے حضرت محمدؐ کو بہت متاثر کیا۔ آپؐ ان سب کو لے کر کعبہ تشریف لے گئے۔ وہاں آپؐ نے زیدؓ کے والد کی موجودگی میں حجرِ اسود پر ہاتھ رکھا اور اعلان کیا "جو صاحبان بھی یہاں موجود ہیں گواہ رہیں کہ زید میرا بیٹا ہے۔ اور میں اس کا وارث ہوں اور یہ میرا"—— اس طرح آپؐ نے زیدؓ کو اپنا بیٹا بنا لیا اور اسے غلامی سے آزاد کر دیا لیکن ان کو ایک اور طرح سے منسلک کر لیا یعنی اپنی بوڑھی دایہ برکہ (اُمِ ایمن) سے نکاح کر دیا۔ وہ اس نوجوان سے بیس سال بڑی تھیں لیکن اس کے باوجود حضرت زیدؓ کا ایک بچہ ان سے ہوا جس کا نام اسامہؓ رکھا گیا اور جو بعد میں عساکرِ اسلام میں ایک مشہور جنرل بنے۔

لیکن اس کے باوجود کہ یہ تینوں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتے تھے آپؐ نے ان میں سے

---

[1] زید بن حارثہ۔ بعض روایتوں کے مطابق ان کو ورقہ بن نوفل نے خرید کر حضرت خدیجہؓ کو پیش کیا تھا۔ (تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب اسلام۔ صاحب حیاۃ محمدؐ ڈاکٹر محمد حسین ہیکل رقمطراز ہیں کہ حضرت زیدؓ کو حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت صلعم کے اصرار پر خریدا۔ آپؐ نے حضرت زیدؓ کو آزاد کر کے متبنیٰ بنا لیا۔

کسی کو ابھی تک اپنا راز دار نہیں بنایا تھا اور شادی کے بارہ سال بعد تک حضرت خدیجہؓ کے علاوہ کسی اور کو ان روحانی تبدیلیوں کا علم نہیں ہوا جو آپؐ میں پیدا ہو رہی تھیں۔

ادھر حضرت خدیجہؓ (جو ادھیڑ عمر کو پہنچ چکی تھیں) تا حال بہت خوش تھیں۔ ان کی جانب حضرت محمدؐ کی ملاطفت کچھ اور بڑھ گئی تھی اور آپؐ کو ان کا اب بھی اتنا ہی خیال تھا جتنا شادی کے وقت تھا۔ آپؐ نے حرم میں ان کی موجودگی کے دوران کسی وقت بھی ان کی کوئی رقیب لانے کے ہتک آمیز خیال کا اظہار تک نہیں کیا۔ حضرت خدیجہؓ صحیح طور پر تو نہیں جانتی تھیں کہ ان کے شوہر کے ذہن میں کس قسم کے خیالات موجزن ہیں لیکن وہ نہ تو ان سے کوئی سوالات پوچھتی تھیں اور نہ ہی اس بات سے مشوش تھیں۔ وہ تجارت کی نگرانی کے علاوہ بچوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتیں۔ تمام توقعات کے برعکس ان نسبتاً عمر رسیدہ خاتون سے حضرت محمدؐ کے دو لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں[1]

سب سے بڑے لڑکے حضرت قاسم تھے۔ کچھ مشرقی مصنفین حضرت محمدؐ کو اب تک ابوالقاسم (قاسم کے والد) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن حضرت قاسم صغر سنی میں ہی انتقال کر گئے اور ان کی وفات نے حضرت محمدؐ کو اپنے ذاتی حالات (یعنی بیٹے سے محرومی وغیرہ) بت پرستی کے عقائد[2] جنہیں آپ کی پرورش ہوئی تھی، اور ان کے متعلق اپنے شکوک و شبہات (یعنی بتوں کی لغویت اور ہر معاملے میں ان کی بے بسی) پر اور زیادہ غور کرنے پر مجبور کر دیا۔ دوسرا لڑکا شیر خوارگی میں ہی فوت ہو گیا۔ ساری لڑکیاں البتہ جوان ہوئیں لیکن تین آپؐ کی زندگی میں ہی وفات پا گئیں اور آپؐ کی صرف ایک صاحبزادی آپؐ کی وفات کے بعد

---

[1] صاحبزادوں کے نام حضرت قاسم اور عبداللہ (طیب و طاہر حضرت عبداللہؓ کے لقب تھے) اور صاحبزادیاں زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ تھیں۔

[2] آنحضرت صلعم کو بیٹوں کی وفات پر بڑا صدمہ ہوا۔ آپؐ نے یہ بھی دیکھا کہ قاسم اور عبداللہ کی بیماری کے زمانے میں حضرت خدیجہؓ نے زمانہ اسلام سے پہلے بتوں کے نام جو قربانیاں دیں اور نذریں چڑھائیں وہ بچوں کو نہ بچا سکیں اس سے آپؐ کا یہ خیال کہ مارنے جلانے والا کوئی اور ہی ہے اور بت پتھر کے ٹکڑے ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں اور راسخ ہو گیا۔ یہ خیال بت پرستی کے مسلک کے خلاف تھا۔ (حیاۃ محمدؐ)

(صرف چھ ماہ تک) زندہ رہیں۔ اور یہ فاطمہؓ تھیں جو آپؐ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ کی بیوی
بنیں۔ اور آج مسلمان ان کی اسلام کے ایک فرقے اور ایک وقت کے حکمران[1] خاندان یعنی فاطمیوں
کی جدہ یا مورث اعلیٰ کی حیثیت سے عزت کرتے ہیں۔ مزید براں انہیں موروثی امامین[2] کی
جدہ یا اُمّ الائمہ بھی کہتے ہیں۔

اگر حضرت محمدؐ کے لڑکے زندہ رہتے تو ہو سکتا ہے آپؐ کے خیالات بالکل مختلف ہوتے
لیکن آپؐ کے کوئی چھوٹے لڑکے نہ تھے کہ ان کی تربیت کی فکر ہوتی۔ چنانچہ کئے[3] ہیں مذہبی
تھے اصلاح کی تحریک چلانے پر مسلسل غور و خوض کرتے رہے۔ بار بار آپؐ اپنے ذہن میں ان
باتوں کو دہراتے جو کاروانی زندگی میں سنی تھیں۔ اور یہ خیالات اب آپؐ کو ایک اور نتیجے
پر لے آئے۔

اور وہ یہ کہ حضرت آدمؑ کے قدیم اور اصل دین کو لوگوں نے خراب کر دیا تھا۔ اس خرابی

---

[1] فاطمی خاندان جس نے مصر پر حکومت کی اور متعدد خلفاء ہوئے۔

[2] مصنف نے یہاں پر موروثی خلفاء کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یہاں اس کا مفہوم آئمہ طاہرین ہیں۔ یعنی حضرت امام حسن۔ حضرت امام حسین۔ امام علی (زین العابدین) امام محمد باقر۔ امام محمد جعفر۔ امام موسیٰ کاظم۔ امام علی رضا۔ امام محمد تقی امام محمد نقی۔ امام حسن عسکری اور امام منتظر محمد مہدی علیہم السلام۔

[3] یہودی اور عیسائی پہلے ہی بت پرستی کے خلاف تھے۔ ان کے علاوہ قریش میں سے ورقہ بن نوفل (عیسائی ہونے سے پہلے) زید بن عمرو، عثمان بن حویرث اور عبیداللہ بن جحش نے بت پرستی کے خلاف تحریک شروع کی۔

ان کا کہنا تھا کہ یہ پتھر کیا ہیں۔ نہ دیکھتے ہیں اور نہ نفع و مضرت پر قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ تحریکیں کامیاب نہ ہوئیں۔ ورقہ بن نوفل عیسائی ہو گئے۔ ظہورِ اسلام کے بعد عبیداللہ بن جحش مسلمان ہو گئے۔ زید بن عمرو عراق و شام چلا گیا اور اپنے آبائی مذہب سے متنفر ہی رہا۔ عثمان بن حویرث قسطنطنیہ جا کر عیسائی ہو گیا۔

(حیاۃ محمدؐ)

کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں یکے بعد دیگرے متعدد پیغمبر اور رسول بھیجے۔ حضرت نوحؑ ان میں سے ایک تھے۔ اسی طرح سے حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت یوحنا[1] (یحییٰ علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰؑ بھی پیغمبر تھے۔ ان میں سے حضرت ابراہیمؑ نے آپؐ کو خاص طور پر متاثر کیا۔ اللہ تعالیٰ کے دوسرے پیغمبروں کے برعکس وہ کسی خاص اعتقادی تعلیم کے لئے نہیں آئے تھے۔ حضرت محمدؐ کے نزدیک (قرآن کے الفاظ میں) نہ وہ یہودی تھے اور نہ عیسائی۔ بلکہ وہ یقینی طور پر حنیف اور ایک خدا کے پرستار تھے۔

ان نظریات نے آپؐ کی مزید غور کرنے میں رہنمائی کی۔ کیا حضرت عیسیٰؑ کو گزرے ہوئے چھ سو سال سے زیادہ نہیں ہو چکے تھے اور کیا یہ مناسب وقت نہیں تھا کہ مخلوق کی اصلاح کے لئے ایک اور پیغمبر آئے؟ کعبہ میں بے ترتیبی سے رکھے ہوئے تین سو ساٹھ بت یقیناً اس بات کی ضرورت محسوس کراتے تھے۔

اور جیسے ہی یہ خیال آپؐ کے ذہن میں سمایا تجارت میں آپؐ کی تمام دلچسپیاں کم ہوتی چلی گئیں اور جلد ہی بالکل ختم ہو گئیں۔ تنہائی اور گوشہ نشینی آپؐ کا مشغلہ بن گیا۔ کاروانی زندگی میں بھی کبھی کبھی آپؐ کو اس کی شدید خواہش پیدا ہوئی تھی جو آپؐ نے کچھ عرصہ بھیڑیں چرا کر پوری کر لی تھی لیکن اب چونکہ آپؐ مکہ کے بہت اہم شہریوں میں سے تھے آپؐ کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اب آپؐ نے صرف یہ ہی نہیں کیا کہ لوگوں سے ملنا جلنا کم دیا اور اپنے کاروانی سفر کے ساتھیوں میں بھی شاذ ہی نظر آتے تھے بلکہ اب آپؐ نے گھر سے غائب رہنا شروع کر دیا۔ حضرت خدیجہؓ نے اس میں کوئی

---

[1] یوحنا — انجیل میں انہیں جان بپتسمی JOHN BAPTIST اور عربی میں یوحنا کہتے ہیں۔ قرآن میں ان کا نام حضرت یحییٰؑ آیا ہے۔ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہم عمر اور ہم زمانہ نبی تھے۔ حضرت عیسیٰ کی نبوت اور ظہور کی خبر لوگوں میں آپ نے ہی پھیلائی بعد میں حکومت نے گرفتار کر کے آپ کو قتل کرا دیا۔

دخل نہ دیا۔ انہوں نے حتی الامکان آپ کی مدد کی لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کرسکتی تھیں حضرت محمدؐ کے دل میں جو لاوا کھول رہا تھا اس کے لئے آپؐ کو انسانی دنیا سے قطعی علیحدگی اور خلوت کی ضرورت تھی۔

جو جگہ آپ نے اپنی گوشہ نشینی کے لئے تلاش کی وہ جبل حرا[2] کی چوٹی تھی جو مکہ سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ حرا کی چوٹی پر ایک بہت بڑی چٹان تھی جس کو ریت کی رگڑ اور ہوا کے جھکڑوں نے درمیان سے پھاڑ کر ایک بڑا شگاف ڈال دیا تھا۔ یہ پہاڑی چٹان صحرائے عرب کے سورج کی خیرہ کن روشنی میں الگ تھلگ کھڑی تھی۔ نہ یہاں سرسبزی تھی اور نہ پانی۔ اس کے ایک بازو میں ایک چھوٹا سا اندھیرا غار تھا۔ یہاں پر حضرت محمدؐ دن اور بعض اوقات کئی کئی دن اور راتیں خاموش عبادت، غور و فکر اور مراقبے[3] میں گذارتے تھے

---

[1] ابھی آپ حضرت خدیجہؓ کی ملازمت میں ہی تھے کہ حضرت خدیجہؓ کو آپ کے کسی وقت میں نبی ہوجانے کا یقین ہوگیا تھا ایک مرتبہ یمن سے قافلے کی واپسی پر آپ نے دیکھا کہ حضورؐ کے سر پر کوئی چیز سایہ کئے ہوئے ہے۔ ادھر میسرہ نے ایک مرتبہ شام کے سفر سے واپسی پر بتایا تھا کہ نسطورا راہب نے آپؐ کے نبی آخر الزماں ہونے کی پیشین گوئی کی ہے۔ ادھر ورقہ بن نوفل کو بھی مکمل یقین تھا کہ آپ نبی ہوں گے اور اسی لئے سب سے پہلی وحی کی ورقہ نے ہی تصدیق کی تھی۔ ان حالات میں حضرت خدیجہؓ شادی کے بعد بعثت سے پہلے آپؐ کو غور و فکر میں ڈوبے رہنے۔ غارِ حرا میں جاکر مراقبے کرنے اور عبادت کرنے سے قطعی منع نہ کرتی تھیں، اور بچوں کے علاوہ تجارت کا کام بھی خود سنبھالتی تھیں۔ ورقہ حضرت خدیجہؓ کو مسلسل یقین دلاتے رہتے تھے کہ آنحضورؐ ضرور نبی ہوں گے۔

[2] ملاحظہ ہو نقشہ ۱ باب اوّل۔

[3] آنحضورؐ ان دنوں میں روزے رکھتے اور عبادت کیا کرتے تھے مسلسل غور و فکر کے بعد آپؐ کو عالم رویا میں حقائق کا انکشاف ہونے لگا کہ کوئی حقیقت مطلق ساری کائنات پر حاوی ہے اور اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہوسکتا۔ عوام بت پرستی اور گمراہی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں یہودیوں اور عیسائیت کی تعلیمات میں بھی حقیقت کی جانب میلان کے باوجود بُت پرستی کا رنگ جھلکتا ہے۔ ضرور اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ہے جہاں سزا و جزا ہوگی۔ ضرور کوئی ایسی عظیم حقیقت ہے جو اس ساری کائنات کی خالق ہے اور وہ اللہ کی ذات ہی ہوسکتی ہے۔ سب سے بلند۔ سب سے ماورٰی (حیاۃ محمدؐ)

آپؐ ان ایام میں بہت کم کھاتے اور بہت کم سوتے تھے۔ نتیجتاً ایک اعصابی تناؤ رہنے لگا اور یہ باتیں آپؐ کی چند سال پہلے کی تجارتی فارغ البالی کی زندگی سے بالکل مختلف تھیں۔

ان روزوں اور شب بیداریوں نے قدرتی طور پر ایک ایسے شخص کی صحت پر بُرا اثر ڈالا جو پیٹ بھر کر کھاتے، ورزش کرنے اور کھلی ہوا میں رہنے کا عادی تھا۔ کم خوابی کے علاوہ آپ کو عجیب و غریب خواب نظر آنے لگے جو جاگنے پر آپؐ کو من و عن یاد رہتے اور آپؐ گھر آ کر حضرت خدیجہؓ کو سناتے اور کبھی کبھی تو آپ بے ہوش ہو جاتے اور دیر تک فرش پر بے دم ہو کر پڑے رہتے اور کبھی کبھی آپؐ پر شدید اعصابی دورے پڑتے۔

انہی دوروں کے سبب بعض لوگوں نے یہ کہانی گھڑ لی کہ آپؐ مرگی کے مریض تھے۔ تاحال یہ ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ کافی لوگوں کا[1] کہنا ہے کہ آپؐ پر مرگی کے دورے پڑتے تھے لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جو بڑے وثوق اور دعوے سے کہتے ہیں کہ ان دوروں کا سبب وہ وجدانی کیفیت تھی جو آپؐ پر یہ جان کر طاری ہوتی تھی کہ ضرور کوئی ایسی طاقت ہے جو کعبہ کے خداؤں کے مقابلے میں لامحدود، برتر اور بہتر ہے۔ یوگ[2] کے متعلق جو کچھ ہمیں آج معلوم ہے اور جس کیفیت کو ہندوستانی یوگی اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں اس کے پیش نظر یہ نظریہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

حضرت محمدؐ کے متعلق صحیح حالات جو اس زمانے کے راویوں اور حضرت خدیجہؓ کے بیان کردہ ہیں یہ ہیں۔ پہلی وحی نازل ہونے سے کچھ پہلے یعنی جب آپؐ انتالیس یا چالیس سال کے تھے اور بعد میں ساری عمر وحی آنے پر آپ پر شدید لرزہ طاری ہو جاتا اور بعد ازاں بے ہوش ہو جاتے۔ اس کیفیت میں آپؐ کو بے حد پسینہ آتا خواہ موسم کتنا ہی سرد کیوں نہ ہو۔ بعض اوقات آپؐ کافی دیر تک زور سے آنکھیں بند کئے لیٹے اور کراہتے رہتے تھے۔

حضرت محمدؐ جانتے تھے کہ آپؐ پر اس قسم کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور اس کا آپؐ کو

---

[1] ۔ یہ مغربی مصنفین ہی ہو سکتے ہیں۔

[2] یوگ ۔ مصنف نے علم معرفت و تصوف سے ناواقفیت کی بنا پر یوگ کا ذکر کیا ہے۔ ورنہ رسول کریمؐ کی وحی کے نزول کی کیفیت کو یوگیوں کے دم سادھ لینے وغیرہ کی مثال سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش نہ کرتا۔

شدت سے احساس تھا لیکن حضرت خدیجہؓ اور آپؐ کی بعض دوسری ازواج کے علاوہ صرف چند لوگوں نے ہی آپؐ کو اس حالت میں دیکھا۔ اس کے علاوہ یہ واضح رہے کہ جتنی دیر یہ کیفیت طاری رہتی آپؐ کبھی کوئی اہم بات زبان سے نہ کہتے۔ اور وحی ختم ہو جانے کے بعد نازل شدہ قرآنی آیات کا ایک ایک لفظ واضح اور صاف طور پر لکھا دیتے۔ ہر ڈاکٹر اور طبیب اس بات کی تصدیق کرے گا کہ مرگی کا کوئی مریض ہوش میں آتے ہی واضح خیالات کے اظہار اور ہوشمندی کی باتیں نہیں کرتا اور نہ ہی ایسے مریض جسمانی طور پر اتنے صحت مند ہوتے ہیں جتنا حضرت محمدؐ اپنی وفات کے ایک ہفتہ پیشتر تک تھے۔

بہر حال خواہ یہ مرگی تھی یا ملیریا یا وجدانی کیفیت اس کی کوئی اہمیت نہیں، خواہ اس پر کتنا کچھ نہ کہا گیا ہو۔ مرگی کے سبب کبھی کوئی پیغمبر یا حکمران نہیں بنا اور نہ ہی مرگی نے کسی کو بلند مرتبے اور اقتدار پر پہنچایا بالخصوصیت سے اس زمانے میں ایسی حالت والے کو آسیب زدہ یا پاگل کہتے۔ لیکن اس زمانے میں بھی اگر کسی شخص کو واضح طور پر ہوشیار اور ہوشمند کہا جا سکتا تھا تو وہ حضرت محمدؐ تھے۔

سب سے پہلی وحی الٰہی ۶۱۰ءمیں[1] نازل ہوئی۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا اور حضرت محمدؐ روزے رکھنے، عبادت کرنے اور مراقبے کے لئے کوہ حرا[2] پر گئے ہوئے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور 'القدر'[3] (برکتوں والی) رات شروع ہو گئی تھی۔ قرآن کی رو سے شب قدر ہزار راتوں سے

---

[1] ابو جعفرؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ کو ۱۷ رمضان المبارک دوشنبے کو غار حرا میں نبوت ملی آپ اس وقت چالیس سال کے تھے (طبقات ابن سعد جزو اول، طبری نے ہشام بن محمدؐ سے بھی یہی روایت کی ہے۔

[2] کوہ حرا جبل حرا کو تقدس کے سبب جبل نور کہا جاتا ہے۔ آنحضور بعثت سے پہلے بھی ہر سال ایک ماہ غار حرا میں بسر کرتے تھے۔ قریش اسی طرح عزلت گزیں ہو کر عبادت کرتے تھے آپؐ غار حرا میں جا کر روزے رکھتے۔ ریاضت کرتے اور جو مساکین وہاں آتے انہیں کھانا کھلاتے تھے۔ (تاریخ طبری) جلد اول حصہ سوم)

[3] القدر۔ یہ تیسویں پارے کی سورۃ قدر کی طرف اشارہ ہے۔ اِنَّآ اَنزَلنٰہُ فِی لَیلَۃِ القَدرِ ٥ ..... سَلٰمٌ ھِیَ حَتّٰی مَطلَعِ الفَجرِ ٥ اس سورۃ کا مفہوم اوپر بتا دیا گیا ہے۔

بہتر ہے۔ جس میں صبح ہونے تک ساری رات سلامتی اور برکتیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ عربوں کا مقولہ ہے کہ اس رات فرشتے دنیا میں اترتے ہیں اور جبرئیل امین آسمانوں سے اللہ تعالیٰ کے فرامین لاتے ہیں۔

حضرت محمدؐ غار کے چٹائی فرش پر چادر اوڑھے لیٹے تھے اور کچھ غنودگی میں تھے۔ اچانک ایک عجیب، واضح لیکن ایسی آواز نے، کہ اس سے پیشتر کبھی نہیں سنی تھی، آپؐ کو جگا دیا۔ آواز دو مرتبہ آئی اور ہر دفعہ زیادہ تاکید سے۔ حضرت محمدؐ نے جنوں کے واہمے کے سبب اس طرف سے کان بند کرنے کی کوشش کی۔ لیکن آواز میں تواتر رہا اور کچھ زیادہ بلند ہوئی۔ اس کا اثر اتنا پریشان کن تھا کہ آپؐ بیہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو ایک سر تاپا نور فرشتے کو انسان کی شکل میں اپنے سامنے کھڑا پایا۔ وہی آواز ایک مرتبہ پھر اُبھری۔ اس نے کہا:

"اِقراء" (پڑھو)

"میں نہیں پڑھ سکتا"۔ حضرت محمدؐ نے جواب دیا۔

"اقراء" (پڑھو) فرشتے نے اصرار کیا۔

"اقراء باسمِ ربّکَ الذی خلَق ۞" (پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔)

"خَلَق الانسانَ مِن عَلَق ۞" جس نے انسان کو لہو کی ایک پھٹکی سے پیدا کیا۔

"اِقراء وربُّکَ الاکرمُ ۞ پڑھو۔ بلند ترین خدا کے نام کے ساتھ۔

"الذی عَلَّمَ بالقَلَمْ ۞ جس نے انسان کو قلم کا استعمال سکھایا۔

عَلَّم الاِنسانَ مالم یَعلَم ۞ اور سکھایا انسان کو جو وہ پہلے نہیں جانتا تھا۔

(سُورۃ العلق)

حضرت محمدؐ نے، جن میں عجیب طرح کا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا[1] ان الفاظ کو دہرایا یہاں تک

---

[1] معتبر کتابوں سے روایت ہے کہ آپ کے یہ کہنے پر فرشتے نے آپؐ سے معانقہ کیا اور آپؐ سے بغلگیر ہوا۔ بعد ازاں آپؐ میں حوصلہ پیدا ہو گیا اور آسانی سے الفاظ کو دہرایا اور یاد کر لیا۔ (طبری)

کہ وہ زبانی یاد ہوگئے ۔ اور آپ نے یہ سبق ختم کر لیا تو فرشتے نے کہا۔

"اے محمدؐ۔ یہ حقیقت ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور میں اس کا فرشتہ جبرئیل ہوں" یہ کہ کر فرشتہ غائب ہوگیا۔

حضرت محمدؐ کے اس جواب نے کہ آپؐ نہیں پڑھ سکتے تھے ایک اور بحث کا آغاز کر دیا اور بانی اسلام کے مخالف اور موافق دونوں قسم کے لوگوں نے ہی اس پر بڑی بحث کی ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ آپؐ بے پڑھے تھے لیکن بعض کا خیال ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ دونوں نظریات کو غلط یا صحیح ثابت کرنے کے لئے کوئی مستند شہادت موجود نہیں ہے۔

اس زمانے میں پڑھنا لکھنا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ جب آپؐ کے چچیرے بھائی علیؓ کرم پڑھنا لکھنا جانتے تھے تو کیا وجہ ہے کہ حضرت ابو طالب نے اپنے بیٹے کو تو تعلیم دلائی اور اپنے بھتیجے کو، جو اُن کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتے تھے، بے پڑھا رکھا؛ حضرت ہاشم اور عبدالمطلب جیسے امیر تاجروں کے گھرانے کے ایک فرد کی تعلیم کے متعلق کیوں اتنی غفلت برتی گئی ؟ اس کی ایک ہی ممکن وجہ ہو سکتی ہے کہ حضرت محمدؐ کو بچپن سے ہی تجارت میں لگ جانے کے سبب باقاعدہ تعلیم کا وقت نہ ملا۔

قرآن کے بعض انگریزی ترجموں میں حضرت جبرئیل کے حکم READ (پڑھو) کی بجائے RECITE (پڑھو۔ دہراؤ) یا CRY (بلند آواز سے پڑھو) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں عربی کے لفظ "قَرَأ" جو قرآن کا مادہ ہے، کے معنی زبانی دہرانا یا خطاب کرنا بھی ہو سکتے ہیں، لیکن مرگی والے جھگڑے کی طرح اس بات کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ حضرت محمدؐ ناخواندہ تھے یا نہیں۔ یہ بات آپؐ کے کردار یا آپؐ کی عظمت کو کسی طرح سے بھی متاثر نہیں کرتی۔ قرآن خواہ کسی صورت سے نازل ہوا یہ اپنی جگہ ایک شاہکار ہے اور یہ کہ حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ کرم، یا حضرت زیدؓ نے حضرت محمدؐ سے سن کر اس کو لکھا یا نقل کیا کوئی فرق نہیں پیدا کرتا۔

جونہی حضرت محمدؐ اس روحانی مظاہرے کی کیفیت (وحی) سے ہوش میں آئے آپؐ کو حضرت خدیجہؓ کا خیال آیا۔ اپنے ہوش مجتمع کر کے غار کے فرش سے اٹھے اور پہاڑی سے اتر کر صحرا کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ جب آپؐ جھاڑیوں میں الجھتے اور ٹھوکریں

کھاتے مکّہ کی تنگ گلیوں میں داخل ہوئے تو افق پر صبح کا اجالا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ کپکپاتے، پریشان اور لڑکھڑاتے آپؐ حضرت خدیجہؓ کے کمرہ میں پہنچے۔ ان کو جگایا، اور جو کچھ دیکھا تھا کہہ سنایا۔ ایک لمحے تو آپؐ ان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے اور اس سے پہلے کہ وہ (حضرت خدیجہؓ) اس حیرانی سے اپنے آپ کو پوری طرح سنبھالیں اور کچھ کہیں آپؐ نے اچانک ایک درد بھری چیخ ماری۔ وہ سمجھ گئیں کہ ضرور کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے۔

حضرت محمدؐ کاہنوں اور قسمت کا حال بتانے والوں سے ہمیشہ نفرت کرتے تھے۔ آپؐ کے نزدیک مافوق الفطرت باتوں کی آڑ لے کر فائدہ اٹھانا ایک چالبازی تھی اور آپؐ اسے بہت بُرا سمجھتے تھے۔ لیکن اس وقت آپؐ خود (ایسی ہی ایک بات سے دوچار تھے) ایک معمول بنے نظر آتے تھے۔ اس کے علاوہ اب جبکہ آپؐ حضرت خدیجہؓ کے کمرے میں واپس پہنچ چکے تھے۔ جہاں سورج کی شعاعیں روشندانوں میں سے اندر آرہی تھیں آپؐ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ جو کچھ آپؐ نے دیکھا کہیں خواب تو نہ تھا یا پھر اس سے بھی بُرا یہ کہ آپؐ پر کسی آسیب کا اثر تو نہ تھا۔

حضرت خدیجہؓ کو اپنے شوہر سے بہت محبت تھی اور شادی کے بارہ سال بعد اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا تھا۔ اب جبکہ آپ ان کے سامنے سوالیہ نگاہیں، بغیر کنگھا کئے ڈاڑھی اور بال اور غار کی گرد اپنے کپڑوں پر لئے کھڑے تھے تو انہوں نے اپنے دل میں آپ کے لئے ایک بچے کا سا گہرا پیار محسوس کیا۔ آپ ان کے شوہر تھے اور اس وقت بہت تکلیف اور پریشانی میں تھے۔ حضرت خدیجہؓ کے دل میں آپ کی محبت امنڈ آئی۔ آپ نے حضرت محمدؐ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی تسلّی دی اور سنجیدگی سے کہا:

"اللہ ہی میرا حافظ و ناصر ہے۔ اے ابوالقاسم" وہ اپنے گذرے ہوئے صاحبزادے قاسمؓ کے واسطے سے آپؐ کو ابوالقاسم کی کنیت سے خطاب کرتی تھیں "پیارے شوہر! آپؐ کو بشارت ہو۔ اور آپؐ سلامت رہیں۔ میں

لہ حیات محمدؐ۔ تاریخ طبری (جلد اول۔ حصہ سوم)

اس خدا کو جس کے ہاتھ میں خدیجہؓ کی جان ہے حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ آپؐ اس کی مخلوق میں اس کے نبی اور پیغمبر ہوں گے۔" اور پھر انہوں نے کہا ——

"کیا آپ ہمیشہ صلہ رحمی کرنے والے، پڑوسیوں پر مہربان، غریبوں کی امداد کرنے والے مسافر کی تواضع کرنے والے، وعدہ کے پابند اور حق کے طرفدار نہیں رہے ہیں۔"

ان حوصلہ افزا باتوں سے حضرت محمدؐ کی پریشانی کچھ کم ہوئی۔ آپؐ مسکرائے۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ کو بازوؤں میں لے لیا اور کچھ دیر آپ کو دبائے رکھا۔ پھر مشورہ دیا کہ آپ کچھ دیر آرام کریں۔ یہ کہہ کر وہ دوڑی ہوئی ورقہ بن نوفل کے پاس پہنچیں اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔

ورقہ اب بوڑھے ناتواں اور نابینا ہو گئے تھے۔ وہ اپنی چٹائی سے مشکل سے ہی اٹھتے تھے لیکن حضرت خدیجہؓ کے بیان کردہ واقعات سن کر وہ اُٹھ بیٹھے اور بلا کسی تامل کے انہوں نے حضرت خدیجہؓ کو یقین دلایا کہ جو کچھ حضرت محمدؐ نے بتایا ہے وہ یقینی طور پر سچ ہوگا کیونکہ ان کے شوہر اللہ تعالیٰ کے منتخب بندے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ خوشی سے پھولی نہ سمائیں اور اپنے ابن عم کا پیغام سنانے کے لئے حضرت محمدؐ کے پاس تیزی سے واپس آئیں۔ آپؐ کے لئے اس سے زیادہ اور کیا خوشی کی بات ہو سکتی تھی۔ کیونکہ آپؐ کو ورقہ پر بڑا یقین تھا۔ اور آپؐ نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ وہ ایک ایسے شخص ہیں جو بڑی مستند بات کہتے ہیں۔

حضرت محمدؐ ایک مرتبہ پھر سو گئے۔ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو چادر اڑھا دی اور چٹائی[1] کے پاس بیٹھ کر دیکھنے لگیں۔ جلدی ہی ایک مرتبہ پھر آپؐ کانپنے اور کراہنے لگے اور پسینے کے قطرے آپؐ کی پیشانی پر نمودار ہو گئے۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ پر اور کپڑے ڈال دیئے۔ کچھ دیر آپ کراہتے اور بڑبڑاتے رہے۔ پھر آپؐ تن کر اُٹھ بیٹھے۔ اور اپنے سامنے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہے۔ جیسے آپؐ کسی کی بات سن رہے ہوں۔ کچھ دیر بعد آپؐ نے یہ الفاظ اس طرح ادا کئے جیسے سبق دہرا رہے ہوں۔ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم)

---

[1] چٹائی۔ عرب میں چارپائی کا دستور نہیں۔ ہر شخص چٹائی یا گدا یا قالین بچھا کر سوتا ہے۔ اللہ کے نبی بھی سب کی طرح چٹائی پر ہی آرام کرتے تھے۔

يَا اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ | اے چادر میں لپٹے۔ کھڑا ہو اور اللہ کا خوف دلا۔
وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ | اپنے رب کی بڑائی بول اور اپنے کپڑے پاک رکھ
وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ | اور نجاست کو چھوڑ دے۔

(سورۃ مدثر)[1]

پھر حضرت محمدؐ کی آواز کم ہوتی چلی گئی لیکن آپؐ مسلسل اسی طرف دیکھتے رہے۔ جیسے مزید وحی کی توقع ہو لیکن جب اور کچھ نہ ہوا تو آپؐ بیوی کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا "خدیجہؓ آرام اور سونے کا وقت گزر گیا۔ جبرئیل نے مجھے یہ حکم پہنچایا ہے کہ لوگوں کو اللہ کا خوف دلاؤں اور انہیں اس کی عبادت کی طرف بلاؤں"[2]

یہ کہہ کر آپؐ کھڑے ہو گئے اور ورقہ سے بات کرنے کے لئے تیزی سے روانہ ہو گئے۔ بوڑھے ورقہ ان کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ حضرت محمدؐ سے حال سننے کے بعد حضرت خدیجہؓ کے ہاتھ بھیجے ہوئے پیغام کی تصدیق کر دی اور مزید کہا۔

"میں[3] اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں ورقہ کی جان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اپنی مخلوق کے لئے پیغمبر چن لیا ہے اور عظیم ناموس[4] جو اللہ کا معتبر فرشتہ ہے آپؐ کے پاس آیا تھا۔ یہ لوگ آپؐ کو جھٹلائیں گے، طرح طرح کی تکلیفیں دیں گے۔ یہاں سے نکال دیں گے اور آپؐ کے خلاف لڑیں گے۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا اور آپؐ کے لئے لڑ سکتا۔"

پھر ورقہ نے آپؐ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ حضرت محمدؐ نے اپنے اس عزیز کا شکریہ ادا کیا اور فکر میں ڈوبے ہوئے گھر کی طرف چل دیئے۔ ورقہ کے بے ساختہ جوش اور ولولے نے آپؐ کا

---

[1] سورۃ مدثر۔ پارہ ۲۹۔ چوہترویں سورۃ۔ یہ شروع کی پانچ آیتیں ہیں۔

[2] سیرۃ الرسول (مولانا وارث کامل (صفحہ ۱۷۴-۱۷۵)

[3] آپؐ کی یہ ملاقات کچھ دن بعد بیت اللہ میں ہوئی اور یہ باتیں انہوں نے آپؐ سے وہاں کہیں (طبری، سیرۃ الرسول (صفحہ ۱۷۵)

[4] ناموس۔ اللہ کا عظیم اور معتبر فرشتہ حضرت جبرئیل

حوصلہ بڑھا دیا۔ اور غار میں جو کچھ پیش آیا تھا اب وہ اتنا ہی صحیح اور واقعی معلوم ہونے لگا جیسا وہ دیکھتے وقت نظر آتا تھا۔

ورقہ کی یہ یقین دہانی آپؐ کے لئے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ آپؐ ایک سچے اور مخلص انسان تھے اور اس بات کا یقین کر لینا چاہتے تھے کہ جن احکام الٰہی اور اس کے پیغامات کا آپؐ اعلان کرتے ہیں وہ آپؐ کے اپنے تخیل کی پیداوار تو نہیں۔ آپؐ چاہتے تھے کہ آپؐ جو بات کہیں وہ اللہ کی جانب سے ہی کہیں۔ درحقیقت آپؐ اتنے محتاط تھے کہ آپ چاہتے تھے کہ جو اعلانات بھی کریں اس میں کسی انسانی دخل یا اثر کا شائبہ تک نہ ہو۔ اسی لئے اکثر و بیشتر آیات اور احکام کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے حکم "قُل" (کہہ دو اے محمدؐ) سے شروع ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن میں سے کہیں سے لی ہوئی ایک آیت اس طرح شروع ہوتی ہے:

"کہہ دو موت کا فرشتہ جس کو تمہارے ساتھ لگا دیا گیا ہے۔ (تمہاری جان نکال لے گا اور) تمہیں مردہ بنا دے گا۔ پھر تم اپنے رب کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔"

اسی طرح قرآن کی ایک کے سوا تمام سورتیں اس طرح شروع ہوتی ہیں:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیرانی کی بات یہ ہے کہ ورقہ بن نوفل نے اس قدر بلا تامل اس بات کی تصدیق کس طرح کر دی کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں تھی کہ وہ پہلے تین مذہب بدل چکے تھے اور اب چوتھا اختیار کر لینا ان کے نزدیک ایک اچھا خیال تھا۔ یا ان کو کوئی روحانی فیضان حاصل تھا یا ان کو حضرت محمدؐ کو آئندہ ملنے والی عظمت کا احساس ہو گیا تھا؟ وجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں۔ کہ ابتدا میں اس نئے دین کو آگے بڑھانے میں ورقہ کا بڑا ہاتھ تھا۔

بہرحال سکون اور حوصلہ ملنے کے باوجود حضرت محمدؐ نہیں جانتے تھے کہ انہیں آئندہ کیا کرنا چاہئے۔ ایک مایوسی کا سا احساس آپؐ پر طاری ہونا شروع ہو گیا۔ اور کچھ روز بعد تو آپؐ پریشان رہنے لگے اور ذہن میں ایسے خیالات جگہ لینے لگے کہ اگر یہ سب کچھ

قدرت کا ایک کھیل یا مذاق ہوا تو کیا بنے گا؟ اور اگر مزید وحی[1] نہ آئیں تو کیا ہو گا؟ آپؐ شدت سے جبرئیل امین کے منتظر تھے کہ مزید نشانی لائیں لیکن وقت گزرتا گیا اور کوئی فرشتہ نہ آیا۔ آپؐ پریشان ہو کر رہ گئے اور پھر خوف نے آپ کو گھیر لیا۔ آخر کار قطعی مایوسی کی حالت میں آپؐ غارِ حرا واپس گئے۔ جبل حرا بالکل ویسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسا ہمیشہ تھا۔ یعنی صحرا کے سورج کی روشنی میں چکا چوند کرتا۔ جھلملاتا اور خشک۔ حضرت محمدؐ اس نتیجے پر پہنچے کہ انہوں نے اپنے آپؐ کو خود ہی بے وقوف بنا لیا ہے۔ اور آپؐ نے خود ہی کچھ کیا ہے جس کا مذاق اُڑاتے تھے۔ آپؐ نے یہ باتیں پھیلا کر خود کے کاہن[2] ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ اور اپنی بیوی کو بلاوجہ اپنے نبی ہونے کا یقین دلا دیا ہے کہ آپؐ اللہ کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ آپؐ شرم سے پانی پانی ہو گئے اور تیزی سے دھوپ میں چمکتی عمودی چٹان پر پہنچے تاکہ خود کو نیچے گرا دیں۔ اس شرم سے بچنے کے لئے اب آپؐ کے پاس یہ ایک ہی بات رہ گئی تھی لیکن جونہی آپؐ نے کنارے سے آگے قدم بڑھانے کا ارادہ کیا جو آپؐ کو موت کی وادی میں لے جاتا آپؐ نے جبرئیلؑ کو دیکھا جنہوں نے ہاتھ اٹھا کر آپؐ کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ اور راسی صاف اور جانے پہچانے لہجے میں بلند آواز سے کہا:۔

"میں جبرئیلؑ ہوں اور آپ محمدؐ۔ اللہ کے رسول"۔

---

[1] واقعہ یہ تھا کہ آغاز وحی کے بعد کچھ روز تک سلسلہ وحی منقطع رہا۔ اس لئے آپؐ پریشان اور مایوس ہو گئے اور مایوسی کے سبب آپؐ نے کئی مرتبہ اپنے آپ کو پہاڑ سے گرانا چاہا پھر آپؐ نے غارِ حرا میں جا کر خشوع و خضوع سے بارگاہِ ایزدی میں دعا کی "یا اللہ تو نے پہلے ہی مجھے کیوں اس اعزاز و اکرام سے نوازا تھا۔ اب اس بیزاری اور بے توجہی کا کیا سبب ہے"۔ حیاتِ محمدؐ (سیرۃ الرسول)۔ صفحہ ۱۰۷)

[2] کاہن۔ قیافے یا دیگر طریقوں سے آئندہ کا حال بتانے والا۔ دھوکے اور فریب سے کمانے والا زمانہ جاہلیت میں اس کا عام رواج تھا۔ رسول کریمؐ ایسے کاہنوں کو بہت بُرا سمجھتے تھے۔ البتہ عیسائی کاہن بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ انجیل میں حضرت یحییٰؑ اور حضرت ذکریاؑ کو بھی کاہن کہا ہے۔

یہ کہہ کر فرشتہ غائب ہو گیا اور حضرت محمدؐ چٹان کے کنارے کھڑے رہ گئے۔ آپؐ نے قدم اٹھانا چاہا لیکن آپؐ کے اعضاء سن ہو گئے۔ آپ کی گویائی ختم ہو گئی اور آپؐ کی حالت ایک بے حس و حرکت مرمریں مجسمے کی سی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جبرئیل آپؐ کو گر کر چھینٹ چھینٹ ہونے سے صرف اس لئے بچا گئے تھے کہ آپؐ معتوب ہو کر بھوکوں مر جائیں۔ آپؐ شاید ایسا ضرور کر گزرتے لیکن حضرت خدیجہؓ کے خیال نے روک دیا۔

حضرت خدیجہؓ جانتی تھیں کہ اس وقت ان کے شوہر سخت ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ جب آپؐ صحرا کی طرف روانہ ہوئے تو وہ سمجھ گئی تھیں کہ آپؐ کہاں گئے ہوں گے اور جب آپؐ واپس نہ آئے تو انہوں نے ایک آدمی آپؐ کی تلاش میں بھیجا۔ آپؐ اس کو سکتے کی سی حالت میں چٹان کے کنارے کھڑے ملے۔ وہ آپؐ کو گھر لے آیا۔ اس طرح حضرت خدیجہؓ ایک مرتبہ پھر انجانے طور پر اسلام کی حفاظت کر رہی تھیں۔ کیونکہ اگر حضرت محمدؐ تنہا ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ آپؐ ان پریشانیوں اور اضطراب میں اپنی جان دے دیتے۔ اگر آپؐ نے ایسا نہیں کیا تو کچھ تو اس میں آپ کے اپنے ارادے کی مضبوطی کا دخل تھا لیکن اس کی بڑی وجہ آپؐ کی عمر رسیدہ بیوی کی شفقت اور سمجھ بوجھ تھی۔ انہوں نے اس سارے عرصہ میں کسی وقت ذرا سی بھی بے یقینی یا بے اعتباری کا اظہار نہیں کیا اور ہر وقت آپؐ کی حوصلہ افزائی کرتی رہتی تھیں اور غالباً ان کی اس وفاداری اور ایثار نے ہی ان کے متعلق قرآن میں آپؐ سے یہ لکھوایا[1]۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

والضحیٰ ۝ قسم ہے دوپہر کی چڑھتی دھوپ کی

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اس خیال کے گروہ کا حامی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وحی خیال کی صورت میں آتی تھی اور آپ اسے الفاظ کا جامہ پہناتے تھے۔ اس نظریے کا کئی جگہ اعادہ کیا ہے جمہور کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی الفاظ کی صورت میں نازل ہوتی تھی۔ اور آپؐ اسے من وعن لکھا دیتے تھے۔ قرآن کی بے مثال زبان خود اس کی دلیل ہے۔ خود عرب کہتے تھے کہ یہ انسان کا لکھا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ	اور رات کی جب وہ چھا جاوے
مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۞	نہ تیرے رب نے تجھے چھوڑا اور نہ بیزار ہوا
وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۙ	اور البتہ آخرت بہتر ہے پہلی زندگی سے
وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۞	اور آگے دے گا تیرا رب پھر تو راضی ہوگا
اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۞	کیا نہ پایا اس نے تجھ کو یتیم۔ پھر تجھ کو پناہ دی
وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۞	اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ دی
وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۞	اور پایا تجھ کو مفلس پھر غنی (دولتمند) کر دیا

(سورۃ والضحٰی - پارہ عم)

یوں تو حضرت محمدؐ کی زندگی میں آئندہ اور عورتوں کو بھی آنا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی نہ تھی جس کے متعلق آپؐ کے جذبات اتنے پرخلوص اور مملو از تعریف ہوں، جتنے حضرت خدیجہؓ کے لئے تھے۔ ان کا اپنے محبوب شوہر میں بلا تصنع اور پُرخلوص اعتماد ہی اس دین میں اس کے ابتدائی مراحل میں یقین پیدا کرنے اور اسے سچا ثابت کرنے کا موجب بنا وہ دین کہ آج دنیا کی آبادی کا ہر ساتواں آدمی اس کا پیروکار ہے۔ حضرت محمدؐ کے بعض سوانح نگار اس میں الجھے ہوئے ہیں کہ حضرت محمدؐ نے اپنی زندگی روحانیت کے ایک پرجوش علمبردار کی حیثیت سے شروع کی یا (نعوذ باللہ) ایک شاطر اور نبوت کے جھوٹے دعویدار کی شکل میں۔ حضرت خدیجہؓ ان کے اس سوال کا خاطر خواہ جواب دیتی نظر آتی ہیں اور وہ اس طرح۔

یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ حضرت خدیجہؓ جیسی فہم و فراست رکھنے والی خاتون ایک ایسے شخص کو پہلے اپنا سالار کارواں، پھر اپنے تجارتی ادارے کا مہتمم اور آخر میں اپنا شوہر بنائیں جو نبوت کا شاطر اور جھوٹا دعویدار ہو۔ یا صرف جھوٹا دعویدار ہی ہو چالباز نہ ہو اور نہ ہی اس بات کا امکان غالب ہے کہ آپؐ جیسا خاندانی اور بااثر مدعی نبوت اتنے یقینی اور منفعت بخش سنہری موقعوں سے اتنا کم فائدہ اٹھاتا۔ اور نہ ہی ایسا ممکن معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسے کردار کا شخص (نعوذ باللہ جھوٹا مدعی) ایک دولت مند مالکہ سے شادی کر کے اس کے مرنے تک اس کا وفادار رہتا یا اس شادی کے منفعتی پہلوؤں کو

چند اُدھائی الہامات کی خاطر نظر انداز کر دیتا۔

میں نے یہاں پر اس بات پر اس لئے زور دیا ہے کہ جو کچھ اس کے بعد ہوا تاریخ کی روشنی میں وہی حضرت محمدؐ کی زندگی کا اصل آغاز ہے۔ حضرت محمدؐ کے متعدد سوانح نگار آپؐ کی بعثت سے پہلے کے یہ چالیس سال صرف چند صفحوں یا ایک دو پیروں میں ختم کر دیتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ چالیس سال ہی آپؐ کی شخصیت کی صحیح وضاحت کرتے ہیں۔ آپؐ کے کردار کو نکھارتے ہیں اور بانیٔ اسلام کی زندگی کی حقیقت اور خلاصہ ہیں۔

پانچواں باب

مخالفتیں اور اذیتیں

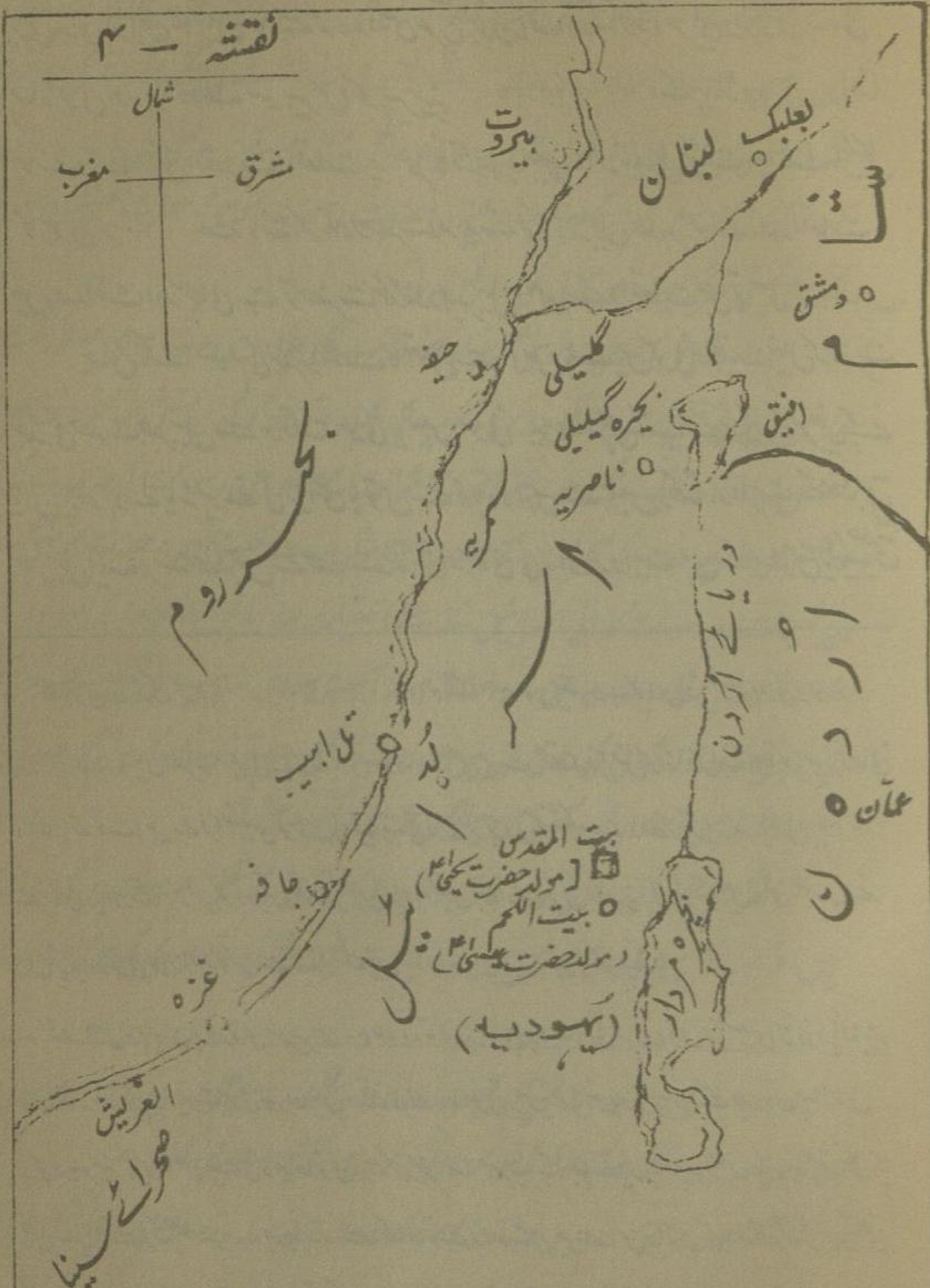
۶۱۲ تا ۶۱۹ عیسوی

جو مغربی مصنفین حضرت محمدؐ کو نبوت کا عیار اور جھوٹا مدعی بتاتے ہیں وہی آپؐ کے رویاء اور روحانی مشاہدات کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ ایسے تمسخر کے خلاف ثبوت اور عدم ثبوت کے طور پر اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ 'عہد نامہ عتیق' کے تقریباً ہر باب میں اور 'عہد نامہ جدید' کے بہت سے ابواب میں ایسے واقعات کا ذکر ملتا ہے جو اپنی نوعیت میں اُن سے زیادہ عجیب یا مختلف نہیں جو جبل حرا پر پیش آئے اور یہ خیال کہ وہ تاریخ کے ایسے ادوار سے تعلق رکھتے ہیں جن کی سرحدیں روایتی یا من گھڑت قصوں کے عہد سے ملتی ہیں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اگر معجزات اور وحی و الہامات پر یقین ہے تو وہ کسی خاص زمانے سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ حضرت عیسیٰ سے دو ہزار سال قبل اور دو ہزار سال بعد بھی رونما ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ حضرت محمدؐ کا غارِ حرا کے واقعات پر مذاق اڑاتے ہیں انہیں لازم ہے کہ وہ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کا کوہ طور پر اور حضرت عیسیٰؑ کا گیلیلی[1] کی پہاڑیوں پر پیش آمدہ واقعات

---

[1] گیلیلی (GALILEE) حضرت عیسیٰ کے زمانے میں فلسطین کا ایک صوبہ یا ضلع۔ اب اسرائیل کا حصہ ہے۔ حضرت عیسیٰ نے اپنی تبلیغ یہاں سے ہی شروع کی اور یہاں ہی پہلے پہل بیماروں، مفلوجوں، کوڑھیوں اور اندھوں کو اچھا کیا۔ یہاں پر ہی آسمان کے دروازے آپ پر کھل گئے اور آپؑ نے روح القدس کو کبوتر یا فاختہ کی شکل میں اترتے دیکھا۔ (انجیل متی) (ملاحظہ ہو نقشہ ۴)



مولد حضرت عیسیٰ علیہ السلام
و دیگر مقامات

پر بھی مذاق اڑائیں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ اسی طرح جون آف آرک[۱] کو ڈومریمی (فرانس) کی پہاڑیوں اور برنا ڈوٹ[۲] سوبیرس کو پیرنیز PYRANNIES کے پہاڑوں میں رونما ہونے والے مافوق الفطرت واقعات پر تمسخر کا نشانہ بنائیں۔ اگر تبدیلی ہیئت، سینٹ مائیکل کا جون JOAN سے بات کرنا اور حضرت مریم کے لُورڈز میں ظاہر ہونے کے واقعات میں صداقت اور سچائی ہے تو حضرت محمدؐ اور جبرئیل امین کے واقعات بھی تو اسی طرح کے ہیں۔

جہاں تک اسلام کی سرگزشت کا تعلق ہے اس بات میں کوئی اہمیت نہیں کہ حضرت محمدؐ کی حضرت جبرئیل سے ملاقات ہوئی یا نہیں ہوئی۔ یہ معاملہ بھی آپ کے مرگی کے مریض ہونے یا ان پڑھ ہونے یا نہ ہونے کی نزاعی باتوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ روایت کے مطابق جبرئیل ایک فرشتہ تھا جس نے حضرت محمدؐ کی رہنمائی کی۔ اور روایت ہی کے مطابق یہ ایک حلیتی[۳]

---

[۱] جون آف آرک JOAN OF ARC (۱۴۱۲ء تا ۱۴۳۱ء) مشہور ہے کہ اس فرانسیسی لڑکی کو لورڈز LOURDS میں حضرت مریم کی زیارت ہوئی۔ الہامات بھی ہوتے تھے کہ فرانس کو آزاد کرائے چنانچہ انہی روحانی احکام کے تحت اس نے فرانسیسی فوجوں کی قیادت کی اور انگریزوں کو شکست دے کر آرلینز ORLEANS سے نکال دیا اور شاہ چارلس کو دوبارہ تخت نشین کرا دیا۔ لیکن بعد ازاں جون انگریزوں کی قید میں آ گئی جنہوں نے اس پر جادوگرنی کا الزام لگا کر اسے زندہ آگ میں جلا دیا۔ (بیبیرز انسائیکلو پیڈیا)

[۲] اصل نام میری برنارڈی سوبیرس۔ ۱۸۴۴ء تا ۱۸۷۹ء۔ چودہ سال کی عمر میں اس فرانسیسی لڑکی کو پاک مریم کی لورڈز کے مقام پر زیارت ہوئی اور بعد میں وقفے وقفے سے ہوتی رہیں۔ فرانس اور اسپین کے درمیان پہاڑوں (کوہ پیرنیز) میں اس عیسائی ولیہ خاتون سے کئی معجزات منسوب کئے جاتے ہیں مثلاً پہاڑ میں ایک نیا چشمہ نکل آیا جس کے پانی سے لوگ صحت یاب ہو جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت مریم سے اس خاتون کی بالمشافہ گفتگو ہوتی تھی لیکن حضرت مریم اور کسی کو نظر نہیں آتی تھیں۔ (سینچری انسائیکلو پیڈیا آف نیمز)

[۳] جلتی جھاڑی۔ کوہ طور پر حضرت موسیٰ کو آگ نظر آئی قریب پہنچے تو یہ آگ ایک پیڑ سے نکلتی دکھائی دی یہ ہی اللہ تعالیٰ کا جلوہ تھا۔ (باب ۳۔ خروج۔ پرانا عہد نامہ) قرآن کی رُو سے بھی یہ واقعہ صحیح ہے۔ یہاں ہی حضرت موسیٰ[۴] کی اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی ہوئی اور الواح توریت ملنے کا شرف حاصل ہوا۔

جھاڑی تھی جس نے حضرت موسیٰؑ کو راستہ پر ڈالا۔ اور یہ بھی ایک روایت ہی ہے کہ یہ یوحنا[1] یا جان بپتسمی JOHN BAPTIST تھے جنہوں نے بہشت کی ایک فاختہ[2] کی امداد سے حضرت عیسیٰ کو مبلغ بنایا۔ بہر حال اگر یہ روحانی وسائل نہ بھی ہوتے تب بھی اس بات کے باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ان کے بغیر بھی ان تینوں حضرات (حضرت موسیٰؑ۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ) کی تبلیغی سرگرمیوں میں کوئی کمی واقع ہوتی۔

ہم جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے مذہب کی بنیاد اپنی عرب بیوی صفورا[3] سے حاصل کی ہوئی تعلیمات پر رکھی۔ اس مذہب کی بنیاد (یاہو[4]) کی پرستش پر تھی، جو صحرا کا مقدس خدا تھا اور ایک خیمے میں رہتا تھا۔ "یاہو" خدا کے حضور جن رسومات کی ضرورت تھی وہ خصوصی طور پر عرب کے صحراؤں کے خانہ بدوش لوگوں سے متعلق تھیں۔ حضرت موسیٰؑ نے ان تعلیمات اور رسومات کو بنی اسرائیل کے لئے اختیار کر لیا۔ "یاہو" کا نام بدل کر یہووا — JAHOVA رکھ دیا اور یہ ہی رسومات آہستہ آہستہ یہودی مذہب بن گئیں۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ خداوند تعالیٰ کی روح ان میں سرایت کر گئی ہے تو غالباً ان کو یہ صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ مذہبی احکام اُن کے ذہن میں کس طرح مرتب ہوئے۔

حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے آغاز اور شروع کی باتوں کے متعلق ہم بہت ہی کم جانتے ہیں۔ قریب قریب وہ ایسی ہی ہوں گی۔ جیسی حضرت محمدؐ کی۔ قیاس کہتا ہے کہ حضرت

---

[1] جان بپٹسٹ (یوحنا) حضرت عیسیٰؑ کے ہمعصر اور دست راست تھے حضرت عیسیٰؑ کی آمد اور ان کی نبوت کی خبر انہوں نے ہی پھیلائی۔ رومن بادشاہ نے آپ کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ قرآن کریم میں انہی کو حضرت یحییٰؑ کہا گیا ہے۔

[2] فاختہ: حضرت عیسیٰ کو اردن میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ آسمان سے اترتی ہوئی ایک فاختہ یا کبوتر کی شکل میں نظر آیا۔ (باب ۳۔ انجیل۔ متی)

[3] صفورہ ZIPPORAH پرانے عہد نامے کی رو سے یہ حضرت موسیٰؑ کی عرب بیوی کا نام تھا اور آپ نے یہودی مذہب کی تعلیمات ان ہی کی امداد سے مرتب کیں۔ (باب ۲۔ خروج۔ پرانا عہد نامہ)

[4] یاہو یا یہووا JAHOVA یا یہودا۔ اللہ تعالیٰ کا قدیم نام (پرانا عہد نامہ)

عیسٰی بھی ایک ذہین لڑکے ہوں گے۔ جلدی ہی انہوں نے لکھ پڑھ لیا ہو گا حضرت محمدؐ کی طرح انہیں بھی ملازمت آسانی سے مل گئی ہو گی۔ انہوں نے بھی ایسا ہی قبولیت والا ذہن اور طبع رسا پائی تھی جیسی حضرت محمدؐ کی تھی جس میں لاشعوری طور پر خیالات جاگزیں ہوتے رہتے تھے اور حضرت محمدؐ کی طرح ان کے ذہن میں بھی یہ خیالات برسوں خوابیدہ پڑے رہے ہوں گے اپنے ان خیالات کی اہمیت کا صحیح اندازہ غالباً ان حضرات میں سے کسی کو بھی نہیں ہوا جب تک کہ وہ روح میں ایک سخت ہیجان اور ارتعاش پیدا کرنے والی وحی اور الہامات کی شکل میں ظاہر نہیں ہو گئے۔ قیاس کہتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ اور حضرت محمدؐ دونوں ہی اپنی ان یادوں اور ان خیالات کو ان کی نئی شکل میں بالکل نہ پہچان سکے ہوں گے۔ اور انہوں نے ان باتوں کو صدق دلی سے اللہ تعالیٰ کا پیغام اور حکم سمجھا۔ خیال غالب ہے ایسا ہی ہوا[1] ہو گا۔

چنانچہ غارِ حرا[2] کا واقعہ بھی اس سے زیادہ بحث کا موضوع نہیں بن سکتا جتنا کہ "جلتی جھاڑی"، یا اردن کے اوپر آسمانی فاختہ کی اڑان۔ حضرت محمدؐ نے بھی ہمیں وہ ہی کچھ بتایا ہے جو ان کے خیال میں وقوع پذیر ہوا۔ اور اسے ہمیں اسی طرح مان لینا چاہئے جیسے حضرت موسٰیؑ کے چالیس دن اور چالیس راتیں صحرا میں گزارنے اور (توریت کی) پتھر کی الواح لانے کو مانتے ہیں۔ درحقیقت حضرت محمدؐ شروع شروع میں غار میں پیش آنے والے واقعہ کو کسی کو بتانے میں بڑے محتاط تھے۔ حضرت خدیجہؓ اور ورقہ[3] کے علاوہ بہ استثنا زیدؓ اور کسی سے ذکر تک نہ کیا۔ اور اصل میں حضرت زید[4]ؓ کو بھی آپؐ نے خود نہیں بتایا بلکہ ان کو اتفاقاً معلوم ہو گیا۔ گھر میں

---

[1] یہ مصنف کا اپنا قیاس ہے۔

[2] غار حرا۔ مکہ مکرمہ سے عرفات کی طرف جاتے ہوئے تقریباً تین میل کے فاصلے پر جبل حرا (جبل نور) کی چوٹی پر واقعہ ہے، ملاحظہ ہو نقشہ ۱ پہلا باب)

[3] ورقہ بن نوفل۔ حضرت خدیجہؓ کے ایک ابن عم جو حق کی تلاش میں بت پرستی چھوڑ کر پہلے یہودی ہوئے اور پھر عیسائی۔ انہوں نے سب سے پہلے آپؐ کے نبی ہونے کی تصدیق کی۔ ایک عالم اور زاہد بزرگ تھے۔

[4] حضرت زیدؓ بن حارث۔ ایک عیسائی غلام اور خادم۔ ان کی محبت اور وفاداری کے سبب آنحضرتؐ نے ان کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔

گود لئے بیٹے کی حیثیت سے انہوں نے اپنے منہ بولے والدین (حضرت محمدؐ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ) کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سن لیا تھا۔ اور جب انہیں معلوم ہوا کہ حضرت محمدؐ کے مذہبی نظریات ان کے اپنے دین عیسوی سے بہت ملتے جلتے ہیں تو اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا اور اپنے آزاد کرنے والے مالک (رسول اللہؐ) کے پیروکار بن گئے۔

اسی طرح حضرت علیؓ ایک دن گھر میں آئے تو دیکھا کہ حضرت محمدؐ اور حضرت خدیجہؓ ایک نئے طریقہ کی عبادت کر رہے ہیں اگرچہ وہ متعدد معبودوں کے ماننے والے ہاشمی خاندان کی روایات میں پلے بڑھے تھے بلا تامل اپنے ابن عم (حضرت محمدؐ) کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے۔

جلد ہی کچھ اور قریبی عزیزوں کو رازداری میں لے لیا گیا۔ اور وہ اپنے غلاموں کے ساتھ ایمان لے آئے۔ یہ تھے حضرت آمنہ کے بھتیجے سعدؓ (ابن ابی وقاص) حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے زبیرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے ایک چچیرے بھائی طلحہؓ۔ اس کے بعد مستقبل میں ہونے والے ایک خلیفہ اور اپنی والدہ کی طرف سے حضرت عبدالمطلب کے نواسے حضرت عثمانؓ (ابن عفانؓ) اسلام لائے۔ پھر عبدالرحمٰن بن عوفؓ، ابوعبیدہؓ اور ابوسلمہؓ اور چند دوسرے لوگ مسلمان ہوئے۔ جنہوں نے آئندہ چل کر اسلام کی سربلندی کے لئے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

حضرت محمدؐ کو اس قدر محتاط کیوں ہونا پڑا اس کا سبب کعبہ کے لوگ تھے۔ یعنی کعبہ کے اہل کار اور شہر مکّہ کے منتظمین۔ ان لوگوں کی حاکمانہ مخالفت کے سبب حضرت محمدؐ کو کسی کامیابی کا موقعہ ملنا بڑا مشکل تھا۔ اہل کعبہ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک وہ جو حضرت محمدؐ کے جدِ اعلیٰ حضرت ہاشم کے خاندان سے تھے اور دوسرے وہ جو اسی نسل کے ایک اور بڑے سردار عبدشمس کی اولاد تھے۔ ہاشمی اس وقت صاحب اقتدار تھے اور عبدشمس والے اُن سے یہ اختیار چھین لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اگر وہ کسی صورت سے ہاشمی خاندان کے ہی ایک فرد حضرت محمدؐ کے ذریعہ کعبہ کے متولیوں (ہاشمیوں) پر بے دینی اور کعبہ کی بے حرمتی کا الزام لگا سکتے تو یہ بہت حد تک ان کے مفاد میں جاتا تھا۔

اس وقت عبدشمس گروہ کا سربراہ ابوسفیان تھا جو ایک امیر تاجر اور دولتمند شخص

تھا۔جس کا خاندان اور دولت کئی نسلوں سے مکے میں روایتی طور پر مشہور تھے۔قومی پرچم کی علمبرداری کے سبب،جس کے تحت اہل قریش لشکرکشی کرتے تھے،اس کی حیثیت ایک سپہ سالار جیسی تھی۔اس کی اپنی شخصیت بھی اس کے فوجی عہدہ کے شایانِ شان تھی۔چہرے مہرے سے بھی وہ ایک سالار اور جنگجو معلوم ہوتا تھا۔قد لمبا اور چھریرا اور نقوش خوبصورت واضح اور گہرے تھے۔ڈاڑھی چھوٹی،تراشیدہ اور سیاہ بھنور تھی اور کشادہ پیشانی کے نیچے سیاہ چمکتی آنکھیں نظر آتی تھیں۔وہ عورتوں میں بہت مقبول تھا اور اس نے مکہ کی ایک حسین اور مغلوب الغضب عورت ہند سے شادی کی تھی۔ہند بھی حضرت خدیجہؓ کی طرح ایک کاروباری عورت تھی اور اپنا زیادہ وقت سٹہ لگانے اور خانہ بدوش لوگوں کو بہت زیادہ سود پر روپیہ دینے میں گزارتی تھی۔

شہر کے ہر معاملے میں ابوسفیان کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور عام طور پر کوئی مخالفت اس کے سامنے نہیں ٹھہرتی تھی۔کچھ اپنی ذاتی وجوہ کی بنا پر اور کچھ خاندانی رقابت کے سبب حضرت محمدؐ سے اسے ازلی دشمنی تھی۔

حضرت محمدؐ جانتے تھے کہ خطرہ کہاں ہے۔اس لئے آپؐ بہت ہوشیاری اور سلامت روی سے کام کر رہے تھے۔اپنے مشن کے پہلے چار سال میں آپ چالیس افراد سے زیادہ کو مسلمان نہ بنا سکے۔ان میں رشتہ داروں اور گھر کے افراد کے علاوہ زیادہ تر ناکام تاجر اور دوسرے غیر مطمئن لوگ تھے۔نیا دین اختیار کر لینے سے ان لوگوں کی زندگی کی مصیبتیں کم نہیں ہوگئی تھیں بلکہ اس کے برخلاف اسلام اب اور زیادہ قربانی دینے اور مشقتیں برداشت کرنے کا متقاضی تھا۔لیکن یہ ایک ایسی واضح اور مبنی برحقیقت زندگی کی امید دلاتا تھا جو ان صحرانشینوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔شروع میں ہونے والے ان مسلمانوں کے متعلق،حضرت محمدؐ نے بعد کے سالوں میں ایک مرتبہ فرمایا:

"سوائے ابوبکرؓ کے اور کوئی ایسا نہ تھا جسے میں نے اسلام کی دعوت دی ہو اور اس نے تامل اور پریشانی کا اظہار نہ کیا ہو۔"

حضرت ابوبکرؓ ان چند گنے چنے لوگوں میں سے ایک تھے جنہیں اپنے اوپر پورا اعتماد

ہوتا ہے۔ گو ان کا اصلی نام تاریخ اسلام کے طلباء کے علاوہ بہت کم لوگ جانتے ہیں، یہ صرف انہی کی ذات تھی جنہوں نے حضرت محمدؐ کی تعلیمات کو آپؐ کی وفات کے بعد بھی جاری رکھا۔ ابوبکرؓ ایک ایسے شخص تھے جنہوں نے اسلامی عقائد اور تعلیمات کو لفظ بلفظ تسلیم کیا اور ہر حکم پر من و عن عمل کیا۔ ان کے متعلق ایک مرتبہ حضرت محمدؐ نے فرمایا کہ اگر سب کے ایمان کو ملا کر اکیلے ابوبکرؓ کے ایمان کے مقابلے میں تولا جائے تب بھی ان کا پلڑا ہی بھاری رہے گا۔

عرب کے لوگوں میں کوئی بات زیادہ دیر تک پوشیدہ نہیں رہتی۔ گو حضرت محمدؐ اپنی مجالس کے مقام کو ایک دوست کے مکان سے دوسرے دوست کے مکان اور بعض اوقات باہر صحرا میں تبدیل کرتے رہتے تھے پھر بھی جو کچھ ہو رہا تھا اس کا بھید کھلنا شروع ہو گیا۔ چنانچہ جلدی ہی مفسدہ پرداز لوگوں نے مسلمانوں کے جلسوں کو درہم برہم کرنا شروع کر دیا اور بعض اوقات تو دھینگا مشتی تک نوبت آ جاتی تھی۔ نئے دین کا سب سے بڑا مخالف خود آپؐ کا چچا ابی لہب تھا۔ آپؐ کی اور حضرت خدیجہؓ کی سب سے بڑی صاحبزادی رقیہ کی شادی اس کے لڑکے عتبہ سے ہوئی تھی لیکن اس شادی سے جو کچھ بھی قرابت بڑھی ہو گی ابی لہب کی بیوی اُم جمیل نے، جو ابوسفیان کی بہن بھی تھیں، اسی شدت سے مخالفت کر کے وزن برابر کر دیا۔ وہ اپنے شوہر کے اس عناد کو اُکسانے سے کبھی باز نہ آئی جو اسے اپنے بھتیجے حضرت محمدؐ سے تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں وہ مکے کے قدیم نام کو بٹہ لگا رہے تھے۔

حضرت محمدؐ کے لئے یہ خاندانی جھگڑے بڑے تکلیف دہ تھے۔ آپؐ ہمیشہ سے خاندانی اتحاد کے حامی تھے لیکن اب کسی ایسی بات سے جس پر آپ کا کوئی زور نہ تھا آپؐ کے اپنے لوگوں میں ایک قسم کی خانہ جنگی پرورش پا رہی تھی۔ ان تفکرات نے آپؐ کی صحت پر بُرا اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ آپؐ نے اپنے پرانے ساتھیوں سے ملنا جلنا کم کر دیا اور لمبے وقفے جبل حرا پر گزارتے۔ غالباً آپؐ کا خیال یہ تھا کہ شاید مزید کوئی وحی ایسی آئے کہ جس سے یہ تکلیف دہ مسائل حل ہو جائیں یا ان جھگڑوں سے بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے۔ لیکن اگر

لہ حضرت ابوبکرؓ کا اصل نام عبداللہ بن عثمان تھا لیکن انہیں لوگ ابوبکرؓ کے نام سے ہی جانتے ہیں

آپکی ایسی کوئی خواہش تھی تو آپ کو مایوس ہونا پڑا۔ جبریل ایک مرتبہ پھر آپؐ کے پاس تشریف لائے لیکن صرف اس حکم کی توثیق کرنے کے لئے کہ گھر سے باہر نکل کر دین کی تبلیغ کریں۔ اس حکم کے واضح اور قطعی ہونے سے انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ آپؐ کے لئے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ مکہ واپس آئیں اور اپنی مہم شروع کر دیں۔ اس عزم اور فیصلے کی تاریخ ۶۱۲ عیسوی تھی اور حضرت محمدؐ کی عمر بیالیس سال تھی۔

سب سے پہلا قدم آپؐ نے یہ اٹھایا کہ اہل کعبہ کو دعوت دی کہ وہ مکہ کے باہر پہاڑی[1] پر آپ کی بات سنیں۔ بہت سے لوگ آئے۔ پہاڑی ڈھلوان سفید کپڑوں میں ملبوس لوگوں سے بھر گئی۔ وہ سننے کے منتظر تھے کہ دیکھیں ان کا عزیز کیا کہنا چاہتا ہے۔ لوگ زیادہ باتیں نہیں کر رہے تھے کیونکہ آفتاب گلنار اور سنہری بھٹی میں ڈوبتے ہوئے صحرا میں اپنے سائے لمبے کر رہا تھا۔ حضرت محمدؐ ذرا اونچی جگہ کھڑے فتح مندی کے نور کی روشن کرنوں کا لباس پہنے معلوم ہوتے تھے۔ آپؐ نے نیچے کی طرف کھڑے مردوں اور عورتوں پر جو آپ کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے نظر ڈالی اور کہا:۔

"اے اہل قریش۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان پہاڑیوں کے پیچھے سے ایک لشکر آپ پر حملہ کرنے کے لئے آ رہا ہے تو کیا آپ میرا یقین کریں گے"

"ہاں" سب نے بیک آواز جواب دیا۔ "ہم نے آپؐ کو ہمیشہ سچا پایا ہے۔"

حضرت محمدؐ نے تشکر کے طور پر سر جھکایا۔ پھر آواز کو بلند کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"میں آپ لوگوں کو خبردار کرنے آیا ہوں کہ آپ نے میری بات کو نہ مانا تو آپ پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔"

سامعین پر ہر طرف نظر ڈالتے ہوئے آپؐ نے قبیلہ قریش کے ہر خاندان کا نام پکارا

---

[1] یہ صفا کی پہاڑی تھی جس کی ڈھلوان پر آپؐ نے پہلے پہل اہل مکہ کو پیغام حق سنایا (سیرۃ النبی) (طبری)

جس جس خاندان کا نام گو بجدار عربی میں پکارا جاتا اس کے لوگوں میں ہلچل سی ہوتی لیکن ڈرلائی طور پر آپ نے تقریر جاری رکھی۔

"میرے عزیزو مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں کو خبردار کردوں کہ اس وقت بھی اور آئندہ ہمیشہ کے واسطے آپ کے لیئے کوئی فائدہ کی صورت نہیں جب تک کہ آپ لوگ یہ نہ مان لیں کہ صرف واحد اور اکیلے خدا کے سوا اور کوئی عبادت کے لائق نہیں"

اس وقت سورج تقریباً بالکل غروب ہو چکا تھا اور اس کے چھپتے ہی شام کی ہوا صحرا کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں سرسرانے لگی۔ ورنہ اس کے علاوہ اور کوئی آواز نہ تھی حضرت محمدؐ کے اعلان سے بالکل عام آدمی بھی مبہوت ہو کر رہ گئے۔ پریشانی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہوئے عربوں نے کچھ دیر انتظار کیا کہ شاید کوئی اس کا جواب دے۔ حضرت محمدؐ نے پھر بولنا شروع کر دیا لیکن اس سے پہلے کہ آپ چند الفاظ سے زیادہ کچھ کہیں ابی لہب نے روک دیا۔ حضرت محمدؐ نے پھر بولنا چاہا لیکن اس دفعہ ابی لہب کی دخل اندازی بے عزتی تک پہنچ گئی اور جب حضرت محمدؐ نے پھر بھی بولنا چاہا تو آپؐ پر پتھر برسانا شروع کر دیئے۔

آپؐ کو غصہ آگیا اور چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ آخر کار آپ بھی ایک انسان تھے اور ایک ایسے فرد جو دوسروں کو حکم دینے کے عادی تھے اور ابھی اخلاقی نظریے کی اس بلندی پر نہیں پہنچے تھے کہ دوسرا رخسار[1] بھی پیش کر دیتے۔ آپؐ اپنے اس بداخلاق۔ ضدی اور بوڑھے چچا کے ہاتھوں بہت کچھ برداشت کر چکے تھے اور اب وہ وقت آگیا تھا کہ آپؐ اس سے زیادہ کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ چنانچہ آپؐ کے مزاج کی متانت جواب دے گئی اور آپؐ نے چچا

---

[1] یہ مصنف کے عیسائی ہونے کا اثر ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دشمن اگر ایک رخسار پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی اس کے آگے کر دو تاکہ وہ خود شرمندہ ہو جائے۔ رسول کریمؐ اخلاق کی بلندی میں حضرت عیسیٰؑ سے کسی صورت میں کم نہ تھے لیکن اسلام کو بچانے، اللہ کا نام بلند کرنے اور بے قصور مسلمانوں کی حفاظت کرنے کے لیئے آپ کو سینہ سپر ہونا پڑا۔

اور چچی دونوں کو بددعا دی[1]۔ آپ نے ان کو بلند آواز اور قطعیت کے ساتھ بددعا دی۔ آپؐ نے موثر انداز میں ان کے دوزخ میں جانے اور ہمیشہ وہاں ہی رہنے کی پیشین گوئی کی۔ آپؐ نے مزید فرمایا کہ دوزخ میں ام جمیل کا ایک کام یہ بھی ہوگا کہ وہ ہمیشہ لکڑیاں ڈھو کر لاتی رہے گی تاکہ اس کے شوہر کو جلانے والے آگ کے شعلے بجھنے نہ پائیں۔ دوزخ کے کسی خوف و دہشت کو آپ نے تخیل کے لئے نہیں چھوڑا جو کچھ آپ نے کہا آپ یقینی طور پر وہ ہی کہنا چاہتے تھے۔ بعد میں آپؐ کی یہ بددعائیں قرآن کی سورۃ ۱۱۱[2] (سورۃ تبت یدا) میں شامل ہوگئیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ؕ	ٹوٹ گئے ہاتھ ابی لہب کے اور وہ خود بھی تباہ ہوگیا۔
مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ؕ	اس کی دولت اور اس کی کمائی اس کے کچھ کام نہ آئی۔
سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۚ	اور وہ لپکتے شعلوں میں جلے گا۔
وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۚ	اور اس کی بیوی کے سر پر لکڑی (ایندھن) کا گٹھا ہوگا۔
فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ؑ	اور اس کی گردن میں کھجور کے ریشے کا رسہ ہوگا

عرب لوگ بڑے توہم پرست ہوتے ہیں۔ حضرت محمدؐ کی یہ بددعائیں جس قدر مخصوص

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ جب آنحضورؐ نے قریش کے سامنے دعوت حق پیش کی تو ابی لہب آگ بگولا ہوگیا اور غضب ناک ہوکر پکارا۔ تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ ۔ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا "(نعوذ باللہ) تو ہلاکت و رسوائی کا منہ دیکھے۔ کیا تو نے اس غرض سے ہم کو جمع کیا تھا!" آنحضورؐ ابی لہب کی اس دریدہ دہنی پر خاموش رہے اور کچھ نہ کہا۔ لیکن یہ گستاخی اللہ تعالیٰ کی جناب میں غضب کا موجب بنی اور چند روز بعد سورۃ تبت یدا نازل ہوئی۔ آنحضورؐ نے خود کوئی بددعا نہ دی (حیات محمدؐ)

[2] تبت یدا ایک سو گیارھویں سورۃ ہے۔

تھیں اتنی ہی واضح بھی تھیں۔ ابولہب اُمِّ جمیل کے ساتھ چلا گیا۔ بعد میں باقی قریش بھی چلے گئے اور صرف حضرت محمدؐ چند مسلمانوں کے ساتھ صحرا کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں کھڑے رہ گئے چونکہ اب وہاں تبلیغ کے لئے کوئی نہ رہا تھا اس لئے کچھ دیر بعد آپؐ بھی گھر چلے گئے۔ گھر پہنچ کر آپؐ کو ایک اور بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ عتبہ نے اپنی بیوی[1] (حضرت رقیہؓ) کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ روتی ہوئی حضرت خدیجہؓ کے پاس آگئی تھیں۔ یہ جیسا کچھ بھی ہوا حضرت رقیہؓ کے لئے بعد میں اچھا ہی ثابت ہوا۔ کیونکہ طلاق کے بعد جلدی ہی ان کی شادی حضرت عثمانؓ بن عفان سے ہو گئی جنہیں ایک دن سلطنت عرب کا تیسرا خلیفہ ہونا تھا۔

گو اسلام کی خدمت اور تعمیر میں حضرت عثمانؓ نے ایک اہم کردار ادا کیا لیکن ان میں حضرت محمدؐ کے دو پہلے نائبین[2] کا سا مسحور کن جوش اور ولولہ نہ تھا۔ وہ ایک خوش شکل آدمی تھے۔ طویل قد اور بھاری جثے پر لمبی سیاہ ڈاڑھی۔ لیکن خود رائے تھے اور اپنا زیادہ وقت قرآن کے مطالعے میں صرف کرتے تھے۔ ان کا اسلام لانا بھی سیاسی طور پر بڑا اہم تھا ایک طرف تو وہ قریش کی ابوسفیان والی شاخ بنی امیہ سے تعلق رکھتے تھے اور دوسری طرف حضرت عبدالمطلب[3] کے خاندان سے۔ اور (آنحضور کی پہلی صاحبزادی کی وفات کے بعد) آپؐ کی ایک اور صاحبزادی سے شادی کر لینے کے سبب آپؐ کا حضرت محمدؐ سے دوہرا رشتہ ہو گیا تھا۔ ان کا نام اُمِّ کلثوم تھا۔ جن کو ان کی پہلی بہن کی طرح ابولہب کے دوسرے لڑکے عتیبہ نے چھوڑ دیا تھا۔

اس وقت حضرت عثمانؓ ایک اور بہادر اور دل گردے کے انسان تھے۔ جنہوں نے

---

[1] آپؐ کی بڑی صاحبزادی حضرت رقیہ ابی لہب کے بڑے لڑکے عتبہ سے اور چھوٹی (حضرت ام کلثوم) چھوٹے لڑکے عتیبہ سے بیاہی تھیں۔ اسلام دشمنی میں ابولہب اور اس کی بیوی نے دونوں کو طلاق دلوا دی تھی اور ان دونوں صاحبزادیوں کی شادیاں یکے بعد دیگرے حضرت عثمان سے ہوئیں۔

[2] حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم

[3] آپ حضرت عبدالمطلب کے نواسے تھے۔

ایسے حالات میں اس غیر مقبول مذہب کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ ایسا کیوں کیا یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ البتہ انہیں جس بات کا یقین تھا وہ یہ تھی کہ حضرت محمدؐ نے انہیں صرف اپنی باتوں سے ہی باور کرا دیا تھا کہ نجات کا راستہ یہ ہی ہے۔

تبلیغ کے نتائج بہت مایوس کن تھے۔ لیکن احکام الٰہی واضح تھے اور ان کی تعمیل کے لئے آپ کو ضرور کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ ایک ہی بات جو آپؐ کے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ ایک اور مجلس منعقد کریں اور ان تنگ نظر اور عمر رسیدہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کریں۔ اس مرتبہ یہ مجلس نجی قسم کی تھی۔ آپؐ نے بنی ہاشم کے سربرآوردہ لوگوں کو اپنے مکان پر شام کے کھانے کی دعوت دی۔ مہمانوں کی گوشت اور دودھ سے تواضع کر چکنے کے بعد آپؐ نے ایک مختصر تقریر کی اور ذرا وضاحت سے بتایا کہ اصل بات کیا ہے۔ آپؐ نے اپنی تقریر کو اس یقین دہانی پر ختم کیا کہ جو لوگ اس وقت آپؐ کا ساتھ دیں گے ان پر اللہ تعالیٰ کا انعام و کرام ہوگا۔ نہ کوئی تائید میں بولا اور نہ ہی کسی نے تعریف کی۔ یہ خامشی بڑی غیر ہمدردانہ اور پریشان کن تھی۔ تقریباً بالکل نا اُمید ہو کر آپؐ نے بلند آواز سے کہا۔

"کون ہے جو میرے اس (پیمبری کے) بار کو اٹھانے میں میرا ساتھ دے گا۔؟ کون ہے جو میرا بھائی۔ میرا نائب اور میرا وزیر ہوگا۔؟

کسی نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی اور زیادہ مایوس کن ہو گئی۔ یہ دیکھ کر حضرت علی کرم (جو اس وقت گیارہ سال کے تھے) آگے بڑھے اور اکابر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ وہ آپؐ کا ساتھ دیں گے اور ہر وہ خدمت بجا لائیں گے جو آپؐ چاہیں گے۔ یہ دیکھ کر حضرت محمدؐ نے اپنے چچیرے بھائی کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور مسرت بھری آواز میں کہا:۔

" دیکھ لیجئے۔ یہ ہے میرا بھائی۔ میرا وزیرؐ اور میرا نائب، ہر شخص پر

لہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ جب میں نے آنحضورؐ کا ساتھ دینے کی پیشکش کی تو آپؐ نے میری گردن پکڑ کر فرمایا کہ "یہ میرا بھائی ہے میرا وصی اور تم میں میرا خلیفہ ہے تم اس کی بات سنو اور جو کہے وہ بجا لاؤ" لوگ یہ سن کر ہنسنے لگے اور حضرت ابوطالبؓ سے کہا سنو تم کو حکم ہوا ہے کہ تم اپنے لڑکے کی اطاعت و فرمانبرداری کرو۔
(تاریخ طبری۔ جلد اوّل بحصہ سوم)

لازم ہے کہ ان کی بات سُنے اور تعمیل کرے۔"

اس فقرے سے سکوت تو ٹوٹ گیا لیکن ایک غلط انداز میں۔ سب ہنس پڑے۔ ایک نے حضرت ابو طالب سے پوچھا "کیا آپ اپنے کم سن صاحبزادے کی تعریف کرانا چاہتے تھے"۔ حضرت ابو طالبؓ نے اپنے شانوں کو جنبش دی اور بات ٹال گئے۔ وہ حضرت محمدؐ کے اس طرز عمل سے تو متفق نہ تھے لیکن جس بچے کو انہوں نے پرورش کیا تھا اس سے بڑی محبت تھی۔ مجلس پرامن طور پر برخواست ہوگئی لیکن کوئی مقصد پورا نہ ہوا۔ یعنی جس بات کی حضرت محمدؐ کو توقع تھی پوری نہ ہوئی۔ اس کے برخلاف اس کا یقینی نتیجہ یہ نکلا کہ اب آپؐ کھل کر سامنے آگئے تھے۔ اب ہر ایک کو پتہ چل گیا تھا کہ آپؐ کے ذہن میں کیا ہے۔ اب آپؐ کے لئے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور وہی آپ نے اختیار کیا۔ بغیر کسی تمہید اور معذرت کے آپؐ نے سب کے سامنے دلیری سے اعلان کر دیا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں جنہیں اس نے اپنی توحید کی اشاعت اور بت پرستی کے خاتمے کے لئے بھیجا ہے۔ اس طرح گویا آپؐ نے قریش کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ایک ایسی جنگ کا کہ وہ دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالے بغیر ختم نہ ہو سکتی تھی۔

جب لڑائی ٹھن گئی تو حضرت محمدؐ کو ایک اور طرف سے بھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس کا مقابلہ اور زیادہ مشکل تھا کیونکہ یہ مخالفت سابق دوستوں کی طرف سے تھی۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ ایک لغو سی بات تھی کہ ایک ایسا شخص جو کچھ عرصہ پہلے ایک اچھا ملنسار سفری گماشتہ، ایک خوش مزاج تاجر اور سیر و شکار کا دلدادہ تھا۔ آج یہ بتانے لگے کہ آسمانوں میں کیا ہوتا ہے۔ کوئی اس پر سنجیدگی سے یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ ان کے خیال میں فرشتوں سے ملاقاتیں یا یہ مان لینا کہ ان کا ایک وقت کا ساتھی اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ نمائندہ ہے جو ایک ایسے مذہب کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہے جو صدیوں کی آزمائش سے گزر چکا ہے محض حماقت، عجیب اور مضحکہ خیز بات تھی۔ یہ لوگ کس طرح ہنستے تھے؟ وہ گھروں میں بھی ہنستے تھے اور بازاروں میں بھی اور جب حضرت محمدؐ سے سامنا ہو جاتا تو اور زیادہ ہنستے اور (نعوذ باللہ) آپؐ کو خبطی، نجومی اور جھوٹا نبی کہتے۔

صورتِ حال بالکل ایسی ہی تھی جیسے حضرت عیسٰی کے ساتھ تھی یا جیسی اس زمانے کے ہر مصلح کو پیش آئی جب روایت ہی قانون تھا۔ اگر حضرت محمدؐ موجودہ زمانے میں ہوتے تو آپکو کو اپنے جذبات وخیالات کے اظہار کے لئے ہر قسم کے راستے مل جاتے۔ آپؐ ایک مبلغ ہو سکتے تھے یا پھر ایک دنیادار مشنری بن سکتے تھے۔ آپؐ احکام الٰہی کو اپنی تخلیق بھی کہہ سکتے تھے۔ آجکل تو ایک خوش رو خوش مزاج سفری ایجنٹ بھی جو رینر بلیڈ یا تیل پھلیل بیچتا ہو اگر ساتھ ہی ساتھ کچھ مذہبی تبلیغ بھی جاری رکھے تو کوئی اسے مذہبی کٹر ہونے کا الزام نہ دے گا اگر حضرت محمدؐ ایسا کر سکتے تو شاید ہی کوئی ان کا مذاق اڑاتا۔ بہت سے ان کی بات سنتے اور ہر ایک ان سے ہمدردی کرتا اور ان سے مہربانی سے پیش آتا۔ اس طرح آپؐ کسی بڑے (عالمگیر) مذہب کی بنیاد تو نہیں ڈال سکتے تھے لیکن شاید کوئی آپؐ کے خود کو اللہ کا پیغمبر کہنے کا خیال نہ کرتا۔

لیکن حضرت محمدؐ کے زمانے میں اس قسم کی رواداری اور تحمل ممکن نہ تھا۔ اس کے ساتھ اور بہت سے الجھاؤ بھی تھے۔ سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ اہل مکّہ امارت پرست تھے۔ خاص طور پر دولت کے پجاری تھے۔ گو حضرت محمدؐ ایک بہت اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن مکّہ میں آپؐ اپنی ذاتی کوشش سے کوئی مقام پیدا نہ کر سکے اور یہ ہی ان کے مقبول نہ ہونے کا سبب تھا۔ مزید براں آپؐ نے کبھی تجارتی سفری گماشتے ہونے سے زیادہ کی خواہش بھی نہ کی۔ آپؐ ہمیشہ ایک تنخواہ دار اور کمیشن یافتہ ملازم رہے۔ پھر کوئی خدا ایک ایسے معمولی حیثیت کے انسان کو اس مقدس شہر کی صدیوں پرانی روایات کو بدل ڈالنے کے لئے کیوں منتخب کرتا۔؟ اگر یہ نیا پیغمبر مکّے کے چار سو برآوردہ لوگوں میں سے ہوتا یا وہ امیروں کی انجمن (کلب) کا ممبر ہوتا یا وہ آل مطلب کے اُن دولت مندوں میں سے ہوتا جو کعبے کے گرد رہتے تھے یا وہ کم از کم ایسا شخص ہی ہوتا جو صحرا کے اس رنگ رلیوں والے شہر کی رنگینیوں میں حصہ لیتا تو شاید اس کے خیالات کو کوئی سنتا اور ان پر کان دھرتا لیکن آپؐ ان میں سے کچھ بھی نہ تھے بلکہ آپؐ تو اس کا الٹ تھے۔

ان رنگین مجلسوں میں شرکت نہ کرنا اور شراب نوشی اور عیاشی سے پرہیز کرنا ہی حضرت

محمدؐ پر سب سے بڑے اعتراضات تھے۔ ان لوگوں کو ڈر تھا کہ ان کے عقائد کے خلاف آپ کی مہم نہ صرف کعبے کے مسلک کو تباہ کر دے گی، جو مکے کی خوشحالی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا بلکہ وہ اپنی اس پُرمسرت عیاشانہ زندگی سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

دوسرے یہ کہ صورتِ حال اس سے مختلف نہ تھی جو چھ سو سال پہلے حضرت عیسیٰ اور بڑے پجاریوں کے درمیان تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر اس نئے دین کو آگے بڑھنے کا موقعہ مل گیا تو کعبہ کا وقار ختم ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی قریش اور ان کی آمدنی کا ذریعہ بھی مزید براں تجارت منقطع ہو جائے گی، کارواں جانے بند ہو جائیں گے اور حج کعبہ کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ ادھر نہ تو بت پرستی کی مقبولیت میں کوئی کمی آئی تھی اور نہ ہی اس کے زوال کے کوئی آثار تھے۔ اس کے برخلاف ان لوگوں کا ابھی تک یہ خیال تھا کہ ان اناث و ذکور خداؤں (دیوی اور دیوتاؤں) نے جو دونوں جنسوں کی افزائش نسل کے مظہر تھے اور جو اس بڑے مقدس گھر کی گھٹی خاموشی میں رہائش پذیر تھے، مکہ کو خوشحال بنا دیا تھا۔ چنانچہ ان کے نزدیک یہ محض بے وقوفی تھی کہ ایک ایسے دوسرے خدا میں عقیدت کا اظہار کر کے ان کی اہمیت کو کم کیا جائے، جس کی طرف بلانے والا صرف ایک شخص ہو اور وہ بھی (نعوذ باللہ) اتنا بے وقوف کہ مواقع میسر ہونے کے باوجود ان سے فائدہ اٹھانے کی سمجھ بوجھ نہ رکھتا ہو۔ ان کے نزدیک دراصل یہ سارا خیال ہی مضحکہ خیز تھا اور کسی توجہ کا محتاج نہ تھا۔ چنانچہ پرانے دوست پھبتیاں کستے، زیادہ تند خو اور اکھڑ لوگ آپؐ کے جلسوں کو گندے گلے گا کر اور سیٹیاں بجا کر درہم برہم کر دیتے۔ جبکہ اور زیادہ کینہ پرور لوگ پتھر پھینکتے اور مسلمانوں کے سروں پر ڈھول جماتے۔

کبھی کبھی کچھ زیادہ بردبار قسم کے لوگ حضرت محمدؐ سے بات چیت کرنے کے لئے جمع ہوتے۔ دونوں فریق ایک دوسرے کی خامیاں گناتے۔ جب دونوں گروہوں میں سے کوئی بھی کسی دلیل سے مطمئن نہ ہوتا تو مخالف لوگ کہتے کہ اگر حضرت محمدؐ اس بات کا کوئی واضح اور قطعی ثبوت پیش کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا رسول مقرر کیا ہے تو وہ شاید ان کو مان لیں مثال کے طور پر وہ کوئی معجزہ پیش کریں۔ وہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی مثالیں دیتے کہ جہاں

بھی ضرورت ہوتی وہ معجزہ دکھاتے تھے۔ آپؐ حضرت عیسیٰؑ کی طرح مصیبت مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ اس لئے انکار کر دیتے۔

آپؐ کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تبلیغ کا حکم دیا ہے۔ معجزے دکھانا آپ کا کام نہیں۔ آپؐ یہ بھی فرماتے کہ اگر وہ آپؐ کی رسالت کے بارے میں کوئی بین شہادت چاہتے ہیں تو مشرکوں کو چاہئے کہ وہ قرآن پڑھیں۔ اس میں وہ تمام احکام اور آیات ملیں گی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی ہیں اور روزانہ لکھ لی جاتی ہیں۔ قرآن خود ایک معجزہ ہے۔

لیکن کج بحثی کرنے والے مطمئن نہ ہوتے اور کندھے اچکا کر رہ جاتے۔ وہ تو اصلی اور واقعی معجزے چاہتے تھے۔ وہ تو کسی مردے کو زندہ، کسی گونگے کو بولتا اور صحرا سے پانی کا چشمہ ابلتا دیکھنا چاہتے تھے۔ جب حضرت محمدؐ مسلسل انکار کرتے رہے تو کہنے لگے کہ اچھا ہم قرآن کو ہی معجزہ مان لیں گے اگر جبرئیل ان کے سامنے حضرت محمدؐ پر کوئی وحی لائیں اور وہ انہیں دیکھ سکیں۔

لیکن حضرت محمدؐ کسی مافوق الفطرت بات کا مظاہرہ کرنے سے انکار کرنے پر سختی سے جمے رہے۔ آپؐ نے اعلان کیا اور بار بار اعلان کیا کہ آپؐ ایک انسان سے زیادہ کچھ نہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے تاریخ میں مذکور دوسرے نبیوں کی طرح اپنی مخلوق کو راہ نجات دکھانے کے لئے چن لیا ہے۔ آپؐ نہیں جانتے کہ معجزہ کس طرح دکھاتے ہیں۔ آپؐ ساری عمر اس بات پر جمے رہے اور کسی بھی وصف خداوندی کے حامل ہونے سے انکار کرتے رہے اور یہ ہی کہتے رہے کہ دوسرے انسانوں کی طرح آپؐ بھی ایک انسان ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ایک ترجمان سے زیادہ کچھ نہیں۔

ان باتوں سے ایک مرتبہ پھر آپؐ کے باعمل اور مخلص ہونے کی ان صفات کا اظہار ہوتا ہے جو آپؐ کو اتنی بلندی پر لے جانے والی تھیں۔ اگر آپؐ کی جگہ کوئی اور بے وقوف آدمی یا نبوت کا کوئی جھوٹا مدعی ہوتا تو اپنے مخالفین کو متاثر کرنے کے لئے غالباً کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرتا۔ لیکن حضرت محمدؐ ایسے نہ تھے۔ آپؐ خوب جانتے تھے۔ کہ آپؐ کیا کرنے آئے تھے۔ آپؐ کو اپنے مشن پر پورا یقین تھا اور اسی یقین پر آپؐ کو جینا اور مرنا تھا۔ آپؐ اس پرانے مقولے پر کاربند تھے کہ انسان کو سب سے پہلے اپنے آپ سے سچا ہونا چاہیئے۔

بہر حال کسی نے آپؐ کی باتوں پر دھیان نہ دیا اور گندی ہجو لکھنے اور برملا عملی توہین

کرنے کے واقعات پیش آتے رہے بلکہ ان میں اور اضافہ ہو گیا۔ آپؐ کے چند سخت ترین بدگو اور بدنام کرنے والے وہ لوگ تھے جو بعد میں آپؐ کے سب سے زیادہ جوشیلے اور سرگرم حامی بن گئے۔

ان میں ایک عمرو ابن[1] العاص بھی تھے...... ان کی جوانی، خوش روئی اور فطانت نے ان کے عالی نسب نہ ہونے کی کمی کو پورا کر دیا تھا۔ لیکن قریش کو جس بات نے ان کا گرویدہ بنا دیا تھا وہ ان کا ملکہ شاعری تھا۔ اور حضرت محمدؐ کے بدنام کنندگان کے لئے ان کا وجود ایک خدائی عطیہ تھا۔ حضرت محمدؐ نہ تو شاعر تھے اور نہ ہی پھڑکتے اشعار کے دلدادہ۔ آپؐ عمرو بن عاص کی کہی ہوئی ہجو یہ غزلوں اور گیتوں کے سبب مرجھائے مرجھائے سے رہتے تھے لیکن بایں ہمہ ایک دن اسی ہجو گو کو عساکر اسلام کا ایک بہت ہی مشہور سپہ سالار بننا اور بازنطینیوں کے خلاف لشکر کشی کر کے شام اور مصر فتح کرنا تھا۔ یہ عمرو ہی تھے جنہوں نے ۶۳۹ عیسوی میں سب سے پہلے نہر سویز کھودنے کی تجویز پیش کی تھی۔ اور یہ بھی وہی تھے جنہوں نے اسکندریہ فتح کیا اور اپنا کیمپ اس جگہ لگایا جہاں بعد میں شہر قاہرہ آباد ہوا۔ گو اس وقت حضرت محمدؐ نے ان کے متعلق "صادق ترین مسلمان اور ثابت قدم مومن" کے الفاظ کہے تھے لیکن جو کچھ انہوں نے اپنے بعد کے زمانے میں کیا اس کا اسلام سے کتنا تعلق تھا آج ایک مذاق سا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ بھی تھے جو صرف ہجو کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ حضرت محمدؐ کے قتل کے خواہاں تھے۔ اذیتوں کے باوجود اکثر مسلمان اپنے مسلک پر قائم تھے۔ ہر ہفتہ کچھ نئے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے۔ مخالفین کا خیال تھا کہ جب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا کعبہ کی عظمت اور ساکھ ختم ہو جانے کا خطرہ ہر وقت موجود رہے گا۔ اذیت دہندہ لوگوں میں سے بعض اعتدال پسندوں نے حضرت ابو طالب کو آنے والے خطرات

---

[1] عمرو بن عاص کی ولدیت کو مصنف نے مشکوک لکھا ہے لیکن کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ان کے نام کے ساتھ ابن العاص کے الفاظ کا شامل ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ عاص کے بیٹے تھے اور علامہ شبلی (سیرت النبی) اور دوسرے مورخین نے ان کو عمرو بن العاص بن وائل ہی لکھا ہے۔ (مترجم)

سے آگاہ کردیا۔ حضرت ابو طالب اب بھی اپنے بھتیجے کے خیالات کو اور جو اضطراب وہ پھیلا رہے تھے پسند نہیں کرتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اب بھی آپؐ کو بہت چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ حضرت محمدؐ کے پاس گئے اور بہت نرمی سے سمجھایا کہ اب بھی وقت ہے کہ وہ اس مہم کو ترک کر دیں۔ آپؐ نے چچا کا شکریہ ادا کیا لیکن بڑے عزم اور وثوق سے کہا کہ خواہ کوئی کچھ ہی کیوں نہ کہے جو راستہ آپؐ نے اختیار کر لیا ہے آپؐ اس سے ہرگز نہ ہٹیں گے۔ حضرت ابو طالبؓ آپؐ کے اس عزم سے بہت متاثر ہوئے۔ آپؐ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور یقین دلایا کہ گو وہ اس نئے دین کو تو اختیار نہیں کر سکتے لیکن بھروسہ رکھیں۔ کہ وہ ہر ممکن طور سے آپؐ کی حفاظت کریں گے اور کبھی مخالفین کی طرفداری نہ کریں گے۔

اس یقین دہانی نے حضرت محمدؐ کے دل میں ایک نیا اعتماد تو پیدا کر دیا لیکن اس سے اہل کعبہ کا خطرہ نہیں ٹلا۔ اب حضرت محمدؐ سے کسی قسم کا تعلق رکھنے میں جان کا خطرہ تھا۔ اس دھمکی سے (آپ کی لڑکی) حضرت رقیہؓ اور حضرت عثمان بھی، جن سے اب ان کی شادی ہوگئی تھی، خاص طور پر متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ ۶۱۵ء میں حضرت محمدؐ نے تقریباً ایک سو مسلمانوں کی ایک جماعت تیار کی اور انہیں حضرت عثمانؓ کی سرکردگی میں حبشہ بھیج دیا۔ حبشہ کے لوگ نسطوری عقیدے کے عیسائی تھے اور دوسرے مذاہب سے رواداری کا برتاؤ کرتے تھے۔ اس طرح مسلمان مردوں اور عورتوں کا ایک ٹھکانہ اور مرکز قائم ہو گیا۔ جن پر حضرت محمدؐ بھروسہ کر سکتے تھے۔ اور یہ کہ اگر بہت ہی برا وقت آئے اور ہجرت کرنا ہی پڑے تو آپؐ کو کوئی پناہ گاہ مل سکے۔

جب یہ لوگ چلے گئے اور محفوظ ہو گئے تو حضرت محمدؐ ایک مرتبہ پھر طوفان کے مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس وقت آپؐ کا شدید ترین دشمن ایک جنونی شخص ابو جہل تھا جس

لہ ابو جہل کا اصل نام ابوالحکم تھا لیکن اپنے غیض و غضب اور اسلام اور آنحضرت کی انتہائی مخالفت اور جہالت کے سبب تاریخ میں ابو جہل کے نام سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا اصل نام کوئی نہیں لیتا۔

کے نام کا مفہوم بھی اسی مناسبت سے "جہالت کا باپ" یا "بہت بڑا جاہل" تھا۔

ابوجہل کی ماں بھی مکے کی کاروباری عورتوں میں سے ایک تھی اور عطریات کی تجارت میں خوب کماتی تھی۔ چنانچہ وہ بھی اُن میں سے ایک تھی جو رسول اللہ جیسے مصلح کی مخالفت صرف اس لئے کرتے تھے کہ آپؐ مکہ کی اس عیاشانہ زندگی کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ جس کے لئے وہ سامان فراہم کرتی تھی۔

ابوجہل ایک چھوٹے قد کا قوی الجثہ بدصورت آدمی تھا۔ اہل مکہ کی اکثریت کے برعکس اس کے بال سُرخ اور اس کی ڈاڑھی زردی مائل بھوری تھی۔ عربوں کے نزدیک وہ پکا شیطان تھا۔ ابوجہل حضرت محمدؐ کے سر سے کم کسی چیز کا خواہاں نہ تھا۔ جب وہ آپؐ کو دیکھ لیتا تو غنڈوں کی ٹولی لے کر آپؐ کا پیچھا کرتا اور دور تک پریشان کرتا۔ ایک دن جب اس نے معمول سے زیادہ تنگ کیا تو آپؐ ایک عزم کے ساتھ مقابلہ پر ڈٹ گئے اور آواز بلند کئے بغیر کہا۔

"اے اہل قریش۔ میں یقیناً تم سے اس کا منافع کے ساتھ حساب چکاؤں گا۔"

یہ کہہ کر آپؐ اپنے راستے پر ہو لئے۔ کسی نے مزید آپؐ کا پیچھا نہ کیا۔ لیکن ان خاموش الفاظ میں ایک ایسے شخص کا خطرناک عزم پوشیدہ تھا جو مستقبل میں دیکھ رہا تھا۔ اگر لوگ مستقبل میں ہونے والی یہ بات خود دیکھ سکتے تو شاید اور زیادہ خوفزدہ ہو جاتے۔ جیسا کہ ہوا حضرت محمدؐ سے اس گستاخی کا فوری ردِّ عمل لازمی تھا۔

حضرت حمزہؓ، حضرت محمدؐ کے ایک اور چچا تھے جو اپنے بھتیجے کے اس طرزِ عمل کے نہ تو خصوصی طور پر موافق تھے اور نہ ہی مخالف۔ وہ آپؐ کے ہم سن بھی تھے اور دوہرے رشتہ دار بھی۔ ان کے والد عبدالمطلب نے آخری عمر میں ایک اور شادی کی تھی۔ جو حضرت محمدؐ کی والدہ کی رشتہ کی بہن تھیں۔ یہ شادی اور حضرت محمدؐ کے والدین کی شادی بھی صرف دو چار روز کے فرق سے ہوئی تھی اور ان دونوں لڑکوں (حضرت محمدؐ اور حضرت حمزہؓ) نے خانہ بدوش دایاؤں کے ہاں رضاعت کے لئے جانے سے پہلے ایک ہی دایہ[1] کا دودھ پیا تھا۔ اور گو

[1] - اس کا نام ثویبہ تھا۔

شکل وصورت اور عادات واطوار میں ایک دوسرے سے ممکن حد تک مختلف تھے دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے دوست رہے۔

حضرت حمزہؓ خصوصیت سے ایک جنگجو شخص تھے۔ بڑے طاقتور اور لڑاکا۔ وہ ایک بڑے ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ ان کی ڈاڑھی گھنی اور آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔ کسی کو اُن سے جان بوجھ کر لڑائی مول لینے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ گو انہوں نے کبھی اپنے بھتیجے کے خیالات و نظریات کی حمایت نہیں کی لیکن اذیتوں کا پامردی سے مقابلہ کرنے پر آپؐ کی تعریف کرتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے ابوجہل کی گستاخی اور بدسلوکی کا حال سنا تو بہت غصہ آیا اور اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ وہ انہیں کعبہ کے سامنے ہی قریش کے چند لوگوں سے اپنے ان کارناموں پر شیخی بگھارتا ہوا مل گیا۔ اس سے آپ کا پارہ اور چڑھ گیا۔ حضرت حمزہؓ اس وقت ایک بے چڑھی کمان ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ اسی سے انہوں نے ابوجہل کے سر پر تڑا تڑ ضربیں لگائیں۔ یہاں تک کہ وہ کعبہ کے پختہ فرش پر گر پڑا۔ دوسرے قریش ابوجہل کی امداد کیلئے آگے بڑھے تو آپ نے ان کو ہاتھ کے اشارے سے پیچھے ہٹا دیا اور شعلے برساتی آنکھوں سے بآواز بلند کہا:۔

"اور میں بھی تمہارے ان پتھر کے خداؤں پر یقین نہیں رکھتا"

یہ اعلان کرنے کے بعد حضرت حمزہؓ اپنے سامنے خلاؤں میں دیکھتے رہے۔ اب اُن پر انکشاف ہوا کہ جو الفاظ غصہ میں ان کی زبان سے نکل گئے تھے وہ درحقیقت ان کے دل کی آواز تھی۔ چنانچہ وہ فوراً پلٹے، خفا قریشیوں کو وہیں چھوڑا اور اپنے بھتیجے کے پاس پہنچ کر ایمان لے آئے۔

حضرت محمدؐ کے لئے حضرت حمزہؓ کا ایمان لے آنا بے حد اہمیت کا حامل تھا۔ آپ سے سے اب آپ کے ایک چچا بھی تھے۔ جو ساتھ ہی ساتھ ایک بے داغ کردار کے انسان اور روایتی

لہ صاحب حیاۃ محمدؐ نے لکھا ہے کہ حضرت حمزہ شکار سے واپسی پر پہلے کعبہ کا طواف کرتے تھے چنانچہ اس روز انہیں کعبہ میں ہی ابوجہل کی اس بدسلوکی کا پتہ چل گیا اور اتفاق سے ابوجہل بھی کعبہ کے صحن میں ہی مل گیا۔

شجاعت کے مالک بھی تھے۔ ان کے مسلمان ہو جانے سے اسلام کو وہ تقویت اور عزت ملی جو ایک سو عام افراد کے مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جانے سے بھی نہ مل سکتی تھی۔ البتہ اس سے اہل کعبہ کی خفگی میں ضرور اضافہ ہونا تھا۔

حضرت حمزہؓ کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے محسوس کیا کہ وہ تو گھاٹے میں رہے ہیں۔ حضرت محمدؐ کے ساتھ بدسلوکی کو مسلمانوں نے ابوجہل کو سزا دے کر برابر کر دیا تھا۔ ادھر حضرت حمزہؓ کے خیالات کی تبدیلی نے حضرت محمدؐ کے قتل کرنے کے منصوبے پر کاری ضرب لگائی تھی۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ مسلمان اپنی اس کامیابی سے کوئی بڑا فائدہ اٹھائیں کچھ نہ کچھ بہت جلدی کرنا لازم تھا۔

ابوجہل کے ایک بھتیجے عمرؓ ابن الخطاب تھے۔ وہ ایک بڑے ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ اتنے قد آور تھے کہ جب وہ بیٹھے ہوتے تو کھڑے ہوؤں سے اونچے لگتے۔ ان کے چہرے کا رنگ پختہ تھا جو جزوی طور پر سیاہ چھلے دار ڈاڑھی سے ڈھکا رہتا تھا — وہ بیک وقت دونوں ہاتھوں سے ایک جیسا کام لے سکتے تھے اور ان کی طاقت اور جثہ متناسب تھے۔ وہ غضبناک بھی تھے اور کوئی ان سے دوبدو ہونے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ جہاں وہ اخلاقی اصولوں کے سختی سے پابند تھے اور مکہ کی شاہانہ زندگی سے اجتناب کرتے تھے وہاں وہ قدیم روایات میں کسی تبدیلی یا ردوبدل کے بھی قائل نہ تھے۔ ابوجہل ان کی اسی بات سے فائدہ اٹھا کر اپنے بھتیجے کو حضرت محمدؐ کے خلاف ورغلاتا رہا یہاں تک انہوں نے آپ کو قتل کرنے کا عہد کر لیا۔ (نعوذ باللہ) فتنہ پرداز (حضرت محمدؐ) کا سر لانے کا وعدہ کر کے حضرت عمرؓ آپؐ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور قریش بیٹھ کر بڑی امید کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ عمرؓ جب کسی کو ٹھکانے لگانے کا عزم کر لیتے تھے تو پھر فوری عمل کرتے تھے۔

بہرحال حضرت عمرؓ ابھی اس مکان کی طرف جا ہی رہے تھے، جہاں حضرت محمدؐ اور آپ کے پیرو روزانہ جمع ہوتے تھے کہ راستے میں انہیں ایک اور قریشی[1] ملا جو حال ہی میں مسلمان

---

[1] ان کا نام نعیم بن عبداللہ تھا۔

ہو گیا تھا۔ عمرؓ اس بات سے واقف نہ تھے۔ اس لئے بڑے فخریہ انداز میں انہوں نے بتایا کہ وہ کس ارادے سے جا رہے ہیں۔ اس شخص نے پریشان ہو کر ہاں میں ہاں تو ملا دی لیکن مشورہ دیا کہ اس سے پہلے کہ وہ اس قسم کا کوئی قدم اٹھائیں یہ بہتر ہوگا کہ وہ پہلے یہ اطمینان کر لیں کہ ان کے گھر والے تو سب اسی طرح ہیں جیسا کہ ہونا چاہیئے۔ حضرت عمرؓ نے اس بات کی وضاحت چاہی تو اس شخص نے بتایا کہ ان کی بہن آمنہؓ[1] اور ان کے شوہر سعیدؓ[2] دونوں مسلمان ہو چکے ہیں مزید کوئی لفظ کہے بغیر عمرؓ انہی قدموں لوٹے اور اپنی بہن کے گھر چلے گئے۔ اس اثنا میں اس شخص نے جلدی سے جا کر حضرت محمدؐ کو خبردار کر دیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنی بہن اور ان کے شوہر کو بھیڑ کی کھال کے ایک ٹکڑے سے قرآن پڑھتے[3] پایا۔ وہ آگ بگولا ہو گئے۔ سعیدؓ کو مار گرایا اور ان کا سر قلم کرنا چاہا۔ حضرت آمنہ نے دخل دینا چاہا تو انہیں زور سے دھکا دیا اور وہ زخمی ہونٹ کے ساتھ لڑکھڑاتی ہوئیں کمرے کے دوسرے سرے پر جا گریں۔ لیکن وہ قطعی نہیں ڈریں اور بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تمہاری ذات اور تمہارے تشدد کے باوجود میں اپنے سچے دین پر
اسی طرح قائم ہوں۔" اور پھر وجد میں آکر کلمہ پڑھا۔
"لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللہِ"

آپ نے اپنی بہن کی طرف بڑی حیرانی سے دیکھا۔ اُن کی آواز میں ایک قسم کی جرأت اور کشش تھی۔ حضرت سعید کو اٹھا کر کھڑا کیا اور کہا "مجھے دکھاؤ آمنہ کیا پڑھ رہی تھیں۔"

[1] حیاۃ محمدؐ اور دوسری کتابوں میں حضرت عمرؓ کی ان ہمشیرہ کا نام فاطمہ بنت خطاب لکھا ہے اور یہی صحیح ہے

[2] ان کا پورا نام سعید بن زید تھا۔

[3] واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے باہر سے بہن کے گھر میں ان کو قرآن پڑھتے سنا۔ بھائی کی دستک سن کر بہن نے لکھی ہوئی آیات کے پارچے کو چھپا دیا۔ پھر حضرت عمرؓ کے اصرار پر وہ سُورۃ نکال کر پیش کی گئی جسے پڑھ کر وہ بہت متاثر ہوئے اور ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ یہ آیات سورۃ طٰہٰ کی تھیں۔

حضرت آمنہ نے بادل ناخواستہ لکھی ہوئی آیات پاک ان کے حوالے کر دیں۔ حضرت عمرؓ نے پڑھنا شروع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

طٰهٰ ۝ ما انزلنا علیک القرآن لتشقیٰ ۝ — ہم نے نہیں اتارا تجھ پر قرآن کہ (بنی نوع انسان) محنت میں پڑیں۔

الا تذکرۃ لمن یخشیٰ ۝ تنزیلاً ممن خلق الارض والسمٰوات العلیٰ ۝ — لیکن نصیحت کے واسطے اس کے جس کو ڈر ہے اللہ کا اس کو اتارا ہے اس ذات نے جس نے پیدا کئے زمین اور بلند

الرحمٰن علی العرش استویٰ ۝ — آسمان وہ بڑی مہر والا ہے جو تخت پر قائم ہوا۔

لہٗ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض وما بینہما وما تحت الثریٰ ۝ ... — اس کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور زمین کے نیچے ہے۔

حضرت عمرؓ بیٹھ گئے اور پڑھتے رہے۔ کچھ دیر بعد اپنی تلوار نیام کر لی اور بہن کے گھر سے اسی طرح اچانک چلے گئے جیسے آئے تھے۔ تیزی سے وہ اپنی پہلی منزل کی جانب چلے۔ حضرت محمدؐ کو ابو جہل کے ایک قریبی عزیز (حضرت عمرؓ) کے قاتلانہ ارادوں کا پتہ چل چکا تھا اور آپؐ اپنے چند اصحاب کے ساتھ جن میں حضرت حمزہؓ بھی تھے بیٹھے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن توقع کے خلاف زور سے دروازہ کھولنے کی بجائے حضرت عمرؓ نے دستک دی۔ حضرت محمدؐ نے اندر آنے کی اجازت دے دی اور جب وہ اپنے دیو قامت جثے کے ساتھ دروازے میں کھڑے نظر آئے تو آپؐ نے دریافت کیا "عمرؓ کیسے آئے؟" حضرت عمرؓ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں اللہ اور اس کے رسول پہ ایمان لانے والوں کی جماعت میں شامل ہونے آیا ہوں"

لیکن جہاں دوسرے مسلمانوں کو اپنی حیرانی پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا وہاں حضرت محمدؐ کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ چند مختصر سوالات کے بعد آپؐ نے حضرت عمرؓ سے اسلام

قبول کرنے کا اعلان کرایا۔

حضرت عمرؓ کا اسلام لانا صرف مسلمانوں کے نصب العین کے لئے ہی ایک بہت بڑی اور فوری اہمیت کا حامل نہ تھا بلکہ اس نے اسلامی تاریخ میں ایک نہ مٹنے والا نقش ثبت کر دیا۔ حضرت محمدؐ کی وفات پر حضرت ابوبکرؓ کے بعد آپ دوسرے خلیفہ ہوئے اور آپ پہلے شخص تھے کہ خلیفہ ہونے پر "امیر المومنین"ؔ کا لقب اختیار کیا جو ۱۹۲۲ عیسوی تک رائج رہا۔ انہی کے عہد حکومت میں عرب سلطنت کو مضبوط اور مستحکم بنیادوں پہ استوار کرنے کا کام مکمل ہوا۔ انہی کی یاد میں بیت المقدس میں "مسجد عمر" تعمیر کی گئی۔ تاریخ اسلام میں حضرت محمدؐ کے بعد دوسرے منبر پہ حضرت عمرؓ ہی آتے ہیں۔ ان میں حضرت محمدؐ کا سا مزاج اور حضرت ابی بکرؓ کا سا تحمل تو نہ تھا لیکن ایک بے پناہ جوش اور ولولہ تھا۔ جو آپ اپنے ماتحت سالاروں میں پیدا کر کے ان کو بے خوف و خطر دنیا کی فتوحات کے لئے بھیج دیتے تھے۔

وہ ایک بڑا ہیجان پرور لمحہ تھا جب حضرت عمرؓ نے "اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں" کا جملہ ادا کیا۔ یہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھی جس کا بڑے سے بڑا رجائیت پسند انسان بھی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ایک ناقابل یقین بات تھی اور اس موقع سے بلا تاخیر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی ضرورت تھی۔

حضرت عمرؓ سے زیادہ اس معاملے میں اور کون سرگرم ہو سکتا تھا۔ جونہی حضرت محمدؐ نے ان کی بیعت قبول کر لی انہوں نے تجویز پیش کی کہ اس کا رسمی اعلان کعبہ میں ہونا چاہئے۔ کسی نے اس تجویز کی مخالفت نہ کی۔ چنانچہ ایک جلوس ترتیب دیا گیا۔ وہ پیروکار (مسلمان) جو حضرت محمدؐ کے گرد اس لئے جمع ہو گئے تھے کہ حضرت عمرؓ کے خلاف آپؐ کی حفاظت کریں اب اپنے ایک وقت کے قاتل کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ آپ کے دائیں طرف رسول اللہؐ اور بائیں طرف ابی بکرؓ تھے۔ آپ کے بالکل پیچھے حضرت حمزہؓ تھے۔

لہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے تک سلطان ترکی خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کہلاتا تھا لیکن ۱۹۲۳ء میں غازی مصطفےٰ کمال نے ترکی میں جمہوریت قائم کر کے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔

ابو جہل اور اس کے حمایتی یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ وہ بڑے یقین سے انتظار کر رہے تھے کہ عمرؓ حضرت محمدؐ کا خون آلود سر ان کے قدموں میں لا ڈالیں گے۔ اس کی بجائے انہوں نے دیکھا کہ ان کا ہیرو اور پشت پناہ نہ صرف یہ کہ ان کے دشمن کے تقریباً ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے چل رہا ہے بلکہ وہ واقعی طور مسلمانوں کی طرح عبادت بھی کر رہا ہے لیکن اس وقت کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا جنہیں اپنی جانیں عزیز تھیں وہ عمرؓ جیسے لوگوں سے لڑائی مول نہیں لے سکتے تھے اور خصوصاً جبکہ حضرت حمزہؓ جیسی شخصیت بھی ان کے ساتھ ہو۔

دوسرے روز حضرت عمرؓ اکیلے کعبہ گئے اور نئے طریقے کی عبادت کی اور پھر بھی نہ کسی نے ہاتھ اٹھایا اور نہ ہی کچھ کہنے کی جرأت کی۔ قریش کے نقطہ نظر سے یہ ایک غلطی تھی۔ گو حضرت عمرؓ کا قتل شدید قسم کا خاندانی قتل و خون کا جھگڑا کھڑا کر دیتا لیکن حضرت محمدؐ کم از کم ایک ایسے قوی معاون سے ضرور محروم ہو جاتے جو اگر ایک طرف بت پرست مکے پر تباہی لاتا تو اتنا ہی نقصان آپؐ کے نظریے اور نصب العین کو بھی پہنچتا۔ بعد میں آپؐ کہا کرتے تھے۔

"اگر خود شیطان کا بھی عمرؓ سے راستے میں آمنا سامنا ہو جائے تو وہ بھی ڈر کر کسی تنگ گلی میں جا چھپے۔"

لیکن اب پانسہ پلٹ چکا تھا اور اب یہ قریش ہی تھے جو حضرت عمرؓ کو آتا دیکھ کر گلیوں میں جا چھپتے۔ لیکن زبانیں بند اور تلواریں نیام ہونے کے باوجود اہل قریش کا رویہ دوستانہ نہ تھا درحقیقت ان کی مخالفت اور عناد میں اور اضافہ ہو گیا تھا اور اب ایک واقعہ نے صورتِ حال کو اور سنگین بنا دیا۔

مسلمانوں کی ایک جماعت حبشہ کو ہجرت کر چکی تھی اور یہ افواہ گرم تھی کہ حضرت محمدؐ اہلِ حبش سے مکہ پر حملہ کرانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ گویا قوم کے خلاف اپنے دوسرے جرائم کی فہرست میں آپؐ اب غداری کا بھی اضافہ کر رہے تھے۔ حضرت محمدؐ کا قتل اب وقت کا تقاضہ تھا خواہ نتائج کچھ ہی ہوں۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ابو سفیان نے ایک فرمان جاری کر کے بنی ہاشم کو برادری سے خارج کر دیا تاآنکہ وہ حضرت محمدؐ کو قتل کے لئے ان کے حوالہ نہ کر دیں اگر حضرت ابو طالب اس وقت مدد نہ کرتے تو حالت بڑی ناگفتہ بہ ہو چلی تھی۔ بلکہ

سے باہر ان کی ایک خاندانی گڑھی ۱؎ (چھوٹا قلعہ) تھی۔ اس میں انہوں نے حضرت محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کو پناہ دی۔ یہاں کچھ عرصہ ۲؎ انہوں نے سخت تکالیف کا سامنا کیا۔ اہل قریش نے انہیں بھوکا مارنے کی کوشش کی اور جو تھوڑا بہت ان لوگوں کو کھانا پینا میسر آتا وہ ان چند وفادار دوستوں کی وساطت سے پہنچتا تھا۔ جو شہر میں ہی ٹھہر گئے تھے لیکن جیسا کہ سب معتوب لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی جرأت اور اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے کا عزم مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔

کچھ عرصہ بعد صورتِ حال نے خراب ہو کر زچ کی شکل اختیار کر لی۔ وقت گزرنے پر مکہ کے چند گروہوں میں اختلاف رائے شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ رائے عامہ ابوسفیان کے خلاف ہو گئی۔ ادھر نہ تو اہلِ حبش نے حملہ کیا اور نہ ہی حضرت محمدؐ اور ان کے ساتھیوں نے ہار

۱؎ شعب ابی طالب۔ اصل میں قدیم مکہ سے ذرا باہر یہ ایک گھاٹی تھی جس میں بنی ہاشم کے مکانات تھے غالباً اس کے گرد فصیل ہو گی اور یہ گڑھی کا کام دیتی ہو گی۔ یہ اب تک موجود ہے اور اب اسے شعب بنی ہاشم کہتے ہیں اس سے باہر نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے جو اب شارع ارقم پر ہے۔ قریش نے غالباً یہ راستہ بند کر کے انہیں محصور کر دیا تھا۔

۲؎ "حیاۃ محمدؐ" از ڈاکٹر محمد حسین ہیکل، "تذکرۃ الکرام تاریخ الخلفاء عرب و اسلام" اور کئی دوسری کتابوں میں یہ عرصہ تین سال کا لکھا ہے ابوسفیان اور ابوجہل کی انگیخت پر قریش نے مسلمانوں کو شعب ابی طالب میں محصور کر کے ان سے ہر قسم کا مقاطعہ کر لیا تھا۔ نہ وہ اس گھاٹی سے نکل سکتے تھے اور نہ ہی قریش ان سے بات چیت یا خرید و فروخت کرتے تھے۔ اس کے لئے قریش نے مسلمانوں سے ترک موالات اور قطع رحمی کا ایک عہد نامہ لکھ کر کعبہ کے دروازہ پر لٹکا دیا تھا۔ تین سال بعد کچھ قریش جن میں مطعم بن عدی، ابوالبختری، زہیر بن امیہ شامل تھے اس مستقل بدسلوکی کے خلاف ہو گئے اور عہد نامہ پھاڑ ڈالنا چاہا۔ لیکن مطعم بن عدی نے اس عہد نامہ کو اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو بسمک اللّٰھم کے الفاظ کے علاوہ سارے عہد نامے کو دیمک چاٹ چکی تھی۔ اس اختلاف رائے کے سبب مسلمانوں پر سے پابندی اٹھانی پڑی۔ لیکن اس دوران فاقوں اور موالات کے سبب مسلمانوں اور بنی ہاشم کو بڑی تکالیف اٹھانی پڑیں۔ حضرت خدیجہؓ اور حضرت ابوطالب کی قبل از وقت وفات ان ہی سختیاں جھیلنے کا نتیجہ تھا۔

مانی۔ مزید برآں اہل کعبہ کے آپس کے جھگڑے طرح طرح کی پریشانیاں اور پیچیدگیاں پیدا کر رہے تھے۔ ابوسفیان نے سمجھ لیا کہ اب سمجھوتہ ناگزیر ہے۔ اس کے لئے اسے اس واقعہ میں ایک معقول بہانہ بھی مل گیا کیونکہ ہاشمیوں کے خلاف جاری کردہ فرمان کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ فردجرم ختم ہو جانے کے بعد حضرت محمدؐ اور ان کی محصور جماعت کو اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت مل گئی۔

اس قید و بند سے واپسی پر کچھ اور لوگ نئے دین میں داخل ہونا شروع ہو گئے لیکن اہل کعبہ نے سردست ان سے چشم پوشی کرنا ہی دانشمندی خیال کیا لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ اب صلح ہو گئی تھی۔ ابھی آرام و امن کہاں۔ یہ تو ایک عارضی صلح تھی اور حضرت محمدؐ کے مخالفین اس انتظار میں تھے کہ آئندہ کیا قدم اٹھائیں۔ ادھر حضرت محمدؐ بھی ہوشیار اور چوکنے تھے آپؐ آٹھ سال سے مسلسل سختیاں برداشت کر رہے تھے اور اب آپؐ کو پہلے سے کہیں زیادہ یقین تھا کہ آپؐ غلط راستہ پر نہیں جا رہے تھے۔ گو اب آپؐ مکہ میں چھپ کر نہیں چلتے تھے اور نہ ہی یہ ڈر ہوتا تھا کہ کسی گلی کے موڑ پر آپ پر کوئی حملہ کر دے گا لیکن ابھی آپؐ کو ان سے بھی زیادہ سخت مصائب کا سامنا کرنا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ساری باتیں آپؐ کے صبر اور حوصلے کی آزمائش کے لئے ہو رہی ہیں۔

مکہ واپس آنے کے کچھ دیر بعد ہی حضرت خدیجہؓ بیمار پڑ گئیں۔ مسلسل اذیتوں اور تکالیف نے جن کی وہ عادی نہیں تھیں۔ انہیں تھکا دیا تھا اور وہ جلدی ہی انتقال کر گئیں مرض الموت کے آخری تین دنوں میں حضرت محمدؐ ان کے پاس سے نہیں ہٹے۔ جب آہستہ آہستہ ان پر غشی طاری ہونے لگی تو آپؐ نے انہیں یقین دلایا کہ وہ جنت کی معزز خواتین میں سے ہوں گی۔ مرتے دم تک انہیں کامل یقین تھا کہ جو کچھ ان کے شوہر کہہ رہے تھے سچ تھا۔ یہ سن کر حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو انہی پیار بھری نظروں سے دیکھا جن سے وہ ہمیشہ دیکھتی رہی تھیں اور آپؐ کے بازوؤں میں دم دے دیا۔ یہ دسمبر (۶۱۹ء) کا مہینہ تھا۔ حضرت خدیجہؓ کی عمر ۶۵ سال تھی اور حضرت محمدؐ ابھی پورے پچاس کے بھی نہیں ہوئے تھے۔

ابھی حضرت محمدؐ اس غم سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک اور جانکاہ صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ یعنی حضرت ابوطالب کا انتقال ہو گیا۔ حضرت محمدؐ آخر وقت تک ان کے پاس رہے۔

آپؐ نے انتہائی کوشش کی کہ آپؐ کے اسی سالہ بوڑھے چچا نئے دین کی قبولیت کا اقرار کر لیں۔ لیکن وہ نہ مانے۔ اصل میں مصائب کے ان سالوں میں ان کی اخلاقی اور عملی امداد، حضرت محمدؐ سے محبت اور فرضِ انسانی کے سبب تھی ورنہ وہ اپنے بھتیجے کے ایک مذہبی انقلاب لانے والے خیالات و نظریات سے کبھی متفق نہیں ہوئے۔ چنانچہ وہ بُت پرست قریش کے جس قدیم مسلک میں پیدا ہوئے اسی پر انتقال کیا۔

ایک سال کے اندر اندر اس دوسری موت کے صدمے نے حضرت محمدؐ کی کمر توڑ دی۔ اور یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ ایسا شخص جس کی راہ میں اتنی مشکلات ہوں کامیاب ہو سکے گا۔ صرف یہ ہی نہیں کہ ساری دنیا ہی آپؐ کے خلاف تھی بلکہ آپؐ اپنے عزیز ترین اور بہترین دوستوں اور چاہنے والوں سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ ان کی اخلاقی حمایت اور شفقت جو آپؐ کے اور آپؐ کے نصب العین کے لئے بڑی اہمیت رکھتی تھی اور اس سے زیادہ ضروری شے ان کی حمایت اور پناہ آپ کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ جب تک حضرت ابو طالب زندہ رہے ان کے بہت سے ساتھیوں نے ان کے لحاظ سے ان کے بھتیجے کی علانیہ مخالفت نہیں کی، اور اسی طرح وضعداری کا خیال کرتے ہوئے حضرت خدیجہؓ کے عزیز و اقارب بھی حضرت محمدؐ کی کھلی مخالفت سے رکے رہے کیونکہ اس شادی کے سبب وہ بھی آپؐ کے رشتہ دار بن گئے تھے لیکن اب یہ تمام مصلحتیں اور رکاوٹیں دور ہو گئی تھیں اور حضرت محمدؐ مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ اکیلے رہ گئے تھے۔ آپؐ کے پاس روپیہ پیسہ بھی نہیں تھا۔ مصائب اور تکالیف کے ان سالوں میں حضرت خدیجہؓ کی تجارت مسلسل کم ہوتی چلی گئی تھی۔ حضرت محمدؐ بے حد مصروفیت کے سبب اس طرف توجہ نہیں کر سکے اور حضرت خدیجہؓ نے بھی آپؐ کو اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ البتہ جو کچھ انہوں نے بچایا تھا اسی پر گذر ہو رہی تھی۔ اور یہ اُن کی وفات کے بعد ہی پتہ چلا کہ باقی تمام مصائب کے علاوہ آپؐ بالکل قلاش بھی ہو چکے تھے۔

اس پر بھی آپؐ کا حوصلہ نہ ہارنا ایک مرتبہ پھر ظاہر کرتا ہے کہ آپؐ دنیاوی آسائشوں اور ضروریات سے کتنے بے نیاز ہو گئے تھے۔ آپؐ کے لئے یہ بہت آسان بھی تھا اور فائدہ مند بھی

کہ آپ قریش کے پاس جاکر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے۔ اس طرح اس مغرور قبیلہ کا ہر فرد آپ کی طرف دست تعاون بڑھاتا۔ آپ کی تجارت بحال ہو جاتی اور عین ممکن تھا کہ آپ کو کعبہ کا متولی بنا دیا جاتا یا ایک بہت قیمتی جہیز لانے والی بیوی بھی آپ کے لئے تلاش کی جا سکتی تھی۔ گو ایک مرتبہ آپ کا صرف اس حد تک جھکنے کا خیال ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عزیٰ، لات و منات کو بھی تسلیم[1] کر لیا جائے، لیکن جلد ہی ایسی رعایت کا خیال واپس لے لیا۔

آپ نے دیکھا کہ جس کارِ عظیم کا بیڑا آپ نے اٹھایا ہے اس میں سمجھوتے اور کسی اور معبود کی شراکت کی گنجائش ہی نہیں اور اس کا حل اتنا آسان نہیں۔ اب آپ راستے پر پڑ چکے تھے اور یہ کتنا ہی حوصلہ شکن کیوں نہ ہو آپ کو منزل پر پہنچ کر ہی دم لینا تھا۔ اس مہم میں آپ کو حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت حمزہؓ، زیدؓ اور حضرت علی کرم جیسے مخلص دوستوں کی غیر متزلزل حمایت حاصل تھی۔ ان کی امداد سے آپ نے ایک مرتبہ پھر یہ ثابت کرنے کا عزم دہرایا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

---

[1] مصنف کا یہ اشارہ داستان غرانیق (اصنام) کی طرف ہے۔ جس کا بعض کتابوں میں ذکر ملتا ہے لیکن یہ ایک داستان طرازی سے زیادہ کچھ نہیں۔ ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے بھی اس داستان کو قطعی غلط اور بے بنیاد قرار دیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو شخص نبی ہونے سے پہلے بت پرستی کے خلاف ہو وہ بعثت کے بعد کس طرح انہیں اللہ کے ساتھ شریک کرنے کو تیار ہو سکتا ہے۔ (مترجم)

چھٹا باب

اِسلامی عقائد و تعلیمات

بظاہر یہ بے ضرر سا اعلان کر کے کہ اللہ نے آپؐ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے، حضرت محمدؐ نے مکہ میں ایک ایسا ہیجان بپا کر دیا تھا جو صدیوں سے دیکھنے میں نہیں آیا تھا اور ایک سو سال بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ یہ تحریک، بڑھتے بڑھتے ایک سیلاب کی طرح اس وقت کی بیشتر مہذب دنیا میں پھیل گئی۔ اور آج تیرہ سو سال گزرنے پر یہ طوفان اب بھی مسلم اور غیر مسلم کے ٹکراؤ پر پھٹ پڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ آخر حضرت محمدؐ نے غارِ حرا میں پہلی وحی نازل ہونے کے بعد دس سال کے دوران میں ایسی کون سی بات اپنے ذہن میں پرورش کی تھی جو اتنی ہنگامہ خیز تھی؟ آپؐ کی تعلیمات یہودیت اور عیسائیت کے مقابلے میں اتنی تیزی سے کیوں پھیلیں؟ حضرت محمدؐ کی تعلیمات اور حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی تعلیمات میں کیا فرق تھا؟ مذہب کے پابند مسلمانوں کی تعداد یہودیوں اور عیسائیوں کی نسبت کیوں زیادہ ہے۔؟

ان باتوں کا جواب اتنا مختصر نہیں کہ ایک پیراگراف میں دیا جا سکے تاگر یہ کتاب اپنے مقصد کو پورا کرتی ہے تو ان کا جواب اس کے صفحات میں ملے گا جو کچھ بھی ہو سکتا ہے اور فی الوقت جن باتوں کی اس باب میں وضاحت کی جائے گی وہ حضرت محمدؐ کے نئے دین کے صرف بڑے بڑے اصول ہوں گے وجس کا نام اسلام ہے، محمدیت نہیں۔

یہ کہنا کہ فلاں شخص یا فلاں خاتون محمدی ہے غلط ہے۔ حضرت محمدؐ نے کسی وقت بھی

یہ نہیں کہا کہ جس دین کی آپؐ نے تبلیغ کی وہ آپؐ کی اپنی اختراع ہے۔ آپؐ نے اپنے متعلق ایسی کسی ایک بات کا بھی دعویٰ نہیں کیا جو الوہیت سے تعلق رکھتی ہو۔ آپؐ کے پیروکاروں نے کبھی آپؐ کی پرستش نہیں کی۔ آپؐ نے تو ہمیشہ یہ کہا کہ آپؐ بھی حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی طرح ہی کے پیغمبر تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس لئے بھیجا تھا کہ اس کے بندوں کو جو وقتاً فوقتاً گمراہ ہوتے رہے ہیں راہ راست پر لائیں۔

آپؐ نے (قرآن کے الفاظ میں) فرمایا:

"قولوا اٰمنّا باللہ وما اُنزِلَ اِلینا وما اُنزِلَ علیٰ ابراھیمَ واِسمٰعیلَ .... ونحنُ لہٗ مُسلِمُونَ۔" (سورہ بقرہ۔ رکوع۔ ۱۶)

"کہہ دو کہ ہم تو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا اور جو حضرات ابراہیمؑ۔ اسمٰعیلؑ۔ اسحٰقؑ۔ یعقوبؑ اور ان کی اولاد میں نیک بندوں پر اتارا گیا۔ اور جو (کتابیں) حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو دی گئیں اور جو دوسرے نبیوں کو ملا اُن کے رب کی طرف سے۔ ہم فرق نہیں کرتے ان میں سے کسی ایک میں اور ہم سب اسی کے حکم بردار ہیں۔"

پھر فرمایا "میں تو تم ہی جیسا ایک انسان ہوں سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی مجھ پر نازل ہوتی ہے۔"

نظریہ اسلام کا حضرت محمدؐ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ اس کی بنیاد بذریعہ وحی اتارے جانے والے ارشاداتِ ربانی کے ایک تیار شدہ مجموعہ پر تھی جو یہودیت کی مذہبی تاریخ کے تدریجی ارتقاء اور عیسائیت کا نتیجہ تھا۔ حضرت محمدؐ ایک حقیقت پرست تھے۔ اگر آپؐ بیسویں صدی میں پیدا ہوتے تو آپؐ خود بھی اور آپؐ کی تعلیمات بھی موجودہ زمانے کے جدید نظریات کے ساتھ زیادہ جلدی ہم آہنگ اور مقبول ہو جاتیں اور بہت اغلب تھا کہ آپؐ ہی ان کے پیشوا ہوتے لیکن آپؐ اپنے پیشرو پیغمبروں کے مقابلے میں ہرگز اپنی برتری نہ جتاتے اور اس سے زیادہ کچھ نہ کہتے، جو کچھ آپؐ نے ساتویں صدی عیسوی میں کہا تھا یعنی یہ کہ آپؐ بھی ان ہی طرح کے ایک پیغمبر تھے اور آپؐ یہ تو یقینی طور پر نہ کہتے کہ آپؐ کے دین کو آپؐ کا نام دیا جائے۔

وہ مرد وعورت جو حضرت محمدؐ کی تعلیمات یا دین اختیار کر لیتے تھے انہیں اس وقت بھی مسلمان کہتے تھے اور اب بھی یہی کہتے ہیں۔ مسلم اسے کہتے ہیں جو اللہ کی اطاعت اختیار کرے اور اپنے آپ کو اُس کے سپرد کر دے۔ یہ لفظ سَلَمْ سے مشتق ہے۔ جو مسلمانوں کے دین اسلام کا مادہ ہے۔

سَلَمَ کا سب سے پہلا مطلب خاموش، پرسکون ہونا، اللہ کے احکام بجالانا۔ قرض چکا دینا اور مکمل امن وسلامتی سے رہنا اور آخر کار اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی سپردگی میں دے دینا ہے جس سے امن وسلامتی کا معاہدہ ہوتا ہے۔

لفظ اسلام کا زیادہ مختصر ترجمہ "اللہ کی اطاعت" ہے۔ نہ صرف مکمل سپردگی بلکہ نیکی کے لئے کوشاں ہونا بھی ہے۔ اصل میں تمام سچے مذاہب کا بڑا اصول یہ ہی ہے۔ جیسا کہ گوئٹے نے کہا تھا "اگر اسلام یہی ہے تو کیا ہم سب مسلمان نہیں ہیں"؟

لفظ 'سلام' جو بعض مغربی لوگ ملتے اور جدا ہوتے وقت بلا سوچے سمجھے استعمال کرتے ہیں، کا مادہ بھی یہی ہے۔ اس کا مطلب نیک خواہش اور سلامتی ہے۔ پورا سلام اَلسَّلامُ عَلَیکَ یا اَلسَّلَامُ عَلَیکُمْ ہے (تم پر سلامتی ہو) جو ایک یا ایک سے زیادہ کے لئے موقعہ کے مطابق استعمال ہوتا ہے۔ سارے اسلام کا دارومدار ان چند بہت ہی سادہ سی بنیادوں پر ہے :۔

"ھواللہ الَّذِی لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلمَلِکُ القُدُّوسُ السَّلامُ المومن المھیمن العزیز الجَبَّارُ المتکبِّر...... ھُوَاللہُ الخَالِقُ البَارِیُٔ المُصَوِّرُ ...... و ھوالعزیز الحکیم" (سورہ حشر)

"وہ اللہ ہے جس کے سوا کسی کی بندگی نہیں۔ جو بادشاہ ہے۔ پاک ذات ہے۔ سلامتی اور امان دینے والا۔ پناہ میں لینے والا۔ زبردست قوت والا اور بڑائی والا ہے ...... وہ اللہ ہے پیدا کرنے والا، عدم سے وجود میں لانے والا اور شکل وصورت بنانے والا.. ...... اور وہ زبردست حکمت والا ہے۔

قرآن کی ایک سو بارہویں سورۃ (سورہ اخلاص) کے الفاظ یہ ہیں :۔

"قُل ھُوَاللہُ اَحَد اللہُ الصَّمَد لَم یَلِد وَلَم یُولَد وَلَم

یَکُن لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ؕ"

"کہہ دو (اے محمدؐ) اللہ ایک ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔ نہ کوئی اس سے پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ اور اس کا مثل کوئی نہیں۔"

حضرت محمدؐ کے نزدیک اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے یا کسی اور کو معبود ماننے سے بڑھ کر کوئی اور گناہ نہیں۔ قرآن میں اس کا ذکر بار بار آیا ہے اور خصوصاً دوسری سورۃ میں۔۔۔۔

"اللہ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الحیُّ القیّومُ ۚ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَہٗ مَا فِی السّمٰوٰتِ وَمَا فِی الاَرْضِ ؕ۔۔۔۔۔۔۔

"اللہ وہ ہے۔ جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ اور ہمیشہ رہنے والا ہے نہ اسے نیند پکڑتی ہے اور نہ اونگھ اور سب کچھ اسی کا ہے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں۔۔۔۔۔۔

ان باتوں کے ساتھ اس کا اضافہ بھی لازمی ہے کہ حضرت محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ نبی نہیں بلکہ رسول۔ کیونکہ جہاں حضرت محمدؐ کو بہت دفعہ نبی (جس کے معنی دین کی اشاعت کرنے والا یا مبلغ ہیں) کہا گیا ہے۔ وہاں دینی اصطلاح میں آپؐ کے لئے لفظ رسول استعمال کیا گیا ہے یعنی اللہ کا پیغام لانے والا۔

یہ عقیدہ بہت اہم ہے کیونکہ جہاں حضرت محمدؐ نے اپنے آپ کو ایک عام عرب جیسا ہی فانی کہا۔ وہاں آپؐ خود کو رسولؐ اللہ کہلانے کے عقیدے کو لازمی قرار دیتے تھے اور پھر قرآن کے الفاظ میں بھی "اللہ پر ایمان کو محمدؐ پر ایمان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔"

شروع شروع میں تو حضرت محمدؐ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ذات کا تصور احاطہ خیال میں نہیں آسکتا تھا۔ پہلے پہلے وہ رب تھا، مالک حقیقی، ایک بہت بلند مقام رکھنے والا خدا تعالیٰ۔ جو بہت بلندیوں پر ساری کائنات کا حاکم مطلق تھا۔ پھر رب کے لفظ کا استعمال کم ہوتا گیا اور اس کی جگہ اللہ نے لے لی۔ اللہ اب زیادہ قریب تھا۔ اور اب انسان جب بھی اس کی طرف متوجہ ہوتو اس کی موجودگی کو محسوس کر سکتا تھا۔ اور جلد ہی وہ اور زیادہ قریب آگیا۔ آنحضرتؐ نے کہنا شروع کر دیا۔

"جب تین[1] آدمی اکھٹے ہوں تو چوتھا اللہ ہوتا ہے اور جب پانچ ہوں تو چھٹی ذات اس کی ہوتی ہے ...... عبادت کرتے وقت زور زور سے بولنا ضروری نہیں کیونکہ اللہ تو بہت آہستہ سے کہی ہوئی بات بھی سن لیتا ہے۔"

اور آخر میں آپؐ نے اعلان کر دیا کہ اللہ صرف سب کے ساتھ اور سب کے نزدیک ہی نہیں بلکہ خود سب لوگوں کے اندر بھی موجود ہے۔

جب میں پہلے پہل عربوں میں رہا تو سب سے زیادہ محکم تاثرات میں سے جو میں نے ان سے اخذ کئے ایک تاثر ان کی روزمرہ کی زندگی میں اللہ کی موجودگی کا تھا۔ وہ ان کے کھانے، سفر، تجارت اور اُن کے پیار و محبت میں ان کی رہبری کرتا تھا۔ وہ کسی وقت بھی ان کے ذہن سے دور نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان کا قریب ترین مشفق تھا۔ یہ بات ایک طرح سے ان لوگوں کے لئے ناممکن ہے جن کا خدا صرف رسمی عبادت کرنے کے سبب ان سے دُور اور جدا رہتا ہے۔ یہ یقین کہ ان کا خدا صحرا میں بھی ان کے ساتھ ہے ان میں سے ہر شخص کا عقیدہ تھا۔ خواہ وہ قبیلے کا سردار ہو یا ایک گڈریے کا لڑکا۔ ایک فقیر سے لے کر ایک امیر تاجر تک خدا اور اسلام پر بڑی سمجھ داری سے بات کر لیتے تھے وہ نہ تو کوئی بات شروع کرتے تھے اور نہ ختم اور نہ ہی کسی بات کا وعدہ کیا جاتا اور نہ ہی کسی سے مدد کی درخواست کی جاتی تھی جب تک کہ اللہ تعالیٰ سے مدد[2] نہ مانگی جائے یا اسے گواہ[3] نہ بنا لیا جائے یا پھر اس کا شکر[4] نہ ادا کر لیا جائے۔

حضرت محمدؐ کے فرمانے کے مطابق اللہ ہر وقت ہمارے ساتھ ہے۔

---

[1] پہلا ٹکڑا سورہ مجادلہ (رکوع ۲) کی اس آیت کا ترجمہ ہے: "الم تر ان اللہ یعلم ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض ۝ ما یکون من نجوی ثلٰثۃ الا ھو رابعھم ولا خمسۃ الا ھو سادسھم ولا ادنیٰ ......" دوسرا ٹکڑا غالباً سورہ ملک کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے:۔ "واسروا قولکم او اجھروا بہ ط انہ علیم بذات الصدور ۝ (سورہ ملک۔ رکوع ۱) یا سورہ ممتحنہ کی یہ آیت وانا اعلم بما اخفیتم وما اعلنتم ط

[2-3-4] یہ انشاء اللہ، اللہ وکیل اور الحمد للہ جیسے کلمات کا ترجمہ ہے جو عام طور پر روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہوتے ہیں۔

ان میں سے کوئی بات بھی یقینی طور پر نئی نہیں ہے لیکن یہ حضرت محمدؐ کے نزدیک نئی تھیں۔ بہت سی قدیم روایات اور عقائد کو نئے اسلوب اور وضاحت کے ساتھ اسلام میں شامل کر لینے کے سبب یہ کہنا کہ آپؐ نے انجیل کی نقل کی ہے غلط ہے۔ آپؐ نے کبھی انجیل دیکھی ہی نہیں، سوائے اس کے کہ ورقہ بن نوفل نے انجیل کی بعض باتیں نامکمل طور پر آپؐ کے سامنے بیان کی ہوں۔ اس وقت کوئی انجیل تھی ہی نہیں جسے آپؐ دیکھتے۔ اس کے علاوہ یہ بھی قریب قریب بعید از قیاس ہے کہ خود ورقہ نے بھی انجیل دیکھی ہو۔ کیونکہ عہد نامہ ہائے عتیق و جدید کا سب سے پہلا باضابطہ عربی ترجمہ حضرت محمدؐ کی وفات کے کئی سو سال بعد ہوا۔

یہ حقیقت کہ دونوں قدیم مذاہب کی قائم رہنے والی قوتیں نئے دین کے ہر مرحلے میں واضح طور پر نظر آتی ہیں نتیجہ ہیں ان باتوں کا جو حضرت محمدؐ نے اپنے متعدد سفر کے دوران سنیں اور اثرات[1] ہیں ان مواعظ کے جو آپؐ نے بحیرا راہب، ورقہ اور نجران کے بشپ قُس بن ساعدہؓ سے سنے۔ آپؐ کا معاملہ ایک ایسے لادین شخص کا سا تھا جو موحّد ہو گیا ہو اور جس نے وحدانیت کے نظریے اور تعلیمات توحید پرست لوگوں کے جلسوں میں شامل ہو کر اور واعظین کو سن کر حاصل کئے ہوں لیکن خود کبھی انجیل کی ایک سطر بھی نہ پڑھی ہو۔

بہت سے لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ اسلام میں یہودی اور عیسائی مذاہب کی بہت سی باتیں[2] شامل ہیں۔ حضرت محمدؐ کے خیال کے مطابق قدیم مذاہب یکے بعد دیگرے بعد میں آنے والے نئے مذاہب میں مدغم ہوتے رہے اور اب ارتقاء پذیر ہو کر انہیں ایک اور نئی صورت اختیار کرنا تھی۔ آپؐ کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغمبر

۱-۲ یہ صرف مصنف کا قیاس ہے ورنہ حقیقت میں اسلام کے تمام احکام قرآن کی شکل میں وحی کے ذریعہ نازل ہوئے اسلام کے احکام اور عقائد میں عیسائی راہبوں اور واعظین کا کوئی اثر نہیں اسلام تو تمام آسمانی مذاہب کی آخری شکل ہے اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق پہلی آسمانی کتابوں کے احکامات کا قرآن میں شامل ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں اگر توریت و زبور کے احکامات انجیل میں دہرائے جاسکتے ہیں تو ان کے اچھے اصولوں کا قرآن یا اسلام میں قائم رہنا عین فطرت ہے مصنف نے یہ حقیقت اگلے پیرے میں خود تسلیم کی ہے +

تھے اور جو احکام ان پر نازل ہوئے وہ حضرت موسیٰؑ پر اُتری ہوئی کتاب کی توثیق و تصدیق کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"ہم نے موسیٰؑ کو کتاب (توریت) دی۔ عیسیٰؑ کو انجیل اور محمدؐ کو قرآن۔"

بلاشبہ حضرت محمدؐ کا یہ بھی خیال تھا کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے تمام عالم انسانیت کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اس کے علاوہ آپؐ کو یہ بھی یقین تھا کہ آپؐ حضرت موسیٰؑ کے لائے ہوئے اور حضرت عیسیٰؑ کے جاری رکھے ہوئے دین کے کام کو مکمل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ایسا خیال کرنے میں آپؐ حق بجانب تھے۔ پہلے دو مذاہب کو جو یکے بعد دیگرے آئے ایسے لوگوں نے شروع کیا تھا جو دنیا کے اسی خطے میں رہتے تھے جس میں حضرت محمدؐ مبعوث ہوئے۔ علاوہ ازیں آپؐ کا خیال تھا کہ یہ خطہ ہی ساری دنیا کی نمائندگی کرتا تھا۔ تجارتی سفروں کے دوران آپؐ کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ بحر روم اور بحر قلزم کے اس پار اور ممالک بھی آباد ہیں لیکن یہ معلومات صرف سرسری تھیں، کیونکہ ہم زیادہ سے زیادہ یہ ہی تو کہہ سکتے ہیں کہ آپؐ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے زیادہ سفر کئے تھے۔

یہ بات کہ حضرت محمدؐ یہودیوں اور عیسائیوں سے خود کو پیغمبر تسلیم نہ کرا سکے یا انہیں اپنے ساتھ نہ ملا سکے اس کا سبب کچھ تو آپؐ کی مثالی اصول پرستی تھا اور کچھ یہ کہ آپؐ کو ان کے دینی اصولوں کے متعلق مکمل معلومات[۱] نہ تھیں۔

آپؐ یہودیوں کے پاس گئے۔ ان کی مقدس کتاب کو سراہا اور یقین دلایا کہ آپؐ اُسے مٹانے کے لئے نہیں بلکہ اس کی تکمیل کرنے آئے ہیں۔ آپؐ نے ان کے روزے اور عیدیں انہی کی طرز پر اپنے نئے دین میں شامل کر لئے۔ آپؐ نے کوشش کی کہ وہ آپؐ سے قدیم طرز کے ایک ایسے دین کے قائم کرنے کے خیال سے متفق ہو جائیں جس میں یہود، عیسائی اور مسلمان سب شامل ہو سکیں، اور جب تک آپؐ ان کے تعاون سے قطعی طور پر مایوس

---

[۱] نبی ہونے کے سبب آنحضور عیسائی اور یہودی۔ ادیان کے اصولوں سے اچھی طرح واقف تھے اور آپؐ نے متعدد فیصلے ان کے دین کے مطابق کئے۔

نہیں ہو گئے آپؐ نے بیت المقدس کو مسلمانوں کا قبلہ رہنے دیا جس کی طرف منہ کر کے آپؐ نماز پڑھتے تھے لیکن آپؐ نے شاید اس پر اچھی طرح غور نہیں کیا کہ اگر یہودی آپؐ کی تجویز مان لیتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق اپنے عقیدے کو غلط تسلیم کرتے تھے۔

حضرت محمدؐ حضرت عیسیٰؑ کو اور ان کے مسیح ہونے کو مانتے تھے۔ قرآن میں آپؐ نے اس طرح لکھایا[۱]۔

"عیسائیوں سے کہہ دو کہ ان کا خدا اور میرا خدا ایک ہے"

حضرت محمدؐ کو عیسائی بنا لینا کوئی مشکل بات نہ تھی اگرچہ عیسائیت کے بعض عقائد کو پسند نہ کرتے تھے لیکن کبھی آپؐ نے ان کی مخالفت نہ کی۔ آپؐ نے مسلمانوں کو عیسائی عورتوں سے شادی کرنے سے بھی منع نہ کیا۔ بلاشبہ آپؐ کو کچھ دیر تک یہ امید رہی کہ کسی نہ کسی صورت میں اسلام اور عیسائیت میں سمجھوتہ ہو جائے گا لیکن اس میں یہودیوں والے معاملے سے زیادہ کامیابی نہ ہونے کا سبب ایک معمولی جھگڑا تھا۔ گو یہ لفظی قضیہ ایک گہری اور الجھاؤ والی بات تھی لیکن بایں ہمہ تھا صرف لفظی الٹ پھیر۔

حضرت محمدؐ ایسے لوگوں کو موحد بنانے کی کوشش کر رہے تھے جو بے شمار خداؤں کی پرستش کرتے تھے لیکن عیسائیوں نے، جن کا آپؐ بے حد احترام کرتے تھے، اپنے بہت اچھے اور سیدھے سادے عقائد کو کچھ غیر ضروری اور ناقابل فہم باتوں میں الجھا دیا تھا۔ حضرت محمدؐ کے نزدیک تثلیث[۲] اور تجسیم (خدا کا انسانی شکل اختیار کرنا) جیسی نہ سمجھ میں آنے والی باتیں توحید کے

---

[۱] کچھ مسلمانوں کی طرح مصنف بھی اس نظریے کا حامی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے احکام خیال کی شکل میں نازل ہوتے تھے اور انہیں آپؐ اپنے الفاظ میں لکھا دیتے تھے اسی لئے مصنف نے متعدد بار یہ کہا ہے کہ آپؐ نے قرآن میں یہ لکھا، لکھوایا یا شامل کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے اور جمہور کا یہی عقیدہ ہے کہ آنحضور کو وحی کے الفاظ حفظ ہو جاتے تھے اور آپؐ اسے جوں کا توں لکھا دیتے تھے۔ پھر قرآن کی زبان اور اسلوب اس کے شاہد ہیں کہ یہ انسانی کلام نہیں ہو سکتا بلکہ قرآن میں کافروں کو چیلنج دیا گیا تھا کہ اگر یہ کلام ربانی نہیں ہے تو اس کی کسی سورۃ کی مثل لے آئیں لیکن وہ عاجز رہ گئے (م)

[۲] تثلیث: عیسائیوں کے تین خدا (۱) باپ یا خود خدا (۲) حضرت عیسیٰؑ انسانی روپ میں خدا کے بیٹے اور (۳) حضرت جبرئیل یا روح القدس۔

اصولوں کے منافی نھیں۔ عیسائی واضح طور پر تین برابر کے خدا مانتے تھے اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ قرآن کی چوتھی سورۃ میں ہم پڑھتے ہیں۔

فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنۡتَهُوۡا خَيۡرًا لَّكُمۡ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ؕ

(سورۃ النساء ۔ رکوع ۲۳)

پس تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولوں پر اور تثلیث یا تین خدا کہنے سے احتراز کرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ اللہ تو صرف واحد خدا ہے۔

پھر عیسائیوں کے ہاں برگزیدہ شخصیتوں (سینٹ) اور شبیہوں کی تعظیم، کعبہ اور اس کے تین سو ساٹھ خداؤں کی پرستش سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ ادھر حضرت محمدؐ تصاویر اور مورتیوں کو بُرا سمجھتے تھے۔ اسلامی دنیا کی ہر مسجد اس کی گواہ ہے۔ ان میں جو نقاشی، مساجی آرائش، صناعی کے کام اور قرآنی آیات کے طغرے نظر آتے ہیں وہ حضرت محمدؐ کے نظریہ مجت شکنی ہی کا نتیجہ ہیں۔ آپؐ کسی زندہ یا جاندار شے کی تصویر بنانے سے منع کرتے تھے یہ بھی کوئی نئی بات نہ تھی۔ عیسائیوں کے "دس احکام" یا THE COMMANDMENTS میں سے دوسرے حکم میں یہی ہدایات موجود ہیں۔

تیسرے یہ کہ اللہ کو حضرت عیسیٰؑ کا باپ کہنا آپؐ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی تھی۔ آپؐ کو اس پر اصرار تھا کہ اللہ کا کوئی مثل نہیں اور اس کے کوئی اولاد نہیں ہو سکتی اور نہ ہی آپؐ یہ مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ جیسی برگزیدہ ہستی کو (خواہ وہ خدا کے بیٹے تھے یا نہیں تھے) قتل ہونے دیتا۔ آپؐ نے علانیہ کہا (اصل میں یہ قرآن کے الفاظ ہیں) کہ ایک اور شخص نے حضرت عیسیٰؑ کی جگہ لے لی تھی اور اسے سُولی دی گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ شخص آپ کا کوئی مرشد یا حواری ہو یا شاید یہودا ہو جسے اس طرح اس کی غداری کی سزا مل گئی۔ حضرت عیسیٰؑ کو تو آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا۔ اس کے متعلق قرآن کی چوتھی سورۃ کے الفاظ یہ ہیں :۔

"اور ان لوگوں (یہودیوں) نے یقینی طور پر ان کو قتل نہیں کیا اور اللہ نے انہیں اپنے پاس اوپر اٹھا لیا۔" (سورۃ النساء ۔ رکوع ۲۲)

(اسی سورۃ میں) آگے فرمایا ہے:۔

"اور نہ انہوں نے اصل میں انہیں قتل کیا اور نہ سُولی دے سکے۔ ان کے سامنے تو اُن سے ملتی جلتی ایک اور صورت تھی (جسے انہوں نے سُولی دے دی)"

(سورۃ النساء رکوع ۔ ۲۲)

آپؐ نے فرمایا کہ یہودی اس بات کو نہیں جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ ہی کو سولی دی تھی۔

عیسائیوں سے صلح کرنے میں اس عقیدہ کے علاوہ ایک اور بڑی رکاوٹ بھی حضرت محمدؐ کے ذہن میں تھی جیسا کہ حضرت محمدؐ نے عرب اور دیگر ہمسایہ ممالک میں دیکھا عیسائیت کوشش کے باوجود اپنے مشن میں ناکام ہو چکی تھی۔ عربوں میں اپنی تین سو سالہ موجودگی کے باوجود نہ ان لوگوں کی بت پرستی کم کر سکی اور نہ ہی اسے ختم کر سکی تھی۔ اس معاملے میں ہر بات حضرت محمدؐ کے حق میں جاتی تھی۔

اس زمانے میں عیسائی مذہب بہت سے فرقوں اور عقیدوں میں بٹ چکا تھا۔ ان میں سے ہر فرقے کے لوگوں کا ایک علیحدہ اور مخصوص عقیدہ تھا۔ آج بھی عیسائی مذہب بہت سے عقائد میں بٹا ہوا ہے جن کے مختلف نام ہیں۔ لیکن یہ اختلاف اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو ساتویں صدی عیسوی میں تھا۔ اس وقت کچھ عقائد ایسے بھی تھے جن کا حضرت عیسیٰؑ کی ان تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا جن کی تبلیغ کو مقابلتاً زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ حضرت محمدؐ کو ان میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی تھی۔

اور وہ فرقے یہ تھے:۔

(۱) سعدلی۔ جن کا عقیدہ تھا کہ تثلیث ایک خدا کی تین مختلف صورتیں ہیں یعنی باپ۔ بیٹا اور روح القدس جو سب مل کر ایک ہی ہیں جیسے کہ انسان کا جسم، روح اور اس کا لاشعور۔

(۲) آرین۔ یہ فرقہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتا تھا لیکن خدا سے علیحدہ اور اس سے کم مرتبے والا۔

(۳) **نسطوری** - ان کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی دو مختلف اور ممتاز حیثیتیں تھیں۔ روحانی اور انسانی۔ حضرت مریم صرف ان کی ماں تھیں اور ان کو خدا کی ماں کہنا ایک مذموم بات تھی۔

(۴) **یوتیخی** - جو کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ انسانی شکل میں آنے سے پہلے مکمل خدا تھے۔ اور دنیا میں صرف انسان۔

(۵) **قلیریدی** COLLYRIDIANS ایک نسوانی فرقہ تھا جو حضرت مریم کی پرستش کرتا تھا۔

(۶) **مریمی** - ان لوگوں کے نزدیک تثلیث اس طرح تھی۔ باپ خدا۔ بیٹا خدا، اور ماں خدا (یعنی حضرت مریم)

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فرقے تھے جو مختلف عقائد رکھتے تھے لیکن عیسائیوں کی اس تمام مختلف الاعتقادی اور ظاہری تناقض کے باوجود حضرت محمدؐ حضرت عیسیٰؑ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ آپؐ فرماتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ سب سے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ آپؐ ان کے خداداد معجزوں کے قائل تھے۔ آپؐ انہیں کلام اللہ کہتے تھے اور یہ بھی کہ ان کا نام مسیح تھا۔ آپؐ حضرت مریمؑ کے روحانی حمل کے بھی قائل تھے اور اس سے بھی اتفاق کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ایک معجزہ تھی۔ آپؐ نے یہ بھی اعلانیہ کہا کہ اس دنیا کے ختم ہونے سے پہلے حضرت عیسیٰؑ اس دنیا میں تشریف لائیں گے اور اللہ کے[1] منکروں کو ختم کر دیں گے۔ اس کے بعد ساری دنیا میں امن ہو جائے گا۔ پھر حضرت عیسیٰؑ کی وفات ہو جائے گی اور وہ آپؐ کے برابر میں ہی دفن ہوں گے۔ قیامت کے روز آپ (حضرت محمدؐ) اور حضرت عیسیٰؑ دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور ان کا حساب ہوگا۔ اس وقت حضرت عیسیٰؑ اللہ تعالیٰ سے یہودیوں کے خلاف شکایت کریں گے کہ ان لوگوں نے انہیں پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا تھا اور عیسائیوں کے

---

[1] حضرت عیسیٰؑ کا اس دنیا میں دوبارہ آنا۔ اللہ کے منکروں کو ختم کرنا۔ آپ کی وفات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر دفن ہونے کی پیش گوئیاں حدیث قدسی ہیں۔

خلاف بھی کہ انھوں نے ان کو خدا بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی۔ قرآن کی تیسری سورہ میں صاف طور پر لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ان کی پرستش کی جائے۔ حضرت عیسیٰؑ کی پرستش ان کی وفات کے بعد شروع ہوئی جس کا سبب جہالت اور مقدس کتاب کی غلط تاویلیں تھیں۔

اس طرح آپؐ نے حضرت عیسیٰؑ کو اپنے برابر کا درجہ دے دیا اور آج بھی یہ خیال غلط ہے کہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ سے نفرت[1] کرتے ہیں یا بُرا کہتے ہیں۔ مسلمانوں میں تو حضرت عیسیٰؑ کا نام جو JESUS کا عربی ہے اور جس کا مادہ ایسوع ہے، کبھی بھی علیہ السلام (آپ پر سلامتی ہو) کا اضافہ کئے بغیر نہیں لیا جاتا۔

یہودیت اور عیسائیت کے اس احترام کے باوجود یہ بات حضرت محمدؐ کے لئے بڑی مایوس کن تھی کہ یہ دو عظیم توحید پرست قدیم مذاہب، جو ان سے پہلے آئے تھے، آپؐ سے عقائد کے سلسلہ میں کسی قسم کی مصالحت یا مفاہمت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

بہرحال یہ طے کر کے کہ تینوں مذاہب کو یکجا کرنا ناممکن تھا آپؐ اسلام کو مضبوطی سے قائم کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ ایسا کرنے میں آپؐ نے عربوں کے قدیم عقائد سے اچھے عقائد لے لئے اور اسی طرح یہودی اور عیسائی مذاہب سے بھی اچھی اچھی باتیں چن لیں۔

آپؐ کے مسائل میں سے پہلا مسئلہ کعبہ کے متعلق فیصلہ کرنا تھا۔ آپؐ نے کعبہ کی پرستش کے خطرات کو بھانپ لیا تھا اور اس کو ختم کرنا چاہتے تھے[2]۔ پھر آپؐ کو کعبہ کی قدیم روایات، ہاشمیوں کی وساطت سے اس کے ساتھ آپؐ کے اپنے اور آپ کے خاندان کے تعلقات اور

---

[1] اس کتاب میں مصنف نے یہ کوشش کی ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے اختلافات دور ہو جائیں یا کم ضرور ہو جائیں۔ اس لئے وہ متواتر عیسائیوں کو مسلمانوں اور اسلام کو سمجھنے کی تلقین کرتا نظر آتا ہے۔ جنگ عظیم اول کے بعد عیسائی مشنریوں نے مسلمانوں کے خلاف کافی منافرت پیدا کر دی تھی۔

[2] یہ صحیح نہیں ہے۔ آپؐ کا شروع سے ہی یہ خیال تھا کہ بت پرستی ختم ہو جائے لیکن دین ابراہیمی کے طریقہ پر کعبہ کی حرمت اور اس کی تعظیم باقی رہے کیونکہ یہ تو شروع سے ہی بیت اللہ تھا۔

اپنے آبائی شہر مکہ کی اس کے سبب اہمیت کا خیال آیا۔ چنانچہ آپؐ نے بتوں کو توڑ دیا اور بہت سی کافرانہ رسومات کو ختم کر دیا لیکن چند رسومات[1] رہنے دیں۔ اس معاملے میں آپؐ نے حضرت عیسیٰؑ کا طریق کار اختیار کیا جنہوں نے مقدس عبادت گاہ (بیت المقدس) کی قبیح رسوم ختم کر دیں لیکن خود عبادت گاہ کو رہنے دیا۔

تعدد ازدواج کے بارے میں آپؐ نے مخالفت نہ کی اور اسے رہنے دیا۔ انجیل کے پرانے عہد نامے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مشرق میں یہ رسم ازمنہ قدیم سے رائج تھی۔ عرب لوگ ہمیشہ سے کثیر الازدواج تھے اور کئی کئی شادیاں کرتے تھے۔ حضرت محمدؐ کو یہ بات پسند نہ تھی لیکن اس سلسلہ میں آپؐ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ یہ ان باتوں میں سے ایک ایسی بات تھی کہ اگر آپؐ اس سے منع کرتے تو آپؐ کے بہت سے[2] پیروکار آپؐ کا ساتھ چھوڑ جاتے جس کے سبب آپؐ کو اور آپؐ کے نصب العین کو نقصان پہنچتا۔ چنانچہ آپؐ نے رسم کو جاری رہنے دیا لیکن بیویوں کی تعداد محدود کر دی۔

غیر مسلموں نے آپؐ پر سب سے زیادہ غیر معقول نکتہ چینی اسی تعدد ازدواج کے معاملے میں کی ہے۔ میں نے لوگوں کو اکثر یہ کہتے سنا ہے کہ اسلام کی بڑی کامیابی کا سبب اس میں عیاشی کی اجازت ہے۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ کوئی بڑا مذہب کبھی ایسی باتوں سے کامیاب نہیں ہوا حضرت محمدؐ کا اس معاملے میں کوئی دخل نہیں تھا۔ کیونکہ عربوں کی قدیم

---

[1] یعنی کعبہ کی حرمت، اس کا طواف اور عبادت کے لئے اس کو قبلہ قرار دینا وغیرہ۔

[2] یہ خیال صحیح نہیں۔ اگر مناسب سمجھا جاتا تو تعدد ازدواج کو ختم کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اسلام نے عملی زندگی کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور غیر فطری پابندیوں سے احتراز کیا۔ اس کی بڑی وجوہات یہ تھیں کہ اول تو یہ رسم ازمنہ قدیم سے رائج تھی اور اس معاشرے میں رچی بسی ہوئی تھی۔ اس کو ختم کرنے سے اور جہاد اور جنگوں کے سبب مردوں میں کمی اور بلا شوہر کی عورتوں کی تعداد میں اضافے سے فحاشی میں اضافہ کا امکان تھا جو اسلام کے اصول کے سخت خلاف ہے دوسرے یہ کہ عرب اور دوسرے گرم ممالک کے جغرافیائی حالات اور آب و ہوا ایک سے زیادہ شادیوں کی متقاضی ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافے کی ضرورت تھی اس لئے اسلام نے بیویوں کی تعداد گھٹا کر زیادہ سے زیادہ چار کر دی اور ساتھ ہی ہر بات میں عدل و انصاف کی شرط لگا دی اور صرف ایک بیوی پر اکتفا کرنے کو ترجیح دی۔

اخلاقی اقدار آپؐ کی وضع کردہ نہیں تھیں اور آپؐ کا یہ خیال بڑی دانشمندی پر مبنی تھا کہ آپؐ ایسی رسوم نہ تو فوری طور پر رائج کر سکتے تھے اور نہ ہی ختم کر سکتے تھے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ جو کچھ ترقی یہودیت اور عیسائیت میں ہوئی وہ بڑی طویل مدت میں ہوئی اور تدریجی تھی۔ لیکن اسلام میں یہ سب کچھ صرف ایک واحد شخص کا کارنامہ تھا اور صرف ایک نسل کے دوران مکمل ہو گیا۔ ہم اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں حالانکہ فی الحقیقت یہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ تک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا ہو اور نہ ہی سینٹ پال نے۔

حضرت موسیٰؑ نے بھی قدیم معاشرتی رسوم کو ختم نہیں کیا۔ آپؑ نے صرف ان میں سے بہت سی بری باتیں دور کر دیں۔ نہ ہی حضرت عیسیٰؑ نے قدیم معاشرتی روایات کو منسوخ کیا بلکہ بقول سینٹ متی ST. MATHEW آپ نے جس بات کو عام کیا وہ اس کے خلاف تھی یعنی :-

"یہ خیال نہ کریں کہ میں پہلے پیغمبروں یا ان کے قانون (شریعت) کو ختم کرنے آیا ہوں۔ میں انہیں ختم کرنے کی بجائے ان کی تکمیل کے لئے آیا ہوں۔ بلکہ میں بلا شک و شبہ کہتا ہوں کہ جب تک یہ آسمان و زمین قائم ہیں ان کے لائے ہوئے احکامات سے ایک نکتہ یا ایک شوشہ بھی نہیں نکالا جائے گا یہاں تک کہ ان کی تکمیل ہو جائے۔"

حضرت عیسیٰؑ نے بھی صرف یہ کیا کہ اپنے مقلدین کے ذہنوں میں ایسی اصولی باتیں سمو دیں کہ کچھ مدت بعد پرانی رسوم کی وہ خرابیاں دور ہو جائیں جو آپ کے نزدیک پرانی ہو کر غیر ضروری ہو گئی تھیں۔

یہ کہنا کہ تعدد ازدواج کی رسم کو اسلام نے شروع کیا بالکل ایسی ہی ناانصافی ہو گی جیسے غلامی کو عیسائیت سے منسلک کرنا۔ البتہ غلامی اور عیسائیت ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ اور غلامی اس کی آڑ میں انیسویں صدی کے آواخر تک جائز سمجھی جاتی رہی۔ یہی کچھ تعدد ازدواج اور اسلام کے بارے میں کہا جا سکتا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ زیادہ شادیوں

کی رسم خاندانوں کو جدا کرنے کی بجائے متحد کرنے کا سبب بنی اور اس نے گھر کو ایک پاکیزہ ادارہ بنا دیا۔

زیادہ شادیاں کرنے کی طرح ختنہ کی رسم کا بھی حضرت محمدؐ سے کوئی تعلق نہیں۔ آپؐ ایسے لوگوں میں پیدا ہوئے جن میں ختنہ کا پہلے سے ہی رواج تھا اور اس میں دخل دینے کی آپؐ نے کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ لیکن اس کا آغاز مسلمانوں نے نہیں کیا۔

اسلام میں کوئی پادریت اور ملائیت نہیں ہے۔ مسلمانوں میں علمائے دین، مبلغ اور مسجدوں کے امام ضرور ہیں لیکن یہ خدا اور بندے میں کوئی درمیانی کڑی نہیں ہیں۔ مسجد ہی میں عبادت کرنا لازمی نہیں۔ ایک مسلمان کا اپنے معبود سے بلا واسطہ رابطہ ہے اور اس رشتہ کو بہت حد تک اس کے اپنے ضمیر پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

مسجد موجود ہے، نماز پڑھانے کے لئے امام بھی ہیں لیکن صرف مسجد میں جانا یا نہ جانا ایک اچھے یا بُرے مسلمان ہونے کا ثبوت نہیں۔ یہ ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ہے کہ مسجد[۱-۲] میں نماز پڑھے یا تنہائی میں۔ مذہبی فرض کی ادائیگی مسلمانوں میں فیشن کے مظاہرے رفیشن پریڈ) یا آپس میں مل بیٹھنے یا گپ شپ کرنے کا ذریعہ نہیں ہے اور پچھلے چھ دن کی روحانی کمی پوری کرنے کے لئے ہفتہ میں صرف ایک دن گرجاؤں میں جمع ہونے والی بات نہیں۔ اسلام میں کوئی بات بھی دین سے جدا نہیں اسلام میں مذہبی فریضے کی ادائیگی میں بھی صرف اتنی ہی توجہ اور وقت درکار ہے جتنا کسی دوسری بات میں۔

مسلمانوں میں جمعہ کا دن عبادت کا مخصوص دن ہے لیکن یہ بستر میں اینڈتے رہنے یا دیر سے سو کر اٹھنے یا گولف کھیلنے یا تیرنے کے لئے جانے کا دن نہیں ہے۔ نماز ختم ہوتے ہی لوگ اپنے اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ عربوں میں کوئی ایسی میکانیکی طرز کی عبادت نہیں جیسا کہ عیسائیوں میں پیشہ ور پادری کراتے ہیں۔ جو خدا کے احکام کو اپنی اپنی سمجھ اور

[۱-۲] مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا افضل ہے لیکن مسجد قریب نہ ہونے یا اس کی غیر موجودگی میں گھر پر یا کہیں بھی نماز پڑھ لینا ثواب میں کمی نہیں کرتا۔

نظریے کے مطابق بیان کر کے اپنی روزی کماتے ہیں۔اس کے برخلاف ایک مسلمان اپنے رب سے ایسے ہی مودبانہ اور جانے پہچانے انداز میں ہمکلام ہوتا ہے جیسے ایک بیٹا اپنے باپ سے۔ مذہب اس کے اندر اور باہر رچا بسا ہوتا ہے۔

آپ کے رہبانیت کے خلاف ہونے کی کئی وجوہات تھیں۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ صرف دین کے سبب تارک الدنیا بن جائیں۔ نفس کشی کریں اور پرہیز گاری کی سختیاں جھیلیں۔ آپ کا خیال تھا کہ ایک شخص عام طریقے سے زندگی گزار کر بھی ایک مثالی مسلمان بن سکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ معمول کے مطابق انسان بھی رہ سکتا ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ زبردستی کی پرہیز گاری اور نفس کشی نہ تو فطری تھی اور نہ ہی اس کے سبب کوئی مرد یا عورت کسی ایسے شخص کے مقابلے میں، جو اپنی متاہل زندگی فطری قوانین کے مطابق گزارتا ہو، زیادہ بہتر انسان بن سکتا تھا یا اللہ تعالیٰ کا زیادہ تقرب حاصل کر سکتا تھا۔

دوسرے مذاہب میں آپ نے ملائیت یا پادریت کی خرابیاں دیکھ لی تھیں یعنی پادری کا اختیار اور اس کا دینی حقائق کو توڑ مروڑ کر بیان کرنا۔ عیسائیوں کے تمام فرقے اپنی مختلف الاعتقادی کے باوجود آپ کے سامنے اس بات کی شہادت پیش کر رہے تھے، کہ مذہبی معاملات میں انسان کے آمرانہ فیصلے دین کو کتنا نقصان پہنچا سکتے تھے۔ آپ نے دیکھ لیا تھا کہ یہ مذہبی رہنما سادہ لوح لوگوں پر کتنا شیطانی اثر رکھتے ہیں اور ان کا کہانہ ماننے پر کس طرح ان کو عذاب اور سزا کی دھمکیاں دیتے ہیں۔

اس بارے میں آپ کے ان خیالات کی تیسری وجہ اسلام میں دیگر بہت سی باتوں کی طرح واقعات اور ماحول تھے۔ آپ صحرا میں پیدا ہوئے اور اسی ماحول میں پرورش پائی۔ شام و فلسطین کو چھوڑ کر آپ صحرائی بود و باش کے علاوہ اور کسی جگہ کی طرز رہائش اور بود و باش کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ آپ کو معلوم تھا کہ خانہ بدوش لوگوں کے لئے، جن کی بیشتر تعداد خیموں میں رہتی تھی، نماز کے وقت ایک مسجد یا ایک نماز پڑھانے والا تلاش کرنا مشکل ہوگا۔ پس آپ نے نماز کے اوقات مقرر کر دیئے لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ نماز بغیر کسی پڑھانے والے کے بھی پڑھی جا سکتی ہے اور مسلمان جہاں بھی ہو وہاں

ہی نماز پڑھ سکتا ہے۔

(صحرا نشینوں کے لئے)[1] زکوٰۃ کو ایک مذہبی فریضہ بنا دینے کا خیال عام طور سے ایک ایسے شخص کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا جو ایک قصبہ میں شہری لوگوں کے درمیان رہتا ہو کیونکہ ایسے خانہ بدوش قبیلوں پر ٹیکس لگانا جو موسم کے ساتھ آتے اور چلے جاتے ہوں مشکل تھا۔ چنانچہ اسلامی بیت المال کے قیام کے لئے جائیداد یا آمدنی پر کچھ فی صد ادائیگی مذہبی فریضہ بنا دیا گیا۔

صاحب حیثیت لوگوں پر ضرورتمندوں کی خبر گیری کرنے کا حکم دینے سے نادار لوگوں کی گزر اوقات کا بندوبست یقینی ہو گیا۔ لوگوں سے مہربانی کا سلوک کرنے اور ان کی امداد کرنے کا خاص طور پر حکم دیا گیا۔ یہ نتیجہ تھا ان سماجی ناانصافیوں کا جو آپؐ نے مکہ میں دیکھی تھیں جہاں غریب اور بدقسمت لوگ امیر تاجروں کے پاؤں تلے روندے جاتے تھے۔ حضرت محمدؐ ان لوگوں کا بڑا خیال رکھتے تھے اور ان پر ترس کھاتے جن کے لئے زندگی گزارنا ایک بڑا مرحلہ تھا۔ آپؐ پہلے مذہبی مصلح تھے جنہوں نے غریبوں کی امداد کے لئے کوئی عملی قدم اٹھایا، اس کو مذہبی تقدس دیا اور اس کو مذہب کا ایک ایسا رکن بنا دیا جس نے بعد میں قانون کی شکل اختیار کر لی۔

اسلام ہی وہ واحد نظامِ زندگی ہے۔ جہاں اشتراکیت یا مساوات اپنے صحیح معنوں میں رائج ہے۔ یہ سکھاتا ہے کہ دنیا کی ہر شے سب کی مشترک ملکیت ہے۔ چنانچہ اسلام میں کوئی شے کسی کی مکمل ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اسلام میں امیروں کی دولت میں غریبوں کا بطور حق حصہ ہوتا ہے۔ قرآن تیرھویں[2] سورہ میں حکم دیتا ہے:۔

---

[1] صحرا نشینوں اور خانہ بدوشوں کا مال و متاع اور جائیداد ان کے جانور اور بھیڑ بکریاں ہوتی ہیں اور وہ جانوروں کی شکل میں ہی زکوٰۃ دیتے ہیں۔

[2] یہ احکام سورۃ روم میں ہیں جو تیسویں (۳۰) سورۃ ہے، تیرھویں نہیں۔ "فَاٰتِ ذِی الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمَسَاكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ ..... (سورہ روم) یہ ہی احکام سورہ بنی اسرائیل (رکوع ۹) میں بھی نازل ہوئے۔

"وَاٰتِ ذِی الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ....."

"اور اپنے مال میں سے اپنے غریب رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کو ان کا مقرر کردہ حصہ دو۔"

مزید یہ کہ اس جمہوری طرزِ فکر کو مسلمان اپنے ساتھ دنیا کے ان تمام حصوں میں لے گئے جہاں وہ گئے اور وہاں پر قوموں اور افراد دونوں کو اس کا پابند کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں اسلام بادشاہت کے نظریے کے خلاف ہے۔ اسلام کے نزدیک اس کا کوئی جواز نہیں کہ جو قومیں یا نسلیں خود کو دوسروں سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ سمجھتی ہیں اور ان کے پاس ایسا کرنے کے ذرائع موجود ہیں وہ دوسری قوموں کو ان کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے بہانے اپنا غلام بنائیں۔ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد آنے والی صدیوں میں اسلامی فوجیں جہاں بھی گئیں انہوں نے کبھی مفتوح قوموں کو غلام نہیں بنایا اور نہ ہی انہوں نے وہاں کے قدرتی ذرائع سے اپنی ذات کے لئے کوئی ناجائز فائدہ اٹھایا۔ کسی موقعہ پر بھی وہ سفید فام لوگوں کی طرح پسماندہ لوگوں کی امداد کے بہانے صرف ان ہی علاقوں میں نہیں گئے جہاں ان کی سخاوت بیش بہا دولت کمانے کا موجب بنے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کو اس دنیا کے متعلق کوئی علم نہیں تھا جہاں وہ بڑھتے چلے جا رہے تھے اور نہ ہی انہیں یہ معلوم تھا کہ وہاں سے وہ کیا حاصل کر سکتے تھے۔ چنانچہ فطری طور پر انہوں نے صرف اس کا فائدہ اٹھایا جو انہیں مل گیا لیکن وہ بھی ہمیشہ وہاں کے مقامی لوگوں کے اشتراک کے ساتھ۔ ان میں سے بیشتر لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور نتیجہ کے طور پر وہ اب ان کے بھائی اور معاون بن گئے تھے۔ اخوت کے اس رشتہ کا ثبوت اور نتیجہ یہ ہے کہ اسپین کے سوا دوسرے تمام ممالک جہاں مسلمان ساتویں اور چودھویں صدی کے درمیان گئے ہمیشہ اسلامی نصب العین کے حامی رہے اور تا حال مکہ کو ہی اپنی تہذیب کا مرکز خیال کرتے ہیں۔

قضا و قدر کے متعلق حضرت محمدؐ کے خیالات کی غلط تاویلیں کی گئی ہیں اور آپ[۳] کے اپنے اقوال کو ہی ان غلط تاویلوں کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ مثلاً

"اللہ نے انسان کو بنایا اور اس کے اعمال کو بھی[۱]۔"

---

[۱] یہ غالباً اس آیت کا ترجمہ ہے۔ "واللہ خلقکم وما تعملون ۔۔۔"

"ہر شخص[1] کا مقدر اس کی گردن کے پیچھے بندھا ہے۔"

لیکن پہلے سے قطعی طور پر طے شدہ مقدر پر یقین، جو لوگوں کو جامد بنا دیتا ہے۔ اصل میں حضرت محمدؐ کا منشا نہ تھا۔ آپؐ نے بارہا اس بات کا اعلان کیا کہ انسان اپنے اعمال کا خود مختار و ذمہ دار ہے، وہ چاہے تو احکام الٰہی کو مانے اور عمل کرے اور چاہے منکر ہو جائے۔ وہ اپنے اعمال و افعال کا ذمہ دار ہے اور اسی لئے وہ جزا و سزا کا مستحق ہے۔

آپ نے فرمایا: "سب سے زیادہ بامراد اور متمول وہ ہے جو کامیابی اپنی محنت اور عمل سے حاصل کرتا ہے اور سب سے زیادہ بدنصیب اور تہی دست وہ ہے جو اپنے اعمال کے سبب ایسا ہے۔"[2]

بہرحال قسمت اور مقدر کے متعلق حضرت محمدؐ کے خیالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں آپؐ کو ان کے ساتھ سمجھوتہ کرنا ہی پڑا جیسے کہ آپؐ نے کثرت ازدواج کے معاملے میں کیا۔ پہلے سے لکھی قسمت کا عقیدہ حضرت محمدؐ کے زمانہ سے بہت پہلے سے موجود تھا۔ عرب لوگ زمانہ ماقبل تاریخ سے ہی مقدر کے قائل تھے۔ اس لئے یہ کہنا کہ اسلام اور قسمت ایک ہی بات ہیں ایک اختراع سے زیادہ نہیں۔

جس طرح عام خیال یہ ہے کہ کثرت ازدواج کا اسلام سے گہرا تعلق ہے۔ اسی طرح کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی جنت ایسی جگہ ہے جہاں کثرت ازدواج کی رسم اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ شادی جیسی ذمہ دارانہ چیز کا آخرت کی زندگی میں

---

[1] یہ سورہ بنی اسرائیل کی ایک آیت ہے: "وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ۝ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ۝" اگر مصنف اس پوری آیت سے واقف ہوتا تو جان جاتا کہ اس کا اپنا خیال درست ہے۔ ترجمہ: ہر انسان کا مقدر (اعمال) اس کی گردن سے باندھ دیا ہے اور نکال دکھائیں گے اس کو قیامت کے دن لکھا اور کھلا کہ پڑھ لے اپنا اعمال نامہ۔ تو ہی بس ہے آج کے دن اپنا حساب لینے والا۔" اسی سورۃ میں آگے آتا ہے کہ اگر تو بھکارہا تو اپنے ہی بُرے کو۔ اور اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب نہیں لاتا جب تک ان پر رسول اور ہدایت نہ بھیجے"

[2] غالباً یہ اشارہ سورہ والشمس کی ان آیات کی طرف ہے: "قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا ۝"

کوئی ذکر نہیں ملتا حضرت محمدؐ نے مسلمانوں کو جس جنت کی بشارت دی تھی وہ ایک آرام دہ زندگی ہے جہاں ان کو وہ تمام آسائشیں میسر آئیں گی جن سے وہ اس دنیا میں محروم رہے۔ جہاں بہترین جھیلیں اور سبزہ ہوگا۔ جہاں ایسے درخت ہوں گے جن پر ہمیشہ پکے ہوئے پھل لگے ہوں گے پینے کے لئے ایسے مشروبات ہوں گے جو فرحت پیدا کریں گے لیکن نشہ آور نہ ہوں گے۔ کھانے والی اشیاء کی بھی افراط ہوگی جن کے کھانے سے نہ بدہضمی ہوگی اور نہ ہی جسم میں فضلہ بننے اور اس کے اخراج کا تھکا دینے والا عمل ہوگا۔ حضرت محمدؐ نے اپنے لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ نہ تو ان کو ناک صاف کرنے کی ضرورت پڑے گی اور نہ ہی غسل کی۔ جسم کی تمام کثافتیں خوشبودار پسینے کے راستے نکل جائیں گی۔

اس گھر (جنت[1]) کے مکینوں کو کوئی محنت نہیں کرنا پڑے گی اور وہ گدوں اور تختوں پر آرام کریں گے جن کے غلاف ریشمی ہوں گے۔ نہ وہاں پر صحرا کی سی پیاس، نہ مسلسل مشقت اور نہ ہی وہاں کی سی تکالیف ہوں گی۔ ہر مسلمان کی خدمت کے لئے بہتر[2] سیاہ چشم، حسین کنواری اور بے حد پرکشش حوریں ہوں گی۔ لیکن ان سے کم خوبصورت اور کم عفیفہ عورتیں بھی جنت میں داخلے سے محروم نہ ہوں گی۔ قرآن میں اس عام خیال کی بار بار تردید کی گئی ہے کہ اسلام عورتوں کو ان کے ضمیر اور خواہشات سے محروم کر دیتا ہے۔ حضرت محمدؐ، جو خواتین کا بے حد احترام کرتے تھے، ان کے متعلق ایسا حکم کیسے دے سکتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے اعلان کیا کہ جنت کے دروازے مردوں اور عورتوں دونوں پر کھلے ہوں گے لیکن آپؐ نے یہ ذکر نہیں کیا کہ ان منتخب جنتی خواتین کے مرد ساتھی کون ہونگے۔ غالباً آپؐ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے پہلے خاوندوں کی آتش رقابت بھڑکے یا یہ کہ ایک ہی خاتون کے ساتھ ہمیشگی کی زندگی گزارنے کے تنگ سے ان کی خوشی و مسرت کم ہو جائے۔ آپؐ اس موضوع کو بڑی ہوشیاری سے چھوڑ گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے حضرت عیسیٰؑ نے اس وقت کیا تھا

---

[1] جنت کی یہ تمام تفصیلات قرآن کی مختلف سورتوں اور آیات میں موجود ہیں۔

[2] سلیمان اعظم۔ سلطنت عثمانیہ (ترکی) کا ایک مشہور سلطان جس نے قسطنطنیہ میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کی جو تاحال موجود ہے اور فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ یہ مسجد ۱۵۵۳ء میں تیار ہوئی۔

جب ان سے اس موضوع پر سوالات کئے گئے تھے۔

درحقیقت مسلمان اپنی خواتین کا کتنا خیال رکھتے تھے اس کا اندازہ ان شاندار مقبروں سے کیا جا سکتا ہے جو سلطان سلیمانؒ اعظم نے قسطنطنیہ میں اور شہنشاہ شاہجہانؒ نے آگرے میں اپنی بیویوں کی قبروں پر بنائے تھے۔ اگر یہ لوگ اپنی عورتوں کی آخرت کی زندگی پر یقین نہ رکھتے تو مسجد سلیمانیہ اور تاج محل جیسے مشرقی فن تعمیر کے نادر نمونوں پہ کروڑوں روپیہ خرچ کرنے کی بیوقوفی نہ کرتے۔

حضرت محمدؐ خواتین سے باتیں کرتے وقت ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ آپؐ کا کہا ہوا یہ فقرہ آپ کی خوش مذاقی اور نرم گفتاری کے اعلیٰ نمونے کے طور پر یاد رہے گا۔ جب ایک ضعیف عورت نے آپؐ سے پوچھا کہ وہ کس طرح جنّت میں جا سکتی ہے تو آپؐ نے فرمایا

"بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جا سکتیں" (پھر اس عورت کی مایوسی کو دیکھ کر کچھ توقف کے بعد فرمایا۔) "جب تم جنت میں پہنچو گی تو جوان ہو جاؤ گی"

قرآن کی رُو سے جنت میں دو باغ ہیں۔

فیھما عینٰن تجریان ۝	ان میں سے ہر ایک میں دو چشمے بہتے ہیں۔
فیھما من کلّ فاکھۃ زوجٰن ۝	ان میں ہر قسم کے پھلدار درختوں کے جوڑے ہوں گے
متکئین علیٰ فرش بطائنھا من استبرق ۝	وہ بیٹھے ہوں گے تکیہ لگائے گدوں پر جن کا استر زربفت کا ہوگا۔
وجنا الجنّتین دانٍ ۝	ان باغوں میں پھل جھک رہے ہوں گے۔
فیھنّ قٰصرٰت الطرف	ان میں خوبصورت نیچی نگاہ والیاں (حوریں) ہوں گی
لم یطمثھنّ انسٌ قبلھم ولا جانٌّ ۝	نہیں چھوا جن کو اس سے پہلے کسی انسان نے اور نہ کسی جن نے۔
فبایّ اٰلاءِ ربّکما تکذّبٰن	پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے۔

ساری پچپنویں ۵۵ سورۃ (الرحمٰن) میں انہی باتوں کا ذکر ہے۔

جانوروں سے لگاؤ اور محبت رکھنے کے سبب آپؐ نے بڑے وثوق سے کہا کہ قیامت کے دن جانور بھی حشر میں شرکت کریں گے۔ اسلام سے پہلے بھی یہ عقیدہ موجود تھا۔ مرنے والے شخص کی قبر سے اونٹ کے باندھنے کی رسم اس عقیدے کی طرف اشارہ کرتی تھی کہ وہ اپنے اس صحرا کے ساتھی کو اگلے جہان میں بھی اپنے ساتھ رکھے گا۔

جنت کی تصویر کو زیادہ دلکش بنا کر پیش کرنے سے آپؐ کی مراد عیاشی یا دنیاوی آسائشوں کا لالچ دینا نہ تھا۔ آپؐ کا منشاء تو یہ تھا کہ مسلمانوں کو مبنی بر حقیقت انعام و اکرام کی خوشخبری دی جائے جو ان کی سمجھ میں بھی آ سکے۔ اس دنیا کا حال بیان کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا۔

"دنیا مسلمانوں کے لئے ایک قید خانہ اور ابتلا ہے اور جب وہ یہاں سے جاتے ہیں تو گویا قید اور تکلیف دونوں سے نجات حاصل کر لیتے ہیں"

اپنے اس رویّہ میں بھی آپؐ عقلمندی کا ثبوت دے رہے تھے۔ تمام مذاہب میں آخرت کی زندگی اتنی دلکش دکھائی گئی ہے کہ ایمان لانے والا ہمیشہ کے لئے وہاں ہی رہنے کا خواہاں ہوتا ہے۔

امریکہ کا ریڈ انڈینؑ ایسی جنت کا خواب دیکھتا ہے جو بادلوں سے ڈھکی پہاڑیوں کے پیچھے واقع ہے اور جہاں وہ اور اس کا وفادار کتا خاموش جنگلوں میں آرام اور مسرت سے ہمکنار ہو سکے۔ قدیم نارتھین (شمالی علاقے کے لوگ) جنت کے لئے اوڈنؑ کے محلات HALLS OF ODINS کی طرف دیکھتا تھا جہاں اسے مسلسل اور نہ ختم ہونے والی شراب خوری میسّر

لہ امریکہ کے قدیم لوگ۔ کولمبس جب امریکہ پہنچا تو وہ اس مغالطے میں تھا کہ وہ ہندوستان پہنچ گیا ہے چنانچہ اس نے یہاں کے لوگوں کو انڈین کہنا شروع کیا۔ اور چونکہ یہ لوگ کچھ سرخ نسل کے تھے۔ اس لئے ریڈ انڈین نام پڑ گیا۔

ٰ اوڈن (ODIN) یا WODEN قدیم جرمنوں اور سکنڈینیویا والوں کا خدا۔ بدھ کا دن (WEDNESSDAY) اسی خدا کے نام سے منسوب ہے۔

ہو اور شراب پیالوں کی بجائے دشمن کی کھوپڑیوں میں ملتی ہو۔

پکے ڈسنٹر DISSENTERS عقیدے کے عیسائیوں کی جنت ایسی جگہ ہے جہاں اجتماعی عبادتیں ہمیشہ جاری رہتی ہیں اور سبت[1] (آرام اور عبادت) کے دن کبھی ختم نہیں ہوتے۔ عام عیسائی کی خواہش ہوتی ہے کہ ایسی جنت ملے جہاں نسبتاً زیادہ آرام ہو اور وہاں کی زندگی میں یہاں کی بے چین زندگی کے تفکرات اور پریشانیاں نہ ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا خیال ایک خواب سے زیادہ نہ ہو لیکن یقینی طور پر وہ جنت ایک ابرآلود، تیز ہواؤں والے اتوار کی ہیجان اور غیر دلچسپ مذہبی درس گاہ کی طرح نہیں ہوگی۔

چنانچہ متعدد بیویاں رکھنے والے لوگ کس طرح ایسی جنت کا تصور کرسکتے تھے جہاں کثرت ازدواج کی اجازت نہ ہو۔ انہوں نے کبھی کوئی ایسا معاشرہ نہیں دیکھا تھا جہاں پر یہ نہ ہو۔ چنانچہ وہ اس سے مختلف حالات کا کیسے یقین کرسکتے تھے۔ اسی طرح کوئی عیسائی شخص جو گھریلو محبت اور بندھنوں کے متعلق گہرا احساس رکھتا ہو کس طرح آخرت کی زندگی میں ایسے دستور کو پسند کرسکتا ہے جہاں بقول سینٹ میتھیو کوئی دنیاوی لگاوٹ اور محبت نہ ہوگی۔

حضرت محمدؐ کو دنیاوی زندگی کا بڑا تجربہ تھا۔ آپؐ نے محبت بھی کی تھی اور جدائیوں کا غم بھی سہا تھا۔ آپؐ کی ساری زندگی ایک جدوجہد اور کشمکش تھی۔ چنانچہ آپؐ ایسے خدائی انعام واکرام کے طلب گار تھے اور آسمانوں میں ایک ایسی آرام دہ جگہ چاہتے تھے جہاں آپؐ کو اور آپؐ کے پیروکاروں کو وہ تمام نعمتیں میسر آجائیں جو انہیں دنیا میں نہیں ملیں۔

جو بات عیسائیوں کی اکثریت سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی یہ ہے کہ عیش وعشرت سے بھری نام نہاد جنت کی ان تصاویر میں بہت سی تصاویر ایک عیسائی کی وساطت سے آئی ہیں۔ ان کا نام سینٹ ایفرائیم ST. EPHRINE تھا اور وہ چوتھی صدی عیسوی میں شام

---

[1] سبت SABBATH یہودیوں اور عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں کائنات کی تخلیق کرکے ساتویں دن (ہفتہ) کو آرام کیا۔ اس لئے یہ آج بھی تک آرام اور عبادت کا دن منایا جاتا ہے۔

میں رہتے تھے۔ جنت کے متعلق ان کے حمدیہ گیتوں میں حضرت محمدؐ کی بتائی ہوئی تمام پیشینگوئیاں موجود ہیں۔ ان میں خوبصورت عورتوں کا بھی ذکر ہے جن کے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ وہ زاہد و مرتاض لوگوں کی دنیاوی زندگی کی پرہیزگاری کی تلافی کر دیں گی۔

مندرجہ ذیل اقتباس انہی حمدیہ گیتوں سے ہے :۔

"میں نے نیک لوگوں کی رہائش گاہیں دیکھیں۔ وہ خود عطریات میں ڈوبے ہوئے تھے اور ان سے خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں — پھولوں کے ہار پہنے تھے۔ اور پھلوں کے ڈھیر ان کے چاروں طرف لگے ہوئے تھے ...... جن لوگوں نے دنیا میں شراب سے پرہیز کیا تھا جنت کے انگور ان کا انتظار کر رہے تھے ..... اور جو لوگ دنیا میں پرہیزگار رہے ان کا یہاں پاکدامن عورتیں سینوں سے لگا کر استقبال کر رہی تھیں۔ کیونکہ وہ راہب تھے اور انہوں نے دنیا میں عورت اور دنیوی محبت سے پرہیز کیا تھا۔

(سینٹ ایفرائیم کے گیت
(جلد ۳ صفحہ ۵۶۳)

اسی طرح جہاں حضرت محمدؐ نے لوگوں کو عذاب سے خبردار کرتے ہوئے دوزخ کی تصویر پیش کی ہے۔ اس میں صحرا کی تمام تکالیف اور صعوبتوں کو ہی زیادہ سنگین بنا دیا ہے — قرآن کہتا ہے :۔

وَاَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ؕ فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّ حَمِیۡمٍ ۙ وَّ ظِلٍّ مِّنۡ یَّحۡمُوۡمٍ ۙ لَّا بَارِدٍ وَّ لَا کَرِیۡمٍ ﴿۰﴾	"وہ گنہگار جھلسا دینے والی ہواؤں، کھولتے پانی اور سیاہ دھوئیں کے سائے میں رہیں گے جو نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ ہی آرام و سکون والا
....	....
فَشٰرِبُوۡنَ عَلَیۡہِ مِنَ الۡحَمِیۡمِ ۚ فَشٰرِبُوۡنَ شُرۡبَ الۡہِیۡمِ ؕ	وہ اُبلتا پانی پئیں گے اور سخت پیاسے اونٹ کی طرح پئیں گے۔ (سورۃ واقعہ)

وَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّن نَّارٍ يُصَبُّ مِن فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ ۝ يُصْهَرُ بِهِ مَا فِي بُطُونِهِمْ وَالْجُلُودُ ۝ وَلَهُم مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيدٍ ۝

"ان کے لباس آگ کے ہوں گے جو ان کے جسموں سے چمٹے ہوں گے۔ ڈالیں گے اُن کے سروں پر کھولتا پانی جس سے اُن کی آنتیں پگھل جائیں گی اور اُن کی جلد بھی اور انہیں لوہے کے گرزوں سے مارا جائے گا۔

(سورہ حج۔ رکوع ۱-۲)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو آئندہ زمانے میں جارج سیل[1] اور ان کے مذاق اڑانے والے ہم مشربوں کے ہونے کا علم تھا۔ کیونکہ قرآن مزید کہتا ہے۔

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝ انطَلِقُوا إِلَىٰ مَا كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝ انطَلِقُوا إِلَىٰ ظِلٍّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ ۝ لَّا ظَلِيلٍ وَلَا يُغْنِي مِنَ اللَّهَبِ ۝ إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۝ كَأَنَّهُ جِمَالَتٌ صُفْرٌ ۝ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝

سورہ والمرسلٰت۔ رکوع ۱

بُرا ہوگا اس دن ان لوگوں کا جو نبیوں کو جھوٹا کہتے تھے ان سے کہا جائے گا جاؤ دیکھو ان چیزوں کو جنہیں تم جھٹلاتے تھے۔ ان سے کہا جائے گا۔ جاؤ دوزخ کی آگ کے دھوئیں کے نیچے جاؤ جو تین ستونوں کی شکل میں اٹھ رہا ہے وہ نہ تمہیں گرمی سے پناہ دے گا اور نہ ہی شعلوں سے بچا سکے گا۔ بلکہ اس میں بڑے بڑے ستونوں جیسے شعلے لپکیں گے اور ان کا رنگ زرد اونٹوں جیسا ہوگا۔ بدنصیبی ہوگی اس دن ان لوگوں کے لئے جو نبیوں کو جھٹلاتے تھے۔

لیکن یہودیوں اور عیسائیوں کے دوزخ کے برعکس مسلمانوں کے لئے دوزخ کی سزا

---

[1] جارج سیل GEORGE SALE ایک انگریز عیسائی۔ اٹھارویں صدی کے شروع (۱۷۳۴ء) میں قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا اور ایک اچھا مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے لیکن بقول مصنف ایک عربی عیسائی کی لکھی ہوئی رسول کریم کی سوانح حیات کے دیباچے میں اس نے آنحضورؐ کے لئے "ظالم" اور "فریبی" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مسٹر باڈلے نے مسٹر سیل کو اس اقدام پر بہت بُرا کہا ہے اور اس کا تفصیلی ذکر اس کتاب کے مقدمہ میں کیا ہے۔

ہیں ہمیشگی نہیں بلکہ ان کے لئے یہ ایک اصلاحی ادارے یا شفاخانے کی طرح ہوگا۔ جہاں دنیا میں لگی روحانی بیماریوں کے مریضوں کو علاج کے لئے بھیجا جائے گا اور جب ان کا مرض دور ہو جائے گا تو وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ جیسا حضرت محمدؐ نے فرمایا:-

"دوزخ پر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اس کے (خالی) دروازے ایک دوسرے سے پڑے ٹکرائیں گے کیونکہ وہاں سے سب چلے جائیں گے۔

عیسائیوں کو بھی حضرت عیسیٰؑ کی وساطت سے مغفرت کی امید دلائی گئی ہے۔

پس جنت حضرت محمدؐ کے ان مشاہدات کا ایک پُر غلو بیان ہے جو آپؐ کو عرب سے باہر کے ممالک میں سفر کے دوران ہوئے۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کچھ خیالات سینٹ ایفرائیم[1] سے بھی مستعار لئے ہوں۔ اسی طرح دوزخ بھی مکہ کے گرد واقع آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے بے آب صحرا کی ایک مبالغہ آمیز تصویر ہے۔

یہ تصویر اس سے بہت ملتی جلتی تھی جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے ذہنوں میں تھی کیونکہ وہ بھی ان بے آب اور ویران ممالک سے اچھی طرح واقف تھے چنانچہ سرسبز چراگاہیں جنت اور صحرا اور اس کا ایندھن دوزخ کے مترادف تھے۔

اس خیال سے کہ اسلام اختیار کر لینے والے لوگ جان لیں کہ ان کے نئے دین میں کیا ہے۔ آپ نے دین کے اصول[3] قائم کر دیئے جو مختصر طور پر یہ ہیں:-

(۱) اٰمنتُ باللہ۔ میں ایمان لایا اللہ پر۔

(لا الٰہ الا اللہ) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں

(۲) وملائکتہٖ۔ میں ایمان لایا اللہ کے فرشتوں پر۔

ان میں سے چار بڑے فرشتے ہیں۔ (۱) جبرائیل جو وحی لاتے ہیں۔ (۲) عزرائیل جو مرنے والوں کی روح قبض کرتے تھے۔ (۳) اسرافیل جو قیامت کے دن صور پھونکیں گے

[1،2] یہ مصنف کا اپنا قیاس ہے۔

[3] اصل میں یہ (۱) تا (۷) اصول ارکان ایمان ہیں۔ ایمان مفصل یہ ہے۔ اٰمنتُ باللہِ وملائکتہٖ وکتبہٖ ورسلہٖ والیومِ الاٰخرِ، والقدرِ خیرہٖ وشرّہٖ من اللہ تعالیٰ والبعث بعد الموت ۵

پانچ وقت اس میں غسل کرے گا وہ پاک صاف ہوگا۔

اس کے علاوہ اسے اپنے جسم کی صفائی اور پاکیزگی کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ نماز سے پہلے ہر مسلمان کو وضو کرنا لازمی ہے۔ مزید براں حضرت محمدؐ جانتے تھے کہ آپؐ کے ملک میں پانی ہر وقت دستیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ نے ایسی ضرورت پڑنے پر پانی کی بجائے ریت یا مٹی استعمال کرنے کی بھی اجازت دے دی۔

یہ نمازیں صرف دعائیں ہی نہیں ہیں۔ حضرت محمدؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ اسے انسانی ضروریات کا علم ہے۔ اس لئے اسے ان باتوں کا جتانا گستاخی ہے چنانچہ نمازیں اس کی حمد، شکر گزاری اور گناہوں پر معافی چاہنے کی دعاؤں پر مشتمل ہوتی ہیں۔

(ج) **روزے رکھنا**۔ رمضان کے پورے مہینے روزے رکھے جاتے ہیں۔ ان تیس دنوں میں صبح صادق اور غروب آفتاب کے درمیان کھانا پینا منع ہے۔ یعنی صبح کو ایک ہاتھ کے فاصلے پر ایک سفید[1] بال اور سیاہ بال میں تمیز نہ ہونے سے پہلے اور شام کو اس کے بعد تک۔

مسلمانوں میں قمری سال مروّج ہونے کے سبب مہینے ہمیشہ ایک ہی موسم میں نہیں آتے چنانچہ جب رمضان کا مہینہ جون میں پڑتا ہے تو ان لمبے اور سخت گرم دنوں میں روزے رکھنا ایک کڑی آزمائش ہوتی ہے۔

دوسرے مذاہب کے روزوں کی طرح اسلام میں بھی روزے رکھنے کا اصل مقصد روزے دار کو تزکیہ نفس یعنی بعض چیزیں چھوڑ دینے اور سختی جھیلنے کا عادی بنانا ہے اور امیر و غریب کو ایک ہی سطح پر لانا ہے۔ البتہ جہاں عیسائی فرقوں میں روزے کی سختیاں جھیلنا روزے دار کے اپنے ضمیر یا صوابدید پر منحصر ہے۔ وہاں مسلمانوں میں روزے کے مقرر کردہ اوقات میں کھانے پینے کا مکمل امتناع سب پر بلا استثنا لازمی اور فرض ہے۔

(د) **حج**۔ یہ رسم کعبہ کے قدیم ترین ایام سے ہی رائج تھی حضرت محمدؐ نے[2] بھی یہ فیصلہ

---

[1] قرآن میں خیط الابیض اور خیط الاسود کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

[2] یہ اللہ کا حکم ہے۔

کر لیا کہ وہ کعبہ کو اپنے نئے دین کا ایک جزو لاینفک رکھیں گے۔ آپؐ نے یہ بھی سوچا کہ اس حج کے سبب اسلامی دنیا کے ہر حصے کے مسلمان سال میں ایک مرتبہ ایک مرکز پر ضرور اکھٹے ہو سکیں گے۔ بہر حال زندگی کے متعلق اپنے عملی نظریے کے پیش نظر آپؐ نے اس فرض میں ایک ترمیم کر کے ان لوگوں کو اس سے مستثناء قرار دے دیا جو اس سفر کی استطاعت نہ رکھتے ہوں یا جن کی غیر حاضری میں ان کے گھر بار کا سنبھالنے والا کوئی نہ ہو۔

(۵) **زکوٰۃ[1] وخیرات** ۔ یہ دو قسم کی تھی۔ پہلی شرعی یا قانونی جو قومی خزانے یا بیت المال کو جاتی تھی۔ دوسری رضاکارانہ لیکن موجب ثواب جو غربا کے لئے وقف تھی۔ یہ موخرالذکر خیرات مسلمانوں کی اکثریت اب تک بڑی فرض شناسی سے دیتی ہے۔

مختصر یہ کہ اس نئے دین کے یہ اصول تھے جن کی خاطر حضرت محمدؐ نے مکہ میں اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالا ہوا تھا۔ آپؐ عربوں کے سامنے عیسائیوں کے خدا جیسا ہی ایک پر جلال خدا پیش کر رہے تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ زبردست اور قدرت والا اور ان کی جفاکش زندگی کے ماحول سے زیادہ مطابقت رکھنے والا۔ یہ جلتے جھلسنے اور لامتناہی صحراؤں کے گلہ بانوں اور جنگجوؤں کا دین تھا۔

عیسائیت میں اخلاقیات کے بے شمار وسیع میدان اور فکر و نظر کی ایسی قلمرو ہیں جو حضرت محمدؐ کے دین میں[2] نہیں ہیں۔ عیسائی زندگی کا بنیادی نظریہ اتنا ہی زیادہ خیالی اور غیر مادی ہے جس قدر بانی اسلام کی زندگی بانی عیسائیت کی زندگی کے مقابلہ میں زیادہ مادی اور عملی ہے۔ صحیح معنوں میں اسلام میں خیالی زندگی کا کوئی وجود نہیں کیونکہ حضرت محمدؐ نے اپنے کردار کو کبھی آسمانی یا غیر مادی نہیں کہا۔ غالباً یہ بھی اسلام کی مقبولیت اور اس کی

---

[1] مصنف نے یہ الفاظ جارج سیل کے ترجمہ قرآن کے مقدمہ سے لئے ہیں۔ جہاں اس کا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے

[2] مصنف نے عیسائی ہونے کے سبب غالباً ایسے خیال کا اظہار کیا ہے۔ ورنہ یہ ہی باتیں اسلام کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہیں۔ یہ یقینی بات ہے کہ اسلام میں اخلاقی قدریں عملی زندگی سے زیادہ تطابق کرتی ہیں۔

بڑھتی ہوئی طاقت کا ایک سبب ہے۔

باایں ہمہ اسلام ایک آسان مذہب نہیں۔ اس کے روزے، بہت سی نمازیں خلوت کی عبادتیں، حج، زکوٰۃ اور خیرات تن آسان یا خودغرض لوگوں کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتے۔ پہلے مذاہب کی طرح نہ تو اس میں ظاہری نام و نمود کا سامان ہے اور نہ ہی دنیاوی انعام و اکرام کا لالچ۔ حضرت محمدؐ نے اپنی دنیوی حکومت میں بھی کسی کو مادی قسم کے انعامات سے نہیں نوازا۔ سوائے اس غنیمت کے جو وہ جنگوں میں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر حاصل کرتے تھے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کے مقابلے میں زیادہ کشش نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے یہ صحیح ہو۔ اسلام میں بہت سے وہ ہی عقائد ہیں جو اس سے پہلے یہودیت اور عیسائیت میں بھی موجود تھے۔ لیکن اسلام میں بس اگر یہی کچھ ہوتا تو یہ بھی اتنا ہی غیر دلکش ہوتا جتنا غیر اصل تھا۔ لیکن اس کا وہ عنصر یا روح جسے کوئی یقیناً نظر انداز نہیں کر سکتا اور نہ ہمیں بھلانا چاہیئے خود حضرت محمدؐ کی ذات ہے۔ یہ ہی وہ عنصر تھا جس نے دین اسلام قائم کیا اور اسی روح رواں کے سبب یہ مذہب عربوں میں پہلی مرتبہ پیش ہونے کے بعد سے تیرہ صدیوں کے دوران پھلا پھولا اور کامیاب ہوا۔ درحقیقت حضرت محمدؐ ہی اصل اسلام ہیں اور اس سے کہیں زیادہ جتنا کہ حضرت موسیٰؑ یہودیت میں اور حضرت عیسیٰؑ عیسائیت ہیں۔ اس دین کی تاریخ کا علم اس کے بانی کے حالاتِ زندگی جانے بغیر بے معنی ہو گا۔

ساتواں باب

سیر ہفت افلاک یا معراج

(۶۲۰ء)

آغاز کتنا ہی مشکل ہو اور راہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو اکثر لوگ پچاس سال کی عمر کو پہنچنے تک اپنی منزل کو جا لیتے ہیں لیکن حضرت محمدؐ ایک استثنا ہیں۔ آپؐ کی آدھی سے زیادہ عمر گمنامی میں گزری، ایک چوتھائی اذیتیں سہنے میں اور اس کا صرف چھٹا حصہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں صرف ہوا۔ وہ تمام باتیں جن کے لئے حضرت محمدؐ کی بے حد ستائش کی جاتی ہے آپؐ کی عمر کے آخری دس سالوں میں وقوع پذیر ہوئیں۔ جب آپؐ کی عمر باون سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ بہت سے لوگ جن کا اسلام کے متعلق علم سطحی ہوتا ہے آپؐ کی پچاس سال کی عمر ہونے سے پہلے کے واقعات کے متعلق سن کر حیران رہ جاتے ہیں۔ اگرچہ جیسا کہ کہا جاتا ہے آپ کی اصل زندگی پچاس سال کے ہو جانے کے بعد شروع ہوتی ہے لیکن آپؐ کی تصویر کے خدوخال کو پوری طرح ضح کرنے کے لئے ان سے پہلے کے حالات کو جاننا نہایت ضروری ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی عام طور پر تسلیم شدہ زندگی کا سب سے زیادہ مایوس کن پہلو یہ ہے کہ ان کی جوانی کے متعلق تفصیلات نہیں ملتیں۔ ہم صرف اتنا سنتے ہیں کہ آپ پیدا ہوئے اور اس کے بعد آپ یکایک تیس سالہ جوان کی شکل میں معجزے دکھاتے ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ اور اس کے تین سال بعد آپ اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہ ہی کمی حضرت موسیٰؑ کے سوانح حیات میں ہے اور یہ ہی حال جان بپتسمیؔ[1] JOHN BAPTIST اور سینٹ پال کا ہے

[1] جان بپٹیسٹ۔ عربی میں انہیں یوحنا کہتے ہیں اور قرآن میں جن کا ذکر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے نام سے آیا ہے وہ یہ ہی ہیں آپ کا نام حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ اس طرح منسلک ہے جیسے حضرت ہارون کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ۔ آپ ہی نے لوگوں کو خبردار کیا کہ جس یسوع کا انتظار تھا وہ آ گیا ہے۔ اسی جرم کی پاداش میں حکومت نے آپ کو پکڑ کر قتل کر دیا۔

ہم ان کو صرف اس وقت دیکھتے ہیں جب وہ اپنی معراج پر پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ ان کا لڑکپن اور جوانی کیسی گزری اس کا ہمیں کچھ علم نہیں۔ ان حالات کو پیش نظر رکھ کر جب ہم ان کے شیشے، پتھر یا لکڑی کے بنے ہوئے جوانی کے مجسموں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ لوگ قریب قریب بالکل خیالی کردار معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ حضرت محمدؐ نے ان سب کے بعد شہرت حاصل کی لیکن آپؐ کی جوانی کے متعلق کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے بشرطیکہ کوئی جاننے یا تلاش کرنے کی تکلیف گوارا کرے۔

حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد حضرت محمدؐ نے ایک غیر متوقع بات کی یعنی آپؐ نے شادی کر لی اور ایک نہیں بلکہ دو۔ لیکن ان میں سے کوئی سی بھی شادی خواہش نفسانی کی خاطر نہیں کی۔ ایک بیوی سات سالہ لڑکی تھیں تو دوسری ایک ایسے مہاجر کی ادھیڑ عمر کی غیر دلکش بیوہ خاتون تھیں جو ۶۱۴ عیسوی میں اسلام کی خاطر حبشہ کو ہجرت کر گیا تھا۔ اور وہاں ہی فوت ہو گیا۔ ان دونوں شادیوں کے اسباب بنیادی طور پر زندگی کے عملی پہلو سے تعلق رکھتے تھے۔

کمسن بیوی سب سے پہلے ایمان لانے والے اور آپؐ کے ایک عزیز دوست حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی عائشہؓ تھیں۔ یہ شادی کرنے کا حضرت محمدؐ کا اپنا کوئی خیال نہ تھا۔ آپؐ تو حضرت خدیجہؓ کی وفات کے غم سے نڈھال تھے اور مصائب میں اتنے گھرے ہوئے تھے کہ آپ کو عورتوں اور گھر بسانے کا خیال بھی نہ آ سکتا تھا۔ یہ تجویز دراصل حضرت آمنہ (آپ کی والدہ) کی بہن اور آپؐ کی خالہ خولہ بنت حکم کی تھی۔ انہوں نے آپؐ کو مشورہ دیا کہ گو سر دست حضرت عائشہؓ کی شادی ایک قسم کی منگنی یا نسبت سے زیادہ نہ ہو گی لیکن اس صورت سے آپؐ کے سب سے زیادہ وفادار دوست کی لڑکی نبی کے گھرانے کی ایک فرد تو بن جائے گی۔ مزید یہ کہ عائشہؓ میں بڑی ہو کر ایک حسین خاتون بننے کے تمام آثار موجود ہیں۔ حضرت محمدؐ رضامند ہو گئے اور نکاح ہو گیا۔

میں اس واقعہ کا خاص طور پر اس لئے ذکر کر رہا ہوں کہ بعض سوانح نگاروں نے اس شادی کے متعلق آپؐ پر بڑی نکتہ چینی کی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اصل میں یہ آپؐ کی تجویز نہ تھی بلکہ اس میں کسی جبر یا خواہش نفسانی کے سبب کسی بوڑھے کا کسی کمسن لڑکی سے شادی کر لینے

کا سوال ہی نہ تھا۔

آپؐ کی دوسری بیوی حضرت سودہؓ بنت زمعہ کے آپ کے گھرانے میں داخلے کا سبب کسی اور بات سے زیادہ گھر کی دیکھ بھال تھا۔ حضرت سودہؓ ایک قد آور اور فربہ اندام خاتون تھیں۔ آپ شروع میں ایمان لانے والوں میں سے ایک تھیں جن کے خاوند اسلام کی خاطر جلاوطنی میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ حضرت خولہ نے اپنے بھانجے (حضرت محمدؐ) کو مشورہ دیا کہ (ان کی قربانیوں اور بے سہارا ہونے کے پیش نظر) ان کی کم سے کم امداد یہ ہوگی کہ آپؐ ان سے نکاح کریں۔

لیکن جہاں آپ کو بیویاں مل گئیں وہاں سکون نہ ملا۔ حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد ابو سفیان اور ابو جہل نے اپنے اس پریشان کن جھوٹے نبی (نعوذ باللہ) سے نجات حاصل کرنے کے لئے زیادہ عملی طریقے اختیار کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اب انہوں نے دبی زبان سے کہنے کی بجائے کھل کر شہر والوں پر روشن کر دیا کہ آپؐ کے قتل سے کم کوئی بات انہیں مطمئن نہ کر سکے گی۔ چنانچہ ایک مرتبہ پھر آپؐ کو مکہ چھوڑنا پڑا۔

اس مرتبہ آپؐ نے حضرت زیدؓ[1] کے علاوہ کسی کو ساتھ نہ لیا اور چونکہ اب شعب ابی طالب جیسی کوئی پناہ گاہ آپؐ کے پاس نہ تھی آپؐ نے فوراً مکہ چھوڑ دیا۔ دونوں اونٹوں پر سوار ہوئے اور مکہ سے ستر میل مشرق میں بنو ہوازن[2] کے علاقے (طائف) چلے گئے۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ تھا جسے مکہ کے امیر لوگ بہت پسند کرتے تھے اور موسم گرما کی شدت سے بچنے کے لئے وہاں چلے جایا کرتے تھے۔ مکہ کے مقدس شہر کی ارد گرد دھوپ میں چمکتی اور جھلستی بے آب و یرانیوں کے مقابلے میں یہاں کا ماحول بہت حد تک مختلف تھا۔ یہاں پانی کی فراوانی تھی اور لوگوں کا ذریعہ معاش زراعت تھا۔ پہاڑیوں کی ڈھلوانیں جن کے درمیان سبز رنگ کے پانی کے چشمے تھے، کھجوروں، پھلدار درختوں اور باغات سے پٹی پڑی تھیں۔

---

[1] زید بن حارثہؓ۔ آنحضرتؐ کے آزاد کردہ غلام، منہ بولے بیٹے اور جان نثار دوست۔

[2] طائف میں بنی ثقیف آباد تھے۔ البتہ بنو ہوازن ان کے علاقے میں بدوی زندگی گزارتے تھے۔

صحرا میں یہ مقام جنت سے کم نہ تھا۔ جب آپ وہاں کے سایہ دار راستوں سے گزرے تو آپ کو بڑا سکون محسوس ہوا لیکن یہ سکون دیرپا ثابت نہ ہوا۔

آپؐ کو پہلی مایوسی تو یہ جان کر ہوئی کہ اس نخلستانی علاقے کے بڑے شہر طائف کے لوگوں نے آپؐ کے اور آپؐ کے دینی اصولوں کے متعلق کبھی کچھ نہیں سنا تھا۔ دوسری یہ کہ وہ لوگ کسی نئے مذہب میں کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ وہ تو اپنی پتھر کی دیوی "اللات"[1] سے پوری طرح مطمئن تھے جو ان کی ہر خواہش پوری کر دیتی تھی۔ آنحضرتؐ کی ذات پر تو انہیں کوئی اعتراض نہ تھا لیکن آپؐ کا "اللات" (جسے الربہ AL-RABBA بھی کہتے تھے) کا مخالف ہونا بہت اہم بات تھی۔

اپنے معمول کے مطابق حضرت محمدؐ نہ تو اس نظریے کے سامنے جھکے اور نہ ہی اس سے سمجھوتہ کیا۔ یہ آپؐ کے لئے بہت آسان تھا کہ اسلام کا فکر چھوڑ کر کچھ دن آرام کر لیتے تا آنکہ آپؐ کی صحت بحال ہو جاتی لیکن ایسا خیال بھی کبھی آپؐ کے ذہن میں نہیں آیا۔ آپؐ نے مشکل راستہ اختیار کیا اور اپنے دین کی تبلیغ شروع کر دی۔ نتیجہ تباہ کن تھا۔ ہر شخص آپؐ کا مخالف ہو گیا۔ تمسخر اڑانے کے بعد آپؐ کی توہین کی گئی اس کے بعد پتھراؤ ہوا۔ چند ہی روز میں آپؐ کو ٹھنڈی چھاؤں والے باغات اور فرحت بخش پانی کے کناروں سے دور پر صعوبت صحرا کی طرف نکال دیا گیا۔ ایک مرتبہ پھر ایسا نظر آتا تھا کہ آپؐ کے اس مشن میں ضرور کوئی خرابی تھی کوئی شخص بھی اتنی مستقل اور مسلسل آفتوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

لیکن زیدؓ جوان تھے اور زندہ رہنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنے منہ بولے والد (حضرت محمدؐ) کے پاس وہ خورد و نوش کا سامان چھوڑا جو آپ نے چھپ چھپا کر طائف سے حاصل کیا تھا اور خود مکہ روانہ ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے ایک مسلمان کو جن کا نام مطعم[2] بن عدی تھا اور جن کے پاس ایک بڑا مکان تھا حضرت محمدؐ کو پناہ دینے پر رضامند کر لیا۔ پھر

---

[1] اللات۔ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے۔ جن میں ہبل اور عزیٰ بہت محترم تھے لیکن "اللات" کا مستقر طائف تھا اور وہاں اسی کی عملداری تھی۔

[2] مطعم بن عدی مسلمان نہیں ہوئے لیکن انہوں نے رسول اللہ کو پناہ دی تھی۔ وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ ہتھیار لگا کر آپ کو مکہ میں لائے اور کعبہ میں جا کر اعلان کیا کہ رسول اللہ ان کی پناہ میں ہیں۔ (سیرۃ النبیؐ جلد اول)

وہ صحرا کو لوٹے۔ وہاں انہوں نے حضرت محمدؐ کو بے ہوشی کی سی حالت میں پایا۔ کچھ تو گرمی کے سبب اور کچھ اس وجہ سے کہ دو جن آپؐ کے ساتھ لگ گئے تھے (اور آپ کو پریشان کرتے تھے) کچھ ایسا ہی تھا جو حضرت محمدؐ نے بڑے وثوق سے بتایا۔ حضرت زیدؓ نے وقت ضائع نہ کیا۔ آپؐ کو اٹھا کر اپنے اونٹ پر سوار کیا، مکے واپس لائے اور کسی قریش کی نظر میں آئے بغیر آپؐ کو بڑی خاموشی[1] سے مطعم بن عدی کے مکان پر پہنچا دیا۔

یہاں پر ہی آپؐ کو وہ واقعہ پیش آیا جو اتنا ہی بڑا موضوع بحث بنا ہوا ہے جتنا کہ آپؐ پر مرگی کے دورے پڑنا یا آپؐ کا بے پڑھا لکھا ہونا۔ لیکن جہاں یہ واقعہ دلچسپ ہے وہاں اس کا تاریخ اسلام پر کوئی اثر نہیں۔ مسلمانوں میں یہ واقعہ "رات کے سفر[2] (معراج النبی) کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت محمدؐ پر لکھی ہوئی بہت سی کتابوں میں اس واقعہ کا تھوڑا یا بہت ذکر مختلف طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ بعض نے بڑی عقیدت سے لکھا ہے۔ بعض نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور بعض نے بے رنگ اور بے کیف انداز میں تحریر کیا ہے۔ میں آپ کو یہ واقعہ اسی طرح بتاؤں گا جیسے میرے دوست قائد مدنی نے ایک رات صحرا میں اپنے خیمہ کے سامنے ریت پر بیٹھے میرے سامنے بیان کیا۔

مدنی ان چند بہت اچھے لوگوں میں تھا جن سے میری ملاقات ہوئی۔ اگر وہ ایک عرب سردار ہونے کی بجائے کسی برطانوی دیہات کا رئیس یا امریکن زمیندار ہوتا تو اس کی اچھائی اور شرافت اور زیادہ نمایاں ہوتی۔ اس کی جھپکتی نیلی آنکھوں میں جھانکنے یا اس کو مسکراتے دیکھ کر ہی اس کے خلوص کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ وہ بہت اچھا داستان گو بھی تھا۔ اس کی معلومات زیادہ تر عہد نامہ عتیق (زبور و توریت) قرآن اور احادیث پر مبنی تھیں لیکن پرانی بات کو

---

[1] مطعم بن عدی جنگ بدر سے پہلے کفر کی حالت میں فوت ہوئے۔ (سیرۃ النبی۔ جلد اوّل)

[2] حیات محمدؐ، تذکرۃ الکرام اور دوسری بہت سی ثقہ اور مشہور کتابوں میں لکھا ہے کہ معراج کی شب آنحضورؐ اپنی چچا زاد بہن اُمّ ہانی بنت ابی طالب کے ہاں مقیم تھے اور یہ واقعہ وہاں ہی پیش آیا۔

ایک بالکل نئے انداز میں بیان کرنے کا اس کو ایک قابل رشک ملکہ حاصل تھا۔ معراج کے سفر کا احوال مدنی کے بیان کردہ واقعات میں سے ایک ایسا واقعہ تھا۔ جو مجھے شروع سے آخر تک ازبر یاد رہا۔

مدنی نے اپنی عبا کو سمیٹ کر درست کیا، عمامہ سر کے پیچھے کی طرف سرکایا۔ سوچنے کے انداز میں میری طرف دیکھا۔ اور یوں گویا ہوا۔

"اس رات صحرا میں خاموشی تھی۔ نہ تو کوئی گیدڑ بولا اور نہ ہی کتے بھونکے، یہاں تک کہ ہوا کی سرسراہٹ بھی بند ہو گئی تھی۔ مکے کی گلیوں میں بھی کوئی بلی دبے پاؤں چلتی نظر نہ آتی تھی۔ طوائفوں کے مکانات میں بھی خاموشی تھی۔ یہاں تک کہ نالوں میں بہتا پانی بھی ٹھہر گیا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج ڈوبنے کے بعد ہر شے پر سکوت طاری ہو گیا تھا۔"

"حضرت محمدؐ شام ہوتے ہی آرام کے لئے لیٹ گئے تھے۔ آپ کا جسم اور روح مسلسل مصیبتیں جھیلنے سے تھک گئے تھے۔ وہ اپنے عم زاد مطعم بن عدی کے بستر پر گہری نیند سو رہے تھے۔ اچانک اس مسلسل خاموشی کا طلسم ٹوٹا۔ قرنا جیسی بلند آواز میں کسی نے کہا۔"

"جاگ اٹھ ۔ اے سونے والے ۔ جاگ اٹھ۔"

"حضرت محمدؐ کی آنکھ کھل گئی اور آپؐ اُٹھ بیٹھے۔ آپؐ نے دیکھا کہ اندھیرے میں چکا چوند کئے ہوئے حضرت جبرئیل آپؐ کے سامنے کھڑے تھے۔

EMILE DERMENGHAM (ایک فرانسیسی سیرۃ نگار) نے حضور اکرم کے معراج پر تشریف لے جانے کے واقعہ کو کتب سیرت سے جمع کر کے نہایت حسین و جمیل پیرائے میں پیش کیا ہے۔ مدنی کا یہ بیان کردہ واقعہ درمنگم کے لکھے ہوئے واقعہ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کے آخر میں مندرجہ کتابیات میں اس کی کتاب VIEDEMAHOMET کا نام بھی درج کیا ہے۔ مدنی کی زبانی بیان کردہ واقعات درمنگم کی اس کتاب سے اخذ کئے معلوم ہوتے ہیں۔

"ان کے چمکدار پروں، برف جیسے سفید بالوں اور ان کے لباس سے، جس پر زر نار کار چوبی کا کام تھا اور جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے، روشنی پھوٹ رہی تھی فرشتے نے پھر آواز دی اور حضرت محمدؐ کو اپنے پیچھے گلی میں آنے کا اشارہ کیا۔

"دروازے پر ایک گھوڑی کھڑی تھی جو اتنی ہی چمکیلی اور پر نور تھی۔ جیسے خود جبرئیل امین۔ اس کے پر بھی تھے جو ایک بہت بڑے عقاب کے پروں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں نیلم کی تھیں اور اس کا سر خوبصورتی میں بالکل انسان کے مشابہ تھا۔ حضرت جبرئیل نے گھوڑی کو حضرت محمدؐ کی خدمت میں پیش کیا اور اس کا نام براق بتایا۔ براق ہنہنائی اور حضرت محمدؐ کو جست لگا کر اپنی پشت پر سوار ہونے دیا۔ پھر ہوا میں ایک لمبی سانس لے کر گلی میں اوپر کی طرف سرپٹ دوڑی۔ جب وہ سوتے شہر کی فصیل کے قریب آئی، تو اس نے اپنے پر پھیلا لئے اور تاروں بھری رات میں ہوا میں تیرنے لگی حضرت جبرئیل پہلو میں آپ کے ساتھ ساتھ اڑ رہے تھے۔"

مدنی نے حضرت محمدؐ اور براق کی جو تصویر پیش کی ہے وہ سادہ اور عربی ماحول کی مظہر تھی۔ حضرت جبرئیل کا سلام پیش کرنا، حضرت محمدؐ کا ایک پیدائشی سوار کی خود اعتمادی کے ساتھ سوار ہونا۔ اس قوم کا روائتی انداز تھا۔ حضرت موسیٰ یا سینٹ پال کا ایسے برق رفتار گھوڑوں پر سوار ہونے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ صرف ایک عرب ہی آسمانی سفر پر اس طرح جا سکتا ہے۔

مدنی نے اپنا بیان جاری رکھا۔

"ابھی وہ کچھ دیر ہی ہوا میں اڑے ہوں گے کہ حضرت جبرئیل نے حکم دیا اور براق زمین پر اتر گیا۔ حضرت محمدؐ سے کہا کہ اتریں اور نماز پڑھیں۔ آپؐ کوہ سینا کی چوٹی پر اسی جگہ تھے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو الواح توریت عطا کی تھیں۔ (نقشہ ۶ پانچواں باب)

"نماز ختم کی تو وہ پھر روانہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ پھر حکم دیا گیا اور

وہ پھر زمین پر اترے۔ اس دفعہ مقام 'بیت اللحم' تھا۔ یہاں پر حضرت محمدؐ نے عین اس جگہ نماز پڑھی۔ جہاں حضرت عیسٰیؑ پیدا ہوئے تھے۔ وہ پھر آگے روانہ ہو گئے۔

"سفر کے تیسرے مرحلے پر وہ اکیلے نہیں تھے۔ راستے میں تین مرتبہ بڑی سجی بنی عورتیں بادلوں سے نکلیں اور آپؐ سے اپنے ساتھ قیام کرنے کی درخواست کی۔ حضرت محمدؐ نہیں جانتے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ چنانچہ آپؐ نے کوئی توجہ نہ دی۔ بہر حال جب تیسری مرتبہ ان عورتوں نے بڑی لجاجت سے درخواست کی تو آپؐ نے حضرت جبرئیل سے دریافت کیا کہ یہ سب کیا ہے۔ بلا شبہ حضرت جبرئیل جانتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بلا تامل جواب دیا۔

"پہلی آواز ایک یہودی کی تھی، دوسری ایک عیسائی کی اور تیسری آواز دنیا اور اس کے فخر و غرور کی تھی۔ اگر آپؐ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ ٹھہرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے تو آپؐ اور آپؐ کی امت بھی ایسی ہی ہو جاتی۔

"اس سے پہلے کہ حضرت محمدؐ کوئی اور سوال کرتے حضرت جبرئیل نے براق سے کچھ کہا اور آپؐ ایک مرتبہ پھر زمین کی طرف آ رہے تھے۔ اس مرتبہ آپؐ بیت المقدس میں مقدس عبادت گاہ[1] کے باہر اترے۔ حضرت جبرئیل نے حضرت محمدؐ سے براق کو دیوار میں ایک کڑے سے بندھوایا اور آپؐ کو لے کر اندر داخل ہوئے۔ یہاں آپؐ نے متعدد انبیا علیہم السلام کو موجود پایا۔ جن میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ بھی موجود تھے۔ رسمی تعارف کے بعد سب نے نماز ادا کی۔ نماز ختم ہونے پر آپؐ نے اپنے دین کی باتیں کیں۔ یہاں تک کہ حضرت جبرئیل نے کہا کہ روانگی کا وقت آ گیا۔"

"عبادت گاہ کے باہر حضرت محمدؐ نے حجر یعقوب[2] پر ایک سیڑھی لگی پائی جو

---

[1] مقدس عبادت گاہ TEMPLE بیت المقدس کی قدیم عبادت گاہ یا مسجد اقصیٰ جو پہلے نبیوں کے زمانے سے ہی مقدس اور محترم تھی۔ [2] حجر یعقوب۔ یہ وہی چٹان ہے جسے صخریٰ ROCK یا مسجد صخریٰ کہتے ہیں اور یہاں سے آنحضورؐ آسمانوں پر تشریف لے گئے۔

آسمانوں تک جاتی تھی۔ فرشتے کے پیچھے پیچھے آپؐ نے بھی سیڑھی پر چڑھنا شروع کیا۔ اس پر چڑھنا آپ کو توقع کے خلاف کچھ مشکل معلوم نہ ہوا۔ آپؐ نے محسوس کیا گویا آپؐ خود ہوا کے بنے ہوئے تھے اور چند لمحوں میں آپؐ نے خود کو بہشت کے دروازوں پہ کھڑا پایا۔

مدنی نے میری طرف بڑے فخر سے دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ سے محسوس ہوتا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "آپ کو ان باتوں کی توقع نہ ہو گی" اور واقعی ایسا تھا۔ مدنی نے مسکرا کر سر کو جنبش دی اور احوال جاری رکھا۔

"جونہی حضرت جبرئیل نے داروغہ بہشت کو بتایا کہ آپ کون ہیں بہشت کے دروازے کھل گئے۔ حضرت محمدؐ نے حضرت جبرئیل کے ساتھ ڈیوڑھی کو عبور کیا اور اپنے آپ کو پہلے آسمان پر پایا۔ یہ خالص چاندی کا بنا ہوا تھا اور ستاروں کے ساتھ سنہری زنجیروں پر لٹکا ہوا تھا۔ ایک ضعیف بزرگ نئے آنے والوں کے استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ حضرت جبرئیل نے حضرت محمدؐ کا ان سے یہ کہہ کر تعارف کرایا کہ یہ آپؐ کے جدّ امجد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ حضرت آدمؑ نے آپؐ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اور سینے سے لگاتے ہوئے کہا کہ آپؐ ان کی سب سے زیادہ معزز اور مفتخر اولاد تھے۔ پھر انہوں نے پہلے آسمان کے دستور کے مطابق آپؐ کی عزت و تکریم کی۔

"ساری جگہ جانوروں، پرندوں اور رینگنے والے جانوروں سے بھری ہوئی تھی۔ ان کے درمیان ایک بہت بڑا مرغ کھڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ آپؐ کو اس کا سر نظر نہیں آتا تھا جو بلندی کے سبب بادلوں تک پہنچتا تھا۔ حضرت آدمؑ نے بتایا کہ یہ تمام پرندے اور جانور اصل میں فرشتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ اور زمین کی غیر انسانی مخلوق کے درمیان رابطے کا کام کرتے ہیں اور مرغ ہر صبح بانگ دے کر ساتوں آسمانوں کے مکینوں کو جگاتا ہے۔

"جب آپؐ نے پہلے آسمان کی کافی سیر کر لی تو حضرت جبرئیل آپؐ کو

دوسرے آسمان پر لے گئے۔ اس کا دروازہ پہلے آسمان جیسا ہی تھا لیکن اندرونی حصہ چمکتے فولاد کا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام یہاں رہتے تھے۔ وہ اپنے اس نامور خلف کو دیکھ کر حضرت آدمؑ کی طرح بہت خوش ہوئے۔ حضرت نوحؑ کے ساتھ حضرت موسیٰؑ اور حضرت یوحنا (حضرت یحییٰؑ) بھی تھے۔ حضرت محمدؐ کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آیا یہ بزرگ ہستیاں مستقل طور پر یہاں ہی رہتی تھیں یا یہ لوگ کچھ دیر کے لئے یہاں پر آ گئے تھے۔ لیکن یہ حضرات بڑے تپاک سے ملے اور قدیم شناساؤں کی طرح بات چیت کی۔

تیسرا آسمان پہلے دو سے زیادہ مزین اور آراستہ تھا۔ یہ ان سے بڑا بھی تھا اور بے شمار قیمتی جواہرات سے سجا ہوا تھا۔ حضرت جبرئیل سے آپؐ کو معلوم ہوا کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت داؤد اسی آسمان پر کہیں رہتے ہیں۔ لیکن ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ آپؐ نے ایک بڑے عظیم الجثہ فرشتے کو دیکھ کر بڑی حیرت کا اظہار کیا کیونکہ اس کی دونوں آنکھوں کا درمیانی فاصلہ ستر ہزار دنوں کا سفر تھا۔ تیسرے آسمان میں داخل ہونے پر نہ تو اس فرشتے نے آپؐ سے گفتگو کی اور نہ ہی آپؐ کا اس سے تعارف کرایا گیا۔ بڑی ڈراؤنی خاموشی سے وہ ایک بہت بڑی کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ جس میں مسلسل لکھتا تھا اور مٹاتا تھا۔

حضرت جبرئیل نے بتایا کہ وہ موت کا فرشتہ عزرائیل تھا۔ ایک لاکھ فرشتے اس کے ماتحت کام کرتے تھے۔

"وہ اس کتاب میں کیا لکھ رہا ہے" حضرت محمدؐ نے چپکے سے پوچھا۔

"وہ پیدا ہونے والوں کے نام لکھ رہا ہے اور مرنے والوں کے نام مٹا رہا ہے۔" حضرت جبرئیل نے جواب دیا۔

"اور جب حضرت جبرئیل چوتھے آسمان کی طرف چلے تو حضرت محمدؐ نے اطمینان کا سانس لیا۔ پہلے آسمان کی طرح یہ بھی چاندی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے درمیان میں ایک فرشتہ تھا جس کے قد کی بلندی پانچ سو دن کی مسافت تھی

اور جو مسلسل روئے جا رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں سے دریا بہہ رہے تھے۔"

"اور یہ" حضرت جبرئیل نے کہا۔ "یہ فرشتہ بنی نوع انسان کے گناہوں پر روتا ہے اور انہیں آنے والی آفتوں سے خبردار کرتا ہے۔"

"حضرت محمدؐ نے اس آسمان سے رخصت ہونے میں کوئی تامل نہ کیا اور صرف ENOCH (حضرت یونسؑ) سے ایک دو باتیں کیں جن سے دروازے پر تعارف کرایا گیا تھا۔

"آپؐ پھر سیڑھی پر چڑھے اور ایک ڈنڈے سے دوسرے ڈنڈے پر اس طرح قدم رکھ رہے تھے گویا خود آپؐ کے پر لگے ہوئے ہیں۔ پانچواں آسمان تمام کا تمام سونے کا تھا۔ یہاں حضرت ہارونؑ اپنے معزز مہمانوں کا استقبال کرنے کے لئے چشم براہ تھے۔ حضرت محمدؐ کا ارادہ تھا کہ یہاں کچھ دیر آرام کریں اور دین کے متعلق کچھ باتیں کریں کہ آپؐ نے ایک خوفناک شکل کا فرشتہ دیکھا جو ایک دہکتے تخت پر بیٹھا تھا اور اس کے چاروں طرف آگ کے شعلے تھے۔ اس کا چہرہ صیقل شدہ تانبے کی طرح تھا اور پھنسی پھوڑوں کے نشانات سے بھرا ہوا تھا۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے ۔اور اس کے آتشیں ہاتھ میں ایک جلتا ہوا بھالا تھا۔ حضرت ہارونؑ نے آپؐ کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ لئے۔ آپؐ کو طرف لے جا کر بتایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا عذاب لانے والا فرشتہ ہے اور آگ اس کے قبضہ میں ہے۔ گنہگاروں اور کافروں پر اللہ تعالیٰ کے عذاب اور سزا کے احکام کی تعمیل کرنا اس کے بڑے فرائض ہیں۔

چھٹا آسمان ایک عجیب و غریب شفاف پتھر کا بنا ہوا تھا جو حضرت محمدؐ نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ آپؐ نے یہاں بھی بڑے تجسس سے کسی بلا کی تلاش کی اور وہ فوراً مل گئی۔ یہ فرشتہ دوسروں کی طرح غیر دلکش اور بدصورت تو نہ تھا لیکن بہت ہی عجیب الخلقت تھا۔ اس کا آدھا جسم

سے نکل کر بہ رہے تھے۔ سمندر کے ریت کے ذروں سے بھی زیادہ فرشتے آرام کر رہے تھے۔ ان میں سے دو دریا بہشت کو سیراب کرتے تھے اور باقی دو دنیا میں پہنچ کر فراتؒ اور نیلؒ بن گئے تھے

"خوفناک شکل کے فرشتوں کے مقابلے میں اس درخت کے نیچے زیادہ سکون اور آرام تھا۔ حضرت محمدؐ کو پھر خیال آیا کہ چند لمحے وہاں بیٹھ کر اپنے خیالات مجتمع کر لیں لیکن حضرت جبرئیل تا حال جلدی میں تھے۔ چند لمحے پرندوں کی چہچہاہٹ سننے کے بعد حضرت محمدؐ کو تیزی سے ملائے اعلیٰ پر لے جایا گیا۔ جو نیلم اور یاقوت کا بنا ہوا تھا۔ یہاں پر ایک فرشتے نے آپ کو تین پیالے پیش کئے جو شراب، دودھ اور شہد سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک اچھے عرب ہونے کے سبب حضرت محمدؐ نے دودھ پسند کیا۔ حضرت جبرئیل نے بھی اس انتخاب کو پسند کیا۔ "اگر آپؐ شراب پسند کر لیتے" حضرت جبرئیل نے کہا "تو آپؐ کی امت گمراہ ہو جاتی"۔ کچھ توقف کے بعد حضرت جبرئیل نے کہا "میں اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ ایک لمحہ کے بعد آپ خداوند قدوس کی حضوری میں جائیں گے۔ میں ساتویں آسمان پر آپ کا انتظار کروں گا"۔ یہ کہہ کر وہ رخصت ہو گئے۔ اور اس سے پہلے کہ آپؐ اپنے بچاؤ کے لئے تلوار مانگتے آپؐ نے محسوس کیا کہ آپؐ کو ایک جھٹکے کے ساتھ اوپر اٹھا لیا گیا ہے اور آپؐ خلا میں بلندی کی طرف پرواز کر رہے ہیں۔ آپؐ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کے خطوں اور گہری تاریکیوں سے گزرے۔ راستے میں آپؐ نے کوئی رکاوٹیں محسوس نہ کیں اور جب آپؐ بادلوں سے ڈھکی اس قلمرو کے نزدیک پہنچے جہاں سے اللہ تعالیٰ ساری دنیا کی نگہبانی کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یکے بعد دیگرے پردے اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ آخر کار یہ طوفانی سفر ختم ہوا اور آپؐ نے خود کو عرش بریں سے دو کمانوں کے فاصلے پر پایا۔

لہ دریائے فرات عراق میں بہتا ہے اور دریائے نیل مصر کا مشہور دریا ہے۔

مدنی نے پھر کچھ توقف کیا اور بڑے وجدانی انداز میں سامنے کی طرف دیکھا۔ پھر وہ گویا ہوا :-

"تھوڑی دیر تک مکمل خاموشی رہی اور قلم[1] کی صریر (لکھنے کی آواز) کے سوا جو قضاء قدر کی الواح پر اللہ تعالیٰ کے احکام لکھ رہا تھا اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

"حضرت محمدؐ نے فوری طور پر اپنا سر نہیں اٹھایا اور جب اٹھایا تو اللہ تعالیٰ کا جلوہ بیس ہزار نقابوں کے پیچھے نظر آیا لیکن اس کے باوجود جو نور نقابوں کے پیچھے سے ضیاپاشی کر رہا تھا پچاس ہزار آفتابوں کی روشنی سے بھی زیادہ منوّر تھا۔

مدنی نے ایک گہرا سانس لیا اور رات کے خلا میں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ مقدس آسمانی سفر وہ خود کر رہا تھا اور سچ مچ اس کے الفاظ سے جلال اور عظمت کا اظہار ہو رہا تھا اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کی پراسرار عظمت کو سچ مچ محسوس کیا۔ ایک لمحہ کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"جب حضرت محمدؐ کی نگاہ خیرہ کن ماحول کی عادی ہو گئی تو آپؐ نے عرش بریں کے دائیں طرف بڑے روشن الفاظ میں یہ لکھا دیکھا۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ

"حضرت محمدؐ کو یہ دیکھ کر گونہ اطمینان ہوا لیکن آپؐ کی ہمت جواب دے گئی جب اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ بڑھائے اور ایک آپؐ کے شانے اور دوسرا آپ کے دل پر رکھا۔ ایک برفانی سردی سے آپؐ کی ہڈیاں اور خون منجمد ہو کر رہ گئے۔ پھر سردی آہستہ آہستہ ختم ہو گئی اور اس کی جگہ ایک روحانی سرور نے لے لی جس کے سبب حضرت محمدؐ کے حواس اتنے حیرت انگیز طور پر

---

[1] آسمانوں پر عرش، کرسی، لوح اور قلم اللہ تعالیٰ کی مقدس نشانیاں ہیں۔

بجا ہو گئے کہ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایک گونجدار آواز نے جو خوف پیدا کرنے سے زیادہ سکون پرور تھی کہا :۔

" اے محمدؐ ۔ اپنے خالق کی خدمت میں تسلیمات بجالاؤ "۔

" حضرت محمدؐ کا خوف جاتا رہا ۔ آپؐ نے بڑا اطمینان محسوس کیا اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے اس دین کے متعلق بڑے پرسکون انداز میں بات چیت کرنے کے قابل پایا جس کی آپ عربوں میں تبلیغ کرنے والے تھے ۔ اللہ تعالیٰ کے آخری احکام یہ تھے کہ مسلمانوں کو دن میں پچاس نمازیں پڑھنا چاہئیں ان وداعی احکام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حضوری سے رخصت ملی اور آپؐ کو بڑی تیزی سے ساتویں آسمان پر پہنچا دیا گیا جہاں حضرت جبرئیل آپؐ کا انتظار کر رہے تھے "۔

" حضرت جبرئیل نے آپؐ سے کچھ نہ پوچھا لیکن جب آپؐ چھٹے آسمان سے گزر رہے تھے تو حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا حال دریافت کیا ۔ جب حضرت محمدؐ نے نمازوں کا ذکر کیا تو حضرت موسیٰؑ نے اپنا سر نفی میں ہلایا اور کہا کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے ہر گھنٹے میں دو مرتبہ سے زیادہ نماز پڑھنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپؐ کا مذہب قائم رہے تو اس میں تبدیلی کرائیں ۔ چنانچہ حضرت محمدؐ جو اپنے پیشرو انبیاء کا بہت احترام کرتے تھے تیزی سے واپس اللہ تعالیٰ کے حضور میں پہنچے ۔ اللہ تعالیٰ نے نمازوں کی تعداد کم کر کے چالیس کر دی ۔ حضرت موسیٰؑ نے اس پر بھی بے اطمینانی کا اظہار کیا ۔ حضرت محمدؐ ایک مرتبہ پھر اللہ تعالیٰ کی خدمت میں واپس گئے ۔ اللہ تعالیٰ سے کافی دیر بات چیت اور حضرت موسیٰؑ سے مشوروں کے بعد مسلمانوں کے لئے نمازوں کی تعداد گھٹا کر پانچ وقت روزانہ کر دی گئی ۔ اس پر بھی حضرت موسیٰؑ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ اگر آپؐ اپنی امت سے ہفتہ کے ہر دن اتنی دفعہ بھی نماز پڑھوانے

میں کامیاب ہو گئے تو وہ آپ کو اپنی توقع سے بہت زیادہ کامیاب سمجھیں گے۔ حضرت محمدؐ نے حضرت موسیٰؑ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ بات آپ مجھ پر چھوڑ دیں......"

"اب آپؐ نے زینہ کے ذریعہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان پر نیچے اترنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ آپؐ زمین پر تشریف لے آئے۔ جہاں آپ کو براق مل گئی، حضرت جبرئیل آپؐ کو نظر نہ آئے۔ چنانچہ آپؐ براق کی سفید پشت پر سوار ہوئے اور چند لمحوں میں آپؐ مکے میں اپنے بستر پر تھے۔"

مدنی یہاں پہنچ کر رک گیا۔ غالباً وہ میری موجودگی کو بھول گیا تھا۔ تسبیح پڑھتے ہوئے اس نے صحرا میں آسمان کی طرف دیکھا۔

کچھ توقف کے بعد میں نے دریافت کیا "حضرت محمدؐ کتنی دیر تک باہر رہے "

مدنی نے بلا تامل جواب دیا "بہت تھوڑی دیر" زیادہ سے زیادہ چند گھنٹے"

کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں نے پوچھا "کیا تم نے کبھی دانتے[1] کو پڑھا ہے "

مدنی نے نفی میں سر ہلایا اور کہا " نہیں تو۔ وہ کیا ہے "

میں نے اس کی وضاحت مناسب نہ سمجھی لیکن اس رات کے بعد سے جب مدنی نے صحرا میں مجھے سفر معراج کا یہ حال سنایا۔ میں نے اپنے دل کو یہ کہتے سنا ہے کہ غالباً دانتے DANTE عرب کی اس قدیم داستان سے ہی متاثر ہوا ہوگا۔ جنت کے ان دونوں احوال میں بعض باتیں ملتی جلتی ہیں۔

اس خیال سے کہ مبادا داستان گوئی کا سارا ماحول پاش پاش ہو جائے۔ میں نے مدنی سے یہ سوال نہیں کیا کہ کیا اسے یقین ہے کہ حضرت محمدؐ نے یہ سفر جسمانی طور پر کیا یا عالم رویا

---

[1] دانتے اٹلی کا مشہور شاعر DIVINE COMEDY اس کی لکھی ہوئی طویل نظم ہے جس میں اس نے جنت کا حال لکھا ہے۔

ہیں۔ اور اس خیال سے کہ مدنی خفا نہ ہو جائے یہ دوسرا سوال بھی نہ کیا کہ آیا یہ سب کچھ حضرت محمدؐ کی اپنے ذہن کی پیداوار تو نہیں تھی؟ بایں ہمہ یہ سوالات ہیں جو اسلام کے متعلق لکھنے والوں کے لئے پریشانی کا موجب بنتے ہیں۔

اور میرا یہ آخری سوال جیسا کہ ظاہر ہے فضول ہی ہوتا کیونکہ حضرت محمدؐ نے خود کہیں نہیں لکھوایا کہ آپؐ نے یہ رات کا سفر کبھی کیا۔ مجھے اس وقت اس بات کا علم نہ تھا اور سمجھتا تھا کہ مدنی اپنی عادت کے مطابق الہامی کتاب (قرآن) کی آیات کی مبالغہ آمیز تصویر کشی کر رہا تھا لیکن یہاں اس کی عادت کے خلاف ایسا نہ تھا۔ وہ حقیقت میں حدیثوں کے حوالے سے بیان کر رہا تھا جن پر مسلمان قرآن جیسا ہی اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس "آسمانی سفر" کے متعلق جو کچھ ہمیں حضرت محمدؐ سے پہنچا ہے وہ صرف قرآن کی ایک سورۃ[1] ہے۔ جس کا عنوان "آسمانی سفر" ہے۔ لیکن اس سورۃ میں بھی کوئی ایسی باتیں نہیں جن کا مدنی اور دوسرے عرب لوگوں کے اعتقادات سے دور کا بھی واسطہ ہو۔ اس کی پہلی آیت میں صرف اتنا اشارہ ہے کہ اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا	پاک ذات ہے وہ اللہ جو لے گیا اپنے بندے کو
مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا	راتوں رات مسجد حرام (کعبہ) سے مسجد اقصیٰ
الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا	(بیت المقدس) جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں
اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ	کہ دکھائیں اس کو اپنی قدرت کے کچھ نمونے۔
	بیشک وہ سنتا دیکھتا ہے۔

یہ سارا احوال غالباً اسی قسم کی داستان ہے جو آپؐ کے ان معجزات کے متعلق مشہور ہیں جن کے وقوع پذیر ہونے کا آپؐ نے کبھی دعویٰ نہیں کیا لیکن اگر حضرت محمدؐ نے اس کو

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل۔ پندرھواں پارہ۔ جس کی شروع کی آئتیں اوپر درج کر دی گئی ہیں۔ معراج کے متعلق مزید احوال سورۃ والنجم اور دوسری سورتوں میں ملتا ہے غالباً یہ بات مصنف کے علم میں نہیں تھی۔ باقی حالات احادیث میں درج ہیں

قرآن میں شامل کرکے اس کی تصدیق کردی تب بھی غیر مسلم مبصروں کو بلا سوچے سمجھے اس واقعہ کی صحت پر شک نہیں کرنا چاہیئے۔

(اللہ کی ایک اور برگزیدہ شخصیت، عالیجاؑ کا آتشیں رتھ میں بیٹھ کر آسمان پر جانے کے واقعہ کا جو انجیل میں درج ہے، مذاق نہیں اڑایا جاتا۔ قیامت اور حضرت عیسیٰؑ کے آسمانوں پر جانے کو عیسائیوں کی اکثریت صحیح تسلیم کرتی ہے برگزیدہ سینٹ جان کے الہامات کو ایک مخبوط الحواس اور مرگی زدہ شخص کی بکواس نہیں کہا جاتا حالانکہ ان الہامات کی عبارت میں ایسے ٹکڑے ہیں جو نامعلوم طور پر مدنی کے بیان کردہ احوال کے بعض حصوں سے بہت ملتے جلتے ہیں اور ان سے کم عجیب اور خیالی نہیں ہیں۔

انجیل کی آخری کتاب کے کسی باب کو لے لیجئے ہمیں ایسے متعدد پیرے مل جائیں گے جو معراج کے سفر کے حالات سے کہیں بھی منطبق ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

چوتھا باب

"اور دیکھو۔ بہشت میں ایک تخت رکھا تھا اور کوئی اس پر بیٹھا تھا اور جو اس پر بیٹھا تھا وہ جیسپر اور سارڈین جیسے قیمتی پتھروں کا تراشیدہ مجسمہ معلوم ہوتا تھا۔ ایک قوس قزح تخت کا ہالہ کئے ہوئے تھی جو زمرّد کی بنی معلوم ہوتی تھی۔ تخت میں سے بجلیوں کی چمک، گرج اور آوازیں نکل رہی تھیں اور تخت کے سامنے آگ کی سات شمعیں جل رہی تھیں جو خداوند کی سات روحیں تھیں اور تخت کے درمیان اور تخت کے گرد چار جانور کھڑے تھے۔ جن کی بہت سی آنکھیں تھیں۔ سامنے بھی اور پشت کی طرف بھی۔"

تیرھواں باب

"اور میں اس سمندر کے ریت پر کھڑا تھا۔ میں نے ایک جانور کو سمندر

ؑ انجیل میں مذکور بنی اسرائیل کے ایک نبی۔

میں سے ابھرتے دیکھا جس کے سات سر اور دس سینگ تھے اور ہر سینگ پر دس شاخیں یا سنگوٹیاں تھیں اور اس کی پیشانی پر گستاخ ، بے ادب لکھا ہوا تھا اور جو جانور میں نے دیکھا وہ ایک چیتے کی طرح کا تھا اور اس کے پاؤں ریچھ جیسے اور اس کا منہ شیر جیسا اور آتشیں اژدھے نے اُسے اپنی طاقت ، اپنی گدی اور بڑا اختیار دیا تھا۔

اکیسواں باب

" اس شہر کی فصیل جیسپر (قیمتی پتھر) کی بنی ہوئی تھیں اور شہر خالص سونے کا تھا اور شیشے کی طرح شفاف اور شہر کی فصیل کی بنیادوں میں ہر قسم کے قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے ..... شہر کو روشنی کے لئے نہ سورج کی ضرورت تھی اور نہ چاند کی کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے نور سے منور تھا۔"

بائیسواں باب

" اور اس نے مجھے خالص آبِ حیات کا دریا دکھایا ، صاف اور بلّور کی طرح چمکتا جو خداوند اور اس کے میمنے (حضرت عیسیٰؑ) کے تخت سے نکل کر بہہ رہا تھا ان کے درمیان میں اور دریا کے دونوں طرف شجر حیات لگے ہوئے تھے جن میں بارہ قسم کے پھل تھے اور ہر مہینے پھل دیتے تھے اور اس درخت کے پتوں سے لوگوں کو شفا ہوتی تھی۔"

اور ان میں سے کوئی بھی خیالی کہانی نہیں - یہ سب کچھ انجیل میں موجود ہے اور اسی طرح کے ٹکڑے سینٹ متی[1] ST. MATHEW کی انجیل کے اس باب میں ہے جہاں انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی حضرت موسیٰؑ اور حضرت الیاسؑ سے گفتگو بیان کی ہے اور جہاں حضرت موسیٰؑ اور اللہ تعالیٰ کی کوہ سینا پر ملاقات دکھائی ہے - خروج EXODUS

---

[1] سینٹ متی MATHEW عیسائیوں کے چار بڑے مذہبی بزرگوں میں سے ایک تھے جنہوں نے مختلف اوقات میں انجیل لکھیں - چنانچہ متی کی انجیل مشہور ہے -

سفر معراج سے ایک بہت ملتا جلتا واقعہ سینٹ آئرینئس ST. IRENIUS نے بیان کیا ہے جو دوسری صدی عیسوی میں فرانس کے ایک شہر LYONS لیونز) کے بشپ تھے۔ ان کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے مندرجہ ذیل اعلان کیا جسے سینٹ جان نے لکھ لیا تھا:۔

"ایسے دن آئیں گے جب ایسے انگوروں کے درخت ہوں گے جن کی دس ہزار شاخیں ہوں گی اور ان میں سے ہر بڑی شاخ میں دس ہزار چھوٹی شاخیں ہوں گی اور ہر چھوٹی شاخ پر دس ہزار ٹہنیاں ہوں گی اور ان میں سے ہر ٹہنی یا ڈالی پر انگور کے دس ہزار خوشے ہوں گے اور ان میں سے ہر خوشے میں دس ہزار انگور ہوں گے اور ان میں ہر انگور سے دو سو چھہتر گیلن شراب نکلے گی۔"

میں جب عربوں کے درمیان رہ رہا تھا اس وقت مجھے مندرجہ بالا اقتباس کا علم نہیں تھا ورنہ میں مدنی کو بتاتا کہ عیسائی بھی آسمانی ضرب کے سوالات قائم کرنے کے اتنے ہی ماہر ہیں جتنے کہ مسلمان۔

بہرحال ان کہانیوں، روائتوں اور آسمانی صحیفوں کے اقتباسات کی بنیاد کچھ ہی کیوں نہ ہو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اُن حصوں کو نظر انداز کر دیں یا ایسی باتوں کو درخوراعتنا نہ سمجھیں جنہیں ہم ذاتی طور پر صحیح خیال نہ کرتے ہوں۔ خواہ ہم ایمان لانے والوں میں سے ہوں یا نہ لانے والوں میں سے لیکن یہ ثابت کرنے کی کوشش کہ حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ کبھی موجود نہ تھے یا (نعوذ باللہ) حضرت محمدؐ نبوت کے جھوٹے دعویدار تھے۔ ہمیں کسی منزل تک نہیں پہنچاتی۔ مدنی جیسے لوگ جو اپنے بیان کردہ سفر معراج پر مکمل اعتقاد رکھتے ہیں تشکی اور متذبذب لوگوں سے کہیں زیادہ مطمئن ہیں۔ اس موضوع پر کسی کے ذاتی نظریات یا اعتقادات سے قطع نظر اس بات سے کہ حضرت محمدؐ نے کھربوں زبانیں رکھنے والے فرشتے کو واقعی طور پر دیکھا یا نہیں دیکھا آپؐ کی زندگی اور آپؐ کے مشن پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑتا۔

آٹھواں باب

ہجرت

۶۲۰ تا ۶۲۲ عیسوی

حضرت محمدؐ کے آسمانی سفر (معراج) پر تشریف لے جانے، وہاں پر انبیا کی طرف سے آپؐ کا والہانہ استقبال اور اللہ تعالیٰ سے مقربانہ انداز میں ہم کلامی سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اب آپؐ کو اپنے مشن کو کامیاب بنانے اور قریش کے خطرہ سے بے خوف ہونے کے لئے کافی حمایت اور استحکام حاصل ہو گیا تھا۔

حالانکہ حضرت موسیٰؑ کی بددعا سے مصر میں طاعون پھیل گئی تھی اور انہوں نے ایک سورج گرہن کی پیشینگوئی بھی کی تھی۔ علاوہ ازیں انہوں نے زمین پر عصا مار کر بیابان میں پانی کے چشمے بھی جاری کر دیئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کا جلوہ زیادہ سے زیادہ آگ کے ایک بلند ستون کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے بنی اسرائیل کی بحیرۂ قلزم میں سے راہ کی نشاندہی کی۔

حضرت عیسیٰؑ نے مُردوں کو زندہ کر دیا تھا، بقول عیسائیوں کے[1] پانی کو شراب میں تبدیل کر دیا اور خوراک کی بہت تھوڑی مقدار سے ایک جم غفیر کو کھلا کر سیر کر دیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کا جلوہ اُردن میں آسمان پر صرف ایک فاختہ کی شکل میں یا آپؑ کو سولی پر چڑھاتے وقت چٹانوں کے تڑخنے کی آوازوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔

---

[1] یہ معجزات ناصریہ NAZARETH میں وقوع پذیر ہوئے (نقشہ نمبر ۴)

لیکن حضرت محمدؐ کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے اتنا بھی نہ کیا۔ اُس نے اپنے رسول کو عربوں میں اپنے مشن کی تبلیغ کے لئے تن تنہا چھوڑ دیا اور یہ کہ آپؐ بغیر کسی مافوق الفطرت امداد کے کامیاب ہو گئے آپؐ کی ذاتی صلاحیتوں کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

جس وقت سے آپؐ کو پیغام الٰہی کو مکہؔ کے لوگوں میں عام کرنے اور اُس کی علانیہ تبلیغ کا حکم ملا تھا دس سال گزر چکے تھے۔ ان دس سالوں میں آپؐ اپنا وہ سب کچھ کھو چکے تھے جو آپؐ نے پچھلے پچیس سالوں میں حاصل کیا تھا اور اب ہر لحظہ اس خیال میں اضافہ ہو رہا تھا کہ بظاہر یا تو خود آپؐ میں یا جو کچھ آپؐ کے ذہن میں تھا اس میں کوئی خامی تھی۔

پھر ایک روز ایک ایسا واقعہ ہوا جو اپنی اہمیت میں ایسا ہی تھا جیسے شاہ سال SAUL OF TARSUS[1] کا تبدیل مذہب یا انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم[2] کی روما کے پوپ سے قطع تعلقی اور بغاوت۔

صدیوں سے عرب کے یہودی حضرت مسیح کی آمد کے منتظر تھے۔ خصوصاً یثرب میں اس کا چرچا کچھ زیادہ ہی تھا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ یثرب مدینہ یا زیادہ صحیح طور پر "مدینۃ النبی" کا پرانا نام ہے۔ کسی مغالطے سے بچنے کے لئے میں اسے مدینہ ہی کہوں گا۔

یہ مدینہ تین یہودی قبیلوں کا وطن تھا یعنی بنی نضیر۔ بنی قینقاع اور بنی قریظہ، حالانکہ مقامی طور پر انہیں نسبتاً کافی اہمیت حاصل تھی لیکن وہ عرب صحرا نشینوں کے دو بڑے قبیلوں بنی اوس اور بنی خزرج کی حکمرانی میں تھے۔ یہ دونوں قبیلے شہری تھے اور مدینہ کے نخلستانوں میں آباد تھے۔

---

[1] شاہ سال SAL OF TARSUS بنی اسرائیل کا پہلا بادشاہ (۱۰۲۰ تا ۱۰۰۰ ق۔م) اس نے بنی اسرائیل کو متحد کیا اور حضرت داؤد علیہ السلام کی مدد سے جالوت OLIATH کو مارا اور فلسطینیوں کو شکست دی۔ قرآن مجید میں اس بادشاہ کا نام طالوت آیا ہے۔ کافی عرصہ حضرت داؤد کے خلاف رہا۔ اس بادشاہ کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام بادشاہ بنے اور بیت المقدس کو پایہ تخت بنایا۔ شاہ سال آخر میں اس وقت کے نبی سیموئیل کا عقیدتمند ہو گیا تھا۔ (عہد نامہ قدیم۔ انجیل) (چیمبرز انسائیکلوپیڈیا)

[2] ہنری ہشتم۔ شاہ انگلستان نے ۱۵۳۴ء میں پاپائے روم سے بغاوت کی اور خود چرچ آف انگلینڈ کا سربراہ بن گیا۔

یہودیوں کا یہ اعتقاد کہ ایک نجات دہندہ آنے والا ہے۔ ان عربوں کو بھی معلوم تھا۔ اور جب ایک دن بنی خزرج کے کچھ لوگوں نے حضرت محمدؐ کو مکہ کے نزدیک عکاظ کے میلے میں تبلیغ کرتے سنا تو آپؐ کے الفاظ نے ان پر ایک جانا پہچانا سا اثر کیا۔ وہ بلا تامل کہہ اٹھے "یقینی طور پر یہی وہ نبی معلوم ہوتے ہیں جن کی آمد سے یہودی ہمیں ڈراتے رہتے ہیں۔" اور جب انہیں اپنی اس دریافت کی اہمیت کا احساس ہوا تو انہوں نے فوری طور پر فیصلہ کر لیا "ہمیں جلدی کرنی چاہئے اور ان کے ساتھ شامل ہو جانا چاہئے۔"

ان لوگوں نے انتظار کیا اور جب سب چلے گئے اور آس پاس کوئی نہ رہا تو حضرت محمدؐ سے بات چیت کی۔ جو کچھ آپؐ نے تقریر میں کہا تھا اس میں دلچسپی ظاہر کی اور مزید تفصیلات دریافت کیں۔ حضرت محمدؐ یہ معلوم کر کے خوش ہوئے کہ کچھ لوگ تو ایسے ملے جو آپؐ کی باتیں سننے کو تیار ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے صحرا میں ملاقات کے لئے ایک ایسی جگہ منتخب کی جہاں مداخلت کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ وہاں وہ رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ آپؐ کے خلوص اور صاف اور واضح دلائل نے مدینہ والوں کو بہت متاثر کیا اور انہوں نے اطمینان کا اظہار بھی کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ اپنے شہر کے دوسرے لوگوں کے متعلق اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتے جب تک وہ ان سے مل کر ان باتوں پر تبادلہ خیال نہ کر لیں جو کچھ انہوں نے ابھی ابھی آپؐ سے سنی ہیں۔

چنانچہ مدینے پہنچتے ہی انہوں نے ایسا ہی کیا اور ایک ایسے عرب رسول کے آنے کی خبر دی جو یہودی نہیں تھا۔ بلکہ خود ان میں سے ایک تھا۔ جو ایک واحد اور سچے خدا کی تبلیغ کرتا تھا اور جو (آنے والے ایک نجات دہندہ کے متعلق) ایک صدی پرانے قضیے اور اختلافات کو ختم کر دے گا۔

اس خبر نے تمام شہر میں اچھی خاصی سنسنی پھیلا دی۔ چنانچہ آئندہ سال پہلے سے زیادہ لوگ حضرت محمدؐ کے پیغام کو سننے کے لئے مکہ گئے۔ ایک مرتبہ پھر آپؐ سے اپنی تعلیمات کو بیان کرنے کی درخواست کی گئی اور اس مرتبہ مدینے والے اور زیادہ متاثر ہوئے۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ حضرت محمدؐ پر اور آپ کی رسالت پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں اور حضرت محمدؐ کے یہ بتانے پر بھی کہ ان کے ایسے اعلان کے نتیجے میں کیسی کیسی تکالیف اور مصیبتیں ان کے راستے

میں کھڑی ہو جائیں گی وہ اپنے یقین پر مضبوطی سے قائم رہے۔ چنانچہ چٹانی صحرا کے نیم تاریک اندھیرے میں ان لوگوں نے بڑے خلوص اور عقیدت سے آپؐ کی اطاعت و فرمانبرداری کا حلف اٹھایا اور مندرجہ ذیل الفاظ کے دہرانے نے ان کی بیعت کی تکمیل کر دی۔

لہ "رسول اللہ جو اچھی بات کہیں گے ہم اس کی اطاعت کریں گے اور ہر رنج و راحت میں ان کا ساتھ دیں گے۔"

پھر بیعت کی تکمیل کے لئے ہر شخص نے باری باری حضرت محمدؐ کے ہاتھ کو چھوا اور مدینہ واپس چلا گیا۔ ان کے ہمراہ (ان کی درخواست پر) حضرت محمدؐ کے ایک پیروکار صحابی مُصعب ابن عمیرؓ بھی گئے تاکہ مدینہ میں اسلام کی ترویج کریں اور اس کی تعلیمات ان لوگوں کو سمجھائیں۔

حالانکہ حضرت محمدؐ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی اور ہدایات نازل ہوتی تھیں لیکن ناگہانی ضرورت اور ہنگامی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے آپؐ ہمیشہ عقل سلیم سے کام لیتے تھے۔ آپؐ اپنے لوگوں کے جوش اور جذبے کو خوب جانتے تھے لیکن آپؐ نہیں چاہتے تھے کہ درجن دو درجن جوشیلے مسلمانوں کو لے کر از سر نو مکہ کی لڑائی لڑیں۔ اس سے پہلے کہ مزید کوئی قدم اٹھایا جائے، آپؐ کے لئے یہ اطمینان کر لینا ضروری تھا کہ مدینہ والوں کی اکثریت آپؐ کو اور اسلام کو قبول کرنے کو تیار ہو جائے۔

یہ انتظار کی مدت غالباً حضرت محمدؐ کی آزمائشوں میں سب سے زیادہ سخت اور صبر آزما تھی۔ مدینہ کے بنو خزرج ملک عرب کی اعلیٰ ترین نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی طاقت اور دبدبہ تمام عرب میں مسلّم تھا۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو اس کا مطلب یہ تھا کہ حضرت محمدؐ

لہ یہ بیعت عقبہ کہلاتی ہے۔ پورے الفاظ یہ ہیں:۔

"ہم عہد کرتے ہیں کہ رنج و راحت اور سختی و نرمی میں آپ کے احکام کی تعمیل کریں گے اور جہاں کہیں بھی ہوں گے لوگوں کی ملامت کی پرواہ کئے بغیر اعلان حق کریں گے۔" "حیاۃ محمدؐ"

"شرک۔ چوری۔ زنا۔ قتل اولاد اور افترا کے مرتکب نہ ہوں گے اور رسول اللہ ﷺ جو اچھی بات کہیں گے اس سے سرتابی نہ کریں گے۔" (سیرۃ النبی)

کو ایسی پشت پناہی مل جائے گی جو آپؐ کے مشن کی کامیابی میں ممدومعاون ثابت ہو گی لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو تن تنہا آپؐ کے لئے اس مہم کا جاری رکھنا ممکن نہ رہ سکے گا۔ مکہ میں حالات آپؐ کے لئے بہت مایوس کن ہو گئے تھے۔ روز بروز آپؐ کے خود کے لئے اور آپؐ کے ساتھیوں کی جانوں کے لئے صورت حال خراب اور مسلسل تشویشناک ہوتی جا رہی تھی۔ حقیقتاً ماحول اتنا پرخطر ہو گیا تھا کہ آپؐ نے مسلمانوں کو گروہ در گروہ مدینے بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے کہ انہیں مسلمانوں جیسا ہمدردی کا سلوک تو نہ مل سکے لیکن وہ کم از کم مذہب کی بنا پر مارے تو نہیں جائیں گے۔ جوں جوں آپؐ کے ساتھیوں کے گروہ یکے بعد دیگرے نئی پناہ گاہوں[1] کی طرف نکلتے جا رہے تھے آپؐ خود کو اتنا ہی تنہا اور بے یار و مددگار سمجھتے جا رہے ہیں۔

جلدی ہی آپؐ کے ساتھ سوائے آپؐ کے اپنے قریب ترین گھر والوں مثلاً حضرت علی کرم حضرت عائشہؓ اور حضرت سوداؓ، حضرت ابوبکرؓ ان کی بیوی اُم رمان ان کی بڑی لڑکی اسماءؓ اور لڑکے عبداللہؓ کے اور کوئی نہ رہا۔ البتہ زیدؓ[2] بھی ابھی وہاں ہی تھے جو بہت خبردار، چوکنے اور صاحب تدبیر تھے۔ وہ خطرے کے سر پر آجانے پر بھی اپنے حواس مجتمع رکھنے پر قادر تھے۔ ہر فرد اپنی جگہ کڑی کمان کی طرح چوکس اور مستعد تھا۔ ادھر قریش بھی مسلمانوں سے کسی طرح کم مستعد اور چوکنے نہیں تھے۔

سال بغیر کسی بڑے ہنگامے یا غیر معمولی واقعہ کے گزر گیا۔ حج کا مہینہ شروع ہو گیا۔ تمام عرب سے ہر طرف کے لوگ مکہ میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ان میں مصعب ابن عمیرؓ بھی تھے، جو مدینہ والوں کو اسلام کی تعلیم دینے کی غرض سے بھیجے گئے تھے۔ ان کے ساتھ ستر مدنی مسلمانوں کی ایک جماعت بھی تھی۔ رات ہونے پر صحرا میں حضرت محمدؐ سے ملاقات کا ایک جگہ اہتمام کیا گیا۔

اس مجلس میں حضرت محمدؐ، حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ اپنے چچا العباسؓ کو بھی ساتھ لائے۔ العباسؓ جنہیں تاریخ اسلام میں ایک اہم کردار ادا کرنا تھا ایک عجیب شخصیت کے مالک تھے۔

---

[1] حبشہ اور مدینہ

[2] زید بن حارث۔ آنحضور کے آزاد کردہ غلام جنہیں بعد میں آپ نے بیٹا بنا لیا تھا اور ایک وفادار اور جان نثار دوست۔

وہ حضرت ابوطالب اور ابولہب سے بہت چھوٹے تھے اور اگرچہ ان کی طرح اپنے بھتیجے کا دین قبول نہیں کیا تھا لیکن ان کو حضرت محمدؐ سے بہت زیادہ دلی لگاؤ تھا۔

جب یہ ان لوگوں کے پاس پہنچے جو بغیر چاند کے صحرا میں ایک مدہم سی سفیدی نظر آرہے تھے، تو عرب کے دستور کے مطابق ان میں بڑی خوش اخلاقی سے سلام دعا ہوئی جو عربوں میں کسی نازک سے نازک گھڑی میں بھی کم نہیں ہوتی۔ پھر العباسؓ یوں مخاطب ہوئے:۔

"اے بنی خزرج کے لوگو میرا عزیز آپ کے پاس پناہ لینا چاہتا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس معاملے پر اچھی طرح غور کرلیں اور نتائج کو بھی سامنے رکھیں۔"

مدینہ کے وفد کے سربراہ البراءؓ نے جواب دیا "ہم نے آپ کی باتیں سن لی ہیں۔ ہمارا عزم اور فیصلہ غیر متزلزل ہے۔ ہماری جانیں رسول خدا کے لئے حاضر ہیں۔ اب وہ اپنا فیصلہ سنائیں"

ایک مرتبہ حضرت محمدؐ نے پھر وہی باتیں دہرائیں جو مدینہ والوں سے پہلی دو ملاقاتوں میں کہہ چکے تھے۔ آپؐ سے بہت سے سوالات کئے گئے۔ جن کا آپؐ نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی آپؐ نے ایک مرتبہ پھر ان تمام ذمہ داریوں سے خبردار کر دیا جو اسلام قبول کر لینے سے ایک مسلمان پر عائد ہوتی ہیں۔ آپؐ کا انداز بڑا پُر وقار تھا۔

حقیقت میں آپؐ کا سارا مشن آپؐ کی اپنی جان، آپؐ کے اہل و عیال اور آپؐ کے قریب ترین دوستوں کی زندگیاں مدینہ والوں کی ایک ہاں اور مثبت ردعمل پر منحصر تھیں۔

اگر ان کو اپنا طرفدار بنانے کے خیال سے آپؐ ان کے سامنے اپنے دین کے صرف نہایت روشن اور امید افزا پہلو ہی بیان کرتے تو آپؐ کو حق بجانب کہا جا سکتا تھا لیکن آپؐ سچ پر قائم رہے اور ہر بات بلاکم و کاست بتا دی۔ آپؐ کے خلوص اور راست بازی نے آپؐ کے مصائب میں اضافہ ہی کیا تھا لیکن ان سے گھبرا کر آپؐ اس کو چھوڑنے کو ہرگز تیار نہ تھے۔ زندگی ہو یا موت آپؐ آخر دم تک اپنے اصولوں پر قائم رہنے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔

بہرحال مدینہ والوں نے اب آپؐ کے متعلق ایک واضح رائے قائم کر لی تھی اس لئے وہ آپؐ کی تنبیہوں سے ذرا خائف نہ ہوئے۔ وہ تو حضرت محمدؐ سے صرف اتنی یقین دہانی چاہتے

تھے کہ جب حالات سازگار ہو جائیں تو آپؐ انہیں چھوڑ نہ جائیں۔ حضرت محمدؐ نے سر کی جنبش سے اس کا یقین دلایا اور کہا "ہرگز نہیں۔ آپ کا خون میرا خون ہے۔ میں آپ کا ہوں[1] اور آپ میرے ہیں"۔

البراء نے کہا "تو پھر ہاتھ بڑھائیے۔ (تاکہ بیعت کی جائے)"

حضرت محمدؐ نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ستر افراد میں سے ہر ایک نے باری باری آپؐ کا ہاتھ چھوا اور حضرت محمدؐ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حلف اٹھایا۔ یہ ایک ڈرامائی اور بڑی اہمیت کا لمحہ تھا لیکن غالباً صحرا کی تند ہواؤں میں کھڑے اور لمبے لبادوں میں ملبوس ان افراد میں سے کوئی بھی اس وقت اس کی اہمیت کو نہ سمجھ سکا۔ اگر اہل مدینہ اسلام قبول نہ کر لیتے اور مکہ کے مہاجروں کو پناہ نہ دیتے تو شاید قرآن کا دین اپنی طفولیت میں ہی ختم ہو گیا ہوتا۔

اس سے پہلے کہ مصعبؓ اور ان کی جماعت مدینہ کو لوٹیں یہ طے پا گیا کہ اب حضرت محمدؐ جونہی اپنی تیاری کر لیں انہیں جلد سے جلد مدینہ آ جانا چاہیئے۔ اب مصائب کے بادل چھٹتے نظر آ رہے تھے۔ اور منزل قریب دکھائی دینے لگی تھی لیکن درحقیقت ایسا نہ تھا۔ حضرت محمدؐ تھوڑی دیر کے لئے قریش کو بھول گئے تھے۔

کسی نہ کسی طرح مدینہ والوں سے صحرا کی ان خفیہ ملاقاتوں کی خبر مکہ والوں سے چھپی نہ رہ سکی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مکہ کے مسلمانوں کی ساری آبادی غائب ہو چکی ہے۔ پوری کی پوری گلیاں سنسان پڑی ہیں۔ دروازے اور کھڑکیاں اندر سے تختوں سے جڑ دیئے گئے ہیں۔ صحرا کی اڑتی ہوئی ریت نے گلی کے پتھروں کو ڈھانپنا شروع کر دیا ہے۔ اور ریت اب دہلیزوں کے سامنے جمع ہو رہی ہے۔ انہی دنوں اس بات نے اور جلتی پر تیل کا کام کیا کہ جب حضرت عمرؓ زرہ بکتر پہنے، سر پر خود رکھے ہاتھ میں کمان لئے اور ایک بہت بڑی تلوار پہلو سے لٹکائے کعبہ میں پہنچے۔ بغیر کسی تمہید کے انہوں نے اپنے سابق دوستوں کو بتایا

---

[1] "میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے۔ جس سے تم لڑو گے میں بھی اس سے لڑوں گا اور جس سے تم صلح کرو گے میں صلح کروں گا" تاریخ طبری

○ "نہیں۔ تمہارا خون میرا خون ہے تم میرے اور میں تمہارا ہوں" (سیرۃ النبی)

کہ وہ بھی جا رہے ہیں اور یہ کہ وہ چھپ کر نہیں بھاگ رہے تھے۔ بلکہ وہ ایک ایسی جگہ جا رہے تھے جہاں وہ قریش سے ان کی زیادتیوں کا بدلہ لینے کے لئے مسلمانوں کو ایک جماعت کی شکل میں منظم کر سکیں اور چلتے ہوئے انہوں نے دھمکی بھی دی کہ اگر کسی کو اپنی جان عزیز نہیں اور اپنی ماں سے اپنا ماتم کرانا چاہتا ہے تو مکہ سے باہر وادی میں مقابلہ پر آجائے۔ کسی نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی اور عمر فاروق رضؓ نفرت سے شانے جھٹکاتے شام کے اندھیرے میں روانہ ہو گئے۔

اس تہدید آمیز اعلان نے ایک اور حقیقت کا انکشاف بھی کیا یعنی یہ کہ جتنا ان کا خیال تھا اس سے کہیں بہت زیادہ لوگ حضرت محمدؐ کے ساتھ تھے۔ صورت حال بہت زیادہ پریشان کن ہو گئی تھی اور یہ کہ اگر اس کو بڑھنے دیا گیا تو خود قریش کے لئے خطرے کا باعث بن سکتی تھی۔ مدینہ میں بیٹھی دشمن کی ایک مضبوط جماعت ان کے شام جانے والے تجارتی کاروانوں کی شاہراہوں کو منقطع کر دے گی اور یہ بھی کہ دشمن کو ان کی تجارت کو متاثر کرنے اور ان کی ضروریات کو منقطع کرنے کے لئے کسی بہت بڑی جمعیت درکار نہ ہو گی۔

ابو سفیان اس وقت مکہ کا حاکم ہی نہیں بلکہ سپہ سالار بھی تھا۔ عہدے کی اس ترقی نے حضرت محمدؐ سے اس کی نفرت میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ جب یہ پریشان کن خبریں اسے پہنچیں تو اس نے شہر کی کونسل کا ایک اجلاس[1] طلب کیا اور بغیر کسی تمہید کے اراکین مجلس کو مکہ کی اصل صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس نے کہا کہ حضرت محمدؐ کا قضیہ جس کو کچھ لوگ کسی وقت قابل توجہ نہیں گردانتے تھے اب ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا اور اگر فوری طور پر کوئی باضابطہ کارروائی نہ کی گئی تو کچھ بھی ہو سکتا ہے اور اب یہ بات ایک یا چند افراد کے بس کی نہیں رہی تھی۔ یہ ایک ایسا معاملہ بن چکا تھا جس سے شہر مکہ کا ہر فرد اور قبیلہ قریش کا ہر رکن متاثر تھا۔ اس نے مزید کہا کہ اس کے خیال میں حضرت محمدؐ کو فوراً اور اسی وقت ٹھکانے لگا دینا چاہیئے۔ جب کونسل کے بعض اعتدال پسند ارکان نے یہ تجویز پیش کی کہ حضرت محمدؐ کو جلاوطن کر دیا جائے یا قید کر لیا جائے تو ابو سفیان ہنسا اور علانیہ طور پر کہا کہ جب تک (نعوذ باللہ) یہ جنونی زندہ ہے خطرہ موجود رہے گا۔ کیونکہ جب

---

[1] ایسے تمام اجلاس دار الندوہ (اندرون حرم) میں ہوتے تھے۔

تک اس (نعوذ باللہ) جھوٹے نبی کے پیروکار یہ جانتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں تو وہ ان کو چھڑانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے اور خصوصاً اب جبکہ مدینہ کا ایک گروہ بھی ان کی حمایت کو موجود ہے۔

ابوجہل جو حضرت محمدؐ سے نفرت کرنے میں ابوسفیان سے کسی صورت سے کم نہ تھا بولا کہ اس معاملے سے نمٹنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ حضرت محمدؐ کو قتل کر دیا جائے۔ اس نے مزید کہا کہ اس کا تو شروع سے ہی یہ خیال تھا اور اگر پانچ سال پہلے ایسا ہو جاتا تو یہ جھگڑا وہیں ختم ہو گیا ہوتا۔ جب لوگوں نے اس کی یہ بات خاموشی سے سن لی تو اس کا حوصلہ بڑھا اور اس نے کہا کہ چونکہ اصل میں یہ ملک کے مفاد میں ایک قومی قتل ہے اس لئے اس کی تجویز ہے کہ مکہ کے ہر گھرانے سے ایک فرد کو ضرور اس میں شرکت کرنی چاہیئے۔ اگر ہر خاندان کی تلوار حضرت محمدؐ کے خون سے رنگی ہوگی تو قتل کے جھگڑے میں سب برابر کے شریک ہوں گے۔ کچھ توقف کے بعد اس نے لوگوں سے ان کی رائے دریافت کی۔ کسی نے بھی اختلاف نہ کیا۔ اس پر ابوجہل پھر بولا کہ یہ قتل آج رات ہی ہونا چاہیئے۔ اس سے سب نے مکمل طور پر اتفاق کیا۔

لیکن جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے وہاں ایک ایسا فرد بھی بیٹھا سن رہا تھا جسے وہاں نہیں ہونا چاہیئے تھا چنانچہ چند منٹ بعد ہی حضرت محمدؐ کو اپنی سزا کے فیصلے اور قتل کے منصوبے کا علم ہو گیا۔ آپؐ فوراً سمجھ گئے کہ اس مرتبہ لوگ واقعی کچھ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ اگر آپؐ خود کو اور اپنے تمام ساتھیوں کو جنہوں نے آپؐ کی خاطر اپنی جانیں خطرے میں ڈالی ہوئی ہیں قتل کرانا نہیں چاہتے تو آپؐ کو فوری طور پر کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔

آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کو بلا کر آنے والے خطرے سے آگاہ کیا۔ ان دونوں حضرات نے رائے دی کہ آپؐ کو فوراً مکہ سے چلا جانا چاہیئے۔ ابوبکرؓ بولے کہ وہ آپؐ کے ہمراہ جائیں گے۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ وہ مکہ میں ہی ٹھہریں گے کیونکہ قریش ان کو زیادہ ناپسندیدہ نہیں سمجھتے اور یہ کہ وہ مکہ میں ٹھہر کر عورتوں اور بچوں کی نگہداشت کر سکیں گے۔ بہرحال اب کوئی لمحہ ضائع کرنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ ابوسفیان، ابوجہل اور ان کے دوسرے ساتھی قاتلین کے قدموں کی آوازیں تنگ اور پیچ در پیچ گلیوں میں سنائی دینے لگی تھیں۔ چنانچہ

حضرت محمدؐ سے ان کی چادر لے کر حضرت علی کرمؑ نے جلدی سے آپؐ کو اور حضرت ابی بکرؓ کو دروازے سے باہر دھکیلا[1] اور پھر دروازہ بند کر کے اندر سے تالا لگا دیا اور یہ اطمینان کر کے کہ روشندان سلاخوں یا لکڑی سے اچھی طرح بند کر دیئے گئے ہیں، حضرت علی کرمؑ حضرت محمدؐ کے بستر پر دراز ہو گئے اور آپؐ کی چادر سے اپنے آپ کو اچھی طرح سے ڈھانپ لیا۔

قاتلین آپؐ کے مکان پر پہنچے لیکن یہ دیکھ کر کہ اندر داخل ہونے کے لئے طاقت استعمال کرنا پڑے گی کچھ تامل کیا۔ ان میں سے ایک شخص نے کسی نہ کسی طرح روشندان میں سے اندر جھانکا۔ اس نے دیکھا کہ چٹائی پر اس کی دانست میں حضرت محمدؐ اپنی جانی پہچانی چادر اوڑھے سو رہے تھے۔ یہ اس نے سب کو بتا دیا اور فیصلہ ٹھہرا کہ صبح تک انتظار کیا جائے اور جیسے ہی حضرت محمدؐ گھر سے باہر نکلیں انہیں قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ گرمی کی مختصر رات گزارنے کے لئے سب کے سب اپنی ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے وہاں ہی خاموشی سے دبک کر بیٹھ گئے۔

نسیم سحر نے صحرا میں سرگوشیاں شروع کر دی تھیں۔ مشرق سے صبح کا ارغوانی اجالا نمودار ہوتے ہی قاتلین حملے کے لئے مستعد ہو گئے اور جونہی سورج کی روپہلی کرنیں مکے کے مکانات کی سپاٹ چھتوں پر پڑیں حضرت محمدؐ کے مکان کا دروازہ کھلا۔ لوگ آپؐ پر ٹوٹ پڑنے کیلئے تیار کھڑے تھے لیکن معاً ان کے قدم وہیں رک گئے۔ انہوں نے حیران آنکھوں سے دیکھا کہ حضرت محمدؐ کی بجائے دروازے کی چوکھٹ پر فربہ اندام علی کرمؑ حضرت محمدؐ کی چادر بازو پر ڈالے کھڑے تھے۔

اس پہلی حیرانی کے بعد سوالات کا ایک ہنگامہ شروع ہو گیا۔ آخر ابو جہل نے دوسروں کو خاموش کر کے حضرت علی کرمؑ سے پوچھا کہ ان کے چچا زاد (اصل میں چچا زاد بھائی) کہاں ہیں۔ حضرت علی کرمؑ

---

[1] ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے "حیاۃ محمدؐ" میں لکھا ہے کہ قریش کے اس فیصلہ کے فوراً بعد آپؐ کو بذریعہ وحی ہجرت کی اجازت مل گئی اور آپؐ خود ہی حضرت ابو بکرؓ کے مکان پر پہنچ گئے اور وہاں سے رات کو دونوں غار ثور چلے گئے۔ بعض نے لکھا ہے کہ آپؐ اپنے مکان میں ہی تھے اور قاتلین آپؐ کو گھیرے ہوئے تھے لیکن مشیت ایزدی سے دشمنوں پر اونگھ طاری ہو گئی اور نصف شب کے بعد آپؐ ان کے درمیان سے ہو کر حضرت ابو بکرؓ صدیق کے مکان پر پہنچ گئے اور وہاں سے دونوں غار ثور روانہ ہو گئے۔

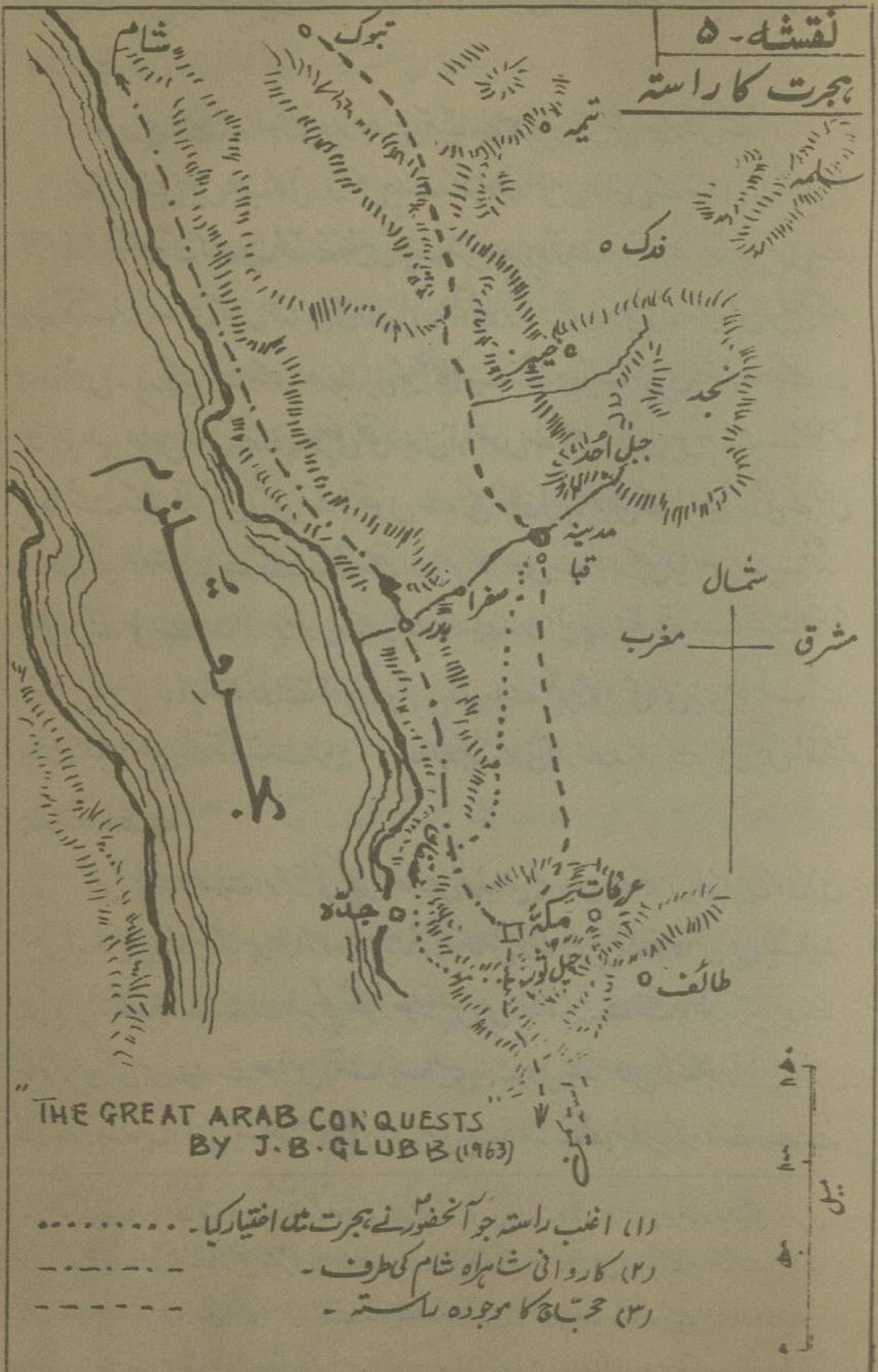
نے جواب دیا کہ انہیں اس کا کچھ علم نہیں ، وہ حضرت ابی بکرؓ کے ساتھ گذشتہ شام کو کہیں باہر چلے گئے۔ لیکن یہ بتا کر نہیں گئے کہ وہ کہاں گئے اور کب واپس آئیں گے۔ حضرت علی کرم نے مکہ کے گورنر اور شہری کونسل کے ارکان کو ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے بظاہر حیرانی اور تعجب سے دیکھا لیکن جب کسی نے اس کا کوئی سبب بیان نہیں کیا تو وہ بھی بڑی بے نیازی سے گلی کی ڈھلوان پر کعبہ کی سمت ٹہلتے ہوئے چلے گئے۔

ابوسفیان اور ابوجہل اس وقت بڑی گومگو کی حالت میں تھے۔ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہونا بھی آسان نہ تھا۔ پھر یہ کہ اندر عورتیں تھیں اور بہر حال وہ رشتہ دار بھی تھیں اور عزیز بھی۔ علاوہ ازیں انہیں یہ بھی یقین تھا کہ جو کچھ حضرت علی کرم نے بتایا وہ بھی سچ تھا۔ وہ سب ایک محض چادر سے دھوکا کھا گئے تھے۔ بہر حال اگر حضرت محمدؐ کسی وعظ یا عبادت کی مجلس میں گئے ہیں تو وہ لوٹ آئیں گے لیکن اگر وہ مدینہ کے لئے روانہ ہو گئے ہیں تو انہیں راستہ میں پکڑا جا سکتا ہے۔ اتنا بڑا سفر اونٹوں پر ہی کیا جا سکتا ہے اور اونٹ آہستہ آہستہ چلتے ہیں اور گھوڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس خیال سے انہیں کچھ اطمینان سا ہوا اور تعاقب کی مہم شروع کرنے کے لئے قائلین جلدی ہی وہاں سے چلے گئے۔

حضرت محمدؐ کو اس بات کا بالکل صحیح اندازہ تھا کہ جب قریش کو معلوم ہو گا کہ آپؐ مکہ سے چلے گئے ہیں تو ان کا ردِ عمل کیا ہو گا۔ چنانچہ آپؐ اونٹوں پر مدینہ کے لئے روانہ نہیں ہوئے بلکہ حضرت ابی بکرؓ کے ساتھ پیدل ہی جبل ثور چلے گئے جو مکے سے تقریباً ایک گھنٹے کا راستہ ہے۔ آپؐ نے حضرت علی کرم کو اپنی اس تجویز سے آگاہ کر دیا تھا اور یہ بھی ہدایت کر دی تھی کہ وہ مکے کے حالات سے انہیں باخبر رکھیں۔ دونوں جلاوطن حضرات جب جبل ثور کی چوٹی پر پہنچے تو ابھی صبح ہونے میں دیر تھی انہوں نے پہاڑ کے چٹانی حصے کے ایک غار (غار ثور[1]) کی بہت اندرونی خلا میں اپنے آپ کو چھپا لیا۔

---

[1] غار ثور۔ جبل ثور مکہ مکرمہ سے تقریباً پانچ میل جانب جنوب ہے اور ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ کی مسافت ہے غار ثور پہاڑ کی چوٹی پر ہے وہاں پہنچنے کے لئے دو پہاڑ چڑھنے پڑتے ہیں۔ دوسرے پہاڑ کی چڑھائی زیادہ دشوار گزار ہے چڑھائی ایک میل کے لگ بھگ ہو گی۔ کوئی مستقل راستہ نہیں اکثر جگہ چٹانیں عمودی اور پھسلواں ہیں، اس پر صدیوں سے چلتے رہنے سے جو پگڈنڈی کی شکل کے راستے ہیں وہ بہت تنگ ہیں اور بعض جگہ دو آدمی بیک وقت ایک ہی پگڈنڈی سے نہیں چڑھ سکتے کبھی چڑھنے والا اترنے والے کا انتظار کرتا ہے اور کبھی اترنے والا چڑھنے والے کا۔ اکثر جگہ چٹانیں پکڑ پکڑ کر چڑھنا ہوتا ہے۔



نقشہ۔ ۵
ہجرت کا راستہ
شام
تبوک
تیمہ
فدک
خیبر
نجد
جبل احد
مدینہ
قبا
سفرا
بدر
شمال
مشرق
مغرب
عرفات
مکہ
جدہ
جبل ثور
طائف
"THE GREAT ARAB CONQUESTS"
BY J.B.GLUBB (1963)
(۱) اغلب راستہ جو آنحضورؐ نے ہجرت میں اختیار کیا۔
(۲) کاروانی شاہراہ شام کی طرف۔
(۳) حجاج کا موجودہ راستہ۔

یہاں وہ دونوں ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئے اور دعائیں مانگتے رہے کہ دشمن کو ان کی کمین گاہ کا پتہ نہ چلے۔

سورج نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی آپؐ نے صحرا میں قریش سواروں کے گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں سنیں جب کافی دور نکل جانے کے باوجود انہیں اونٹوں کے پیروں کے نشان نظر نہ آئے تو وہ سمجھ گئے کہ حضرت محمدؐ نے انہیں ایک مرتبہ پھر بیوقوف بنایا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اب مکہ کے نزدیک ہی تلاش شروع کی۔ ان میں سے کچھ لوگ واقعی غار پر بھی آئے جہاں قریش کے یہ دونوں مفرور چھپے بیٹھے تھے۔ حضرت ابی بکرؓ کانپ اٹھے۔ وہ ایک شہری باشندے تھے اور عمر بھی اب پچاس سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ یوں تو انہوں نے پچھلے سالوں میں بہت سے مصائب برداشت کئے تھے لیکن دشمن کے ہاتھوں سے بچ نکلنے کی یہ مہم ان کے طریقہ زندگی کے بالکل خلاف تھی۔ وہ خوف سے سہمے ہوئے تھے اور اس کا انہوں نے اظہار بھی کیا لیکن حضرت محمدؐ بالکل ایسے ہی بے خوف اور پر سکون تھے جیسے وہ ایسے اور مواقع پر رہتے تھے۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے بڑی مایوسی سے کہا کہ ہم دو نہتے آدمی ان خون کے پیاسے جنگجو لوگوں کی اتنی بڑی جماعت کے سامنے کیا کر سکیں گے تو آپؐ نے فرمایا "اے ابوبکرؓ۔ کوئی فکر نہ کرو ہم اکیلے نہیں ہیں۔ اللہ تعالےٰ ہمارے ساتھ ہے"۔

اس تسلی سے حضرت ابوبکرؓ کی کچھ ڈھارس تو بندھی لیکن اس سے تلاش کی مہم میں کوئی فرق نہیں آیا۔ قریش نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ وہ حضرت محمدؐ کو تلاش کر کے دم لیں گے خواہ اس میں ایک مہینہ ہی کیوں نہ لگ جائے۔ غار کے باہر کچھ گھوڑ سوار آپس میں رد و کد کر رہے تھے جو اندر بیٹھے ہوئے پناہ گزین بھی سن رہے تھے۔ اس وقت ایک ایسی بات ہوئی جسے مسلمان ایک معجزہ خیال کرتے ہیں۔ غار[1] کے دہانے پر ببول کی ایک جھاڑی تھی۔ اس میں ایک فاختہ نے گھونسلہ بنا کر انڈے دے دیئے

---

[1] جنوری ۱۹۷۳ء مطابق ۱۳۹۲ھ حج کے موقعہ پر مجھے بھی غار ثور کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے لمبائی کی دوسری جانب غار کا ایک اور تنگ دہانہ بھی ہے جس میں سے پیٹ کے بل ہو کر اندر جا سکتے ہیں یا باہر نکلا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہجوم کے باعث ہم لوگ باری باری اصل راستے سے جھک کر غار میں داخل ہوئے۔ بیٹھے بیٹھے نفل ادا کئے اور دوسرے راستے سے پیٹ کے بل رینگ کر باہر نکلے یہ دوسرا راستہ بعد میں بنا لیا گیا معلوم ہوتا ہے۔ اب غار کے دہانے پر کوئی جھاڑی وغیرہ نہیں ہے۔

تھے اور اسی اثنا میں ایک مکڑی نے غار کے دہانے پر جالا تان دیا تھا۔ گھوڑ سواروں نے جو اس غار کی بھی تلاشی لینا چاہتے تھے جب یہ دیکھا تو اس متفقہ نتیجہ پر پہنچے کہ اس غار میں داخل ہو کر تلاشی لینا اپنا وقت ضائع کرنا ہے کیونکہ ان چیزوں کے ہٹائے بغیر اتنی تھوڑی دیر پہلے کوئی غار کے دہانے سے کس طرح اندر جا سکتا ہے۔

یہ کوئی عجیب اور معجزے[1] والی بات نہ تھی۔ جون[2] کے مہینے میں جس طرح فاختہ کا انڈے دینا بتایا جاتا ہے اسے مبالغہ آمیز کہا جا سکتا ہے لیکن مکڑی کا اتنی دیر میں جالا پورا دینا ناممکن نہیں ہے۔ البتہ جس بات کا سمجھنا مشکل ہے وہ قریشی جنگجوؤں کی بیوقوفی ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہوا ہو یہ خون کے پیاسے بیوقوف لوگ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور وہاں سے چل دیئے۔ پناہ گزینوں نے خدا کا شکر ادا کیا لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

جب رات کا اندھیرا شروع ہوا تو عبداللہ بن ابی بکرؓ اور ان کی بہن اسمار[3] غار پر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ حضرت علی کرم بخیریت ہیں۔ البتہ حضرت اسمار سے انہوں نے ضرور کچھ سوالات کئے تھے لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ انہیں اپنے والد (حضرت ابوبکرؓ) اور بہنوئی (حضرت محمدؐ) کے متعلق کچھ معلوم نہیں تو زیادہ پوچھ گچھ نہ کی۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت سوداؓ کو کسی نے تنگ نہیں کیا۔ بھائی اور بہن صبح ہونے سے پہلے پہلے مکہ واپس پہنچ گئے۔ بعد ازاں دن میں حضرت

---

[1] بعض اور لوگ بھی اسے معجزہ نہیں کہتے۔ مثلاً سیرۃ ابن ہشام میں اس معجزے کا ذکر تک نہیں EMILE DERMENGHAN نے لکھا ہے کہ یہ کوئی معجزے والی بات ہی نہیں تھی۔ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں "حیاۃ محمدؐ"

[2] ہجرت کا واقعہ ماہ جون ۶۲۲ء کا ہے۔

[3] حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ۔ آپ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن اور عبداللہ بن زبیرؓ کی والدہ تھیں۔ آپ تین رات مسلسل اپنے بھائی عبداللہ کے ساتھ غار پر کھانا اور خبریں لے کر جاتی رہیں۔ اندھیری راتوں میں پانچ چھ میل دور جانا اور پہاڑ پر چڑھ کر غار تک پہنچنا اور واپس آنا ایک لڑکی کے لیئے کام رکھتا تھا۔ یہ آپ کے ایمان اور ایثار کا ثبوت ہے۔

ابوبکرؓ کے چرواہے ان کے جانوروں کو چراتے چراتے غار کے قریب تک گئے اور وہ ان دونوں چھپے ہوئے حضرات کی ضروریات کی چیزیں ان کو دے آئے لیکن ان کے وہاں سے نکلنے کا تا حال کوئی موقع نہ تھا۔ قریشی سوار کئی مرتبہ غار کے قریب سے گزرے لیکن مکڑی اور فاختہ اپنا فرض بخوبی انجام دے رہی تھیں اور کسی نے ان کو پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔

دوسرے روز تلاش میں سرگرمی کچھ کم ہوگئی۔ حضرت اسماءؓ اور حضرت عبداللہ جو صورتحال پر نگاہ رکھے ہوئے تھے اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب اگر حضرت محمدؐ اور حضرت ابوبکرؓ ہجرت کے سفر پر روانہ ہو جائیں تو کوئی خطرہ نہیں۔ اس لئے تیسری[1] رات کو وہ غار پر دو اونٹوں اور ایک اعرابی رہبر کو لے کر آئے جس پر انہیں بھروسہ تھا۔ چنانچہ جلدی سے حضرت محمدؐ اونٹ پر سوار ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے متابعت کی اور رات کی تاریکی میں صحرا کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اندھیرے آسمان پر نیا چاند (ہلال[2]) تیر رہا تھا۔

تخیل پرست لوگ "ہلال" کو آج کی ملتِ اسلامیہ کا قومی نشان قرار دینے کی اصل اسی واقعہ سے منسوب کرتے ہیں لیکن اس حسین خیال میں کوئی صداقت نہیں۔ اس لئے کہ چاند تارے کو اصل میں سلطان عثمان اول، بانی سلطنت عثمانیہ، کے پوتے سلطان الطغرل نے پہلے پہل ۱۲۰۹ء میں ترک سلطنت کا نشان قرار دیا تھا۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کے کئی فرقے مثلاً اہل التشیع ہلال یا تارے کا اسلام سے کوئی تعلق تسلیم نہیں کرتے۔

کاروانوں کے عام اور بڑے راستوں سے بچنے کے خیال سے ان مہاجرین نے بحیرہ قلزم کی طرف جانے والا ایک وتری راستہ[3] اختیار کیا۔ مدینہ مکہ سے تقریباً دو سو[4] میل دور ہے۔ جب

---

[1] سیرت کی اکثر کتابوں میں لکھا ہے کہ آپ مسلسل تین روز غار میں رہے اور چوتھی شب کو مدینہ کی جانب سفر کا آغاز کیا۔

[2] یہ جون ۶۲۲ء کا واقعہ ہے اور ماہ ربیع الاول کا نیا چاند آسمان پر تھا یعنی ربیع الاول کی شروع کی تاریخیں تھیں۔

[3] ملاحظہ ہو نقشہ

[4] آج کل جو پختہ سڑک مکہ سے جدہ کے راستے مدینہ منورہ جاتی ہے مکہ سے مدینہ منورہ کا فاصلہ ۳۰۰ میل سے کم نہیں۔ غالباً پرانے کاروانی راستوں کے ذریعہ یہ فاصلہ دو سو میل ہو گا۔

تک آپؐ اس سفر کا بہت کافی حصہ طے نہ کر لیتے پکڑے جانے کا خطرہ ہر وقت موجود تھا۔ چنانچہ جلد ہی جب آسمان پر صبح کا اجالا پھیلا تو آہستہ آہستہ انہیں اپنے چاروں طرف لاوائی چٹانوں، پتھروں اور اونچے اونچے ریت کے ٹیلوں سے بھرا ہیبت ناک صحرا نظر آنے لگا۔ حد نظر تک اجاڑ اور سنسان سطح زمین میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی تھی۔ پرندوں کی وہ جانی پہچانی چہچہاہٹ تک بھی نہ تھی جو عام طور پر صبح کی آمد کی خبر دیتی ہے۔ چمکیلی کنکریوں پر اونٹوں کے چلنے کی آواز کے سوا اس بے آب و گیاہ سرزمین پر ہر طرف خاموشی تھی۔ سورج کی تمازت خطرناک حد تک شدید ہوتی جا رہی تھی اور اس کی شعاعیں زمین پر سیدھی پڑ رہی تھیں۔ معتدل علاقوں کی طرح رات کی شبنم کی نمی جیسی کوئی چیز بھی درمیان میں نہ تھی۔ جلد ہی عرب کا آسمان ان مسافروں کے سروں پر تپتا تانبا بن گیا اور پیروں تلے کے راستے سے پگھلتے ہوئے فولاد کا سا دھواں اٹھتا معلوم ہوتا تھا۔ افق سرابوں کا سمندر نظر آتا تھا اور سامنے ریت کے بڑے بڑے بگولے میدان میں ادھر سے ادھر چکر لگا رہے تھے۔

تینوں مسافر چلتے رہے جب تک وہ چل سکتے تھے۔ آخر کار انہیں ایک بڑی چٹان کے سایہ میں آرام کرنے کے لئے ٹھہرنا پڑا[۱]۔ کسی کنویں یا نخلستان کے تلاش کرنے کا تو سوال ہی نہ تھا کیونکہ یہ لوگ سمندر کی جانب ایک غیر معروف راستے سے سفر کر رہے تھے اور انہوں نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو ایسے پڑاؤ اور مقامات سے محروم کر لیا تھا جہاں سے وہ اپنے کھانے پینے کی ضروریات اور پانی کی کمی کو پورا کر سکتے۔

اس حال میں بھی یہ لوگ خطرے سے باہر نہیں تھے۔ قریش نے اعلان کیا ہوا تھا کہ وہ اس شخص کو ایک سو اونٹ انعام دیں گے جو حضرت محمدؐ کو زندہ یا مردہ مکہ لا سکے اور ایک شخص نے تو یہ انعام قریب قریب جیت ہی لیا تھا۔

غار سے روانگی کی دوسری صبح کو ان دونوں جلاوطن افراد اور ان کے رہبر کو ایک بدو سردار نے دیکھ لیا جس کا نام سراقہ بن مالک[۲] تھا۔ اپنے قبیلے کے دوسرے افراد کو یہ بتائے بغیر کہ اس کے ذہن میں کیا ہے وہ تیزی سے گھوڑے پر سوار ہو کر اس انعام کو حاصل کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔

---

[۱] ملاحظہ ہو نقشہ   [۲] سیرۃ النبی میں یہ نام سراقہ بن جعشم لکھا ہے۔ سراقہ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔

جو اس کی نظر میں جیتنے برابر تھا۔ کمان اور نیزے سے پوری طرح مسلح ہونے کے علاوہ وہ ایک نہایت اچھی نسل دار گھوڑی پر سوار تھا۔ حضرت ابو بکرؓ نے، جو بہت چوکنے تھے، سراقہ کو پہلے دیکھا اور فوراً حضرت محمدؐ کو خبردار کر دیا۔ حضرت محمدؐ نے بھی سرپٹ آتے ہوئے بدو سردار کی طرف دیکھا، لیکن قرآن کی آیات آپؐ کے وردِ زبان رہیں۔ اس اثنا میں سوار نزدیک آ گیا۔ اس نے تیر نکالے اور ایک تیر کمان میں جوڑا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ تیر چلاتا اس کی گھوڑی بدک[1] گئی اور اچانک اتنی تیزی سے پیچھے ہٹی کہ اپنے سوار کو گرا دیا۔

ایک صحرا نشین بدو کے لئے گھوڑے سے گرجانا بڑی شرم کی بات سمجھی جاتی تھی اور پھر حضرت محمدؐ جو اس کی قابلِ رحم حالت دیکھ رہے تھے، کی نظروں کے سامنے ایسا ہونا تو اس کے لئے شرم سے گڑ جانے کا مقام تھا۔ سراقہ بڑی بے بسی کی حالت میں تھا۔ وہ اس وقت صحرا میں تنہا کھڑا تھا۔ اس کی کمان ایک طرف دور جا گری تھی اور نیزہ دوسری طرف اور اس کی گھوڑی دور افق کی طرف دوڑتی چلی جا رہی تھی جیسے کوئی شیطان اس کے پیچھے لگا ہوا ہو، اور یہ ساری صورتِ حال ایسی تھی کہ اسے کوئی باعزت عرب برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ سراقہ نے ایک ہی معقول بات کی جو وہ ایسی حالت میں کر سکتا تھا یعنی اس نے حضرت محمدؐ سے معافی مانگ لی اور وعدہ کیا کہ وہ کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہ کرے گا کہ اس نے آپؐ کو دیکھا تھا۔ حضرت محمدؐ نے جو خود ایک نازک صورتِ حال سے دوچار تھے، اسے معاف کر دیا اور نشانی کے طور پر حضرت ابو بکرؓ نے ایک ٹکڑے پر اس کو معافی نامہ لکھ دیا۔ یہ بات ختم ہوئی تو سراقہ نے مصیبت زدہ مسافروں کو امن و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ اپنے ہتھیار اٹھائے اور گھوڑی کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ حضرت محمدؐ نے جو معمول کے مطابق پرسکون تھے قرآنی آیات کو جہاں سے چھوڑا

---

[1] سراقہ: بعض کتب میں لکھا ہے کہ آنحضور نے سراقہ کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے امداد کی دعا کی چنانچہ سراقہ کا گھوڑا گھٹنوں تک ریت میں دھنس گیا اور اس نے خوف زدہ ہو کر معافی مانگ لی۔ صاحب حیات محمد نے لکھا ہے کہ اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ دھڑام سے نیچے گر گیا۔ وہ اسے اپنے لئے اچھا شگون نہ سمجھا اور آپؐ سے معافی مانگ لی۔

تھا پھر پڑھنا شروع کر دیا اور روانہ ہو گئے۔

تقریباً ایک ہفتہ یہ سفر خشک، بنجر اور ویران علاقوں میں جاری رہا۔ کوئی زندہ جانور یہاں تک کہ کوئی گدھ یا سانپ تک بھی اس بیابان میں نہیں ہوتا۔ نباتات میں البتہ کہیں کہیں صرف ببول اور املی کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ تھے۔

روانگی کے ساتویں دن صبح کو آپؐ قبا کے نخلستان میں پہنچ گئے جو مدینہ سے صرف چند میل کے فاصلے پر ہے۔ اس صبح جب سورج طلوع ہوا اور سطح زمین پر زندگی کے آثار نظر آنے لگے تو مسافروں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اجاڑ بیابان سرزمین کو وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ صحرا کی بجائے اب انہوں نے اپنے آپ کو ایسی پہاڑیوں کے درمیان پایا جہاں کھجور کے اونچے اونچے پیڑوں کی کثرت تھی۔ ان کے اردگرد باغات تھے جن میں نارنگی، لیموں اور انار لگتے تھے۔ آب پاشی کے نالوں سے پانی تیزی سے نکل کر زرخیز زمین کو سیراب کر رہا تھا جس میں انجیر اور خوبانی کے پیڑ لگے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ ان کے لئے ناقابل یقین تھا اور اس سے بھی زیادہ جب بینتالیس سال پہلے آپؐ نے اپنی والدہ کے ساتھ اس جنت ارضی کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ آپؐ نے فوراً اونٹ کو بٹھایا اور اتر گئے۔ پھر آپؐ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جس نے حفاظت سے انہیں منزل تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد آپؐ سایہ میں آرام کرنے اور تازہ دم ہونے کے لئے لیٹ گئے۔

آپؐ زیادہ دیر آرام نہ کر سکے۔ مکّہ کے لوگوں کو جو آپؐ سے پہلے مدینہ آ چکے تھے معلوم تھا کہ آپؐ بھی جلد ہی مکّے سے روانہ ہونے والے ہیں اور وہ آپؐ کا انتظار کر رہے تھے۔ جونہی آپ کی

لے طبری نے ابو جعفر اور ابن اسحٰق سے روایت کی ہے کہ انصار مدینہ ذی الحجہ میں بیعت عقبہ کے لئے آئے۔ ان کی واپسی کے بعد رسول کریمؐ ذی الحجہ کے باقی حصے، محرم اور صفر میں مکہ میں رہے اور ربیع الاول کے شروع میں ہجرت کر کے دوشنبہ (پیر) کے دن ۱۲ ربیع الاول کو مدینہ پہنچے۔" مصنف نے مدینہ پہنچنے کی تاریخ ۲ جولائی ۶۲۲ء لکھی ہے اور سر جان گلب نے اپنی کتاب THE GREAT ARAB CONQUESTS میں آپؐ کے قبا پہنچنے کی تاریخ ۲۸ جون ۶۲۲ء لکھی ہے وہاں چار روز قیام کے بعد ۲ جولائی کو آپؐ مدینہ میں تشریف لے گئے۔ مولانا شبلی نے قبا پہنچنے کی تاریخ ۸ ربیع الاوّل مطابق ۲۲ ستمبر ۶۲۲ء لکھی ہے۔

آمد کی خبر پھیلی لوگ جوق درجوق آنا شروع ہو گئے۔ ان میں بہت سے آپؐ کے عزیز اور گھر کنبے کے لوگ بھی تھے۔ جن میں حضرت حمزہؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے الزبیرؓ بھی شامل تھے۔ وہ اپنے ساتھ صاف کپڑے، چاول، شہد، کھجوریں اور دودھ سے بھرے ہوئے مشکیزے لائے۔ حضرت محمدؐ نے یہ تحائف اور مبارک بادیں شکریے کے ساتھ قبول کیں لیکن چند روز تک آپؐ قبا میں ہی مقیم رہے کیونکہ بے حد تھک گئے تھے۔ اس کے علاوہ ہر وقت کی ہتک اور بے عزتی سہنے اور حملوں سے بچاؤ کی فکر کے ماحول سے نکل کر اچانک اپنا ایک پُرتپاک اور دوستانہ خیر مقدم دیکھ کر آپؐ جذبات سے مغلوب ہو گئے۔

قبا پہنچنے کے چوتھے روز[1] صبح تک آپؐ کی صحت بحال ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپؐ نے اعلان کر دیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ آپؐ شہر مدینہ میں، جس نے آپؐ کو اپنایا ہے، داخل ہوں۔

روانگی سے پہلے آپؐ نے ان سب لوگوں کو جمع کیا جو آپؐ کے استقبال کے لئے آئے تھے اور پہلی بار اعلانیہ طور پر نماز پڑھی اور فوراً بعد کسی مداخلت کے بغیر دن کے وقت پہلا خطبہ دیا۔ بعد ازاں آپؐ اپنی اُونٹنی پر سوار ہوئے جو "القصوہ" نامی ایک سفید سانڈنی تھی۔ اور مدینہ کے جھک جھک کر تعظیم بجا لاتے ہوئے کھجوروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

آپؐ کے برابر میں آپؐ کے باوفا دوست حضرت ابی بکرؓ تھے اور آپؐ کے آگے آگے ہمسایہ قبیلے کے شیخ بریدؓ تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک نیزہ تھا جس کے ساتھ انہوں نے پیغمبر اسلام کے پرچم کے نشان کے طور پر اپنا سفید عمامہ باندھ لیا تھا۔ القصوہ کے پیچھے اونٹوں پر سوار دوسرے لوگ تھے۔ آپؐ کے چاروں طرف مجاہدین یا پیادہ دوڑتے یا سوار چل رہے تھے اور ہاتھوں میں تلواریں یا کمانیں لہراتے پکار پکار کر حضرت محمدؐ کی آمد سے خبردار کر رہے تھے۔ اور یہ اعلان بھی کرتے جا رہے تھے کہ اب وہ آپؐ کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے۔

یہ ایک بڑا پُرشکوہ منظر تھا۔ تقریباً بالکل ناقابل یقین۔ کیونکہ ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا کہ آپؐ کو مکہ کی گلیوں سے چھپ کر اور دبے پاؤں گزرنا پڑتا تھا اور ہر وقت یہ ڈر رہتا تھا کہ شاید اگلے موڑ پر کوئی خنجر لئے کھڑا ہو اور کسی کے متعلق یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ کون

---

[1] مولانا شبلی قبا میں چودہ روز قیام کو زیادہ قرین قیاس سمجھتے ہیں۔

دوست ہے اور کون دشمن۔ جس مشن کی آپؐ تبلیغ کرتے تھے اس کے سبب لوگ آپؐ سے نفرت اور آپؐ کی مخالفت کرتے تھے لیکن آج آپؐ ہی عرب کے سب سے اچھے شہر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہو رہے تھے۔

جب یہ جلوس مدینہ کے دروازہ پر پہنچا تو جوش اور نعرے اور بلند ہو گئے اور حضرت محمدؐ کی مسرت میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہوتا گیا لیکن وقت اور موقعہ کو سمجھنے کی نایاب صلاحیت سے کام لیتے ہوئے آپؐ نے رُک جانے کا حکم دیا۔ آپؐ سواری سے اترے، بیت المقدس کی جانب رُخ کر کے اس کامیابی پر شکرانے کی نماز پڑھی اور پھر سوار ہو گئے۔ اب آپؐ نے القصوہ کی نکیل ڈھیلی چھوڑ دی اور اسے اپنی مرضی کے مطابق چلنے دیا۔ اونٹنی کئی گلیوں میں سے گزری جہاں ٹھٹ کے ٹھٹ لوگ کھڑے جوش مسرت میں نعرے لگا رہے تھے۔ القصوہ کھجوروں کے سایہ میں ایک کھلی جگہ بیٹھ گئی۔ حضرت محمدؐ اترے اور اعلان کیا کہ جہاں آپؐ کی اُونٹنی اپنی خوشی سے ٹھہری ہے وہاں پر آپؐ ایک مسجد اور اپنا گھر بنائیں گے۔

نئے قائد کے گرد انہیں دیکھنے اور چھونے کی کوشش کرنے والے لوگوں کے مجمع کے بڑھ جانے سے شور وغل بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ آخر کار حضرت محمدؐ کے اپنے کچھ لوگوں نے راستہ صاف کیا اور آپؐ کو حضرت ابو ایوبؓ انصاری، ایک مدنی، کے مکان پر لے گئے جنہوں نے معزز مہمان کو اس وقت تک اپنے مکان پر قیام کرنے کی پیش کش کی جب تک کہ آپؐ کا اپنا مکان تعمیر نہ ہو جائے۔

حضرت محمدؐ حیران رہ گئے جب حضرت علیؓ بھی تقریباً اسی وقت مدینہ پہنچ کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپؓ مکہ سے تمام راستے پاپیادہ آئے تھے اور پاؤں میں چھالے پڑ جانے کے سوا بالکل تندرست اور ہمیشہ کی طرح پرجوش تھے۔ وہ یہ خوشخبری بھی لائے کہ کنبے کے باقی افراد بھی بہت جلد پہنچ جائیں گے اور یہ بھی بتایا کہ ایک جماعت کی رہنمائی زیدؓ کر رہے تھے جس میں ان کی اپنی بیوی زینبؓ اور ام المومنین حضرت سودہؓ اور آپؐ کی صاحبزادیاں حضرت فاطمہؓ اور اُم کلثومؓ شامل تھیں اور عبداللہ بن ابوبکرؓ اپنی بہنوں حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ اور اپنی والدہ اُم رومان کے ساتھ آ رہے تھے۔

حضرت محمدؐ نے اپنے بستر پر پیچھے کی طرف تکیہ کا سہارا لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ آپؐ نے بہت تکالیف برداشت کی تھیں۔ آپؐ کو جسمانی تکلیفیں بھی دی گئی تھیں اور ذہنی بھی، لیکن آپؐ کا یہ یقین کبھی متزلزل نہیں ہوا کہ جو کچھ آپؐ پر نازل ہوا وہ حق ہے۔ آپؐ کا یہ تیرہ سالہ ایمان اور یقین اب باور ہو رہا تھا۔ آپؐ کو بس ایک ہی افسوس تھا کہ حضرت خدیجہؓ آپؐ کی اس کامیابی میں شریک نہ تھیں لیکن بہرحال انہیں ان سب حالات کا پتہ چل گیا ہوگا اور یقینی طور پر جنت الفردوس میں اس پر خوشیاں منا رہی ہوں گی۔ آپؐ نے ایک آہ بھری اور بستر پر دراز ہو گئے۔ آپؐ چاہتے تھے کہ اگر ہو سکے تو کچھ دیر آرام کر لیں۔ پچھلے ہفتوں میں آپؐ نے کامیابی کے کافی مراحل طے کر لئے تھے۔ بایں ہمہ آپؐ یہ بھی جانتے تھے کہ جتنا کام آپؐ کو ابھی کرنا ہے اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہ تھا۔

حضرت محمدؐ اللہ کے رسول تھے لیکن آپؐ حقیقت پسند بھی تھے۔ آپؐ جانتے تھے کہ آپؐ کی زندگی کی یہ واضح کامیابی آپؐ کے مشن کی ابتدا تھی۔ اگر اسلام کی جڑیں مضبوط کرنا ہیں اور اگر عرب کے لوگوں کو اُسے اسی طرح دکھانا اور باور کرانا ہے جیسے آپؐ خود کرتے تھے اور اگر احکام الٰہی کی تعمیل کرنی ہے تو ابھی آپؐ کو بہت کچھ کرنا ہوگا اور بڑے مراحل طے کرنا پڑیں گے۔ بایں ہمہ آپؐ یہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ یہ دلکش صبح آپؐ کی اپنی زندگی میں اور آنے والی صدیوں میں کس عظیم کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ کیونکہ درحقیقت اسی لمحہ دنیا میں خالص مذہب کی بنیاد پر قائم ہونے والی واحد حکومت مدینہ کے نخلستان میں وجود میں آ رہی تھی۔

یہ ۲ جولائی ۶۲۲ء کی تاریخ تھی جس دن سے سن ہجری شروع ہوا یعنی ترک وطن کرنے کا سال یا صحیح طور پر کہیں تو سال ہجرت۔ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں اس تاریخ کو سرکاری طور پر تقویم اسلامی کا آغاز قرار دے دیا گیا۔ اور اس وقت کوئی یہ خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ اس کے بعد تمام دنیا کے مسلمان اپنا سال اس دن سے شروع کریں گے اور مسلمان ہجرت سے پہلے کے واقعات کو "قبل از ہجرت" اور بعد کے واقعات کو "بعد از ہجرت" اسی طرح کہیں گے جیسے عیسائی اپنی تقویم میں "قبل از مسیح" اور "بعد از مسیح" کہنے کے عادی ہیں۔ اب جبکہ مدینہ پہنچنے کے بعد حضرت محمدؐ آہستہ آہستہ دودھ نوش

کر رہے تھے، حضرت ابوبکرؓ اپنی سفر سے بگڑی حالت کو درست کرنے اور اپنی ڈاڑھی کو مہندی لگانے میں مصروف تھے اور القصوہ جگالی کر رہی تھی تو کوئی بھی اس بات کو اہمیت نہیں دے رہا تھا کہ جبلِ حراؔ[1] کے اندھیرے غار میں جس خیال نے جنم لیا تھا وہ اب پروان چڑھ چکا ہے۔ اس وقت کوئی اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ کتنے تھوڑے عرصے میں یہ نظریہ پختہ ہو کر ایک بہت بڑے سیلاب کی طرح پھیلے گا اور دنیا کے وسیع علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور صدیوں کی قائم شدہ اور مستحکم حکومتوں اور مذاہب کو اپنے ریلے میں بہا لے جائے گا۔

---

[1] نزولِ قرآن کے تقدس کے سبب اسے جبلِ نور بھی کہتے ہیں۔

نواں باب

مدینہ

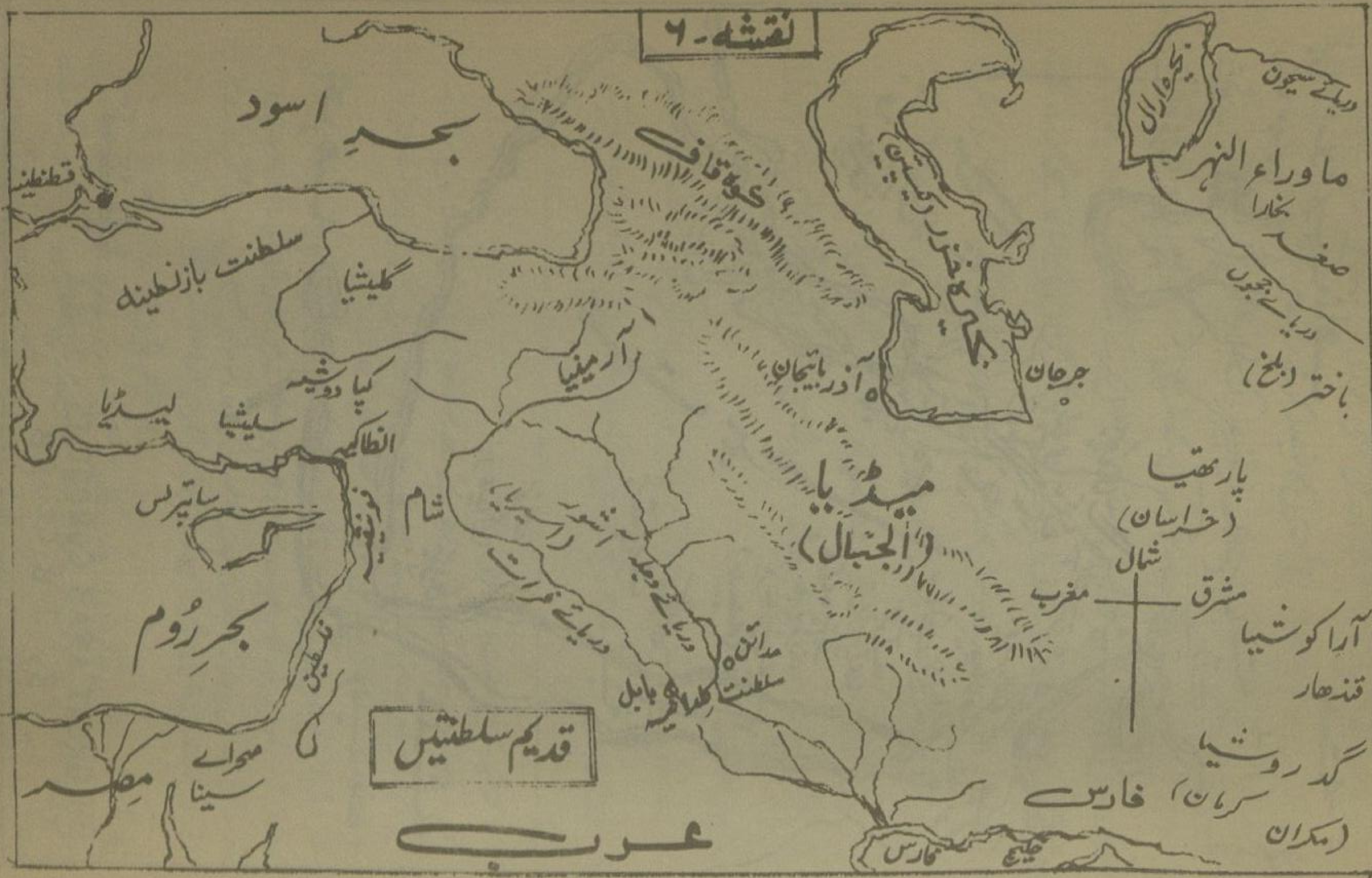
۶۲۲ عیسوی

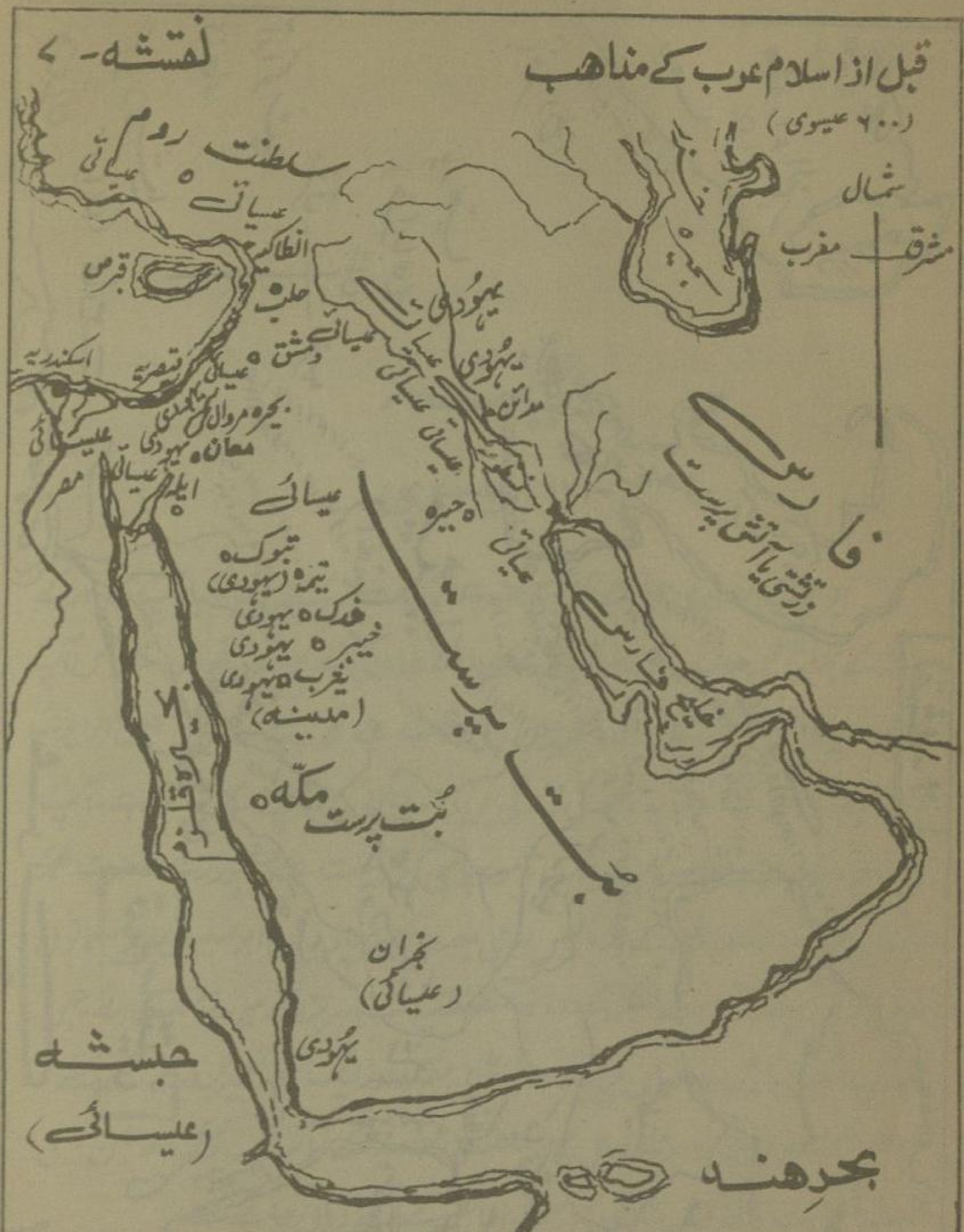
ابوایوب رضؓ انصاری جن کے مکان پر حضرت محمدؐ نے مدینہ پہنچنے پر قیام کیا، آپؐ کے دور کے رشتہ کے بھائی بھی ہوتے تھے۔ وہ آپؐ کے ان رشتہ داروں کے پوتے تھے۔ جن کے پاس آپؐ کو چھ سال کی عمر میں آپؐ کی والدہ صحرا میں اپنی وفات سے کچھ پہلے مدینہ لائی تھیں، ابوایوبؓ ایک مجاہد مسلمان تھے۔ حضرت محمدؐ کی زندگی میں وہ ہر لڑائی میں آپؐ کے ساتھ رہے۔ آپؐ کی وفات کے بعد بھی وہ اسلام کے ایک نامور سپاہی کی حیثیت سے مشہور رہے۔ حضرت محمدؐ کے مدینہ میں فاتحانہ داخلے کے اڑتالیس سال بعد وہ امیر معاویہ بن ابوسفیان، جو مسلمانوں کے پانچویں خلیفہ[1] تھے، کے لشکر کے ساتھ قسطنطنیہ کے باہر لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ جس جگہ آپ شہید ہو کر گرے وہاں پر ایک عالی شان مقبرہ اور ایک مسجد تعمیر کر دیئے گئے تھے جو ابھی تک موجود ہیں اور چند سال پہلے سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمہ تک ترک سلاطین اپنی تخت نشینی سے پہلے شمشیر بندی کی رسم کی ادائیگی کے لئے وہاں جاتے تھے۔

حضرت محمدؐ کی تعلیمات آپؐ کے پیروؤں کو کتنی بلندی پر لے جانے والی تھیں، اس کی بہت سی مثالوں میں سے ایک یہ ہے کہ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ غیر تعلیم یافتہ عرب اور قریش کے

---

[1] خلافت راشدہ اصل میں حضرت علی کرمؑ اور امام حسن رضؓ پر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد درحقیقت ملوکیت نے جگہ لے لی بہر حال ۱۹۲۲ء تک سربراہ مملکت خلیفہ کہلائے۔


نقشہ-۶
بحرِ اسود
قسطنطنیہ
سلطنت بازنطینہ
گلیشیا
کوہ قاف
بحیرہ خزر (کیسپین)
بحیرہ ارال
دریائے سیحون
ماوراء النہر
بخارا
صغد
دریائے جیحون
باختر (بلخ)
جرجان
آذربائیجان
آرمینیا
کپادوشیہ
لیڈیا
سلیشیا
انطاکیہ
شام
سائپرس
میڈیا
(الجبال)
پارتھیا
(خراسان)
شمال
مغرب
مشرق
آراکوشیا
قندھار
گدروشیا
(کرمان)
(مکران)
فارس
خلیج فارس
مدائن
سلطنت
بابل
دریائے دجلہ
دریائے فرات
بحرِ روم
فلسطین
صحرائے سینا
مصر
قدیم سلطنتیں
عرب


نقشہ - ۷
قبل از اسلام عرب کے مذاہب
(۶۰۰ عیسوی)
سلطنت روم
عیسائی
شمال
مشرق
مغرب
فارس
قبرص
حلب
دمشق
اسکندریہ
معان
یہودی
مصر
تبوک
خیبر
بت پرست مکہ
نجران
(عیسائی)
حبشہ
(عیسائی)
بحر ہند
۰ ۱۰۰ ۲۰۰ ۳۰۰
"THE GREAT ARAB CONQUESTS
By J.B.GLUBB

خنجروں سے بچ نکلنے والے ابوبکرؓ۔ عمرؓ اور علیؓ اتنی تھوڑی سی مدت میں مشرق کی ایک وقت کی عظیم الشان اور طاقتور سلطنتوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والے بن جائیں گے، شام، کلدانیہ[1] بازنطینہ[2]، مصر اور میڈیا[3] اور ایران کے ممالک ان غیر معروف جلاوطنوں کو خراج ادا کریں گے۔ ان مملکتوں کے حکمران، ان کے سپہ سالار اور ان کے مذہبی رہنما (بقول ان کے) ان غیر شائستہ مفلوک الحال اور بے خانماں لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان کے در پہ حاضری دیں گے جو آج اپنے مدنی میزبانوں کی چٹائیوں پر بڑی تشکر گزاری کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور یہ کہ حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار شمال اور مغرب میں اور زرتشت کے آگ کے پجاری، مشرق اور جنوب میں اسلام کے عظیم سیلاب کے ریلے میں اس طرح بہ جائیں گے جیسے سمندر کے کنارے کی کنکریاں اور خلیج فارس سے لے کر بحر اوقیانوس تک کسی وقت کے گلہ بانوں، سفری گماشتوں اور تاجر ساہوکاروں کے نام ان شاہی خاندانوں کی جگہ لے لیں گے جن کی سلطنتیں صدیوں سے قائم تھیں۔

چند سال بعد عظیم میسوپوٹامیا (عراق) کے شہر بصرہ میں ایوان حکومت سے تقریر کرتے ہوئے ان میں سے ایک[4] نے جو آج مدینہ میں ابوایوبؓ انصاری کے مکان کے باہر ریت پر

---

[1] کلدانیہ۔ قدیم سلطنت بابل (عراق) (نقشہ ۶)

[2] بازنطینہ۔ موجودہ ترکی کے علاقہ کو بازنطینہ کہتے تھے۔ قسطنطنیہ مشرقی رومن سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ مصر، شام اور فلسطین بھی اسی سلطنت کے حصے تھے جو حضرت عمرؓ کے دور میں فتح ہوئے۔ البتہ قسطنطنیہ کو ترکی کے سلطان محمد فاتح نے ۱۴۵۴ء میں فتح کیا۔ (نقشہ ۶) (نقشہ ۷)

[3] میڈیا۔ قدیم شمال مغربی ایران کے علاقہ کو میڈیا کہتے تھے (یعنی موجودہ آذربائجان، کرمان شاہ اور کردستان کا علاقہ) آرمینیہ اور اسیریا (شام) کا ایک بڑا علاقہ بھی اسی سلطنت میں شامل تھا۔ ایک بڑی سلطنت اور تہذیب تھی۔ بعد میں یہ علاقہ سلطنت فارس کا حصہ بن گیا اور ۳۳۰ قبل مسیح میں اسکندر اعظم نے اسے فتح کر لیا اور یونانی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ اس طرح اس بڑی تہذیب اور سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔
(انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا) (نقشہ ۶)

[4] نقشہ ۶ (۵) یہ اشارہ حضرت سعد بن وقاص کے متعلق معلوم ہوتا ہے جو ساتویں مسلمان تھے اور شعب ابی طالبؓ میں آنحضورؐ کے ساتھ انہیں بھی درختوں کے پتوں پر گزارہ کرنا پڑا تھا لیکن یہ کوفہ کے گورنر تھے بصرے کے نہیں۔ وہاں پر انہوں نے عامل (گورنر) کے لئے ایک محل (دارالامارہ) تعمیر کرایا تھا جس پر حضرت عمرؓ نے بعد میں باز پرس کی مغیرہؓ ابن شعبہ اور ابوموسیٰؓ اشعری حضرت عمرؓ کے زمانے میں بصرہ کے گورنر رہے لیکن وہ سابقون الاولون میں سے نہ تھے۔

کھڑے انتظار کر رہے تھے کہا۔

"مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب مکہ میں رسول کریمؐ کے ساتھ صرف سات مسلمان تھے اور میں ان میں سے ساتواں تھا۔ ہمارے پاس کھانے کے لئے درختوں کے پتوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان دنوں مجھے کسی نے تحفے میں کپڑے کی ایک چادر دی۔ جس میں سے کچھ کپڑا میں نے استعمال کیا اور باقی حصہ سعد ابن مالک کو پہننے کے لئے دے دیا۔ آج ہم میں سے ہر ایک کسی نہ کسی صوبہ کا عامل (گورنر) ہے۔"

ماہ جولائی (۶۲۲ء) کی اس سہ پہر تک مستقبل کے ان عاملوں (گورنروں) سپہ سالاروں اور قاضیوں (ججوں) کے لئے طویل ترین سفر جو اب تک انہوں نے کیا تھا مکہ سے مدینہ تک تھا۔ انہوں نے اتنی سرسبزی کبھی نہ دیکھی تھی۔ اور دھوپ میں تپتی چٹانوں والی سطح زمین کے عادی لوگوں نے جب اس سرسبز میدانی علاقے کو دیکھا جس میں مدینہ آباد تھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا۔ ایک ایسے علاقہ کے رہنے والوں کے لئے جہاں پانی کا ایک ایک قطرہ سونے سے زیادہ قیمتی تھا آبپاشی کے نالوں میں مسلسل اور تیزی سے پانی کا بہنا ایک اچنبھے کی سی بات معلوم ہوتی تھی۔ ایسی جگہ کو دیکھ کر جہاں کھانے کے لئے جتنی چاہیں کھجوریں مل جائیں اور جہاں انجیر، خوبانی اور انار اتنی بہتات سے ہوں جیسے صحرا میں پتھر، حضرت محمدؐ کی بیان کردہ جنت کی موجودگی پر یقین محسوس ہوتا تھا۔

حالانکہ مدینہ میں پہلے چند روز آپؐ نے آرام اور عبادت کے لئے وقف کر دیئے تھے لیکن آپؐ کا ذہن منصوبہ بندی میں لگا ہوا تھا۔ اسلام اب آپؐ کو پھر اسی تیزی سے کام کرنے کے لئے آمادہ کر رہا تھا جیسا کہ آپؐ نے بڑھتے ہوئے مصائب اور اذیتوں کے زمانہ میں کیا تھا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ اب تو اسلام کی صداقت بھی ثابت ہو چکی تھی اور اب آپؐ پر لازم آتا تھا کہ ان لوگوں کو بھی جو ایمان لے آئے تھے اور ان پر بھی جو اس کا مذاق اڑاتے تھے اس کی صداقت کو ثابت کریں اور ان پر بھی جنہوں نے ابھی تک اسلام کا نام بھی نہیں سنا تھا — بہر کیف اس سے پہلے کہ آپؐ اس کام پر پوری توجہ دے سکیں لازم تھا کہ آپؐ اپنے لئے مستقل

رہائش کا بندوبست کریں۔

دس سال پہلے جب آپؐ کو باہر نکل کر لوگوں میں اللہ کے پیغام کی تبلیغ کا حکم ملا تھا حالات کی مجبوری سے حضرت محمدؐ کو ملنے والے اللہ تعالیٰ کے احکام سرسری اور مختصر ہوتے تھے۔ دین کے بنیادی اصول اور اللہ تعالیٰ کے احکامات جبرئیل امین ٹکڑے ٹکڑے اور چھوٹی چھوٹی آیات کی شکل میں لاتے تھے اور یہاں آکر اب وہ سورتوں کی شکل اختیار کرنے لگے تھے۔ حقیقتاً حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؑ اور شاید زیدؓ کے علاوہ اب تک کی نازل شدہ تمام وحی اور احکام کسی اور نے سنے بھی نہیں تھے۔ اور اکثر بیشتر مسلمان ابھی تک اسلام کے متعلق بہت کم جانتے تھے اور غالباً حضرت محمدؐ کو خود بھی بعض باتوں میں کچھ وضاحت درکار تھی۔

بہر حال یہاں آکر وہ موقع میسر آنا تھا جو شاید ہی کسی دین کے بانی کو ملا ہو۔ یعنی ان احکامات کی تفصیلات بغیر کسی خلل اندازی کے مرتب کی جائیں۔ اسی وجہ سے آپؐ کو سکون کے لئے ایک گھر اور اشاعت کے لئے ایک مسجد کی فوری طور پر ضرورت تھی اور ایک باہمت اور سرگرم انسان ہونے کے سبب آپؐ خوب جانتے تھے کہ کسی کام کے کرنے کا سب سے مؤثر اور یقینی طریقہ یہ ہے کہ وہ کام خود کیا جائے۔

سمجھ دار اونٹنی القصوہ نے اس اللہ کے گھر کے لئے جگہ کا انتخاب کر دیا تھا جہاں سے نور اسلام کی ساری دنیا میں ضیا پاشی ہونی تھی۔ اگلا قدم اس کی تعمیر کرنا تھا۔ حضرت محمدؐ نے پوری اشتہا سے دودھ پیا۔ خوب کھجوریں کھائیں اور جب پوری نیند لے کر ساری تھکان دور کر لی تو کام میں مصروف ہو گئے۔

مکہ کے ان مہاجرین کے مدینہ پہنچنے کے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر پہلی مسلم عبادت گاہ یا مسجد کی بنیادوں کی کھدائی کا کام شروع ہو گیا تھا۔ آپؐ کے استقبال کا جوش اور ہماہمی اتنی زیادہ تھی کہ اس وقت کسی کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ القصوہ نے جس جگہ اپنے مقدس اور تھکے ہوئے سوار کو اتارا تھا وہ ایک قبرستان تھا۔ لیکن کسی نے اس کی پرواہ نہ کی۔ جو لوگ وہاں مدفون تھے وہ کافر تھے چنانچہ ان کے مردے اور ہڈیاں کھود کر پھینک دی گئیں تاکہ قیامت کے روز دوبارہ

---

[1] یہ زمین دو یتیم لڑکوں کی تھی اور ان سے اس کی قیمت ادا کی گئی۔

زندہ ہونے کے لئے وہ اپنے اعضا مختلف جگہ سے اکھٹے کریں۔ جو کھجور کے درخت بعض قبروں پر سایہ کرتے تھے کاٹ ڈالے گئے۔ زمین ہموار کر کے بنیادیں رکھ دی گئیں۔ حضرت محمدؐ نے ان تمام تیاریوں کے علاوہ اس کی اصل تعمیر میں بھی حصہ لیا۔ مدنی اور مکی دونوں آپؐ کی امداد کر رہے تھے۔

آپس میں ایک قابل عمل تعاون قائم رکھنے کے لئے حضرت محمدؐ نے ایک ایسا طریقہ نافذ کیا جس نے ایک ایک مہاجر کو ایک ایک مدنی کا باقاعدہ بھائی بنا دیا۔[لے] مدینہ والوں کو آپؐ نے انصار یا امداد کرنے والے کہا اور اہل مکہ یعنی اپنا وطن چھوڑ کر پناہ لینے والوں کو مہاجرین کا نام دیا۔ یہ لفظ ہجر سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں، اس نے وطن چھوڑ دیا۔

انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کو نہ صرف یہ کہ کھلایا پلایا اور مکان میں اپنے ساتھ رکھا بلکہ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ان کے پاس تھا اس میں بھی ان کو اپنا حصہ دار بنا لیا۔ اس بھائی چارے نے مکمل طور پر ایک خونی رشتے کی شکل اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ جب کوئی انصاری فوت ہوتا تو اس کے لئے لازم تھا کہ وہ اپنے ورثہ میں سے اپنے حقیقی وارثوں کے ساتھ اپنے منہ بولے بھائی کو بھی متناسب حصہ دینے کی وصیت کرے۔ یہ ایک عظیم اور نہایت مدبرانہ خیال تھا کیونکہ اس نے انصار اور مہاجرین میں ایک ہی قبیلہ کے افراد ہونے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا جس نے ایک نئے دین کی بنیاد کے طور پر بیش بہا کام کیا۔

یہ ایک ہی خاندان یا قبیلے کے فرد ہونے کا احساس یا ایک دوسرے کے کام آنے کا معاہدہ اشد ضروری تھا کیونکہ جہاں بنی خزرج نے حضرت محمدؐ کو مدینہ آنے کی دعوت دی تھی وہاں ایسے دوسرے قبیلے بھی تھے جنہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ یہودیوں کے گروہ کے علاوہ عربوں کا ایک

سے یہ بات مصنف نے غالباً مزاح پیدا کرنے کے لئے لکھی ہے۔

لے اس بھائی چارے کو سلسلہ مواخات کہتے ہیں یہ ایک عملی اقدام تھا اور اس نے خونی رشتے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جو لوگ ایک دوسرے کے بھائی بنے ان کی چند مثالیں یہ ہیں۔ آنحضورؐ اور حضرت علی کرم، حضرت حمزہؓ اور زید بن حارثہؓ، حضرت ابوبکرؓ اور خارجہؓ بن زید انصاری حضرت عمرؓ اور عتبانؓ بن مالک انصاری۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت اوسؓ بن ثابت انصاری۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ اور حضرت ابوایوبؓ انصاری۔ حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت ابودرداؓ انصاری ایک دوسرے کے دینی بھائی بنے۔ (سیرت النبی۔ حصہ اول)

دوسرا قبیلہ بنی اوس بھی تھا۔ وہاں پر ایک فتنہ پرداز شخص عبداللہ بن اُبی بھی تھا۔ اس وقت نہ تو خود اس نے اور نہ ہی اس کے زیرِ اثر لوگوں نے حضرت محمدؐ کو کوئی زیادہ اہمیت دی۔ چنانچہ انہوں نے اس میں کوئی دلچسپی نہ لی کہ شہر کی دوسری جانب کیا ہو رہا ہے۔ ہوا یہ کہ جہاں ان کی اس غفلت سے اُن کا نقصان ہوا حضرت محمدؐ کو اتنا ہی فائدہ پہنچا۔

پہلی مسجد بڑی سادہ طرز کی تھی۔ دیواریں پتھر کی بنیادوں پر دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں سے کھڑی کی گئی تھیں۔ چھت کھجور کی شاخوں اور پتوں کی تھی جو قبرستان سے کاٹے ہوئے کھجور کے تنوں کے شہتیروں پر رکھی ہوئی تھی۔ مسجد کے اندر کی طرف گارے سے لپائی کر دی گئی تھی۔ مسجد میں کوئی سجاوٹ نہ تھی۔ یہاں تک کہ کوئی منبر بھی نہیں تھا حضرت محمدؐ لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے۔ رات کو لکڑی کی چھپٹیاں جلا کر روشنی کی جاتی تھی۔ بعد میں ان کی جگہ تیل کے چھوٹے چراغوں نے لے لی تھی۔ لیکن مسجد کی عمارت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی یہاں تک کہ پندرہ سال بعد حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں اسے وسیع کیا گیا۔

موجودہ مسجد میں صرف بنیادیں اصل عمارت کی رہ گئی ہیں۔ باقی سب کچھ بدل گیا ہے۔ پرانی مسجد پر یکے بعد دیگرے پانچ مساجد تعمیر ہو چکی ہیں۔ آخری عمارت[1] جو اس وقت مدینہ میں ہے۔ پندرہویں صدی عیسوی میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ ایک مزین عمارت ہے۔ اور اس کے پانچ مینار ہیں۔ اور ایک سبز گنبد ہے۔ جس کے کلس پر ایک طلائی گولہ اور ایک چاند ہے اس سبز گنبد کے نیچے حضرت محمدؐ مدفون ہیں۔ سوائے اس کے اور وہاں پر کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو کسی طرح بھی حضرت محمدؐ کے طریق کو ظاہر کرتی ہو بحقیقت یہ ہے کہ سب کچھ اس کے اندر ہے اور اس کے باہر شاید آپؐ اپنی ذات کے کسی مظہر کو پسند بھی نہ کرتے۔

حضرت محمدؐ کا طرزِ زندگی اتنا ہی سادہ تھا جیسے حضرت عیسیٰؑ کا۔ آج کے بہت سے گرجاؤں اور مساجد کی اندرونی چمک دمک اور آرائش بعد میں آنے والوں کے کام ہیں جو شاید یہ نہیں

---

[1] یہ مسجد سلاطین عثمانیہ (ترکیہ) کے زمانے میں تعمیر ہوئی اب اس میں بھی بہت توسیع ہو چکی ہے۔ ترکوں کے وقت کی مسجد بدستور موجود ہے اور نئی توسیع شدہ مسجد مختلف قسم کے قیمتی پتھروں سے تعمیر ہوئی ہے طرزِ تعمیر اور محرابیں نہایت خوبصورت ہیں۔ نئی مسجد کو پورے طور پر مسقف کرنے میں غالباً کچھ وقت لگے گا۔

سمجھتے کہ وہ سادگی کتنی قابلِ قدر تھی جسے دونوں بڑے مذاہب کے بانی پسند کرتے تھے۔ اب اس عمارت کی جہاں لوگ آج (سنہ ۱۹۵۰ء) میں نماز پڑھتے ہیں، اگر کوئی چیز مسلمانوں کو اصل عمارت کی یاد دلانے کے لئے رہ گئی ہے تو وہ صرف اس کا نام ہے۔ یعنی مسجد النبی یا رسول اللہ کے نماز پڑھنے کی جگہ۔

مسجد کی ذیلی عمارات کے طور پر حضرت محمدؐ نے اپنے لئے اور اپنے گھر والوں کے لئے مکانات تعمیر کئے تھے۔ یہ کچی جھونپڑیوں کی ایک قطار تھی جو ایک دوسرے سے صرف کھجور کی شاخوں سے بنی ہوئی ٹٹیوں سے جدا کی ہوئی تھیں۔ جن پر دونوں طرف گارے کی لپائی کردی گئی تھی۔ ان کے اندر کوئی سجاوٹ یا پردے نہیں تھے۔ حضرت محمدؐ ایک چٹائی پر سوتے تھے اور اپنے گھر کا کام خود کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے پھٹے کپڑوں کو بھی خود ہی درست کرلیتے تھے۔ اور اپنے جوتوں کی مرمت بھی کرلیتے تھے۔

باور کیا جاتا ہے کہ ایسا سادہ رہن سہن صرف درویش اور مرتاض لوگوں کا ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر اس پر کوئی ذرا غور کرے تو اسے فوراً معلوم ہوجائے گا کہ حضرت محمدؐ کسی طرح بھی صرف ایک روایتی درویش نہ تھے۔ بچپن سے ہی آپؐ کی پرورش ایک درمیانہ طبقہ کے آسائشوں والے ماحول میں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ تک آپؐ مکہ کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور اب آپؐ مدینہ تشریف لے آئے تھے جہاں کا ہر ایک فرد اپنا بہترین اثاثہ آپؐ کے حوالے کرنے کو تیار تھا۔ یہاں تک کہ فتوحات کے بعد جب ریاست کے خزانے میں دولت اور مالِ غنیمت کی ریل پیل ہوگئی تھی تب بھی آپؐ نے اپنی سادہ اور درویشانہ زندگی کے طریقوں کو اسی طرح قائم رکھا۔

حضرت محمدؐ کی خوراک میں زیادہ تر ستو۔ کھجوریں اور دودھ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی گوشت کا شوربہ۔ سبزیاں اور کچھ شہد ہوجاتا تھا لیکن اکثر اوقات آپؐ صرف کھجوروں اور دودھ پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ بہرکیف جو کچھ بھی ہوتا تھا وہ فرش پر ایک چٹائی پر بیٹھ کر کھاتے تھے۔ آپؐ کا لباس بھی اتنا ہی سادہ تھا جتنی آپؐ کی خوراک۔ جسم پر نیچے آپؐ معمولی قسم کی اونی یا سوتی آستینوں والی قبا پہنتے تھے اور اس کے اوپر ایک ڈھیلی ڈھالی عبا۔ سر پر ایک بھاری قسم کا

عمامہ ہوتا تھا۔ جو بڑی احتیاط سے بندھا ہوتا تھا۔ پاؤں میں چمڑے کے چپل یا سینڈل نما جوتے ہوتے تھے۔ زندگی کے آخری حصہ میں آپؐ نے بعض اوقات دمشق کا ریشمی کپڑا اور ایک زردوزی کی عبا بھی زیب تن کی۔ لیکن صرف کبھی کبھی۔ آپؐ نفیس اور قیمتی کپڑے کو ناپسند فرماتے تھے اور مسلمانوں کے ایسا لباس پہننے کو بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ حبش کے حکمران نجاشی نے ایک مرتبہ آپؐ کو کچھ پاجامے اور لمبے سیاہ بوٹ کا ایک جوڑا بھیجا۔ پاجاموں کے متعلق آپ نہیں جانتے تھے کہ کیسے پہنتے ہیں اس لئے کبھی استعمال نہیں کئے البتہ بوٹ کبھی کبھی پہنے لیکن انہوں نے آپؐ کے پاؤں کو تکلیف دی۔

ہو سکتا ہے کہ رہن سہن کا یہ طریق کار آپؐ کی بدوی جبلّت کا نتیجہ ہو۔ آپؐ کی بچپن کی یادوں میں صحرا کی سادہ زندگی رچی ہوئی تھی۔ جس کے بعد آپؐ کو تجارتی سفروں میں خانہ بدوش زندگی کے تجربے ہوئے۔ حقیقت میں ایک صحرا نشین کی فطرت میں اگر کہیں فضول خرچی جائز ہے تو وہ صرف اپنے اصطبل میں اچھے جانور جمع کرنے پر ہوتی ہے۔ حضرت محمدؐ کے پاس صرف چند گھوڑے تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں گھوڑے کم استعمال ہوتے تھے۔ ان کا استعمال اصل میں اس وقت زیادہ بڑھا جب مسلمانوں نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ حضرت محمدؐ کی اصل سواری تیز رفتار سانڈنیاں اور خچر تھے۔ اول الذکرؐ کی تعداد تین تھی۔ جن میں سے ایک مشہور القصوہ تھی اور آپؐ کے پاس دو خاصے کے خچر تھے۔ ایک سفید اور ایک سبزہ جن کے نام دُلدل اور شیبا[1] تھے۔ اس کے علاوہ آپؐ کے پاس کچھ بار برداری کے اونٹ، دودھ دینے والی اونٹنیاں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ بھی تھے۔ ایک صحرا نشین فطرتاً اپنے کھانے، کپڑوں اور ذاتی آسائشوں پر کم خرچ کرتا ہے لیکن جانوروں کے معاملے میں کافی مسرف ہوتا ہے۔

---

[1] طبری نے لکھا ہے کہ دُلدل نامی خچر اور عفیر نامی گدھا، مقوقس والیٔ مصر نے حضرت ماریہ قبطیہ کنیز اور دوسرے تحائف کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں بھیجے تھے۔ فروہ بن عمرو نے فضہ نامی ایک اور مادہ خچر آپؐ کی خدمت میں پیش کی تھی وہ خچر آپؐ نے حضرت ابی بکرؓ کو تحفۃً دے دیا۔ آپؐ کے سب سے پہلے گھوڑے کا نام "سکب" تھا جس پر سوار ہو کر آپؐ جنگ اُحد میں شریک ہوئے۔

بہرحال حضرت محمدؐ کے سادہ طریق زندگی کا سبب کچھ ہی کیوں نہ ہو آپؐ نے شروع سے ہی اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ علم و عمل دونوں میں سادگی اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ آپؐ نے ہمیشہ اس اصول پر زور دیا اور مسلمانوں کو ہمیشہ یہی ہدایت کی کہ اپنے دل و دماغ میں اس اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دیں۔ مسلمانوں کی اکثریت نے اس پر عمل کیا اور اپنے قائد کی وفات کے بعد بھی بہت عرصہ تک اس روایت کو برقرار رکھا۔

حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں شام کی مہمات میں مسلمانوں کے سپہ سالار خالدؓ بن ولید اور شام کی رومن افواج کے سپہ سالار مینویل کے درمیان گفت و شنید ہوئی۔ دونوں جرنیل ایک بڑے خیمے میں ملے۔ مینویل اور اس کے افسران جو بڑی زرق برق وردیوں میں ملبوس تھے اور ان کی تلواروں میں جڑے ہوئے جواہرات چمک رہے تھے زربفت کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف حضرت خالدؓ نے ایک صحرانشین مجاہد کا لباس پہنا ہوا تھا معمولی کپڑے کی قبا، نہ زرہ بکتر اور خود زیب بدن تھا۔ آپ کے پہلو میں ایک تلوار لٹک رہی تھی۔ اور ہاتھ میں ایک نیزہ تھا اور ان میں اور ان کے ماتحت افسران میں کسی طرح کا کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ غالباً نہ انہوں نے اور نہ ان کے ساتھیوں نے یہ دیکھا کہ ان کے لئے بھی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ عیسائیوں سے سلام دعا کے بعد مسلمان آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ گئے اور جب مینویل نے ان سے دریافت کیا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تو انہوں نے جواب دیا۔۔

"خاک ہی سے تم بنے۔ خاک ہی سے تم پیدا ہوئے اور ایک روز یقینی طور پر خاک ہی میں مل جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین بنائی اور جو کچھ خداوند کریم نے بنایا وہ تمہارے ریشمی مشجر سے بہتر ہے۔"

اتفاق سے دوسرے ہی روز خالدؓ بن ولید اور ان کے ساتھی بدوؤں نے مینویل کی بڑی تربیت یافتہ اور جنگ آزمودہ فوج کو ایسی زبردست شکست دی جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے بعد مسلمان بڑھتے گئے اور بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔

مدینہ میں مسجد کے تعمیر ہو جانے کے بعد حضرت محمدؐ کو جو پہلی مشکل پیش آئی وہ یہ تھی

کہ مسلمانوں کو نماز کے لئے بلانے کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اب تک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی بلکہ اس کے برخلاف اب تک مسلمانوں کو جمع کرنے کے لئے بڑی خاموشی اور رازداری سے کام لیا جاتا تھا اور ہر قسم کی احتیاط کی جاتی تھی کہ کہیں کسی کو یہ نہ معلوم ہو جائے کہ مسلمان کہیں نماز کے لئے جمع ہو رہے ہیں لیکن اب حالات کے مطابق ہدایات کے طالب لوگوں کے لئے اس طریقہ کو بدلنا تھا۔

یہودی لوگوں کو عبادت گاہ میں بلانے کے لئے ترُم یا بِگل بجائے جاتے تھے اور عیسائی گھنٹہ بجاتے تھے۔ حضرت محمدؐ ایسے مقدس اور ارفع مقصد کے لئے ان طریقوں کو بے جان اور بے کیف سمجھتے تھے۔ آپؐ نے محسوس کیا کہ انسانی آواز اس جذبے اور کیفیت کو جو ایسے سنجیدہ مواقع کے لئے ضروری ہے لوگوں تک پہنچانے کے لئے زیادہ موزوں رہے گی۔

شروع میں بلانے کے لئے کوئی مستقل طریقہ نہیں تھا۔ الصّلوٰۃ الصّلوٰۃ پکارنا ہی مسلمانوں کو نماز کے واسطے بلانے کے لئے کافی سمجھا گیا لیکن کچھ عرصہ بعد حضرت محمدؐ نے فیصلہ کیا کہ کسی زیادہ مؤثر طریقہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس بارے میں مختلف روائیتیں[1] ہیں کہ آپؐ نے آخری اور موجودہ قاعدہ کس طرح وضع کیا۔ ان میں سے کسی روایت کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی کیونکہ کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آخر ان کلمات یا الفاظ کو آپؐ خود کیوں وضع نہیں کر سکتے تھے۔ کلمات نہایت سادہ اور باوزن ہیں اور دنیا بھر کی مساجد کے میناروں سے دن میں پانچ وقت ایک خاص لَے میں بلند آواز سے کہے جاتے ہیں اور اس وقت کی طرح آج بھی دل پر اثر کرنے والا یہ پیغام ہر اعتقاد کے لوگوں پر ایک خاص کیفیت طاری کر دیتا ہے۔

---

[1] اذان کی ابتدا کے متعلق مختلف روائتیں ہیں پہلے مختلف اصحاب نے اپنی رائے اور تجاویز پیش کیں مثلاً ایک یہ تھی کہ مسجد کی چھت پر نماز کے وقت ایک علم کھڑا کر دیا جائے یہودی اور عیسائیوں کے طریقوں پر بھی غور کیا گیا آخر میں حضرت عمرؓ کی تجویز قبول ہوئی کہ حضرت بلالؓ سے اذان دلوائیں۔ اذان کے الفاظ کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے الفاظ عبداللہ بن زیدؓ اور حضرت عمرؓ کو خواب میں نظر آئے۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے دوسروں کے مقابلے میں اپنی رائے پیش کی: "ولا تبعثون رجلاً ینادی بالصّلوٰۃ" یعنی ایک آدمی کو بھیجا جائے جو پکار کر نماز کا اعلان کر دے ایک روایت کے مطابق آنحضورؐ نے مروجہ اذان کے الفاظ کو خود خواب میں دیکھا اور اسی کے مطابق اذان کو رائج کیا۔
(سیرت النبی)

اذان کے الفاظ یہ ہیں:۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ

اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدَا الرَّسُوْلُ اللّٰہِ ۔ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدَا الرَّسُوْلُ اللّٰہِ

حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ ۔ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ

حَیَّ عَلَی الْفَلَاح ۔ حَیَّ عَلَی الْفَلَاح

اَللّٰہُ اَکْبَرُ ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ۔

ہر روز صبح کی نماز کے وقت یہ تاکیدی نصیحت اذان سے[1] پہلے کی جاتی ہے۔

اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم ۔ اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم

(نماز سونے سے بہتر ہے) (نماز سونے سے بہتر ہے)

جب اذان کے ان کلمات کا فیصلہ ہو گیا تو اب اذان دینے کے لئے کسی مناسب شخص کو تلاش کرنا تھا۔ اس وقت مسجد میں کوئی خادم یا ملازم نہیں ہوتے تھے اور اگرچہ آپؐ خود عرصہ تک اذان دینے کا کام سرانجام دیتے رہے لیکن یقینی طور پر مستقلاً اور ہمہ وقت مستعدی سے ایسا کرنا آپؐ کے لئے ممکن نہ تھا۔ مؤذن ایسا شخص ہونا چاہئے جس کی آواز بہت بلند اور پاٹ دار ہو اور جس کی آواز سارے شہر میں سنی جا سکے اور اس کا مستقل طور پر صرف یہی کام ہو۔ آخر کار نظر انتخاب ایک حبشی مسلمان پر پڑی جن کا نام بلالؓ بن رباح تھا۔ یہ عظیم اور شائستہ شخصیت جو حبشی نژاد ہونے کے سبب سیاہ پتھر کا مجسمہ معلوم ہوتے تھے، سابقون الاولون میں سے ایک تھے۔ اُس وقت یہ ایک مکّی کے غلام تھے جس کا نام امیہّ بن خلف تھا۔ اُمیہ

---

[1] شاید شروع میں ایسا ہوتا ہو۔ ورنہ "الصلوٰۃ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم" کے الفاظ فجر کی اذان میں "حَیَّ عَلَی الْفَلَاح" اور "اَللّٰہُ اَکْبَر" کے درمیان کہے جاتے ہیں۔ اذان کے درمیان ان الفاظ کا مستقل اضافہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ہوا۔

ایک کٹر بت پرست اور اسلام کا دشمن تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ بلالؓ بھی مسلمان ہو گئے ہیں تو اس نے ان کو بت پرستی کی طرف واپس لانے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن جب حضرت بلالؓ نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تو انہیں اذیتیں دی گئیں جب مظالم اور تکالیف کا بھی کوئی اثر نہ ہوا تو امیہ اپنے ان حبشی غلام کو باہر صحرا میں لے گیا اور یہاں انہیں کپڑے اتار کر عرب کی جھلسا دینے والی دھوپ میں ایک کھمبے سے باندھ کر لٹا دیا اور سینہ پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا جس پر یہ الفاظ لکھ دیئے۔

"تم یہاں اسی طرح پڑے رہو گے جب تک یا تو مر نہ جاؤ یا اسلام سے توبہ نہ کرو"

لیکن اس پر بھی بلالؓ اپنے دین پر قائم رہے اور دھوپ اور پیاس سے نیم مردہ ہو جانے کے باوجود اَحَدٌ۔ اَحَدٌ (خدا ایک ہے) ہی کہتے رہے۔ وہ اس شدید تکان اور تکلیف سے شاید مر جاتے اگر ابوبکرؓ ان کی مدد کو نہ پہنچ جاتے اور سینے سے پتھر ہٹا کر ان کو رہا نہ کر دیتے بعد ازاں آپ نے امیہ کو ایک بڑی رقم دے کر بلالؓ کو اپنی ملازمت میں لے لیا۔

واضح طور پر یہی وہ وفا شعار، پرجوش اور بے چون و چرا اطاعت کرنے والے فرد تھے، جو بخوشی اپنی باقی زندگی ہر روز پانچ وقت ایک ہی اذان دہرا گزار سکتے تھے۔ سخت ترین اذیتوں کے پیش نظر وہ پہلے مسلم مؤذن ہونے کی بجائے شاید پہلے مسلم شہید ہوتے۔ بہرحال انہیں مسجد کی چھت پر چڑھا دیا جاتا[۱] تاکہ فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کے وقت مشرق[۲] اور مغرب شمال اور جنوب کی طرف منہ کر کے اذان دیتے۔ اسی اذان کو ڈرامہ لکھنے والے اور فلم بنانے والے اپنی کہانیوں اور فلموں میں مشرقی ماحول پیدا کرنے کے لئے جوں کا توں شامل کر لیتے ہیں بغیر یہ جانے بوجھے کہ اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بلالؓ کی زندگی مدینہ کی مسجد کی چھت پر اذان دیتے ہوئے ہی ختم نہیں ہوئی۔ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد آپ نے اذان

لہ صاحبِ حیاتِ محمدؐ نے لکھا ہے کہ شروع میں بنی نجار کی ایک خاتون کا مکان مسجد کے برابر اور اس سے اونچا تھا حضرت بلالؓ اس پر چڑھ کر اذان دیتے تھے اور عبداللہؓ بن زید بن ثعلبہ اذان کے الفاظ ان کے ساتھ دہراتے جاتے تھے۔

ٓلہ مدینہ منورہ سے کعبۃ اللہ جانب جنوب ہے۔ مصنف نے چاروں سمتوں کے نام لکھ دیئے ہیں حالانکہ موذن کو صرف تین سمتوں کی طرف ہی منہ کرنا ہوتا ہے۔

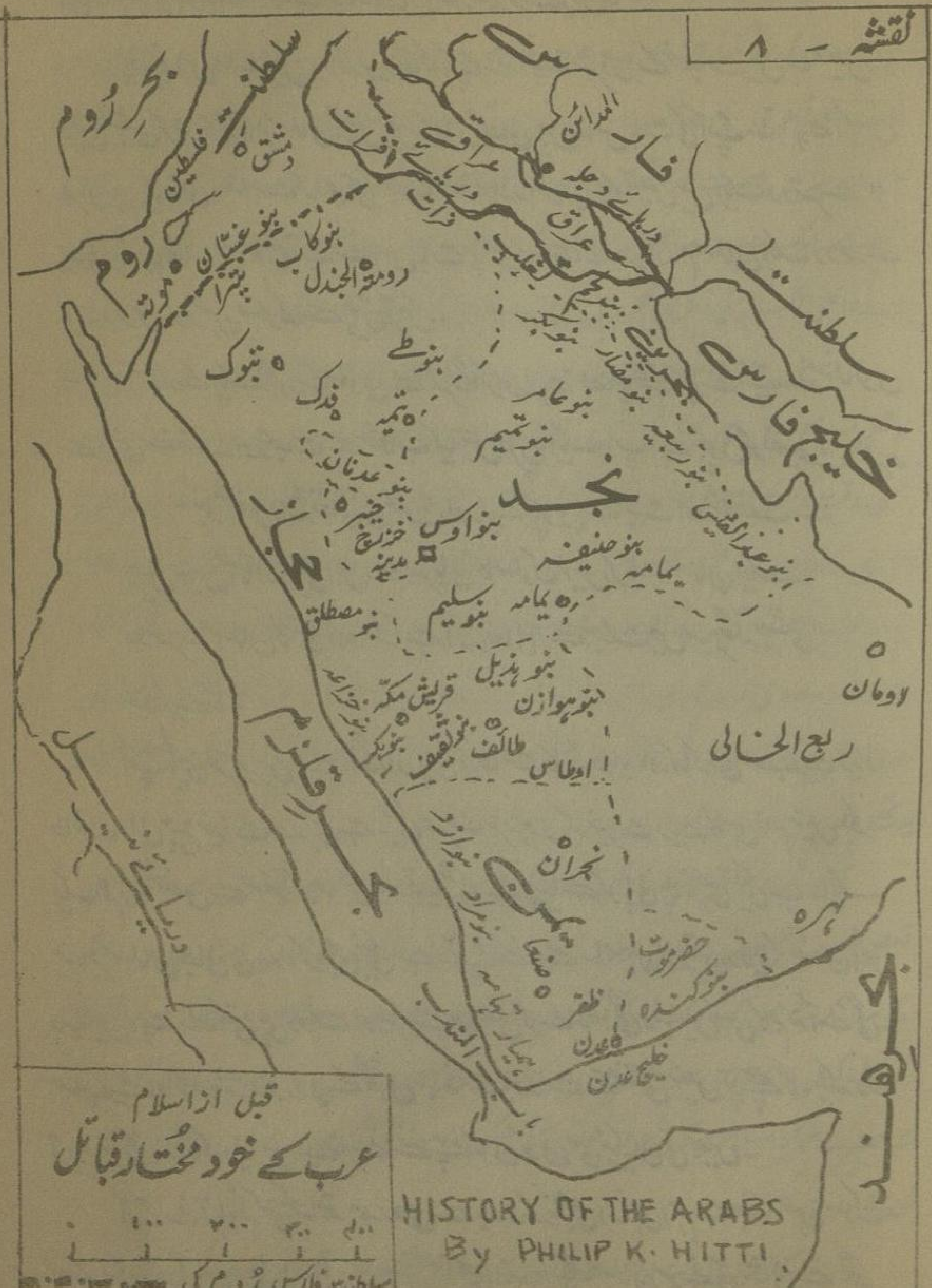
دیناترک کر دیا۔ اور جب عساکر اسلامی نے شام و عراق اور فلسطین کی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تو بلال رضؓ بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ انہیں اس دوران ہر قسم کے عہدے دیئے گئے اور ایک مرتبہ انہیں قیصریہ میں شہنشاہ قسطنطین کے بیٹے کے پاس مسلمانوں کا سفیر بنا کر بھی بھیجا گیا۔ اذان دینے کے فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد حضرت بلال رضؓ نے صرف ایک اور موقعہ پر اذان دی اور وہ اس جگہ جہاں حضرت خالدؓ بن ولید کے شہر فتح کر لینے کے بعد بیت المقدس میں مسجد عمرؓ[1] تعمیر ہوئی۔ آخر کار انہوں نے دمشق میں وفات پائی جہاں ان کا شاندار مقبرہ آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

مسجد کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد حضرت محمدؐ نئے دین کے لئے احکامات اور ہدایات جاری کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپؐ کو یقین تھا کہ اگر آپؐ صورت حال کو ہوشیاری سے قابو میں رکھ سکیں تو اب ہر بات آپؐ کی موافقت میں تھی۔

ساتویں صدی کے عرب کو ایک اچھے قائد کی ضرورت تھی۔ مصر، شام، فارس اور یونان کی عظیم سلطنتیں یکے بعد دیگرے ختم ہو کر بھلائی جا چکی تھیں۔ سلطنت روما کا شیرازہ بکھرنے والا تھا۔ اور کوئی الیقعم موجود نہ تھی جو اس کی جگہ لے سکے۔ حضرت محمدؐ غالباً خود بھی اس بات سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے کہ دشمنوں کی چال میں چھوڑی عظمت و سطوت کی مشعل کو لے کر آگے بڑھنے کا کام شاید آپؐ کا ہی مقدر بن چکا تھا۔ بلکہ ان گزری ہوئی سلطنتوں کے متعلق بھی شاید آپ کی معلومات سرسری سی ہوں البتہ آپؐ اتنا ضرور جانتے تھے کہ عربوں میں جو اس وقت خود مختار[2] قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک نئے دین کے پھلنے پھولنے کے لئے بے مثال مواقع اور آسانیاں موجود تھیں اور آپؐ کو اس کا بھی یقین تھا کہ اگر آپؐ اس مہم کو صحیح خطوط پر شروع کریں تو آپؐ

---

[1] بیت المقدس جنوری۔ فروری ۶۳۸ء میں فتح ہوا۔ کافی عرصہ محصور رہنے کے بعد عیسائیوں نے اس شرط پر شہر حوالہ کرنے پر رضامندی ظاہر کی کہ خلیفہ اسلام خود وہاں آئیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ بیت المقدس گئے محصورین نے شہر ان کے حوالے کر دیا اس وقت حضرت بلال رضؓ بھی موجود تھے چنانچہ حضرت عمرؓ کی درخواست پر آپ نے وہاں اذان دی جہاں بعد میں مسجد عمرؓ تعمیر ہوئی۔ [2] ملاحظہ ہو نقشہ ۸



نقشہ - ۸
بحر روم
سلطنت روم
فلسطین
دمشق
فارس
المدائن
عراق
دریائے دجلہ
دریائے فرات
بنو غسان
بنو کلب
دومۃ الجندل
تبوک
بنو طے
فدک
تیماء
بنو عامر
بنو تمیم
نجد
خیبر
حجاز
بنو اوس
خزرج
بنو حنیفہ
یمامہ
بنو عبد القیس
خلیج فارس
سلطنت فارس
بنو سلیم
بنو مصطلق
بنو ہذیل
بنو ہوازن
قریش
مکہ
طائف
بنو ثقیف
بنو بکر
عمان
ربع الخالی
نجران
یمن
صنعا
ظفر
عدن
خلیج عدن
حضرموت
بنو کندہ
مہرہ
بحر قلزم
بحر ہند
دریائے نیل
قبل از اسلام
عرب کے خود مختار قبائل
سلطنت فارس و روم کی حدود
HISTORY OF THE ARABS
By PHILIP K. HITTI

ان تمام قبائل کو ایک حکومت کے تحت یکجا اور متحد کر سکتے ہیں۔

چنانچہ اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ تھا کہ آپؐ نے اپنے شروع کے خطبات میں سامعین کو ذہن نشین کرا دیا کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس بات کی آپؐ نے اپنے اس فرمان میں بھی کافی وضاحت کر دی تھی جب انصار اور مہاجرین کو آپس میں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا تھا۔ اسی طرح آپؐ نے اس بات پر بھی بہت زور دیا کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کی مدد کریں اور حسنِ سلوک سے پیش آئیں۔

مسجد کے ایک کھجور کے ستون سے کمر لگا کر اور اپنے عصا پر جھکتے ہوئے آپؐ نے مسلمانوں سے ایسی شفقت اور محبت سے خطاب کیا جس طرح ایک باپ اپنے بچوں کو نصیحت کرتا ہے۔

"جو شخص اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اپنے بچوں سے محبت اور شفقت سے پیش نہیں آتا اللہ بھی اس سے مہربانی کا سلوک نہیں کرتا۔ جو مسلمان ایک دوسرے مسلمان کا تن ڈھانکتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جنت میں سبز حُلّہ بہشتی عطا کرے گا۔"

آپؐ اپنی تقریر میں لوہے، آگ اور پانی کی طاقت کا ذکر فرمایا اور کہا کہ ان سب سے زیادہ طاقت والی چیز خیرات اور نیکی ہے۔ نیکی صرف غریبوں کو خیرات دینے کا ہی نام نہیں بلکہ ایک غم زدہ شخص سے مسکرا کر ملنا بھی صدقہ یا نیکی ہے۔ پیاسے کو پانی پلانا بھی نیکی ہے۔ ایک مسافر مسلمان بھائی کی امداد کرنا بھی نیکی ہے۔ آپؐ نے اپنے سامعین کو یقین دلایا کہ انسان اس دنیا میں اپنے لئے کتنی ہی دولت اور عزت حاصل کر لے وہ اگلی دنیا میں کسی کام نہ آئے گی۔ حساب لینے والا فرشتہ جانوروں کے گلوں، باغات یا دولت کے متعلق نہیں پوچھے گا۔ بلکہ وہ تو یہ سوال کرے گا کہ دنیا میں اپنے مرنے سے پہلے کون کون سی نیکیاں کی تھیں۔

آپؐ نے فرمایا کہ کسی کے ساتھ ہمدردی سے بات کرنا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا حسنِ سلوک۔ روزمرہ کی زندگی میں خوش اخلاقی سے پیش آنا بھی ایک اچھے مسلمان ہونے کی نشانی ہے۔ گھر میں آتے اور جاتے سلام علیک کہنا اور دوستوں اور اجنبیوں کے سلام کا اسی گرمجوشی سے جواب دینا، مہمان نوازی اور تواضع کی روایات کو قائم رکھنا یہ سب باتیں ارکانِ اسلام سے ہیں۔

آج بھی ایک اچھے عرب کی جو امتیازی خصوصیات ایک غیر ملکی کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہیں وہ اس کی نرم گفتاری، رحمدلی اور مہمان نوازی ہے۔ دنیا میں اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں خوش اخلاقی عربوں کی حد تک ہو۔ مزید برآں یہ تواضعات پرخلوص ہوتی ہیں۔ تیرہ سو سال ہو چکے ہیں جب مدینہ میں حضرت محمدؐ نے ان لوگوں کو اعلیٰ اطوار کا جو درس دیا تھا وہ ابھی تک نہیں بھلایا گیا ہے۔ ایک عرب اب بھی اپنے مہمان کی حفاظت اپنی جان تک کو خطرہ میں ڈال کر کرتا ہے اور وہ ابھی تک اپنی آخری کھجور میں بھی اپنے مہمان کو شریک کرتا ہے۔

انہیں روحانی انعام واکرام کے درس دینے کے علاوہ حضرت محمدؐ اپنے پیروکاروں کی زندگی کا عملی پہلو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ آپ نے شروع سے ہی ایسی نئی رسوم کو رواج دینا شروع کیا جو کسی وقت آہستہ آہستہ قانون اور ضابطے کی شکل اختیار کر لیں۔ کھیتی کیلئے پانی کی مستقل اور محفوظ فراہمی کے قاعدے وضع کئے۔ ہر ایک کے لئے لازمی قرار دیا کہ ہر کاٹے ہوئے درخت کے بدلے ایک نیا درخت لگائے۔ آپؐ نے محصولات کا طریقہ بھی وضع کیا۔ تجارتی تجربہ رکھنے کے سبب آپؐ نے اجازت دے دی کہ سرکاری واجبات جنس اور نقد دونوں صورتوں میں ادا کئے جا سکتے ہیں اور اس طریق کار کو صرف زراعتی پیداوار تک ہی محدود نہیں رکھا۔ مثلاً ایک قاعدے کے الفاظ یہ تھے "ہر بالغ ایک دینار یا اسی قیمت کا کپڑا دے۔"

کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات آپؐ سے کچھ غلطیاں بھی ہوئیں۔ ایک واقعہ جس سے ایک ایسی غلطی منسوب کی جاتی ہے یہاں پر نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ اس واقعہ کے بیان کرنے میں آپؐ کے سوانح نگاروں نے کتنی غیر ذمہ داری سے کام لیا ہے۔ اس واقعہ کا ذکر آپؐ کی ان بہت سی سوانح عمریوں میں ملتا ہے جو مغرب والوں نے لکھی ہیں۔ حالانکہ اس سے حضرت محمدؐ یا اسلام پر کوئی حرف نہیں آتا لیکن یہ سوانح نگار حضرات کی بے وقوفی کا ایک نمونہ ضرور ہے۔

مدینہ کے کھجوروں کے درخت سارے عرب میں مشہور ہیں۔ جن کی ایک سو سے زائد قسمیں ہیں اور بعض قسمیں تو اپنی اچھی خوشبو، ذائقے اور گٹھلی کے چھوٹی ہونے کے سبب ساری دنیا میں شہرت رکھتی ہیں۔ البتہ ایک مادہ کھجور کے درخت میں اس وقت تک پھل نہیں لگتا

جب تک کہ اسے مصنوعی طور پر نر کھجور سے پیوند نہ کیا جائے۔ جنوری اور فروری کے مہینوں میں وہ عرب لوگ جو نخوالی کہلاتے ہیں مادہ کھجور کی پھننگ پر چڑھ جاتے ہیں اور دعائیں پڑھ کر نر درخت کے پھول کو الٹا کر کے مادہ کھجور کے کھلے ہوئے پھول میں داخل کر کے دونوں کو یکجا باندھ دیتے ہیں۔ بعض سوانح نگاروں کا کہنا ہے کہ حضرت محمدؐ نے کبھی اس بات کے متعلق نہیں سنا تھا اور جب انہیں یہ معلوم ہوا تو کسی سبب سے انہوں نے ایسا کرنے سے روک دیا نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ کے کھجوروں میں پھل آنا بند ہو گیا بلکہ بعض کھجور تو سوکھ گئے۔

بڑی مایوسی کی حالت میں عرب کے کھجوروں کے تاجروں کا ایک وفد حضرت محمدؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ یقین دلایا کہ وہ اسلام کی ہر لڑائی میں شرکت کریں گے لیکن وہ چاہتے ہیں کہ وہ اس سے پہلے بھوکے نہ مر جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت محمدؐ نے شکایت کو بڑے غور سے سنا اور پھر کوئی شرم محسوس کئے بغیر اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔ آپؐ نے فرمایا؛
"میں بھی آپ ہی کی طرح کا ایک فانی انسان ہوں اور جب میں آپ کو دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اسے مانیں لیکن اگر میں اپنی ذاتی رائے یا خیال کی بنا پر کوئی حکم دوں تو میں بھی صرف ایک فانی انسان ہوں۔"

یہ عرب زندگی کا ایک معمولی اور بے ضرر سا خاکہ ہے لیکن حقیقت میں اس میں کوئی صداقت نہیں۔ کھجوروں کا جس طرح مصنوعی جنسی ملاپ کرتے ہیں یہ تو صحیح ہے لیکن اس میں جس طرح حضرت محمدؐ کو ملوث کیا گیا ہے وہ غلط ہے۔ اگر کوئی اس پر ذرا سا بھی غور کرے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔

کھجور عربوں کی سب سے بڑی غذا ہے اور جو بھی کھجوروں کے تاجروں یا کاشتکاروں کے درمیان پیدا ہوا ہو کھجور کی تناسلی خصوصیت کو ضرور جانتا ہے۔ یہ کہانی بالکل ایسی ہی ہے جیسے کینساس[1] KANSAS کے کسی رہنے والے زمیندار کے متعلق کوئی مشرقی یہ کہے کہ وہ فصلوں کو ادل بدل کر لگانے یا اسی قسم کی بعض اور باتوں سے ناواقف ہے۔

---

[1] KANSAS کینساس ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ایک ریاست ہے جو اپنی زرعی پیداوار کیلئے مشہور ہے۔

حضرت محمدؐ کو مادی اور روحانی دونوں قسم کے مسائل سے واسطہ پڑتا تھا۔ مکہ کی آب و ہوا شدید گرم تھی لیکن خشک ہونے کے سبب وہ صحت کے لئے نسبتاً اچھی تھی۔ اس کے خلاف مدینہ کی سطح نسبتاً بلند تھی اور یہاں پانی اور سایہ دونوں نعمتیں موجود تھیں۔ لیکن گرمی اور سردی دونوں شدید ترین ہوتی تھیں۔ مکہ سے آنے والے مہاجر بیمار رہنے لگے۔ انہیں مختلف قسم کے بخاروں نے گھیر لیا۔ جو شاید نزلہ زکام اور ممکن ہے ملیریا ہو۔ جلدی ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے سے دبی دبی شکایتیں کرنے لگے لیکن حضرت محمدؐ نے فوراً ہی اس کا سدِ باب کر دیا۔ آپؐ نے ایک مرتبہ پھر اسلامی اخوت کی طرف توجہ دلائی اور اس بات پر زور دیا کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آئیں اور تکلیفیں برداشت کرنے کی عادت ڈالیں اور اس طرح کی باتیں کرکے دشمن کو ان لوگوں میں اختلاف پیدا کرنے کا موقع نہ دینے کی اہمیت جتائی۔ آپؐ نے اس بات پر بڑی فصاحت و بلاغت سے خطبہ دیا۔ کیونکہ آپؐ جانتے تھے کہ آپؐ کا اپنا اور ان لوگوں کا مستقبل اسی بات پر منحصر ہے۔ آپؐ کی شخصیت اتنی عظیم اور آپؐ کا جذبہ اتنا پرخلوص تھا کہ جلدی ہی ایسی شکایتوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔

اس شخص کے لئے جو عربوں کو اچھی طرح نہیں جانتا یہ کارنامہ اس سے کہیں زیادہ اہم تھا جیسا کہ ظاہر میں نظر آتا ہے بُنیادی طور پر ایک عرب کسی حکومت یا قانون کے تابع ہو کر رہنا پسند نہیں کرتا۔ اس میں نظم و ضبط کا بھی فقدان ہوتا ہے۔ جب وہ لڑتا ہے یا کوئی کام کرتا ہے تو اپنے ذاتی جوش اور حوصلہ کی بنیاد پر کرتا ہے۔ مل جُل کر کام کرنے کا جذبہ ان میں مفقود ہے۔ قدیم عرب اسی لئے کسی قسم کے کھیلوں میں حصہ لیتے نظر نہیں آتے۔ عرب لوگ دنیا کے بہترین شہ سوار مانے جاتے ہیں لیکن ان کی پولو کی ٹیمیں بنانے کی کوششیں ہمیشہ ناکام رہیں۔ ایک عرب کو پولو کا گھوڑا اسٹک اور گیند دینے کے بعد اسے روکنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی سواری اور نگاہ مغرب کے لوگوں سے بہت زیادہ برتر ہوتی ہے لیکن ایک مرتبہ گیند مل جانے کے بعد وہ اسے کسی دوسرے کو دینے کا روادار نہیں۔

حضرت محمدؐ نے انہی عربوں کو جس طرح تقریباً ایک ناقابل تسخیر جماعت کی شکل میں ڈھال دیا وہ آپؐ کے عظیم معجزات میں سے ایک ہے اور اس تمام عزت و افتخار کی مستحق صرف

آپ کی ذات ہے ۔ کیونکہ آپؐ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی اسلام کئی فرقوں میں بٹ گیا اور بعدازاں حریف خاندانوں[1] میں اور مسلمان ایک دوسرے کو اسی جوش اور جذبے سے قتل کرنے لگے جیسے وہ کافروں کو کرتے تھے۔

مکان کی تعمیر۔ دین کی تبلیغ۔ زراعت کو فروغ دینے اور نزلہ زکام کی شکایتوں کے رفع کرنے کے علاوہ حضرت محمدؐ کے اپنے خاندانی جھگڑے بھی تھے۔

آپؐ کی دو لڑکیاں آپؐ کے پاس نہیں تھیں ۔ حضرت رقیہؓ تا حال اپنے شوہر حضرت عثمانؓ کے ساتھ حبش میں تھیں اور حضرت زینبؓ مکہ میں ۔ ان کے خاوند ابوالعاص نے ان کے والد (حضرت محمدؐ) کو اللہ کا رسول ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اور حضرت زینبؓ کو مدینہ جانے سے روک دیا تھا۔ بیٹیوں کی یہ جدائیاں خصوصاً حضرت زینبؓ کے معاملہ میں جو ابھی مکہ[2] میں تھیں اور جن کو رسول دشمنی میں ہر وقت خطرہ درپیش ہو سکتا تھا۔ آپ کو پریشان رکھتی تھیں ۔ بہر حال آپؐ تنہا نہیں تھے ۔ آپؐ کے ساتھ آپؐ کی فربہ اندام زوجہ حضرت سودہؓ اور آپؐ کی دوسری صاحبزادیاں فاطمہؓ اور ام کلثوم بھی تھیں۔ آپؐ کی کمسن زوجہ حضرت عائشہؓ ابھی تک اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھیں ۔ حالانکہ آپ کی عمر دس سال تھی لیکن آپ اسی تیزی سے جوان ہو رہی تھیں جو عرب عورتوں کا خاصا ہے اور جس کے سبب وہ تیس سال سے پہلے ہی بوڑھی معلوم ہونے لگتی ہیں ۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اور ان کی بیوی کی تجویز کے مطابق حضرت محمدؐ نے شادی کی تکمیل کے طور پر انہیں رخصت کرا کے لے آنے کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت محمدؐ کے اور معاملات کی طرح یہ رسم بھی نہایت سادہ تھی ۔ حضرت عائشہؓ کو نہلا دھلا کر ایک صاف ستھرا لباس پہنایا گیا اور ان کی والدہ اُمّ رمان آپ کو حضرت محمدؐ کے مکان پر لے آئیں ۔ جہاں آپؐ چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے ۔ اور انہیں آپؐ کے زانو پر یہ کہتے

---

[1] بنو ہاشم ۔ بنی امیّہ ۔ بنو عباس ۔ بنی فاطمہ وغیرہ

[2] مدینہ آنے کے سلسلہ میں ابوالعاص کے ایک عزیز نے حضرت زینبؓ سے بدسلوکی بھی کی تھی۔ جس کے سبب آپ کافی دیر تک تکلیف میں مبتلا رہیں ۔

ہوئے بٹھادیا۔" اب یہ آپ کی زوجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپؐ کو اور ان کو اپنی برکتوں سے نوازے۔" یہ مبہم سی دعا دینے کے بعد وہ اور ان کے دوسرے ساتھی واپس چلے گئے۔

پچاس سال کی عمر میں ایک دس سال کی لڑکی سے شادی پر حضرت محمدؐ کے بعض سوانح نگاروں نے اسی قسم کا شور و غوغا کیا ہے جس طرح آپؐ کے آسمانی سفر (معراج) اور مرگی کے دوروں کو موضوع سخن بنا رکھا ہے۔ ان میں سے ہر بات کے متعلق اعتراض کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہر معاملہ کو اپنے معاشرے اور اپنے لوگوں کے رسم و رواج کے نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔ انہوں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا کہ ایشیا میں ایسی شادیوں کی رسم پہلے بھی تھی اور اب بھی عام ہے۔ انہوں نے اس کا بھی ذکر نہیں کیا کہ مشرقی یورپ میں ابھی تک ایسی شادیوں کا دستور موجود ہے اور چند سال پہلے تک اسپین اور پرتگال میں ایسی شادیاں عام تھیں اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دور افتادہ پہاڑی علاقوں میں آج بھی یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھی جاتی۔ رسم اور دستور کے علاوہ انہوں نے اس معاملہ کے خصوصی حالات پر بھی غور نہیں کیا۔

سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کو لیجئے جو لڑکی کے والد تھے۔ وہ مکہ کے ایک خوشحال تاجر تھے لیکن انہوں نے اسلام کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ یہ عام سمجھ بوجھ کی بات ہے کہ وہ اپنے قائد کے ساتھ، جن کا انہوں نے ان کے بُرے دنوں میں بھی ساتھ دیا تھا، ایک مضبوط سیاسی رشتے کے خواہاں ہوں گے۔ ہو سکتا ہے ان مادی اسباب کے علاوہ کچھ اور وجوہات بھی ہوں۔ انہیں حضرت محمدؐ سے بے حد عقیدت تھی۔ ان کی عزت کرتے تھے اور انہیں پسند کرتے تھے۔ اس لئے انہیں یقین تھا کہ ان کی لڑکی کو ان کے دوست کے گھر میں ہر طرح کا آرام[۱] ملے گا۔

اب حضرت محمدؐ کے حالات پر بھی غور کیجئے۔ تاحال انہیں زندگی میں کوئی دلکشی، جوانی کی امنگ یا رنگینی نہیں ملی تھی۔ مسلسل محنت و مشقت ہی کرتے رہے۔ اتنے مصائب جھیلنے اور قتل کی دھمکیاں سہنے کے بعد انہیں کچھ مسرت اور شادمانی کی ضرورت بھی تھی۔ انہوں نے ابھی تک معمول کے مطابق عورتوں سے کبھی حظ نہیں اٹھایا تھا۔ ستائیس سال کی عمر تک آپؐ حضرت عائشہؓ

---

[۱] سب سے زیادہ یہ کہ وہ رسول اللہ کی زوجہ محترمہ ہوں گی اور اُم المومنین کہلائیں گی۔

کی طرح ہی پاکدامن رہے اور پھر شادی بھی کی تو ایک ایسی بیوہ عورت سے جو آپ سے عمر میں پندرہ سال بڑی تھیں۔

تیسری اور سب سے بڑی وجہ، جسے لوگ عام طور پر بھلا دیتے ہیں اور اسی لئے ایک مرتبہ پھر اس کا اعادہ کیا جاتا ہے، یہ تھی کہ عائشہؓ گو عمر میں کم سن تھیں لیکن اتنی ناسمجھ بچہ بھی نہیں تھیں، جنہیں (نعوذ باللہ) ان کی رضامندی کے خلاف ایک عیاش طبع بوڑھے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہو۔

ایک ناکتخدا لڑکی سے شادی کر کے حضرت محمدؐ بہت مسرور ہوئے۔ اب آپؐ نے خود دوسروں کی شادیاں کرانے کا فیصلہ کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک اور جوڑے کو شادی میں متحد کر دیا۔ آپؐ کی صاحبزادی فاطمہؓ اب سولہ سال کی تھیں اور عرب کے دستور کے مطابق وہ بالغ ہو چکی تھیں۔ ادھر حضرت علی کرمؓ جو مسلمانوں کی نئی نسل کی نمائندگی کرتے تھے بائیس سال کے تھے۔ وہ عرب کے عام لوگوں سے قد میں نسبتاً چھوٹے تھے لیکن قوی الجثہ تھے۔ آپ کا سر بڑا۔ ڈاڑھی گھنی۔ آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں۔ چہرے کی خوبصورتی میں اگر کوئی کمی تھی تو وہ آپ کی شجاعت اور وفاشعاری نے پوری کر دی تھی ادھر حضرت فاطمہؓ بھی کوئی بہت زیادہ حسین نہیں تھیں لیکن ورثہ میں ماں سے محبت اور خلوص اور باپ سے بہت زیادہ فراست اور دلکشی پائی تھی۔ رشتہ فطری طور پر بہت مناسب معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس کا کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ بعد ازاں یہ شادی حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں اس قدر فتنہ و فساد کا سبب بن جائے گی جیسا کہ انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم کی پوپ سے بغاوت نے عیسائیوں میں پیدا کر دیا تھا۔

حضرت محمدؐ[1] تو کیا اس وقت اس کا کسی کو بھی خیال نہیں آسکتا تھا کہ ایک روز اسلام دنیا کی قوی ترین طاقت بن جائے گا۔ کوئی ایسی بات سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔ اس وقت کے حالات

---

[1] مصنف کی نظر میں آنحضورؐ کی زندگی کا صرف مادی اور عقلی پہلو ہے۔ اس لئے ایسی بات لکھ گیا ورنہ حضور اللہ کے برگزیدہ ترین نبی تھے اور آپؐ کی نظروں کے سامنے سب کچھ تھا۔

کے تحت ایسا قیاس کرنے کی کوئی بنیاد اور وجہ بھی نہیں تھی کہ اسلام مدینہ کے قرب وجوار سے آگے بڑھے گا۔ حضرت محمدؐ اسلام کی عمارت کی تعمیر اور استحکام میں لگے ہوئے تھے لیکن مال مصالحہ کچھ بہت اچھا نہیں تھا گو آپؐ کی چھوٹی سی جماعت میں ایسے کافی لوگ موجود تھے جو آپؐ کے ایک اشارے پر جان دینے کے لئے تیار تھے لیکن ایسے بھی بہت تھے جو شاکی اور غیر مطمئن تھے اور ایسے ہزاروں عرب تھے جو آپؐ کے دشمن تھے۔ ہزاروں ایسے بھی تھے جنہوں نے کبھی آپؐ کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ پچھلے بارہ مہینوں میں حالت کچھ بہتر ضرور ہوگئی تھی لیکن اسلام کی محبت وعقیدت ابھی تک صرف اصحاب اور دوستوں تک محدود تھی۔ چنانچہ آپ کی شادیاں بڑی سیاسی اہمیت کی حامل ثابت ہوئیں۔

دسواں باب

پہلی لڑائی

(غزوۂ بدر)

(۱۷ رمضان المبارک سنہ ۲ھ یوم جمعہ مطابق دسمبر ۶۲۳ء جنوری ۶۲۴ء)

حضرت محمدؐ نے خیرات اور نیکوکاری پر خطبہ دینے، اپنا گھر اور مسجد تعمیر کر لینے کے بعد کچھ اطمینان کا سانس لیا۔ ان باتوں سے آپؐ کو دین کی اشاعت کے لئے ایک بنیاد تو مل گئی لیکن تاحال تحفظ و استحکام میسر نہ آسکا اور نہ ہی بے فکری سے رہنے کے لئے سرمائے کا بندوبست ہوا تھا۔ سچے دینداروں کے علاوہ اور کسی پر ابھی تک آپؐ کا زور نہ تھا۔

مسلسل تیرہ سال سے آپؐ توہین اور اذیتیں برداشت کرتے رہے تھے اور اس کا انعام مزید تحقیر اور مزید تکلیفیں تھیں۔ مدینہ آجانے کے باوجود آپؐ جانتے تھے کہ چند ماہ تک آپؐ کے دشمن پھر سے آپؐ کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوں گے۔ تیرہ سال تک ظلم و تعدی سہنے اور مصیبتیں جھیلنے کے بعد اب آپؐ نے یک لخت یہ فیصلہ کر لیا کہ اب مزید برداشت سے کام نہ لیں گے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔

یہ قریش ہی تو تھے جن کے سبب آج آپؐ ہر طرح سے قلاش، بے خانماں اور بے یار و مددگار بن کر رہ گئے تھے۔ یہ بات بالکل عیاں تھی اور یہ بھی روزِ روشن کی طرح واضح تھا کہ اس صورتِ حال سے نبٹنے کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ اب قریش کو اپنی حد سے نہ بڑھنے دیا جائے۔ انہوں نے صلح جوئی کی ہر تجویز کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس لئے اب یہ دیکھنا خالی از دلچسپی نہ تھا کہ اگر ادھر سے بھی جارحانہ رویہ اختیار کیا جائے تو اُن کا ردِعمل کیا ہوگا۔

حضرت محمدؐ کے لئے اس بات کی آزمائش کرنا بہت آسان تھا۔ عرب لوگ عملی افراد ہونے

کے ساتھ ساتھ معقول بھی ہوتے ہیں۔ وہ ہر معقول بات کو مان لیتے ہیں بشرطیکہ اس میں معقولیت ہو۔

حضرت محمدؐ کے نئے پیروکار اور پرانے ساتھی اس بات کو ہرگز برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے کہ قریش ان کے قائدؐ کی زندگی اجیرن کر دیں چہ جائیکہ بغیر کسی جوابی کارروائی کے انہیں مسلسل ایسا کرنے دیا جائے اور اس میں بھی کوئی معقولیت نظر نہ آتی تھی کہ خوراک کی کمی کے باعث وہ سب بھوکے مریں اور حقیر سے معاوضے پر کام کریں جبکہ وہ صرف تھوڑی سی کوشش سے اہل قریش ہی سے کافی مال غنیمت حاصل کر سکتے تھے۔ اس طرح مال غنیمت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ جو اس وقت عرب لوگوں کے نزدیک روزی کا ایک جائز ذریعہ تھا، وہ اہل مکہ سے بدلہ بھی لے سکتے تھے کیونکہ یہ تمام مصیبتیں ان ہی کی تولائی ہوئی تھیں۔

چنانچہ حضرت محمدؐ نے اپنی حکمتِ عملی کا دوسرا قدم اٹھایا وہ ان سب لوگوں کے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا اور اس کام کے لئے آپؐ کے پاس صحیح قسم کے لوگ بھی تھے۔ یہ عرب لوگ خواہ وہ خانہ بدوش ہوں یا شہری، غیر مہذب نہیں تھے وہ شاعری اور موسیقی کے بھی اتنے ہی دلدادہ تھے جتنے جنگ اور مال غنیمت کے۔ البتہ وہ کوئی کام کرنا پسند نہ کرتے تھے اور اگر وہ کسی اور ذریعہ سے وافر روزی حاصل کر لیں تو کام سے جی چراتے تھے۔ حضرت محمدؐ یہ خوب جانتے تھے کہ یہ شمشیر زن لوگ نہایت اچھے سپاہی بنائے جا سکتے تھے اور اہل قریش پر یہ اچھی طرح واضح کیا جا سکتا تھا کہ اب تک آپؐ کو پے در پے اذیتوں اور ایذاؤں نے عاجز کر رکھا تھا لیکن اب وہ ان کے کیمپ میں جا کر ان کو لڑائی کے لئے للکار سکتے تھے۔

حضرت محمدؐ کے اس جارحانہ اقدام کے کچھ اور اسباب بھی تھے۔ آپؐ کو ایک قومی خزانہ (بیت المال) قائم کرنے کا بھی کچھ بندوبست کرنا تھا۔ نہ آپؐ کے پاس اتنا سرمایہ تھا اور نہ ہی آپؐ کے کسی خوش حال مہاجر کے پاس۔ کیونکہ ان لوگوں کی تجارت، ان کے جانوروں کے گلے، ان کے مکانات اور اُن کی جائیدادیں سب کے سب اہل مکہ نے ضبط کر لئے تھے۔ دوسرے یہ کہ اسلام کو فروغ دینے اور لوگوں کو طمانیت بہم پہنچانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ انہیں کچھ رقم بھی دی جائے اور خوراک مہیا کرنے کے علاوہ ان کو مصروف بھی رکھا جائے۔ ان مہمات نے دونوں مسئلے حل کر دیئے۔

حضرت محمدؐ کے طاقت استعمال کرنے کا ایک سبب خود قریش تھے۔ آپؐ کے خلاف ابوجہل کی دشمنی کے جنون میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ مسلسل حملہ آور جماعتیں بھیج رہا تھا۔ جو مسلمانوں کی چھوٹی اور بکھری ہوئی جماعتوں پر چھپ کر حملے کرتے رہتے تھے۔ اس نے چند اچانک حملے مدینے کے قرب وجوار میں بھی کیے اور کھیتوں اور باغات کو نقصان پہنچایا۔ اس کا مقصد حضرت محمدؐ پر یہ واضح کر دینا تھا کہ آپؐ کے متعلق اس کے خیال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور اس کے ارادے اب بھی اتنے ہی خونیں اور قاتلانہ تھے۔ دونوں فریقوں کی نظر میں اس کا ایک ہی حل تھا یعنی لڑ کر فیصلہ کر لیا جائے۔

یہ فیصلہ کر کے حضرت محمدؐ ایک ایسا اصول وضع کر رہے تھے جو آئندہ چل کر دین اسلام کا ایک باضابطہ عقیدہ بن گیا۔ یعنی جہاد یا مذہبی جنگ، جو اگرچہ مذہبی طور پر فرض نہ تھا لیکن اس جذبے نے آئندہ زمانے میں اسلام کو دنیا کے گوشے گوشے تک لے جانے میں وہ کام کیا جو کسی اور ذریعہ سے نہیں ہو سکتا تھا۔

لیکن تقریباً ہر معاملے کی طرح جو آپؐ نے کیا یا کرنے کا حکم دیا یہاں بھی آپؐ صحیح اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ کافروں سے نمٹنے کے لئے اس طریقہ کار کی اجازت دینے کے آئندہ چل کر کتنے دور رس نتائج اور اثرات ہوں گے۔ یقینی طور پر اس وقت آپ یہ کیسے دیکھ سکتے تھے کہ مستقبل بعید میں تلوار کے قانون کا استعمال کس طرح کیا جائے گا۔ اس وقت تو فوری طور پر جو کچھ آپؐ کر رہے تھے اس کا ابتدائی محرک تو وہ رنج وغصہ تھا جو ان لوگوں کے خلاف تھا جن سے آپؐ اس کے سوا کسی شے کے طلب گار نہ تھے کہ وہ آپؐ کی بات سنیں لیکن بدلے میں ان سے توہین اور اذیتوں کے علاوہ اور کچھ نہ ملا اور یہ قدم اس وجہ سے بھی اٹھانا پڑا کہ اپنے لوگوں کو کپڑا، خوراک اور اسلحہ فراہم کرنا تھا اور دوسرے قبائل کا تعاون بھی حاصل کرنا تھا۔ ایک ایسے عرب ہونے کے سبب جو صحرا کے لوگوں میں بہت پھرا ہو آپؐ جانتے تھے کہ قبائلی لوگ ایسے دین کو جلد قبول کریں گے جس میں نفع رساں لڑائی اور جنگجوئی بھی شامل ہو۔

حضرت محمدؐ پر جہاد کی تعلیم دینے کے سلسلے میں بڑے اعتراضات کئے گئے ہیں۔ خصوصاً ان سوانح نگاروں نے جو آپ کو (نعوذ باللہ) اچھوتا نبی، خیال کرتے ہیں، آپؐ پر بڑے حملے کئے ہیں اور ایسا ظاہر کیا ہے گویا مذہبی جنگ کی تبلیغ پہلے پہل آپؐ نے ہی کی ہے۔ غالباً وہ لوگ یہ بھول

جانتے ہیں کہ بہت قدیم زمانے سے زیادہ تر لڑائیوں کا اصل یا ثانوی محرک مذہب ہی رہا ہے۔

اگر حضرت محمدؐ نے عہد نامہ عتیق (زبور و توریت) کا مطالعہ کیا ہوتا تو آپؐ فوراً دیکھ لیتے کہ دو ہزار سال قبل حضرت موسیٰؑ نے بھی مذہبی جنگیں لڑی تھیں[1] اور وہ علاقے اہل قریش سے ہونے والی جنگ کے مقام سے کوئی بہت زیادہ دور نہ تھے۔ اگر اور آگے بڑھتے تو آپؐ کو معلوم ہو جاتا کہ اسرائیلی ججوں اور بادشاہوں نے مذہب کے نام پر جنگیں لڑنے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔ آپؐ یہ بھی جان لیتے کہ ان لڑائیوں میں اس قدر قتل عام ہوا تھا کہ حضرت محمدؐ کی اپنی لڑائیوں میں زخمیوں اور مقتولین کی تعداد ان کے مقابلے میں صرف ایسی نظر آتی جیسے کسی فٹ بال کے میدان میں ایک دو حادثے ہو جائیں۔ آپؐ کو یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ قدیم عبرانیوں نے مذہبی جنگوں کے اصول (قواعد) اتنے سخت بنائے تھے کہ نہ اس سے پہلے کبھی تھے اور نہ ہی بعد میں ہوئے۔

حضرت محمدؐ کو صرف خون بہانے اور قتل و غارت کے لیے جنگ کرنا ہرگز پسند نہ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ہر کافر قیدی کے سامنے دو باتیں رکھی جاتی تھیں۔ وہ یا تو زرِ فدیہ ادا کرے اور آزاد ہو کر گھر چلا جائے یا پھر اسلام قبول کر لے۔ قرآن کہتا ہے[2]

"جب حُرمت کے مہینے ختم ہو جائیں تو مشرکوں کو قتل کرو جہاں بھی ان کو پاؤ لیکن اگر وہ توبہ کر لیں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کو چھوڑ دو ......" (سورہ توبہ)

---

[1] یہ جنگیں حضرت موسیٰ نے عمالقیوں، اموریوں، حتیوں، حویوں اور کنعانیوں کے خلاف لڑیں۔ جن میں قوم کی قوم اور عورتوں اور مردوں کو قتل کر دیا گیا۔ پرانے عہد نامے کی کتاب استثنا کے بیسویں باب سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ "ان قوموں کے شہروں میں جن کو تیرا خدا میراث کے طور پر تجھ کو دیتا ہے کسی ذی نفس کو جیتا نہ چھوڑنا۔ بلکہ ان کو یعنی حتی۔ اموری۔ کنعانی۔ فرزّی اور یبوسی قوموں کو جیساکہ تیرے خداوند نے حکم دیا ہے بالکل نیست و نابود کر دینا تاکہ وہ تم کو اپنے مکروہ کام کرنا نہ سکھائیں۔" یہ جنگیں زیادہ تر فلسطین اور بحیرۂ قلزم کے ساحلی علاقوں میں ہوئیں جو بدر کے مقام سے زیادہ دور نہ تھے۔

[2] پوری آیت اس طرح ہے "فاذا انسلخ الاشھر الحرم .... ان اللہ غفور الرحیم" (سورہ توبہ)

ایک اور جگہ کہا ہے۔ "لا اکراہ فی الدین" "دین میں کوئی جبر نہیں"

اگر قیدی اسلام اختیار کر لیتا تو اسے فوراً دوسرے مسلمانوں کی طرح تمام روحانی اور مادی رعایتیں دی جاتی تھیں۔ یہ طریقہ کار اختیار کرنا یقینی طور پر حضرت محمدؐ کے اپنے مفاد میں تھا لیکن بایں ہمہ ایک یا دو موقعوں کے سوا آپؐ نے ہارے ہوئے دشمن سے بیدردی کا سلوک نہیں کیا۔ آپؐ اگر انتقام لینے کو اپنی تعلیم کا جزو بنا لیتے تو بھی یہ اس زمانے کے دستور کے عین مطابق ہوتا اور اس وقت کے عیسائی مذہب کے اور بہت بعد کے اخلاقی اصولوں سے بھی مطابقت رکھتا۔

جب ۱۰۹۹ عیسوی میں صلیبی جنگ لڑنے والے عیسائیوں نے بیت المقدس پر حملہ کیا تو انہوں نے ہر جگہ قتل و غارت کیا اور تباہی مچادی تھی لیکن جب سلطان صلاح الدین نے حملہ کر کے عیسائیوں کو وہاں سے بیدخل کیا تو اس نے کوئی انتقامی کارروائی نہ کی۔[1]

اور نہ ہی مسلمانوں نے دوسرے مذہبی جنگجوؤں کی طرح ان ممالک کو تباہ و ویران کیا جن پر انہوں نے یلغار کی۔ وہ جہاں بھی گئے حالات میں پہلے سے کچھ بہتری ہی ہوئی اور جہاں انہوں نے تاخت کی وہاں اس علاقے کو ایک ابر باراں کی طرح بہت جلد زرخیز و شاداب بنا دیا اور حضرت محمدؐ کے عہد کے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں نے ان ممالک کو عربی تہذیب و تمدن کی مشعل روشن کر کے اس وقت نشاۃ ثانیہ عطا کی جبکہ یورپ ابھی زمانہ وسطیٰ کی تاریکیوں کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا اور دمشق۔ فیض (مراکش) سیول، غرناطہ اور قرطبہ (اسپین) میں فن تعمیر کے شاہکار بالواسطہ نتائج ہیں۔ اس روایت کے جس کا آغاز حضرت محمدؐ نے ۶۲۳ عیسوی میں مسجد تعمیر کر کے کیا تھا۔

حقیقت میں جنگ حضرت محمدؐ کے لئے ناگزیر اور مصلحت کا تقاضا تھی جو بعد میں سود مند بھی ثابت ہوئی۔ لیکن آپؐ ان عرب حملہ آوروں کی طرح نہ تھے جنگ کرنا اور خون بہانا جن کی عادت ثانیہ بن چکی تھی اور اگر قریش آپؐ کو اپنے دین کی پرسکون تبلیغ کے لئے تھوڑا سا بھی موقعہ

---

[1] سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو ۱۱۸۷ء میں دوبارہ تقریباً ایک سو سال بعد فتح کیا ایسے لوگوں کی عام معافی اور جان بخشی کرنا جنہوں نے مسجد اقصیٰ میں گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون بہایا تھا ایک ایسا کارنامہ ہے جو تاریخ عالم میں فقید المثال ہے پھر بیت المقدس، ۱۱۸۷ء سے لے کر ۱۹۶۷ء تک یعنی اسرائیلی عرب جنگ تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔ (مترجم)

دے دیتے تو لڑائی کا خیال بھی آپؐ کے دل میں نہ آتا۔

اس وقت تک حضرت محمدؐ کسی سے نہ لڑے تھے یہاں تک کہ کبھی ہاتھا پائی بھی نہ کی تھی۔ نہ آپؐ نے کبھی فوج کی سالاری کی تھی اور نہ ہی فن لشکر کشی کی تربیت حاصل کی تھی۔ لے دے کر اس ضمن میں آپؐ کا تجربہ صرف اتنا تھا کہ سولہ سال کی عمر میں ایک دفعہ ایک قبائلی جنگ[1] میں آپؐ اپنے چچا کے تیر لے کر ان کے ساتھ گئے تھے۔ نہ آپؐ کے پاس مسلح اور جنگ آزمودہ سپاہی تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ جانتے تھے کہ اگر اپنے آپؐ کو اور اپنے دین کو زندہ رکھنا ہے تو آپؐ کو لازمی طور پر لڑائی کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ اور یہ بھی کہ اگر قریش نے مدینہ پر حملہ کیا اور وہ کامیاب ہو گئے تو اسلام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ آپؐ نے چھاپہ مار دستے بھیجنا شروع کر دیئے جس نے مسلمانوں میں جنگ کا حوصلہ پیدا کیا اور اس کے ساتھ ہی انہیں ہتھیاروں کے استعمال کا عادی اور مشاق بنا دیا۔ کبھی یہ چھاپہ مار دستے حضرت حمزہؓ یا ابو عبیدہؓ کی سرکردگی میں جاتے اور کبھی خود حضرت محمدؐ سالار ہوتے۔

لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضرت محمدؐ نے فوجی معاملات میں کوئی تجربہ نہ رکھنے کے باوجود ہر چھوٹی جھڑپ اور بڑی لڑائی میں، جن میں آپؐ نے حصہ لیا ایک جنرل ہونے کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ آپؐ بہادر بھی تھے اور عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اپنے نوجوان سپاہیوں کے ساتھ ہر صعوبت اور تکلیف برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ حقیقتاً حضرت محمدؐ نے عرب کے تپتے ہوئے صحراؤں میں جس طرح پرصعوبت سفر کئے اور لڑائیاں لڑیں خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ کم از کم آپؐ کے متعلق مرگی کے دوروں کی کہانیاں قطعی من گھڑت یا مبالغہ آمیز ہیں۔

بہر حال دشمن پر چھوٹے چھوٹے حملوں اور جھڑپوں کے باوجود ابھی تک قریش سے کوئی انتقامی لڑائی نہیں لڑی گئی تھی اور نہ ہی ان کا کوئی مالدار قافلہ روکا جا سکا تھا۔ اسلام کا وقار بلند

---

[1] یہ اشارہ حرب الفجار کی طرف ہے جو چار سال تک جاری رہی تھی اور آپؐ اپنے چچا الزبیر کے ساتھ کئی مرتبہ گئے۔ شروع میں آپؐ صرف تیر اٹھا کر انہیں دیتے رہے اور بعد میں خود آپؐ کے قول کے مطابق کبھی کبھی تیر بھی چلائے۔

کرنے اور اسلامی خزانے (بیت المال) کو پُر کرنے کے لئے حضرت محمدؐ کو ایک بڑی کامیابی کی ضرورت تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مکّہ والے اپنے شہر سے زیادہ دور کسی مقام پر کوئی فیصلہ کن لڑائی لڑنے کا خطرہ مول نہ لیں گے اور نہ ہی حضرت محمدؐ ہی ابھی اتنے طاقتور تھے کہ اپنی جگہ سے دور جا کر لڑتے لیکن آپؐ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر جلد ہی قریش کو کسی جگہ اچانک نہ جا لیا گیا تو صورت حال زیچ ہو کر رہ جائے گی۔ ایسا کرنے کے لئے آپ نے ایک چال چلی۔ جسے آپؐ کی تعریف کرنے والوں نے نظر انداز کیا ہے لیکن آپؐ کے بدنام کرنے والوں نے خوب اچھالا ہے۔

رجب کے مقدس مہینے میں، جس کے دوران تمام عرب لوگ ایک ان کہی رضامندی کے طور پر ہر قسم کی لڑائی اور لوٹ مار سے مجتنب رہتے تھے، حضرت محمدؐ نے ایک شخص عبداللہ بن حجشؓ اور کچھ بادیہ[1] نشینوں کو مدینے سے روانہ کیا۔ ان کے ضابطے کے فرائض مکے اور طائف کے درمیان جاسوسی کرنا اور یہ دیکھنا تھا کہ دشمن اس وقت کیا کر رہا تھا لیکن اصل ہدایات حضرت محمدؐ کی جانب سے دیئے ہوئے ایک مہر شدہ خط میں تھیں۔ جو حضرت عبداللہ کو مدینہ سے روانہ ہونے کے دو روز بعد کھولنا تھا اور اسے پڑھنے کے بعد اپنی سمجھ کے مطابق اس پر عمل کرنا تھا۔

خط میں دی ہوئی ہدایات[2] پر عبداللہ بن حجشؓ حیران رہ گئے۔ انہیں اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ کسی بھی قریشی قافلے پر جو سامنے آئے، حملہ کر سکتے تھے۔ البتہ اس خط میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا کہ رجب کے مہینے میں جنگ و جدال منع ہے لیکن یہ بھی ناقابل یقین بات تھی کہ ایک سابق مکّی (آنحضورؐ) بت پرستی کے ماحول کی ایک ایسی روایت کو نظر انداز کر دیتے جس میں وہ پلے بڑھے ہوں۔

---

[1] اس مہم میں حضرات عبداللہ بن حجشؓ۔ عمار بن یاسرؓ۔ ابو حذیفہ بن عتبہؓ۔ سعدؓ بن ابی وقاص۔ عامر بن فہیرہ۔ واقد بن عبداللہ۔ عتبہؓ بن غزوان اور سہیل بن بیضاؓ شامل تھے۔ قیادت حضرت عبداللہؓ بن حجشؓ کی تھی۔ (طبری)

[2] ہدایات یہ تھیں کہ یہ تحریر پڑھنے کے بعد مکّہ اور طائف کے درمیان (بطن نخلہ) کا رخ کرنا۔ وہاں قریش کے قافلے کا انتظار کرنا اور اس کے حالات کا پتہ لگا کر خبر دینا

(حیات محمد۔ سیرت النبی)

عبداللہ نے یہ ہدایات اپنے ساتھیوں کو بھی بتا دیں جنہوں نے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے بغیر غنیمت حاصل کرنے کا یہ اچھا موقع تھا چنانچہ اس فیصلے کے نتیجہ میں عربوں کی ایک جماعت کو جو رجب کے مہینہ کے دوران اپنے آپ کو محفوظ خیال کرتے ہوئے غافل چلی آ رہی تھی گھات لگا کر لوٹ لیا۔

اس قدیم روایت کو توڑنے پر ایک تہلکہ مچ گیا۔ یہاں تک کہ خود مدینہ میں بھی اس بات کو اتنا ناپسند کیا گیا کہ حضرت محمدؐ کو یہ کہنا پڑا کہ ان کا خیال تھا کہ عبداللہؓ انتظار کریں گے اور رجب[1] کا مہینہ ختم ہونے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائیں گے اور اس ذمہ داری سے انکار کی تصدیق کے طور پر آپؐ نے اس مال غنیمت میں سے کوئی حصہ لینے سے انکار کر دیا۔[2]

اصل[3] بات کیا تھی یہ تو شاید کوئی کبھی نہ جان سکے لیکن اس سے دو باتیں ضرور نکلتی ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا حضرت محمدؐ قطعی طور پر لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے؟ اور اگر آپؐ خود چند ہدایات بھی نہیں لکھ سکتے تھے تو آپؐ کے گھر میں یا آپؐ کے عملے میں کون ایسا بھروسے کا آدمی تھا جس نے یہ قابل اعتراض حکم لکھا ہوگا۔ ابو بکرؓ، حمزہؓ یا علیؓ کہیں سے کوئی بھی اگر یہ جانتا کہ آپؐ کا منشا کیا ہے تو وہ یقینی طور پر اعتراض کرتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جنگ کے اصولوں کے متعلق آپ کی حکمت عملی اپنے وقت اور زمانے سے بہت آگے تھی۔ ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا تھا۔ جنگ[4] آخر کار ایک دھوکے کا کھیل ہی

---

[1] یہ واقعہ رجب کی آخری تاریخ کو رات کے پیش آیا۔ اسی رات سے شعبان کا مہینہ شروع ہو رہا تھا چنانچہ قریش کہتے تھے کہ یہ خونریزی رجب کے مہینے میں ہوئی اور مسلمان کہتے تھے کہ یہ اقدام شعبان میں کیا گیا۔ قریش کا ایک سردار عمر بن الحضرمی اسی لڑائی میں مارا گیا اور اس کا قتل جنگ بدر کا پیش خیمہ بن گیا۔ (حیات محمد)

[2] جب غنیمت کا مال پیش ہوا تو آنحضورؐ نے فرمایا میں نے تم کو یہ اجازت نہیں دی تھی۔ غنیمت کا حصہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ صحابہ بھی بہت برہم ہوئے۔" [3] خط کی اصل ہدایات اوپر بتا دی گئی ہیں۔ (سیرت النبی)

[4] طبری نے ابن اسحق سے روایت کی ہے کہ آنحضورؐ نے نعیم بن مسعودؓ سے جنگ خندق کے دوران فرمایا کہ لڑائی چال سے سر ہوتی ہے۔ ہم سے علیحدہ ہو جاؤ اور کوئی تدبیر نکالو۔

تو ہے۔ جنگ کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار میکیاویلیؒ نے آپؐ کی وفات کے نوسو سال بعد، نپولینؒ نے اس سے دو سو سال بعد اور جاپانیوں نے صرف چند سال قبل کیا ہے اور وہ سب اپنی جگہ درست تھے۔ کیونکہ اگر جنگ کسی مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ تو پھر ذریعہ کے متعلق جھگڑا کیسا۔

بہرکیف ابھی تک حضرت محمدؐ کا مقام اس معاملے میں میکیاویلی یا نپولین جتنا بلند نہیں ہوا تھا چنانچہ جب پہلا شور وغل کچھ کم ہوا تو آپؐ نے ایک ایسا راستہ اختیار کیا جو آپؐ کو آئندہ ہمیشہ ایسے گومگو کے حالات میں اختیار کرنا تھا یعنی آپؐ نے بارگاہ خداوندی سے رجوع کیا اور ایک وحی نازل ہوئی۔ اس وحی میں اور اس کے بعد آنے والی متعدد وحی میں اللہ تعالیٰ کی ہدایات اس معاملے کے متعلق نازل ہوئیں جس نے رسول اللہ کو پریشان کر رکھا تھا۔ آپؐ کی پریشانی دور ہو گئی۔ وہ روایت یہ ہے۔

"یسلونک عن الشھر الحرام......... والفتنۃ اکبر من القتل (سورۃ بقر آیت ۲۱۱)

ترجمہ :۔ اے رسول لوگ آپؐ سے حرمت والے مہینے میں جنگ کرنے کے متعلق پوچھیں گے آپ کہہ دیں کہ اس ماہ میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی راہ سے لوگوں کو روکنا اور اللہ کو نہ ماننا اور مسجد حرام سے روکنا اور وہاں سے لوگوں کو نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے اور فتنہ پھیلانا تو قتل سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے" (سورہ بقر۔ رکوع۔ ۲۷)

۱؎ میکیاویلی MACHIAVELLI سولھویں صدی میں ایک مشہور اطالوی سیاستدان گزرا ہے۔ جس نے حکمرانوں کے لئے سیاست پر ۱۵۱۳ء میں ایک مشہور کتاب THE PRINCE لکھی۔ حکمرانوں نے اس کتاب کو ہر زمانے میں بڑی اہمیت دی ہے۔

۲؎ نپولین بوناپارٹ۔ انقلاب فرانس کے بعد ایک مشہور جرنل کی حیثیت سے ابھرا اور ۱۸۰۴ء میں فرانس کا شہنشاہ بن گیا۔ روس اور برطانیہ کے سوا تمام یورپ فتح کر لیا لیکن ۱۸۱۵ء میں اتحادیوں سے شکست کھائی اور ۱۸۲۱ء میں سینٹ ہیلینا میں قیدی کی حیثیت سے وفات پائی۔

گو اس وحی نے حضرت عبداللہ بن جحش رضؓ کو الزام سے بری کر دیا اور حضرت محمدؐ اور مدینہ والوں کے دل کی خلش بھی دور کر دی لیکن اہل قریش کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ روز بروز وہ اپنے سابق ہموطنوں کے غیر مصالحانہ رویہ پر زیادہ سے زیادہ مشتعل ہوتے جا رہے تھے۔ خونریزی کا فتنہ سر اٹھا رہا تھا۔ بس ایک چھوٹا سا بہانہ درکار تھا، جو ان کو حضرت محمدؐ کے خلاف لشکر کشی پر آمادہ کر دیتا اور جو آپؐ کو اپنی طاقت آزمانے کے لیئے ایک لڑائی کا موقعہ فراہم کر دیتا۔ یہ چھوٹی سی بات جس کے بعد ازاں دوسرے اور دوررس نتائج بھی نکلنے تھے۔ جلد ہی وقوع پذیر ہو گئی۔

۶۲۳ عیسوی کے اواخر میں آپؐ کو معلوم ہوا کہ ابوسفیان لاکھوں دینار قیمتی مال سے لدے ہوئے ایک ہزار سے زائد اونٹوں کا قافلہ لے کر شام سے واپس آ رہا ہے اور یہ کہ وہ مدینہ سے نسبتاً قریب ایک مقام سے گزرے گا۔ آپؐ نے جلدی سے تین چار سو کے درمیان نفری ستر اونٹ، چند گھوڑے اور خچروں کا بندوبست کیا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ ان میں کچھ غیر مسلم بھی مال غنیمت کے لالچ میں شامل ہو گئے ہیں تو آپؐ نے مجاہدین کی تعداد گھٹا کر تین سو کر دی۔ یہ بے سروسامان لوگوں کی ایک چھوٹی سی جماعت تھی جن میں بیشتر کے پاس زرہ بھی نہ تھی۔ اور سواری کی کمی کے باعث باری باری اونٹوں پر سفر طے کر رہے تھے۔ مسلمانوں کا رسالہ جسے بعد میں بڑی شہرت حاصل ہوئی صرف دو گھوڑوں سے شروع ہوا تھا۔

ا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قریش ایک ہزار کا لشکر لے کر مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آ رہے ہیں۔ (سیرت النبی)

۲ البراء سے مروی ہے کہ اہل بدر کی تعداد اتنی ہی تھی جتنی جالوت کے مقابلے میں طالوت کے لشکر کی تھی یعنی تین سو دس سے کچھ زائد تھی اور کوئی غیر مسلم نہ تھا۔ ان میں ساٹھ مہاجرین اور دو سو چالیس سے کچھ زائد انصار تھے۔ عبیدہ رضؓ اور ابن عباس رضؓ سے مروی ہے کہ تعداد تین سو تیرہ تھی اور اسی پر اجماع ہے (طبقات ابن سعد واقدی)

۳ خود نبی کریم صلعم کی سواری کے اونٹ میں حضرت علی کرمؓ اور مرشد غنوی اور ایک اور صحابی شریک تھے اور باری باری اونٹ پر سوار ہوئے تھے۔ حیات محمدؐ کے بیان کے مطابق آنحضورؐ ۸ رمضان اور "سیرت النبی" کے مطابق ۱۲ رمضان ۲ ھ کو مدینہ سے روانہ ہوئے اور ۱۷ رمضان کو بدر کے مقام پر پہنچ کر پانی کے چشموں پر قبضہ کر لیا۔

ابوسفیان کو بھی کسی نہ کسی طرح حضرت محمدؐ کے ارادوں کا علم ہو گیا اور اس نے اپنے قافلے کو بڑی شاہراہ سے ہٹا کر اس کا جھکاؤ بحیرہ قلزم کی طرف کر دیا۔ اس کی چال سے قافلہ مدینے والوں کی گھات سے بچا رہا اور اس سے پہلے کہ انہیں اس کا علم ہو ان کی زد سے نکل گیا۔ البتہ بنظر احتیاط اس نے ایک قاصد کو یہ خبر لے کر مکّہ روانہ کر دیا کہ حضرت محمدؐ بذات خود اس قافلے کو لوٹنے کے لئے میدان میں نکل آئے ہیں۔

قاصد[1] نے تیزی سے منزلیں طے کیں اور سفر کرتے ہوئے اس نے اپنے ذہن میں ابوسفیان کے پیغام کی اہمیت میں بہت کچھ اضافہ کر لیا اور مکّہ تک پہنچتے پہنچتے اس پر ہیجان کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اپنے آپ کو اونٹ سے تقریباً گراتے ہوئے وہ ڈرامائی انداز میں کعبہ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنے ناک[2] اور کان کاٹ ڈالے۔ یہ ایک بڑی آفت اور مصیبت کی نشانی تھی۔ چنانچہ مکّے کے تمام سربرآوردہ لوگ اپنے اپنے کام چھوڑ کر دوڑتے ہوئے آکر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ڈاڑھی پر بہتے خون کے ساتھ اس نے چلا چلا کر دہائی دی "مدد۔ مدد، اے اہل قریش۔ حضرت محمدؐ تمہارے کارواں کا تعاقب کر رہے ہیں"۔

اس خبر کا اثر فوری ہوا۔ خطرے کا اعلان ہونے کے ایک گھنٹے کے اندر اندر ایک ہزار جوشیلے افراد مع سات سو اونٹ اور ایک سو گھوڑوں کے جمع ہو کر شور مچانے لگے کہ قافلے کے قیمتی مال و متاع لوٹ لئے جانے کے علاوہ اب تو ہمیں قافلے کے ان تمام لوگوں کا بدلہ لینا ہے جن کے قتل کی خبر آئی ہے۔ ابوجہل بن ہشام، جو اب ستر سال کا ہو چکا تھا لیکن ابھی تک قوی الجثہ اور تنومند تھا، پہلا شخص تھا جو سب سے پہلے مسلح ہوا۔ اسے کامل یقین تھا کہ وہ اس مرتبہ ضرور حضرت محمدؐ کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اب قافلے کے لوٹ لئے جانے کی خبر کی

---

[1] اس قاصد کا نام ضمضم بن عمرو غفاری تھا۔ بحقیقت یہ ہے کہ ابوسفیان نے یہ قاصد شام سے روانگی کے وقت ہی مکّہ بھیج دیا تھا تاکہ بوقت ضرورت قافلے کی کماحقہ حفاظت ہو سکے اور اگر مسلمان حملہ کریں تو اس کا تدارک ہو سکے۔

[2] صاحب "حیات محمدؐ" نے لکھا ہے کہ ضمضم نے اضطراب میں اپنے اونٹ کے کان کاٹ ڈالے اور ناک چیر دی۔ کجاوہ الٹ دیا اور اونٹ پر کھڑے ہو کر دہائی دی۔ آفت رسیدہ اور فریادی لوگ ایسا ہی کرتے تھے۔

تصدیق آئے نہ آئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ انتقام لینے کے لئے اس سنہری موقعہ کو کیوں چھوڑا جائے۔ رات ہونے سے پہلے پہلے لشکر کو روانگی کا حکم مل چکا تھا۔

صحرا میں خبریں بڑی پراسرار تیزی سے سفر کرتی ہیں۔ چنانچہ اسی وقت حضرت محمدؐ کو بھی معلوم ہو گیا کہ قافلہ بچ نکلا ہے اور ابوجہل ایک بڑا لشکر لے کر روانہ ہو چکا ہے۔ تعداد کے فرق کے باوجود حضرت محمدؐ نے لڑنے اور اپنے مستقبل، اپنی ساکھ اور غالباً اپنی زندگی کو اس لڑائی میں داؤ پر لگا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ البتہ آپؐ کے کچھ لوگوں نے ضرور خوف و اضطراب کا اظہار کیا۔

اسلام کی منظم اور باقاعدہ جنگوں سے پہلے لوٹ مار تمام عرب لوگوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ لیکن قتل اور خونریزی میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور خود قتل ہو جانے کی صورت کو تو بالکل پسند نہ کرتے تھے۔ حضرت محمدؐ نے ان کے حوصلے بلند کئے اور انہیں یقین دلایا کہ اللہ تعالیٰ انہیں فتحیاب کرے گا۔ لیکن پھر بھی کچھ لوگ ایسے تھے۔ جنہوں نے عربوں کے عام خیال کے مطابق تجویز پیش کی کہ کیا یہ زیادہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم لڑائی نہ لڑیں اور اپنے لوگوں کو کسی بہتر اور زیادہ مفید مواقع کے لئے بچا کر رکھیں۔ کیونکہ اگر ہم لڑائی میں مارے گئے تو ہمیں کیا فائدہ ہو گا۔ حضرت محمدؐ نے بلا تامل جواب دیا۔ "جنت"۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ایک قطرہ خون بہانا اور ایک رات مسلح رہ کر گزارنا دو مہینے کے روزوں اور نمازوں سے زیادہ ثواب کا حامل ہے۔ جو شخص اللہ کے راستے میں لڑ کر شہید ہوتا ہے اس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اور قیامت کے روز اس کے زخم شنگرف کے مانند سرخ اور تابناک ہو جائیں گے اور ان سے مشک جیسی خوشبو آئے گی اور ان کے کھوئے ہوئے بازو فرشتوں کے پروں[ل] سے تبدیل کر دیئے جائیں گے۔

اس بنیادی عقیدے نے مسلمان مجاہدین کے پہلے منضبط گروہ کے خیالات کا دھارا یکسر بدل کر رکھ دیا اور اس تصور نے لوگوں کی بہادری میں اضافہ کرنے، تکالیف اٹھانے، تکان

ل یہ الفاظ آپ نے حضرت جعفر طیارؓ کی جنگ موتہ میں شہادت کے موقعہ پر کہے۔ جن کے دونوں بازو قلم ہو گئے تھے آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو پر عطا کر دیئے ہیں اور وہ جنت میں اڑتے پھرتے ہیں اسی نسبت سے انہیں جعفر طیار یا اڑنے والے جعفر کہا جاتا ہے۔ (حیات محمدؐ)

برداشت کرنے، یہاں تک کہ اپنی جان تک کی پرواہ نہ کرنے میں اتنا زبردست کردار ادا کیا ہے جتنا کہ کسی "فرمان امروز" جاری کرنے، یا بہت زیادہ تربیت دینے یا دنیاوی انعام و اکرام کا لالچ دینے سے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت محمدؐ کے عربوں میں اس خیال اور نظریے نے قربانی کا ایک مثالی تصور پیدا کر دیا تھا۔ جواب بھی قائم ہے۔ وہ موت سے ڈرنے کی بجائے اس کو دنیاوی رنج والم سے نجات کا ایک ذریعہ سمجھ کر اس کی تمنا کرتے ہیں۔

لیکن حضرت محمدؐ نے جنوری ۶۲۴ء[1] عیسوی کی اس صبح کو اپنے آپ کو صرف روحانی تعلیم دینے تک ہی محدود نہ رکھا۔ آپؐ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کی امداد کو موجود ہے لیکن آپؐ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اللہ کی نصرت زیادہ موثر ہوگی اگر ہم بھی ایک دوسرے سے تعاون کریں۔

صف آرا ہونے اور لڑنے کے لیے جو جگہ منتخب کی گئی وہ وادی بدر تھی۔ بدر ایک ریتیلا میدان ہے جس کے شمال اور مشرق میں عمودی پہاڑیاں ہیں۔ مغرب کی طرف ریت کے بڑے بڑے ٹیلے اور جنوب میں ایک نیچی اور پتھریلی ڈھلوان ہے۔ ایک چھوٹا سا پانی کا نالہ وادی میں شرقاً غرباً بہتا ہے جو یہاں وہاں اکٹھا ہو کر ابلتے چشموں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان چشموں کو روک کر مسافروں نے حوض بنا دئے ہیں۔ حضرت محمدؐ نے ایک ایسے ہی حوض کے قریب اپنے لشکر کا پڑاؤ ڈالا جو دشمن سے قریب ترین تھا اور باقی حوضوں کا راستہ روک دیا۔ اس طرح آپؐ[2] نے سارے پانی کو اپنے قبضہ میں لے لیا جو لڑائی ہو یا امن صحرا میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ دن خاموشی سے گزر گیا مگر[3] کے چند قیدی جاسوسوں نے بتایا کہ دشمن کا لشکر چند میل کے فاصلے پر آرام کر رہا ہے۔ انھوں نے لشکر کی تعداد کا اندازہ[4] بھی بتا دیا۔ دشمن کی تعداد نے حضرت محمدؐ

---

[1] ہجرت کا انیسواں مہینہ، ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ یوم جمعہ۔ بعض نے ۱۹ رمضان المبارک دوشنبے (پیر) کا دن لکھا ہے (طبقات ابن سعد) کثرت رائے کے مطابق جنگ بدر ۱۷ رمضان جمعہ کے روز ہوئی (نقشہ ۹-۱۰)

[2] آنحضورؐ نے یہ اقدام حضرت حبابؓ کے مشورے پر کیا تھا۔ [3] بدر کے مقام سے قریشی لشکر کے دو غلام ہاتھ آ گئے۔

[4] آنحضورؐ نے ان سے لشکر کی تعداد پوچھی تو صحیح نہ بتا سکے پھر آپؐ نے دریافت کیا کہ لشکر میں روزانہ کتنے اونٹ ذبح ہوتے ہیں انھوں نے جواب دیا نو یا دس۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا کہ قریش کے لشکر کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے


نقشہ-۹
مدینہ سے بدر تک
تفہیم القرآن - جلد دوم
مدینہ منورہ
اُحد
بدر
الشفیعہ
بئر الشیخ
مستورہ
رابغ
قضیمہ
ینبع البحر
عسفان
ذہبان
جدہ
وادی فاطمہ
مکہ مکرمہ
حدیبیہ
طائف
ابوسفیان کے کاروان کا راستہ
THE GREAT ARAB CONQUESTS
MAP-VII
شمال
مشرق
مغرب
بہ پیمانہ ۴۰ میل فی انچ

نقشہ-۱۰


شمال
مشرق
مغرب
پہاڑیاں
پہاڑیاں
پہاڑیاں
قیادت گاہ
رسول اللہ
العدوۃ الدنیا
العدوۃ القصوی
جنگِ بدر
۱۷ رمضان سنہ ۲ھ - جنوری سنہ ۶۲۴ء
ہفت وار "ہلال" راولپنڈی
۲۶ ستمبر ۱۹۷۶ء
ینبوع کو

کو بدل نہیں کیا اور رات بھر کھجور کی ٹہنیوں سے بنی جھونپڑی یا سائبان میں عبادت کرتے رہے جو آپؐ کے سپاہیوں نے آپؐ کے لئے پانی کے نزدیک بنا دی تھی۔

جب آفتاب نے ابھر کر صحرا کو سنہرا بنا دیا تو مکے کا لشکر بھی ابوجہل کی قیادت میں وادی میں داخل ہو گیا اور مسلمانوں سے ایک تیر کے فاصلے پر صف آرا ہو گیا۔ اس وقت کی عرب لڑائیاں ان بڑی اور خونریز جنگوں سے بالکل مختلف تھیں جو بعد میں مسلمانوں نے دنیا کی فتوحات کے دوران لڑیں۔ یہ لڑائیاں چھوٹی ہوتی تھیں اور جانے پہچانے لوگوں میں ہوتی تھیں۔ اور ان کی نوعیت ابھی تک محاصرہ ٹرائے TROY[2] کے مقابلوں کی سی تھی۔ ابتدائی مرحلے میں دونوں طرف کے کچھ بہادر اپنی صفوں سے باہر نکلتے، دشمن پر بڑی لعن طعن کرتے۔ اپنے قائدین کے جنگی کارنامے بیان کرتے اور آخر میں دشمن کے لشکر سے کسی کو مقابلے کے لئے للکارتے۔ دوسرا مرحلہ ایک کا ایک سے مقابلہ ہوتا اور تیسرے مرحلے میں عام حملہ ہوتا جس میں مل کر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاتے۔

بدر کی جنگ بھی اسی مقبولِ عام دستور کے مطابق لڑی گئی۔

زرہ بکتر پہنے ڈھالوں کی آڑ لئے ہاتھوں میں تلواریں سنبھالے ابوسفیان کا خسر عتبہ اس کا بھائی شیبا[3] اور ابوسفیان کا برادر نسبتی الولید نکل کر قریش کی صفوں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اپنے مقابل میں کھڑے مسلمانوں پر لعن طعن کی اور خوب بُرا بھلا کہا۔

کافروں کا خون بہانے یا سیدھے جنت کی نعمتوں سے سرافراز ہونے کے شوق میں تین مدنی نوجوان آگے بڑھے لیکن ان کو دیکھ کر مکے کے لوگوں نے چیخ کر کہا کہ وہ اتنا

---

[1] نقشہ نمبر ۱۰ ملاحظہ ہو۔

[2] ٹرائے TROY یونان کا ایک قدیم شہر جس کو فتح کرنے کے لئے عرصہ تک لڑائی جاری رہی۔ روزانہ چند جانباز دونوں جانب سے نکلتے اور مقابلے ہوتے اور واپس چلے جاتے۔ آخر کار چند جانباز لکڑی کے ایک بڑے گھوڑے کے اندر بیٹھ کر شہر میں داخل ہوئے اور اس کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

[3] شیبا عتبہ کا بھائی اور ولید عتبہ کا لڑکا اور ابوسفیان کا برادر نسبتی تھا۔ (حیاتِ محمدؐ۔ سیرت النبی)

طویل سفر کر کے اس لئے نہیں آئے ہیں کہ وہ ان نوجوانوں کو قتل کر کے اپنی تلواریں کند کریں خصوصاً جبکہ ان سے ان کی کوئی پرخاش نہیں۔ وہ تو اپنے عم زادوں کے سر چاہتے ہیں، جو مکّہ کے غدار ہیں۔ کیا وہ اتنی جرأت کریں گے؟

یاد رہے کہ یہ جنگ خصوصی طور پر انتقام لینے اور خون کے بدلے چکانے کی جنگ تھی کیونکہ دانت کے بدلے دانت ہی اس معاشرے کا مسلمہ اصول تھا۔ لڑائی کا سیاسی پہلو اس وقت تک منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ اگر بدلہ چکا لیا جاتا تو اس کے بعد لڑائی میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہتی اور بعض اوقات تو درمیان میں ہی جنگ بند کر دی جاتی تھی۔

اہل قریش کی طعنہ زنی پر حضرت علیؑ کرم جوش میں مسلم صفوں سے باہر نکلے۔ ان کا چار آئینہ اور خود دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ان کے بالکل پیچھے پیچھے عبیدہ بن حارث، حضرت محمدؐ کے ایک ددھیالی بھائی، اور حمزہؓ نکلے جنہوں نے شترمرغ کا ایک پر اپنے چار آئینے میں لگا رکھا تھا۔ یہ تینوں بہادر اس طرح حضرت محمدؐ کے قریبی رشتہ دار بھی تھے اور قریش کی ہاشمی خون بہانے کی خواہش بھی پوری کرتے تھے۔

تینوں مقابلے جتنی تیزی سے ہوئے اتنے ہی خونیں بھی تھے۔ حضرت حمزہؓ نے شیبا کو اور حضرت علیؑ کرم نے الولید کو قتل کر دیا۔ البتہ حضرت عبیدہؓ سخت زخمی ہو گئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ گریں حضرت علیؑ کرم اور حضرت حمزہؓ ان کو امداد کو پہنچ گئے۔ حضرت حمزہؓ عتبہ پر ٹوٹ پڑے اور تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس طرح چند ہی منٹ کے اندر اندر مکّے کے تین نامور جنگجوؤں کو جہنم کا راستہ دکھا دیا گیا جس کا حضرت محمدؐ نے ان سے وعدہ کیا تھا۔

غصّے میں دہاڑتے تین اور مکّی ابوجہل کے پرچم تلے سے تیر کی طرح نکل کر مسلمان بہادروں پر ٹوٹ پڑے۔ یہ بھی اسلام کی تلواروں کی نذر ہو گئے۔ اس کے بعد تین اور نکلے اور ان کا بھی وہی حشر ہوا۔ قریش کچھ دیر کے لئے ٹھٹک کر رہ گئے لیکن حضرت محمدؐ نے اس سے پورا پورا فائدہ

لے اہل قریش کے بیان کے مطابق یہ جنگ رجب کے مہینے میں عبداللہ بن جحش کے حملے اور عمر بن حضرمی کے قتل کا بدلہ لینے کی جنگ تھی ؛

اٹھایا اور آپؐ کے ایک مختصر اور فوری حکم کے ساتھ آپؐ کے لشکر ہی عام حملے کے لئے ٹوٹ پڑے۔

اب جنگ کا تیسرا مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ حالانکہ دشمن کی تعداد تین گنا سے بھی زیادہ تھی لیکن حضرت محمدؐ کے دور اندیشانہ اقدام کے سبب مسلمانوں کو بڑی برتری حاصل تھی کیونکہ پانی ان کے ہاتھ میں تھا۔ اہل مکہ صحرائے عرب کی جھلسا دینے والی دھوپ میں لڑ رہے تھے اور اپنے سامان سے لدے ہوئے اونٹوں تک جائے بغیر، جو بہت پیچھے تھے، وہ پانی پی کر تازہ دم نہیں ہو سکتے تھے۔ چند لوگ جو پیاس سے بیتاب ہو کر بدر کے چشمے تک پہنچتے وہ مسلمان تیر اندازوں کے تیروں کا نشانہ بن جاتے۔

پہاڑی پر ایک طرف کھڑے حضرت محمدؐ نیچے لڑائی کا جائزہ لے رہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ آپ کے ساتھ تھے۔ عام حملہ ہونے تک تو آپؐ خاموش اور پرسکون تھے لیکن اب اچانک آپؐ پر اس قدر جوش کی سی کیفیت طاری ہوئی کہ آپؐ بیہوش ہو گئے۔ ہوش میں آئے تو آپؐ کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔ آپؐ نے زمین سے ایک مٹھی خاک اٹھائی اور دشمن کی طرف اچھال دی اور آپؐ نے جوش میں آکر کہا "اللہ کرے ان کی صورتیں مسخ ہو جائیں۔"[۱] اس کے بعد آپؐ گھوڑے پر سوار ہوئے اور اپنے حفاظتی دستے کو ساتھ لے کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے حضرت ابی بکرؓ آپؐ کے پیچھے پیچھے تھے۔

جو لوگ معجزوں کے قائل ہیں کہتے ہیں کہ اس وقت ایک مافوق الفطرت بات ظہور میں آئی۔ پروں کو پھڑپھڑاتے اور چمکتی تلواریں ہاتھ میں لئے فرشتوں کی ایک جماعت حضرت محمدؐ کی امداد کے لئے آ گئی اور لڑتے ہوئے مسلمانوں میں شریک ہو گئی۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو لیکن جو کچھ ہوا وہ فرشتوں کو شامل کئے بغیر ہی کافی اہم ہے۔

جونہی حضرت محمدؐ نے خاک کی مٹھی دشمن کی طرف پھینکی صحرا میں اچانک ایک سخت آندھی اٹھی۔ یہ جھلسا دینے والی گرم ہوا حضرت محمدؐ کی عین پشت کی طرف سے آئی اور دہکتی آگ

---

[۱] صاحب حیات محمدؐ نے لکھا ہے کہ آپؐ نے مٹھی بھر کنکریاں اٹھا کر قریش کی طرف پھینکیں اور فرمایا کہ "شاهت الوجوه" یعنی تمہاری صورتیں مسخ ہو جائیں۔

کے جھونکے کی طرح دشمن کی آنکھوں میں جا پڑی۔ تھکے ہارے، پیاسے اور مسلمانوں کی تلواروں کی بے پناہ کاٹ سے حوصلہ ہارے ہوئے قریش پہلے ہی بچاؤ کی لڑائی لڑ رہے تھے کہ اس آندھی نے رہا سہا حوصلہ بھی ختم کر دیا۔ کافروں کے لئے حضرت محمدؐ کی بد دعاؤں اور دشمن کے خون کے پیاسے مسلمانوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے وقتاً فوقتاً آپؐ کے نعروں سے دشمن بوکھلا گیا، لیکن فوری طور پر ان کی صفیں نہ ٹوٹیں اس کا سبب ابوجہل کی موجودگی تھا۔

ابوجہل ہار نے ماننے والا آدمی نہ تھا۔ حضرت محمدؐ کی طرح نعرے لگاتا ہوا وہ بھی اپنے گھوڑے پر سوار گھمسان کی لڑائی میں جا گھسا۔ مسلمانوں کے اکابر نے اسے دیکھ لیا اور اس کے گرد گھیرا تنگ کر لیا۔ بوڑھا ہو جانے کے باوجود وہ ابھی تک ایک مانا ہوا جنگجو تھا۔ اس سے پہلے کہ اسے گھوڑے پر سے گرانے میں کامیاب ہوں اس نے تلوار کے پے در پے واروں سے اپنے کئی حملہ آوروں کو مار ڈالا۔ آخر کار حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے اس کو زمین پر گرا دیا اور اس کے سینہ پر چڑھ بیٹھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ حضرت محمدؐ اور اس کے ساتھیوں کو برا بھلا کہنے سے باز نہ آیا اور اس کا کوسنا بند نہ ہوا جب تک کہ عبداللہؓ نے اس کا سر پکڑ کر تن سے جدا نہ کر دیا۔ پھر وہ یہ سر لے کر حضرت محمدؐ کے پاس پہنچے۔ آپؐ فتح کی یہ خون آلود نشانی دیکھ کر خوش ہوئے اور جنگ کے میدان سے پیچھے آ کر گھوڑے سے اترے اور سجدے میں گر گئے[1] اور بلند آواز سے فرمایا "لا الٰہ الا اللہ" ابوجہل اپنی سزا کو پہنچا اور اسی طرح اللہ کے باقی تمام دشمن اپنے کیفر کردار کو پہنچیں گے۔"

---

[1] 'حیاتِ محمدؐ' میں ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے لکھا ہے کہ ابوجہل کو معاذ بن عمرو بن جموح نے قتل کیا لیکن تاریخ طبری (جلد اول، حصہ سوم) کے مطابق سب سے پہلے معاذ بن جموح نے ہی ابوجہل پر حملہ کیا اور تلوار کے ایک وار سے اس کا ایک پاؤں مع نصف پنڈلی کے کاٹ دیا۔ ابوجہل گر پڑا۔ جواب میں عکرمہ بن ابوجہل نے حضرت معاذ کا ایک بازو کاٹ ڈالا جو لٹکتا رہ گیا اور جسے آپ نے خود پاؤں تلے داب کر علیحدہ کر دیا۔ ابوجہل زخمی پڑا تھا کہ معوذ وہاں سے گزرے اور تلوار کا ایک اور وار کیا اور مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔ لیکن جب لڑائی ختم ہونے پر رسول اللہؐ نے مقتولین میں ابوجہل کی تلاش کا حکم دیا اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود اس کے پاس پہنچے تو اس میں اب بھی کچھ جان باقی تھی۔ چنانچہ آپ نے اس کا سر قلم کیا اور رسول اللہؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

قریش کے سپہ سالار کی موت کی خبر آناً فاناً میں پھیل گئی اور دشمن پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ چند منٹ کے اندر اندر اہلِ مکہ اپنی زرہیں اور تلواریں پھینک کر جان بچانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ حقیقتاً وہ اس تیزی سے بھاگے اور ادھر مسلمان اتنے تھک چکے تھے کہ بہت سے لوگ قید ہونے سے بچ نکلے۔

جنگی قیدیوں میں امیہ بن خلف[1] بھی تھا۔ کسی کا اس سے کوئی خاص جھگڑا نہ تھا سوائے اس کے کہ بلالؓ کبھی اس کے غلام ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ مسلمان جو لڑائی میں فتح یاب ہونے کے باعث ٹھنڈے پڑ گئے تھے اپنے سابق ہموطنوں سے معروفِ گفتگو تھے کہ بلالؓ وہاں سے گزرے۔ جونہی اپنے اذیت دہندہ اُمیہ پر نظر پڑی، جس نے انہیں ننگا کر کے جان سے مار ڈالنے کے لئے صحرا کی سخت دھوپ میں ایک پتھر سے باندھ دیا تھا۔ آپ کو غصہ آ گیا اور تھکے ہوئے سپاہیوں کو خطاب کر کے کہا کہ جب تک کافروں کا یہ سرغنہ زندہ ہے وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتے۔ امیہ ضرور قتل ہو گا۔ بعض مسلمانوں نے اس مکی کی کچھ طرفداری کرنا چاہی لیکن ہٹیلے حبشی نے کہا "ہرگز نہیں"۔ ایک سپاہی نے اُمیہ کے کان میں کہا کہ بھاگ جاؤ تو بہتر ہے۔ اس نے کوشش بھی کی لیکن بلالؓ بجلی کی طرح اس کے پیچھے لپکے۔ وہ زیادہ دور نہ بھاگ سکا۔ کیونکہ اب وہ ادھیڑ ہو چکا تھا اور موٹا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے برخلاف بلالؓ پانچ وقت مسجد کی چھت پر چڑھ کر اذان دینے کے سبب موٹے نہیں ہوئے تھے۔ حضرت بلالؓ نے اُمیہ کو جا لیا۔ کسی وقت کے ایذا رساں نے ایک خوفناک چیخ ماری لیکن بلالؓ کی تلوار جسم کے پار ہونے کے سبب اس کی آواز خون بہنے کی خرخر میں دب کر رہ گئی۔ پرانا بدلہ چکایا جا چکا تھا لیکن مکمل یقین حاصل کرنے کے لئے اسلام کے پہلے موذن نے

---

[1] "حیاتِ محمدؐ" کے مطابق حضرت بلالؓ نے اُمیہ بن خلف کو میدانِ جنگ میں ہی قتل کر دیا تھا کیونکہ بعض لوگ اسے قتل کرنے کی بجائے گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ طبری نے لکھا ہے کہ جنگ ختم ہونے پر میدانِ جنگ میں ہی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے جنہیں اُمیہ عبدالالہ کہتا تھا۔ اُمیہ اور اس کے لڑکے کو پناہ میں لے لیا تھا لیکن حضرت بلالؓ نے قسم کھائی کہ مشرکین کے اس سرغنہ کو ہرگز جیتا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ چنانچہ اس نے بھاگنا بھی چاہا تو لوگوں نے گھیر لیا اور اسے اور اس کے لڑکے کو قتل کر دیا گیا۔

اپنے پرانے آقا کا سر کاٹ کر نئے آقا کے قدموں میں ڈال دیا۔

اس روز جو بہت سے بدلے چکائے گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا اور یہ آخری بھی تھا حضرت محمدؐ نے اپنے سب مجاہدین کو اکٹھا کیا اور تمام لاشوں کو ایک جگہ جمع کرنے اور چھانٹنے کا حکم دیا۔ چونکہ گرمی بہت زیادہ تھی اس لئے انہیں جلد دفن کرنا تھا۔ مقتولین میں صرف چودہ مسلمان تھے اور ستر اہل مکہ۔ ان کے علاوہ چوہتر کی قیدی بنائے گئے تھے۔ مسلمانوں کو شہیدوں کے قاعدے کے مطابق دفن کر دیا گیا تاکہ ان کے جسم اپنی ارواح کے ساتھ جنت میں جا ملیں۔ البتہ مکیوں کے ساتھ کافروں کا سا برتاؤ کیا گیا اور ان سب کو ایک ہی قبر میں جہنم واصل ہونے کے لیے سپرد خاک کر دیا گیا۔

اب قیدیوں کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ سب کو تہ تیغ کر دیا جائے۔ لیکن حضرت ابو بکرؓ کا خیال تھا کہ اس ایک دن میں ہی ایک دوسرے کے کافی عزیز مارے جا چکے تھے۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ بہت تھک جانے کے باعث زیادہ توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ حضرت محمدؐ نے حضرت ابو بکرؓ کی تجویز قبول کر لی۔ صرف دو قیدیوں[1] کو قتل کی سزا دی گئی۔ ان میں سے ایک شاعر تھا جو مکہ میں حضرت محمدؐ کے تبلیغ کے زمانے میں مسلسل آپؐ کی ہجو کہتا رہتا تھا۔ دوسرا ایک ایسا شخص تھا جس نے ایک روز حضرت محمدؐ پر اس وقت بزدلانہ حملہ کیا جب آپؐ کعبہ کے باہر عبادت میں مصروف تھے۔ باقی قیدیوں[2] کے بارے یہ طے پایا کہ جو بالکل غریب و نادار ہو ان کو بلا فدیہ چھوڑ دیا جائے بشرطیکہ وہ حضرت محمدؐ کے خلاف آئندہ کسی لڑائی میں حصہ نہ لینے کی قسم کھائیں۔ جن لوگوں نے ایسی قسمیں کھائیں ان میں سے کچھ مسلمان بھی ہو گئے۔

صاحب استطاعت لوگوں کے لئے تین متبادل تجویزیں تھیں۔ یعنی یا تو وہ مسلمان ہو جائیں یا بدستور قید رہیں۔ یا زر فدیہ دے کر رہائی حاصل کر لیں۔ حضرت محمدؐ اور ان کے نائبین خوب جانتے

---

[1] نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط

[2] غریب لوگوں کے لئے زر فدیہ کا ایک بدل یہ بھی رکھا گیا تھا کہ اگر وہ پڑھے لکھے ہوں تو ہر ایک دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا سکھا دے۔ باقی غریب لوگ بغیر فدیے کے آزاد کر دیے گئے صرف صاحب استطاعت لوگوں سے فدیہ لیا گیا جو ایک ہزار تا چار ہزار درہم تھا۔

تھے کہ کون کون سے قیدی کتنی کتنی رقم ادا کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں میں جنہوں نے مفلسی کا سہارا لینا چاہا آپؐ کے چچا العباسؓ بھی تھے۔

حضرت عباسؓ ایک موقعہ پرست شخص تھے۔ کچھ مزاحیہ صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ ان کے کردار کے مطالعہ سے ایک شخص پر یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قریش اور حضرت محمدؐ کے جھگڑوں میں وہ بے تعلق رہے وہ ان جھگڑوں کو ایک مقصدی نظر سے دیکھتے رہتے تھے اور اپنے آپ کو واقعات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ڈھالتے رہتے تھے۔

وہ اپنے بھتیجے کے ساتھ مدینہ سے آئے ہوئے لوگوں سے ملاقات کے لئے گئے تھے۔ آپؐ نے ان سے کہا تھا وہ ان لوگوں پر پوری طرح بھروسہ کرتے ہیں کہ وہ ان کے بھتیجے کی ہر طرح حفاظت اور خبر گیری کریں گے لیکن جب موقع آیا تو یہ محبت اسی بھتیجے کے خلاف بدر کی لڑائی میں شامل ہونے سے نہ روک سکی اور نہ ہی آپ کو حضرت محمدؐ پر یہ سخت اعتراض کرنے سے روکا کہ ان کے ساتھ ایک عام قیدی کا سا سلوک کیوں کیا جا رہا تھا اور جب آپ کا زر فدیہ مقرر کر دیا گیا تو آپ نے اپنی غریبی کا شور مچانا شروع کر دیا۔

حضرت محمدؐ اپنے ان چچا کو بہت پسند کرتے تھے آپؐ کو ان کا ہر وقت کا بدلنا مزاج بھی اچھا لگتا تھا۔ جب آپ نے اپنی مفلسی کا رونا رونا شروع کیا تو حضرت محمدؐ نے آپ سے برجستہ کہا "ہو سکتا ہے کہ آپ واقعی قلاش ہوں لیکن وہ روپیہ کہاں ہے جو آپ اپنی بیوی کے نام جمع

ل یہ مصنف کی اپنی رائے ہے ورنہ حضرت عباسؓ ہمیشہ ہی آنحضورؐ سے محبت کرتے تھے اور آنحضورؐ بھی آپ کو بہت پسند کرتے تھے مکہ کے قیام کے دوران وہ آنحضورؐ کو قریش کے منصوبوں اور تجاویز سے قاصد بھیج کر مطلع کرتے رہے یہ علیحدہ بات ہے کہ قریش کے دباؤ کے سبب بدر کی جنگ میں قریش کے ساتھ شریک ہونا پڑا۔

لے تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب و اسلام اور تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ جب حضرت عباس نے زر فدیہ ادا کرنے سے معذوری کا اظہار کیا تو رسول اللہ نے فرمایا کہ جو روپیہ چلتے وقت بیوی کے پاس چھوڑ آئے ہیں کیوں نہیں منگوا لیتے۔ حضرت عباسؓ اس بات پر آپؐ کی رسالت کے قائل ہو گئے کیونکہ یہ بات کسی کو بھی معلوم نہ تھی اور روپیہ منگا کر زر فدیہ ادا کر دیا گیا۔ حضرت عباسؓ کو اپنے علاوہ اپنے بھتیجوں یعنی عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کا بھی فدیہ ادا کرنا پڑا۔

کر آئے ہیں۔

ایک اور قیدی جس سے آپ کو ذاتی تعلق تھا آپ[4] کا داماد ابو العاص تھا۔ ابو العاص کو خود تو حضرت محمدؐ سے کوئی کاوش نہیں تھی لیکن اسے یہ یقین نہ آتا تھا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ قید ہونے کے بعد بھی اس کے یہ ہی خیالات تھے۔ بہرحال حضرت محمدؐ نے اسے بغیر فدیہ دئے رہا کر دیا[1] لیکن یہ وعدہ لے لیا کہ وہ اپنی بیوی (آپ[4] کی صاحبزادی زینب) کو آپؐ کے پاس مدینے روانہ کر دے گا۔ ابو العاص اس پہ رضامند ہو گیا چنانچہ زیدؓ کو مکہ روانہ کر دیا گیا کہ وہ حضرت زینبؓ کو مدینہ لے آئیں۔ اس اثنا میں ابو العاص یرغمال کے طور پر حضرت محمدؐ کے پاس رہا۔

فدیہ کے معاملے میں دوسرے قیدیوں سے ان کی آمدنی کے مطابق سلوک کیا گیا۔ البتہ دشمن کے چھوڑے ہوئے ہتھیار، زرہیں اور اونٹوں کی تقسیم کے متعلق کچھ تھوڑا سا بحث مباحثہ ہوا۔ لیکن حضرت محمدؐ نے اس معاملے میں اللہ تعالیٰ سے رجوع کیا۔ اسی وقت مال غنیمت کی تقسیم کے طریقہ کار کے متعلق وحی[2] نازل ہوئی، جس پر اس وقت تک عمل ہوتا رہا جب تک اسلامی عساکر دنیا کی فتوحات کے لئے جاتے رہے۔

حضرت محمدؐ کی پہلی بڑی جنگ اس طرح اختتام پذیر ہوئی۔ یہ ایک مکمل فتح تھی۔ جس نے حضرت محمدؐ کو ایک مسلّمہ قائد بنا دیا۔ اس نے اسلام کو وہ عظمت بھی دی جس کی اب تک کمی محسوس کی جاتی رہی تھی۔ اس فتح نے دوسرے قبائل کو بھی ترغیب دی کہ وہ ایسے دین کو کیوں نہ اختیار

---

[1] ابو العاص کے فدیے میں جو زیورات دیئے گئے وہ آپؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے بھیجے تھے اور ان میں حضرت خدیجہؓ کا وہ ہار بھی تھا جو انہوں نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دیا تھا۔ یہ زیورات دیکھ کر آپؐ آب دیدہ ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا "چاہو تو اس اسیر کو رہا کر دو اور یہ زیورات بھی واپس کر دو"۔ چنانچہ ابو العاص کا فدیہ صرف یہ ٹھیرا کہ وہ حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دے ابو العاص اس پر رضامند ہو گئے اور حضرت زینبؓ مدینے آگئیں۔

[2] وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَابْنِ السَّبِيلِ ...... (اور جان لو جو غنیمت ملے تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے اور اس کے رسول کے لئے اہل قرابت کے لئے، یتیموں کے لئے، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے" (سورہ انفال۔ رکوع ۵)

کر لیں جس میں جنگ میں بچ جانے والوں کو دنیا دی اور شہید ہو جانے والوں کو روحانی انعام و اکرام ملتا ہے۔ اس سے خود حضرت محمدؐ کو بھی بہت زیادہ اطمینان قلب حاصل ہوا۔ اب آپؐ کو پہلے سے بھی زیادہ یقین حاصل ہو گیا تھا کہ آپؐ کا دین سچا ہے اور آپؐ شروع سے ہی حق پر تھے۔

جنگ بدر حضرت محمدؐ کے ذہن میں ہمیشہ ایک مفتخر یاد کے طور پر جاگزیں رہی۔ آپؐ نے ان تین سو افراد کو جو اس جنگ میں قریش سے لڑے تھے۔ مسلمانوں میں من حیثیت الجماعت ایک خاص درجہ دے دیا۔ آپؐ کی زندگی میں اور آپؐ کی وفات کے بعد بھی اکابر بدر کو اجازت تھی کہ اگر وہ کبھی سزا یا سرزنش کے مستوجب ٹھیریں تو وہ اس کو کم کرانے کے لئے بدر کی لڑائی میں اپنی خدمات کا حوالہ دے سکتے تھے۔ اور وہ اس کے مستحق بھی تھے کیونکہ یہ وہی تھے جنھوں نے جہاد کے اس نئے ہتھیار کو سب سے پہلے ڈھالا اور اس کی آزمائش کی جس کے ذریعہ اسلام کو دنیا کے بہت سے ممالک میں پہنچانا تھا۔ آنے والی صدیوں میں شامیوں، ایرانیوں، مصریوں، بربریوں، رومیوں، ہسپانویوں، ہندوستانیوں، چینیوں، ملایا والوں، روسیوں اور ترکوں کو وہی جنگی نعرہ سننا تھا جو پہلے پہل ان تین سو بہادروں کے گلوں سے اس وقت نکلا تھا جب انھوں نے بدر کے نالے پر پرجوش حملہ کیا تھا اور وہ نعرہ تھا "اللّٰہُ اَکبَر۔ اللّٰہُ اَکبَر"۔

گیارھواں باب

یہودی

(۶۲۴ عیسوی)

بہت کم لوگوں نے جنگ بدر کا حال سنا ہے۔ اس جنگ میں بظاہر کوئی ایسی خاص بات بھی نہیں کہ وہ ایسا ضرور کریں۔ آج کے ایک سپاہی کی نظر میں اور اس وقت کے کسی ایرانی یونانی یا رومن ہمعصر سپاہی کی نظر میں بھی اس کی حیثیت ایک بڑی جھڑپ سے زیادہ نہیں اور اگر ساتویں صدی کے دور میں ایشیائے کوچک میں اخبارات بھی ہوتے تب بھی حضرت محمدؐ کی یہ فتح کوئی شہ سرخی نہ بناتی لیکن پھر بھی اس چھوٹی سی فتح کے اثرات تاریخ اسلام اور ساری دنیا پر اتنے ہی اہم تھے جتنے کہ شہنشاہ قسطنطین[1] کے ہاتھوں میلویا MELVIA کے پل پر میکسنٹیس MAXENTIUS کی تباہی یا چالون CHALON کے مقام پر سفاک ہنوں کے بادشاہ اٹیلا[2] ATTILA کی شکست۔

---

[1] قسطنطین اعظم۔ رومن شہنشاہ (۳۰۶ تا ۳۳۷ء) ۳۰۶ء میں یارک میں تخت نشین ہوا اور سیزر (قیصر) ہونے کا اعلان کیا۔ ۳۱۰ء میں شہنشاہ میکسملین کو شکست دی لیکن اس کا بیٹا MAXENTIUS ابھی تک روم کا حکمران تھا۔ ۳۱۲ء میں اسے روم کے نزدیک میلویا کے پل پر شکست دے کر سارے مغربی ممالک کا بلا شرکت غیرے شہنشاہ بن گیا۔ اسی قسطنطین اعظم نے بعد میں عیسائیت اختیار کر کے اپنا دارالحکومت بازنطینہ میں بنایا اور ۳۳۰ء میں قسطنطنیہ کی بنیاد ڈالی۔ ۲۲ مئی، ۳۳۷ء کو وفات پا گیا۔ (چیمبرز انسائیکلو پیڈیا۔)

[2] اٹیلا۔ سفاک ہنوں کا بادشاہ جس نے روم اور مشرقی یورپ کو تباہ و تاراج کر ڈالا۔ بعد میں CHALON کے مقام پر رومنوں نے اس کے اور مخالفین سے مل کر اس کو ۴۵۱ء میں شکست دی۔ (چیمبرز انسائیکلو پیڈیا ۱۹۶۳ء)

قریش کے مقتولین کی تعداد، مال غنیمت اور ابو جہل کی موت ہی اس جنگ کے اہم نتائج نہ تھے اور نہ ہی اس جنگ کے سبب لوگوں کو لڑائی کی منصوبہ بندی اور جنگی چالوں کے کوئی نئے سبق ملے اور نہ ہی بہادری کے کوئی خاص کارنامے دیکھنے میں آئے لیکن اس کے باوجود اس فتح کی اہمیت اس قسم کے مادی فوائد سے بہت زیادہ تھی۔ اس کامیابی نے حضرت محمدؐ کو سانس لینے کا موقعہ فراہم کیا۔ اسی کے سبب آپؐ کو نہ صرف اپنے ساتھیوں سے بلکہ خود سے بھی یہ کہنے کا موقع ملا "میں نے نہ کہا تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔"

حضرت محمدؐ کو حوصلہ افزائی کی ضرورت تھی اور اب انہیں اس کی ہر وقت سے زیادہ ضرورت تھی۔ اس سے بھی زیادہ جتنی کبھی کسی اور نبی کو ہوئی ہو گی۔

حضرت عیسیٰؑ اور سینٹ پال عقوبت اور اذیتوں کے دوران ہی وفات پا گئے۔ وہ اس نازک مرحلے تک پہنچے ہی نہیں کہ ان کا مشن کسی حد تک کامیاب ہو جاتا اور پھر خود کو سچا ثابت کرنا پڑتا اور جس طرح مکہ سے ہجرت کرنے پر حالات نے حضرت محمدؐ کی موافقت میں پلٹا کھایا انہیں اس کی حسرت ہی رہی۔ اگر حضرت محمدؐ کو بدر کی لڑائی میں کامیابی نہ ہوتی اور وہ ہار جاتے تو ان کے لئے اپنے مشن کو جاری رکھنا بے حد مشکل ہو جاتا۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ خوب جانتے تھے کہ گو اس وقت آپؐ نے اپنے مضحکہ اڑانے والوں کے عزائم کو خاک میں ملا دیا ہے لیکن آپؐ کو اس پر قانع ہو کر بیٹھ جانا نہیں چاہئے اور اپنی اس کامیابی سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے اور آگے بڑھتے رہنا چاہئے۔

البتہ اس فتح کی خوشی کی پہلی چند ساعات آپؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کے انتقال نے غم آگیں کر دیں۔ وہ جب سے حبش کی جلاوطنی سے واپس آئی تھیں کبھی اچھی نہیں رہیں۔ جنگ کی صبح کو وہ اتنی کمزور ہو چکی تھیں کہ ان کے شوہر حضرت عثمانؓ لشکر کے ساتھ جانے کی بجائے ان کے پاس ہی موجود رہے۔ ان کا دم تقریباً اسی وقت آخر ہوا جب مسلمانوں کے عام حملے سے اہل قریش کی صفوں میں انتشار پیدا ہو چلا تھا۔

حضرت خدیجہؓ کے بچوں سے حضرت محمدؐ بہت پیار کرتے تھے۔ جہاں تک ان کا اولاد ہونے کا تعلق تھا آپؐ نے انہیں ہر معاملے میں بہت زیادہ پدرانہ محبت اور پیار دیا جو عام طور پر مذہبی جنگیں لڑنے والے ایک شخص کے مزاج اور طبیعت کے خلاف ہوتا ہے۔ حضرت رقیہؓ

کے انتقال سے آپؐ کو بے حد صدمہ ہوا۔ لیکن کچھ دن بعد ہی مکہ سے حضرت زیدؓ کے ساتھ آپؐ کی دوسری صاحبزادی حضرت زینبؓ کے آجانے سے اس کی کچھ تلافی ہو گئی۔ زیدؓ ایک اور خوشخبری بھی لائے کہ آپؐ کے چچا ابی لہب اپنے بھتیجے (حضرت محمدؐ) کی اس فتح کی خبر سن کر اس قدر برافروختہ ہوئے کہ یہ خبر سننے کے چند گھنٹے بعد ہی مر گئے۔

حضرت محمدؐ نے بلا تامل سب کو یاد دلایا کہ آپؐ نے مصائب کے ابتدائی ایام میں ابی لہب کو کیا بددعا دی تھی[1] اور بعد ازاں ایک مرتبہ پھر آپؐ نے بڑے مفتخرانہ انداز میں اسی پیشگوئی کو یاد دلایا جب ابی لہب کے بیٹے اور آپؐ کے سابق داماد عتبہ کو جس نے آپؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہ کو طلاق دے دی تھی، ایک کارواں کے ساتھ شام جاتے ہوئے شیر نے پھاڑ کھایا۔

اس طرح بیٹی کے صدمے کے علاوہ باقی ہر بات آپؐ کی موافقت میں جاتی معلوم ہو رہی تھی۔ آپؐ کے پیروکاروں کی جماعت قائم تھی۔ آپؐ نے اپنے دشمنوں سے ایک انتقام بھی لے لیا تھا اور مقامی قبائل کی نظروں میں آپؐ کا وقار بھی بہت بلند ہو گیا تھا۔ البتہ صرف ایک گروہ ایسا تھا جو آپؐ کی قدردانی نہ کرتا تھا اور حقیقت میں اس کامیابی کی اہمیت کو گھٹانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا اور وہ یہودی تھے۔

اس کامیابی کو سراہنے کی بجائے یہودی اس فتح کو ایک غیر اہم سی بات کر کے بیان کرتے گھروں میں بھی اور باہر بھی۔ وہ وحی کے نزول کا بھی مذاق اڑاتے۔ مسجد میں داخلے کے لئے حضرت محمدؐ کی ابتدائی رواداری اور وسیع القلبی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ آپؐ کی عبادات اور خطبات میں موجود رہتے اور اس کی ہنسی اڑاتے۔ وہ قرآن کے مستند ہونے اور اس کی صداقت سے بھی انکار کرتے اور مقابلے میں انجیل پیش کر کے کہتے کہ قرآن کے اکثر احکام اس کی نقل ہیں۔ وہ آپؐ کی اور مسلمانوں کی ہجو بھی لکھتے۔ چند عبرانی نوجوان تو اس سلسلے میں اتنے بڑھے کہ آپؐ پر پتھر بھی پھینکے اور کئی مرتبہ حملہ کر کے آپؐ کی جان تک لینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

پھر انھوں نے ایک زیادہ سیدھے طریقے سے مسلمانوں پر یہ صاف صاف واضح کر دیا کہ

---

[1] سورہ تبت یدا ابی لہب و تب ہ کے نزول کی طرف اشارہ ہے۔

وہ مدینے میں انکی خوشنودی حاصل کر کے ہی رہ سکتے ہیں۔ آج کل کی طرح اس زمانے میں بھی یہودی بہت سے ساہوکاری اداروں کے مالک تھے اور سود پر روپیہ قرض دیتے تھے چنانچہ جب حالات مہاجرین کے حق میں موافق ہوتے دیکھے تو روپیہ وصول کرنے میں سختی کرنے اور درشتی پر اُتر آئے۔

تعجب کی بات یہ تھی کہ یہودی اپنا وطن چھوڑ کر سینکڑوں میل دور یہاں کیا کر رہے تھے اور حضرت محمدؐ اور مسلمانوں سے ان کی خصوصی دشمنی کی کیا وجہ تھی۔ اس کی وضاحت بہت آسان ہے۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہودیوں کو فلسطین سے نکالنے میں زیادہ تر برطانیہ ابن سعود[1] یا ہٹلر[2] HITLER کا ہاتھ تھا۔ اس سے زیادہ غلط بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ بہت قدیم زمانے سے یہودیوں کو اپنے ملک (فلسطین) سے دیس نکالا ملتا[3] رہا ہے۔ جیسے انھوں نے شروع میں طاقت کے ذریعے حاصل کیا تھا۔ قدیم زمانے میں یہودیوں کو ملک بدر کرنے والوں میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ۷۲۲ ق۔م کے قرب میں سارگون[4] ثانی۔ ۵۸۶

---

[1] ابن سعود۔ شاہ نجد و حجاز (سعودی عرب)

[2] ہٹلر۔ اڈولف ہٹلر مشہور جرمن ڈکٹیٹر جس نے جنگ عظیم دوم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) میں فوجی طاقت سے برطانیہ کے علاوہ سارے یورپ پر قبضہ کر لیا تھا لیکن روس پر حملہ کرنے سے اس کی بہت سی فوج تباہ ہوگئی اور اتحادیوں نے مل کر ۱۹۴۵ء میں اسے شکست دے دی۔ اس نے جرمنی سے یہودیوں کو نکال دیا تھا اور بہت سوں کو قتل بھی کر دیا تھا۔ موجودہ زمانے میں یہود دشمنی میں سب سے پہلے اس کا نام آتا ہے۔ اور اب اسرائیلی حکومت قائم ہو جانے اور عربوں کے علاقوں پر طاقت سے قبضہ کر لینے کے سبب عرب بھی ان کے دشمن ہیں۔

[3] ملاحظہ ہو نقشہ ۱۱

[4] سارگون ثانی SARGON II سلطنت سیریا (شام) کا حکمران۔ ۷۲۲ قبل مسیح میں یہودیوں کو فلسطین سے نکال دیا۔ (چیمبرز انسائیکلوپیڈیا)

بنی اسرائیل کی مہاجرت اور یہودیوں کی جلا وطنیاں



بنی اسرائیل کی مہاجرت اور یہودیوں کی جلا وطنیاں

ق م میں بادشاہ بخت نصر[1]۔ ۶۳ ق م میں پومپئی[2]، ۷۰ عیسوی میں ٹائٹس[3] TITUS اور ۱۳۵ء میں ہیڈریان[4] نے توان کو مکمل طور پر جلاوطن کر دیا تھا۔ آج[5] دنیا کے دس لاکھ یہودیوں میں سے مشکل سے چھ لاکھ پچاس ہزار فلسطین میں ہیں۔

ہر اجتماعی سزا کے بعد معتوب یہودی مختلف ملکوں میں نکل گئے۔ بہت سے عرب کے اندرونی علاقوں[6] میں جا بسے۔ ٹائٹس کے ہاتھوں بیت المقدس کی تباہی کے بعد یہودیوں کے تین طاقتور قبیلوں یعنی بنی قینقاع، بنی قریظہ اور بنی نضیر نے مدینہ پر، جسے پہلے یثرب کہتے تھے، قبضہ کر لیا اور اسے اپنا زرعی مرکز یا قلعہ بنا لیا۔ چنانچہ اسی وقت سے ان میں اور مقامی عرب قبیلوں بنی اوس اور بنی خزرج کے درمیان، جو اب شہری بن چکے تھے، جھگڑا شروع ہو گیا

---

[1] بخت نصر NEBUCHAD NASSAR سلطنت بابل کا ظالم بادشاہ۔ ۵۸۶ ق م میں بیت المقدس فتح کیا اور اسرائیلیوں (یہودیوں) کا قتل عام کر کے انہیں نکال دیا۔ یہ لوگ بابل کے علاقہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ بعد ازاں شاہ سائرس کے معاف کرنے پر ۵۳۹ ق م میں دوبارہ گروہ در گروہ فلسطین واپس آ کر بسے۔ نقشہ ۱۱ (چیمبرز انسائیکلوپیڈیا)

[2] پومپی POMPEY (۱۰۶ تا ۴۸ ق م) شروع میں ایک رومن جنرل کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ بعد ازاں ۶۰ ق م میں سیزر اور CRASSUS کے ساتھ مل کر قدیم روم میں حکومت بنائی جو TRIUMVIR یا تین افراد کی حکومت کہلاتی تھی۔ اس نے بھی یہودیوں کو فلسطین سے دیس نکالا دیا۔ (چیمبرز انسائیکلوپیڈیا ۱۹۶۳ء)

[3] ٹائٹس TITUS یہود دشمن رومن شہنشاہ (۴۰ء تا ۸۱ء) جس نے یہودیوں کو شکست دے کر بیت المقدس فتح کر لیا اور اسے تباہ کر کے یہودیوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔

(چیمبرز انسائیکلوپیڈیا)

[4] ہیڈریان HEDRIAN ایک مشہور رومن شہنشاہ۔ ۱۱۷ء میں تخت نشین ہوا۔ ۱۳۵ عیسوی میں یہودیوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا اور ملک بدر کر دیا۔ (چیمبرز انسائیکلوپیڈیا)

[5] یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی اور دوسری مرتبہ ۱۹۵۴ء میں۔ یہودیوں کی یہ تعداد غالباً ۱۹۴۶ء کی ہے۔

[6] ملاحظہ ہو نقشہ، صفحہ

جو مسلسل چلتا ہی رہا۔ حضرت محمدؐ کی ہجرت سے چند سال پہلے یہ جھگڑا شدت اختیار کر گیا اور نتیجہ کے طور پر 'بعث' کے مقام پر ان کے درمیان ایک خونریز لڑائی ہوئی۔ بعدازاں لڑنے والے فریقوں نے آپس میں یہ فیصلہ کیا کہ نظریوں کے ان بے کار اختلافات کو بھلا دینا مناسب ہوگا۔ اور رقابت اور انتقامی کارروائیاں ایک مشترکہ اعلیٰ اختیارات والا سردار مقرر کر لینے سے ختم ہو سکتی ہیں۔ اس عہدے کے لئے جس عرب کو چنا گیا وہ یہی عبداللہؓ بن ابی تھا جو یہودیوں کا طرفدار تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کی سرداری کی توثیق ہو، حضرت محمدؐ اپنے بے سروسامان پیروکاروں کے ساتھ مدینے آگئے اور یہاں کی ہر چیز کو بدل کر رکھ دیا۔

عبداللہ شروع شروع میں اس رقابت کا صحیح اندازہ نہ کر سکا جو اس کے لئے خطرہ بننے والی تھی کیونکہ نہ تو اسے حضرت محمدؐ پر کوئی یقین تھا اور نہ ہی ان کے دینی عقائد کی اس کے دل میں کوئی قدر تھی۔ اس لئے جو دل میں آتا کھلے بندوں کہتا۔ ادھر حضرت محمدؐ کا بھی اس کے متعلق ایسا ہی خیال تھا۔ آپؐ بھی اسی طرح عبداللہ کی صلاحیتوں کا پوری طرح اندازہ نہ کر سکے اور چونکہ ابھی اس سے دشمنی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے آپؐ اپنے پڑوسیوں سے بنا کر رکھنا ہی مناسب خیال کرتے تھے لیکن آپؐ کی یہ غلط فہمی اہل مکہ کے خلاف آپؐ کی کامیابی کے چند ہفتوں بعد ہی دور ہو گئی۔

ایک روز آپؐ اپنے گدھے پر سوار شہر کے یہودی حصے سے گزرے۔ دیکھا کہ عبداللہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک کچی دیوار کے سایہ میں بیٹھا ہے۔ چنانچہ آپؐ بھی سواری سے اتر کر ان لوگوں میں جا بیٹھے۔ رسمی سلام دعا کے بعد آپؐ نے ان کو دین اسلام کے متعلق کچھ بتانا شروع کیا۔ عبداللہ اور اس کے ساتھی مکہ کے قریش کی طرح بدلگام جنونی اور کھرے نہ تھے۔ اس لئے ختم ہونے تک آپؐ کی بات تحمل سے سنتے رہے لیکن اس کے بعد عبداللہ نے نرمی لیکن صاف گوئی سے جواب دیا کہ جو کچھ آپؐ نے کہا وہ دلچسپ تو ضرور ہے لیکن بدقسمتی سے درست

ؒ عبداللہ بن ابی بن سلول کی رسول اللہ سے رقابت اور دشمنی کی ابتدا یہاں سے ہی ہوئی اور یہ ہی اس دشمنی کا سب کا بڑا سبب تھا۔

نہیں ہے اور آپؐ کو مشورہ دیا کہ مناسب یہی ہوگا کہ آپؐ شہر کے اپنے علاقے تک ہی محدود رہیں اور اپنے کام سے کام رکھیں اور یقین دلایا کہ اگر آپؐ اس پر کاربند رہے تو شہر کے اس حصے کے لوگ بھی اپنے کام سے غرض رکھیں گے۔

حضرت محمدؐ کو یہودیوں کے اس رویے سے نہ صرف کچھ پریشانی ہوئی بلکہ کچھ غصہ بھی آیا۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ ان یہودیوں سے تعلقات ختم نہیں کرنا چاہتے تھے جنھوں نے عبداللہ کو اکسا کر اس طرح گفتگو کرنے کی جسارت دلائی تھی۔ درحقیقت آپؐ نے یہودیوں سے ایک معاہدہ[1] کیا ہوا تھا جس کی رُو سے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی طے پایا تھا کہ شہر کے تمام معاملات میں یہودی اور مسلمان، اسلام اور یہودیت پر قائم رہتے ہوئے ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور مشترکہ دشمنوں کے خلاف دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر لڑیں گے۔

اس عہدنامے کی سب سے بڑی شق یہ تھی:۔

"وہ یہودی[2] جو ہمارے اس مشترکہ نظام میں ہمارا ساتھ دیں گے وہ ہمارے اپنے لوگوں کی طرح ہماری امداد واستعانت کے برابر کے حقدار ہوں گے۔ مختلف قبیلوں کے یہودی جو یثرب میں سکونت پذیر ہیں، مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک قوم متصور ہوں گے وہ اپنے مذہب پر اسی آزادی سے عمل پیرا رہیں گے جس طرح مسلمان۔ یہودیوں کے معاون اور حلیف

---

[1] ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے حیات محمدؐ میں اس معاہدے کا مکمل متن دیا ہے۔ اسی طرح کا ایک معاہدہ انصار اور مہاجرین کے درمیان ہوا۔ ان معاہدوں سے نبی کریمؐ نے اہل مدینہ کو اختلافات کے باوجود متفق کر دیا اور ایک نظام کے تابع کر دیا۔ بنی اوس، بنی عوف کے یہودیوں سے معاہدے کی ایک اور بڑی شق یہ تھی کہ وہ قریش مکہ اور ان کے حلیفوں کا ساتھ نہ دیں گے اور نہ انہیں پناہ دیں گے۔ شروع میں بنی قریظہ، بنی نضر اور بنی قینقاع اس معاہدے میں شریک نہ تھے لیکن کچھ دن بعد ایسا ہی ایک معاہدہ ان کے ساتھ بھی ہو گیا۔ یہ آپؐ کی ایک بڑی سیاسی فتح تھی اور اس طرح مدینے اور اس کے اطراف کے باشندوں کے لئے آپؐ امن وسلامتی کے مرکز ومحور بن گئے۔

[2] حیات محمد (ڈاکٹر محمد حسین ہیکل)

بھی اس تحفظ اور آزادی کے حقدار ہوں گے "۔

لیکن اس رعایت کے باوجود حضرت محمدؐ اس پر مصر تھے کہ آپؐ ہی وہ نبی ہیں جن کا یہودیوں سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ادھر یہودی اسی شدّومد سے اس بات کے منکر تھے۔ اور وہ یہ کس طرح مان سکتے تھے جب تک، کہ وہ یہ تسلیم نہ کرلیں کہ ان کی وہ بات غلط تھی کہ ان کا نجات دہندہ ان کے اپنے لوگوں میں سے ہوگا۔

بنی اسرائیل ایک خالص مذہبی حکومت کے قائل تھے۔ نظریاتی طور پر تو یہ حکومت الہٰیہ تھی مگر عملی طور پر اس کے یہ معنی تھے کہ ایک ایسے شخص کی حکومت ہو جو اپنے لوگوں کو موثر طور پر قائل کر سکے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی اور اس کے احکام کی صحیح ترجمانی کا اختیار اسی کو ہے۔ یہودی اس بات کے قائل نہ تھے کہ کوئی عرب بھی ایسا ترجمان ہو سکتا ہے۔

یہودیوں کی اس ہٹ دھرمی نے جو کسی قدر منطقی بھی تھی اور اس کے ساتھ عبداللہ بن اُبی کے غیر مصالحانہ رویے اور دوسرے لوگوں کی ہجو گوئی اور عام معاندانہ درشتی نے مل جل کر نئے اور پرانے[1] مدینہ میں کھلی مخالفت کی فضا پیدا کر دی تھی۔

پہلا باضابطہ اختلاف قبلہ کی سمت کی تبدیلی پر ہوا۔ قبلہ ایک ایسا طاق نما خلا یا محراب ہوتی ہے جو ریاضی کے اصولوں کے مطابق بڑی قطعیت سے کعبہ کی سمت کا یقین کرتی ہے۔ جس کی طرف مسلمانوں کو نماز کے وقت لازمی طور پر رُخ کرنا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی ہر مسجد یا مکان بنانے میں سب سے پہلا تعمیری قدم قبلہ کا تعیّن ہی ہوتا ہے۔ صرف خانہ بدوش ہی ایسے مسلمان ہوتے ہیں جو قبلہ کا کوئی نشان نہیں بناتے لیکن ان میں ایک خداداد اور حیران کن صلاحیت ہوتی ہے کہ نماز پڑھتے وقت وہ خود بخود اسی طرف رُخ کر لیتے ہیں جو ان کے قبلے کا ہونا چاہئے۔

کئی مرتبہ میں ابر آلود راتوں میں صحرا میں راستہ بھول جاتا۔ گو مجھے اپنے کیمپ کا کمپاسی زاویہ معلوم ہوتا تھا لیکن رات کے وقت قطعیت سے سمت متعین کرنے کی کوئی صورت نہ ہوتی تو میں، کسی عرب سے کہتا کہ قبلہ رُخ کھڑے ہو جاؤ۔ میری رہائش سے قبلہ تقریباً بالکل مشرق میں تھا

---

[1] یہودی یثرب، (مدینہ) کی قدیم آبادی میں رہتے تھے اور مسلمان انصار و مہاجر نئے مدینے میں۔

اور عموماً اُس نشان وہی پر میں سوار ہو کر روانہ ہو جاتا اور یقین کے ساتھ اپنے خیمے تلاش کر لیتا۔

یہودیوں سے اختلافات بڑھنے سے پہلے حضرت محمدؐ کا قبلہ شمال میں بیت المقدس میں تھا۔ لیکن جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں، اس کی وجہ یہودیوں کی تائید یا ہمدردی حاصل کرنا نہ تھی۔ کیونکہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے تو وہ مکہ کے دورِ اذیت میں بھی نماز پڑھتے تھے۔ یہ اس لئے تھا کہ حضرت محمدؐ کے خیال کے مطابق بیت المقدس کئی توحید پرست مذاہب کا مرکز تھا اور ساری دنیا کا مقدس شہر تھا لیکن جب آپؐ نے دیکھا کہ یہودی حصے میں حالات کیا رُخ اختیار کر رہے ہیں تو با دلِ نخواستہ آپؐ کو یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑا کہ یہودی آپؐ سے کسی قسم کے تعاون کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ چنانچہ آپؐ نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اب آپؐ کو بھی رُخ پھیر لینا چاہیئے۔

۶۲۳ عیسوی کے نومبر کی ایک صبح کو نماز کے دوران جب آپؐ دو سجدے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے کر چکے تھے تو آپؐ نے اچانک اپنا رُخ شمال سے جنوب کی طرف بدل لیا۔ آپؐ کے ساتھ ہی ساری جماعت نے بھی اپنا رُخ تبدیل کر لیا۔ اس طرح مکہ اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا کعبہ ایک مرتبہ پھر مہاجرین مکہ اور ان کے میزبان انصار مدینہ کے لئے مقدس اور محترم بن گیا چنانچہ اس روز سے مراکش سے منگولیا تک کے تمام ممالک، براستہ عرب، ہندوستان ملایا اور انڈونیشیا کے قبلہ کا رُخ مکہ کی طرف ہوتا ہے۔ نیویارک، زنجبار، سیرالیون، لندن تک کا ہر مسلمان دن میں پانچ مرتبہ صحرائے عرب کے اس مقدس شہر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا

لہ حقیقت یہ ہے کہ عرصہ سے آپؐ کی دلی خواہش تھی کہ کعبہ ابراہیمی کو اپنا قبلہ بنائیں لیکن حکم الٰہی کے منتظر تھے جو ایک نماز کے دوران ہوا اور یہ آیت نازل ہوئی " قد نرىٰ تقلّب وجهك فی السّماء ...... فولّوا وجوهكم شطره ۞ (سورہ بقر)

لہ طبری نے ابن اسحٰق کے حوالے سے لکھا ہے کہ مدینے آنے کے اٹھارہ ماہ بعد شعبان کے مہینے میں قبلہ بدل دیا گیا۔ واقدی سے بھی یہی مذکور ہے کہ ۲ھ نصف شعبان میں سہ شنبے (منگل) کے روز ظہر کی نماز کے دوران یہ تبدیلی عمل میں آئی اور آنحضورؐ نے اپنا رخ شمال سے جنوب (کعبۃ اللہ) کی طرف کر لیا۔ یہ واقعہ مدینے کے باہر ایک مسجد میں پیش آیا۔ جسے اسی سبب سے مسجد ذو قبلتین کہتے ہیں۔

ہے۔ کتنا حیرت انگیز اور عظیم خیال ہے؟

کسی اور مذہبی پیشوا کو اپنے لوگوں کو اس طریقے سے متحد کرنے کا کبھی خیال نہیں آیا اور نہ کسی مذہب میں عبادت کی اتنی سخت تاکید ہے۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دن کی ہر ساعت میں دنیا میں کسی نہ کسی جگہ مسلمان اپنی توجہ اور اپنی آنکھیں ویران سرزمین کے دھوپ میں تپتے اس مقدس مقام (کعبہ) کی طرف کئے ہوتے ہیں۔

بہت سے لوگ، خصوصاً تھیٹر کے پیشے سے تعلق رکھنے والے حضرات، ایسے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ مشرق سے مسلمانوں کا خاص مذہبی تعلق ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مشرق اپنے اندر کوئی مذہبی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ اس کا دارومدار اس پر ہے کہ مسلمان جہاں بھی ہے مکہ اس سے کس طرف ہے۔

اگر وہ صحرائے اعظم افریقہ کا خانہ بدوش ہے تو وہ اپنا رُخ عین مشرق کی طرف کر کے نماز پڑھتا ہے۔ اگر وہ پیرس (فرانس) کا رہنے والا ہے تو نماز کے واسطے اس کے لئے صحیح سمت جنوب مشرق ہوگی اور وہ اگر بحر ہند کے جزائر مالدیپ کا باشندہ ہے تو شمال مغرب، اور ایک پنجابی (پاکستانی) کے لئے عین مغرب۔ خود مکہ میں رہتے ہوئے سمت میں اختلاف ہوتا ہے۔ تمام حاجیوں کا رُخ (خواہ وہ کعبہ کے کسی طرف ہوں) اندر کی طرف کعبے کی سمت ہوتا ہے۔ چنانچہ نومبر کی اس صبح کو سجدہ جنوب کی طرف کیا گیا۔ (کیونکہ کعبہ مدینے سے جنوب کی طرف ہے)۔

یہ خبر کہ حضرت محمدؐ نے باضابطہ طور پر یہودیوں سے مذہبی مصالحت کے متعلق ہر قسم کا ناطہ توڑ لیا ہے بڑی جلدی پھیل گئی اور ماحول میں کھچاؤ پیدا ہو گیا۔ حضرت محمدؐ اور آپؐ کے ساتھی ایک طرف تیار ہو گئے اور عبداللہ بن ابی دوسری جانب، اور عملی قدم اٹھانے کے لئے زیادہ

لے مکہ کر میں کعبہ کے جتنے نزدیک ہوں اتنی ہی جلدی سمت میں تبدیلی کرنا پڑتی ہے تاکہ نظریں اور رُخ کعبے سے نہ ہٹ جائیں۔ اسی لئے مسجد حرام میں کوئی صف سیدھی نہیں بن سکتی۔ بعض اوقات تو ہر چند گز پر اپنا رُخ موڑ کر کعبہ کی طرف کرنا ہوتا ہے اور نتیجے میں صفیں سیدھی ہونے کی بجائے کعبہ کے گرد گول دائرے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ یہودیوں نے اشتعال دلانے میں پہل کی اور مسلمانوں نے جواب دیئے ہیں۔

عصماء بنت مروان نامی ایک عورت دین اسلام سے کاوش رکھتی تھی اور حضرت محمدؐ سے خاص طور پر کیونکہ اس کے نزدیک آپؐ امن وسکون کو تباہ کر رہے تھے۔ وہ شاعری میں اچھا ملکہ رکھتی تھی۔ اس نے کچھ اشعار پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کی ہجو میں لکھے۔ سامی نسل کے لوگ اشعار بہت جلد یاد کر لیتے ہیں۔ چنانچہ عصماء کے اشعار جلدی ہی مدینے کی گلیوں اور باغات میں زبانِ زدعام ہو گئے اور چٹخارے لے کر پڑھے جانے لگے۔ مسلمان جواب کوئی استہزا برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے سخت برہم ہوئے۔ ان کی برہمی پر عصماء اور اس کے ساتھی خوش ہوئے۔ پھر ان گانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور اشعار میں ذاتی حملے کئے جانے لگے۔ حضرت محمدؐ کے دشمن ہر رنگ مذہب کے فدائی مسلمانوں کی تحقیر کے لئے نئے اشعار سننے کے لئے منتظر رہنے لگے۔ غالباً ان کو یہ خیال نہیں آیا کہ یہ اونٹنی کا دودھ پینے والے (مسلمان) خون بھی بہا سکتے ہیں۔ چنانچہ انہیں اس کا نتیجہ جلد ہی معلوم ہو گیا۔

ایک رات جب عصماء اپنی اس دن کی ہجویہ شاعری ختم کر کے اپنی چٹائی پر سو رہی تھی۔ عمیرؓ[1] نامی ایک مسلمان اس کے گھر میں چھپ کر داخل ہو گئے۔ عمیرؓ چونکہ نابینا تھے اس لئے انہیں رات کو نقل وحرکت کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ جب وہ عصماء تک پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ اس کا بچہ بھی اس کی بغل میں تھا۔ بچے کو علیحدہ کر کے عمیرؓ نے اپنی تلوار سوئی ہوئی عورت کے سینے میں اتنی طاقت سے بھونک دی کہ اس کی نوک پار ہو کر فرش میں گڑ گئی۔

جب حضرت محمدؐ کو عمیرؓ کا کارنامہ معلوم ہوا تو آپؐ مسجد میں تشریف لائے۔ جماعت کو خطاب کرتے ہوئے عمیرؓ کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: "اگر آپ لوگ کسی ایسے شخص کو دیکھنا چاہتے ہیں جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اعانت کی ہے تو دیکھ لیں یہ موجود ہیں۔"

گویا یہودیوں کے خلاف آئندہ حکمتِ عملی کا واضح طور پر اعلان ہو چکا تھا۔ اب مسلمانوں کو صرف دشمن کے آئندہ اقدام کا انتظار تھا اور اس میں دیر نہ لگی۔

---

[1] عمیرؓ۔ ان کا پورا نام عمیر بن عوف تھا۔ نابینا نہ تھے مگر نظر بہت کمزور تھی۔ (حیاتِ محمدؐ)

ایک اور بوڑھے شخص ابوانک[1] کو بھی شاعری کا چسکہ تھا اور اس نے بھی حضرت محمدؐ کو ہی اپنا موضوع سخن بنایا۔ یہ غلطی اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی اور عربوں کی طرح حضرت محمدؐ کو شعر گوئی سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور ایسی نظمیں بھی جو آپؐ کے خلاف نہ ہوتی تھیں آپؐ کو برہم کر دیتی تھیں۔ چنانچہ انگلستان کے بادشاہ ہنری دوم[2] کی طرح آپؐ نے باآواز بلند پکارا۔ "کون ہے جو مجھے اس شریر اور بدقماش شخص سے نجات دلائے گا۔"

وہاں نارمن سردار تو نہیں تھے جنھوں نے گرجا میں ہی آرچ بشپ کا خون کرکے گرجا کی بے حرمتی کر دی تھی۔ البتہ کچھ ایسے ہی منچلے عرب ضرور تھے جو اس بوڑھے شاعر کے سینے میں تلوار اتار سکتے تھے۔

قتل کی ان وارداتوں نے عبداللہ بن ابی اور اس کے حامیوں کی اسلام دشمنی اور کینہ پروری میں اور اضافہ کر دیا۔ اب یہودیوں کے دلوں میں دشمنی اور نفرت کے ساتھ ساتھ خوف بھی پیدا ہو گیا تھا لیکن اس سے حضرت محمدؐ کے خلاف ان کے رویے اور دشمنی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

بنی قینقاع قبیلے کے یہودیوں نے، جو مدینے کے باہر ایک قصبے یا گڑھی میں رہتے تھے، کسی نہ کسی طرح مسلمان عربوں سے کیے ہوئے معاہدے کو توڑ دیا۔ حضرت محمدؐ ان کے اکابر کے پاس گئے۔ اور ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب سزا کے طور پر یا تو آپؐ کو اپنا پیغمبر تسلیم کر لیں یا پھر اس کے نتائج بھگتنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ یہودیوں نے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ ان کے سردار نے کہا "اے محمد! کیا ہمارے لوگوں کو آپؐ نے اپنے جیسے لوگ سمجھا ہے۔ ابھی تک آپؐ کو صرف ایسے لوگوں سے ہی واسطہ پڑا ہے جو جنگی مہارت نہ رکھتے تھے اور اسی لئے آپؐ نے انہیں قتل کر دیا۔ لیکن اگر ہم سے مقابلہ ہوا تو اسرائیل کے خدا کی قسم آپؐ جان لیں گے کہ ہم لوگ مرد میدان ہیں"

---

[1] ابوانک ایک اور ہجو گو تھا اور رسول اللہ کی شان میں گستاخانہ اشعار کہتا تھا۔ سالمؓ بن عمر نے اس کا کام تمام کیا (حیات محمدؐ)

[2] ہنری دوم۔ شاہ انگلستان نے (۱۱۳۳ء تا ۱۱۸۹ء) گرجا سے اختلافات کی بنا پر کنٹربری کے لاٹ پادری ٹامس بکیٹ THOMAS BACKET کو قتل کرا دیا تھا۔ یہ الفاظ ہنری دوم کے ہیں جو اس نے اپنے نارمن سرداروں کی موجودگی میں کہے تھے اور انہوں نے لاٹ پادری کو گرجا میں ہی قتل کر دیا۔

اس سرکشانہ انداز سے حضرت محمدؐ کو حیرت ہوئی لیکن فوری طور پر کوئی کارروائی نہ کی۔ آپؐ نے خیال کیا کہ یہ بہتر ہوگا کہ حملہ کرنے سے پہلے مزید اشتعال انگیزی کا موقع دیا جائے۔

یہودیوں نے اس مرتبہ بھی آپؐ کی تنبیہہ کی کوئی پرواہ نہ کی۔ ایک مسلمان لڑکی بنی قینقاع[1] کی ایک دوکان میں بیٹھی ہوئی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی کہ ایک بے فکرے اور لاابالی عبرانی نوجوان نے پیچھے سے آکر اس کا دامن اوپر اٹھایا اور اس کی چولی سے اٹکا دیا۔ آج کی طرح اس وقت بھی عرب عورتیں اپنی بھاری بھرکم قباؤں کے نیچے کوئی زیر جامہ نہیں پہنتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ بے خبری میں اٹھ کر بازار میں آئی تو اس کے جسم کا پچھلا حصہ عریاں ہو گیا اوباش لوگوں کی پھبتیوں اور گندے مذاق نے لڑکی کو شرم سے پانی پانی کرکے دوکان میں واپس بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اسی وقت ایک مسلمان جس نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تلوار کھینچ کر ہنسی ٹھٹا کرنے والے یہودیوں پر ٹوٹ پڑا اور ان میں سے ایک کو مار ڈالا لیکن اس سے پہلے کہ دوسرے پر وار کرے وہ خود بھی مارا گیا۔

اب حضرت محمدؐ نے کوئی تامل نہ کیا۔ آپؐ نے اپنے تمام لوگوں کو اسی سفید پرچم تلے جمع کیا جس کے ساتھ آپؐ بدر میں لڑے تھے۔ اور انہیں لے کر یہودیوں کے قلعہ پر پہنچ گئے۔ بنی قینقاع قلعے کے اندر چلے گئے اور دروازے بند کر لئے۔ حضرت محمدؐ نے ان کا محاصرہ کر لیا تاکہ انہیں بھوکا مارا جا سکے محاصرہ دو ہفتے[2] جاری رہا۔ جونہی یہودیوں نے ہتھیار ڈالے ان میں سے تقریباً چار سو افراد کو مشکیں کس کر قلعہ سے باہر لے آیا گیا اور پھر اسی جذبے کے ساتھ جس سے عالیجا[3] نے بعل[4] کے چار سو پجاریوں کو ۹۰۰ ق۔م میں کشون کی ندی کے کنارے قتل کر دیا تھا آپؐ نے ان قیدیوں کے قتل عام کا حکم دے دیا۔ لیکن

---

[1] بنی قینقاع کے یہودی زیادہ تر زرگری، سنار اور لوہار کا کام کرتے تھے۔

[2] طبری نے زہری سے روایت کی ہے کہ غزوہ قینقاع شوال ۲ھ میں ہوا اور یہ محاصرہ پندرہ شب جاری رہا۔

[3] عالیجا۔ انجیل کے مطابق یہ بھی ایک نبی اور بادشاہ تھے جو بنی اسرائیل میں ہوئے۔

[4] بعل۔ فلسطین کی ایک عبادت گاہ۔ بعل آفتاب کو کہتے ہیں یہ لوگ سورج کی پرستش کرتے تھے اور اسی نسبت سے اس شہر کا نام بعلبک پڑا جو ابھی تک لبنان میں موجود ہے۔

وقتی طور پر آپؐ کے اس حکم کی تعمیل نہ ہو سکی۔

عبداللہ بن ابی کو جب معلوم ہوا کہ کیا ہونے والا ہے تو فوراً موقعہ پر پہنچ کر یہودیوں کی طرف سے دخل انداز ہوا۔ وہ اب بھی اتنا بااثر اور طاقتور تھا کہ حضرت محمدؐ نے اس سے کھلے مقابلے کو مناسب نہ سمجھا چنانچہ ان معتوب لوگوں کی جانیں بچ گئیں۔ البتہ ان سب کو وہیں اور اسی وقت شہر بدر کر دیا گیا۔ وہ کچھ عرصے صحرا میں مارے مارے پھرتے رہے اور آخر کار شام کو ہجرت کر گئے۔ ان کی تمام املاک اور اثاثے حضرت محمدؐ اور ان کے لوگوں نے ضبط کر لئے۔ اس مالِ غنیمت میں سے آنحضرتؐ کے حصہ میں کچھ قدیم تلواریں، ایک بڑی کمان اور چاندی کا وہ چار آئینہ ملا جو شاہ ساؤل SAUL[ؑ] نے حضرت داؤدؑ کو جالوت سے مقابلے کے لئے نکلتے وقت دیا تھا۔

حالانکہ اب سادہ لوح سے سادہ لوح عبرانی پر یہ اچھی طرح واضح ہو گیا تھا کہ حضرت محمدؐ اب کوئی مزید گستاخی برداشت نہیں کریں گے لیکن ایک اور شاعر نے آپؐ کی ہجو لکھ کر غالباً یہ کوشش کی کہ شاید وہ پہلے دو مقتول شعرا سے کچھ آگے بڑھ سکے۔ اس ہجوگو کا نام کعب ابن الاشرف[ۃ] تھا۔

[لہ] ہو سکتا ہے یہ بھی ایک وجہ ہو لیکن طبری نے عاصم بن عمرو بن قتادہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ عبداللہ بن ابی نے آپؐ سے آگے درخواست کی کہ ان لوگوں نے مجھ پر بڑے احسانات کئے ہیں۔ اس لئے میری طرح انہیں چھوڑ دیں چنانچہ آپؐ نے ان سب کی جان بخشی کر دی لیکن پورے قبیلہ کو جو سات سو افراد پر مشتمل تھا جلاوطن کر دیا گیا۔ (سیرت النبی)

[ٗ] ساؤل۔ قرآن کریم میں اس بادشاہ کا نام طالوت آیا ہے یہ ہی وہ بادشاہ تھے جنہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بحوالہ انجیل فلسطیوں کے لشکر کے نامی گرامی پہلوان جالوت GOLIATH سے مقابلے کے لئے بھیجا۔ اور مقابلے پر جاتے وقت انہیں اپنا خود، اپنی زرہ اور تلوار دی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ سب کچھ وہاں ہی چھوڑا اور اپنے گوپیے (فلاخن) میں ایک چکنا پتھر رکھ کر مارا جو جالوت کی پیشانی کو پھوڑ کر اندر گھس گیا اور وہ مر گیا۔ حضرت داؤدؑ اور جالوت کے واقعہ کا ذکر قرآن کریم میں بھی اسی طرح سے ہے۔

[ۃ] کعب بن الاشرف ایک مشہور شاعر تھا اور عربوں اور یہودیوں میں معزز شمار ہوتا تھا۔ آنحضورؐ سے خاص دشمنی تھی۔ ہجو کہتا تھا مکہ جا کر بدر میں قریش مقتولین کے مرثیے لکھے اور آنحضورؐ کے قتل کے منصوبے بنائے پھر مدینہ واپس آکر فتنہ انگیزی کرتا رہا تا آنکہ قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ربیع الاول ۳ھ کا ہے۔ (سیرت النبی)

کعب نے ان جذبات کی رد میں مزید بیوقوفی یہ کی کہ اس نے نہ صرف مکہ جا کر پہلے ہی غضبناک قریش کو بھڑکا دیا بلکہ مدینہ واپس آ کر اس کے متعلق بڑی شیخی بھی بگھاری۔ حضرت محمدؐ اس وقت مسجد میں تھے۔ جب آپؐ نے سنا کہ کعب مدینے واپس آ گیا ہے آپؐ نے اپنی جگہ سے حرکت کئے بغیر اپنی دعا میں یہ الفاظ بھی شامل کر دیئے "یا اللہ تو جس طریقے سے بھی مناسب سمجھے مجھے اشرف کے اس بیٹے سے نجات[1] دلا۔

جلدی ہی مسلمان نوجوانوں کی ایک ٹولی اللہ کا یہ کام کرنے کے لئے نکل کھڑی ہوئی۔ اچھے خاصے حیلے بہانوں اور چاپلوسی کے بعد اور اس کی نئی بیوی کے متنبہ کرنے کے باوجود، وہ اس بیوقوف کو اس کے گھر سے باہر لے آنے میں کامیاب ہو گئے۔ رات کا وقت تھا۔ اس بہانے سے کہ وہ خود بھی حضرت محمدؐ کے قتل کے درپے ہیں۔ چلتے چلتے اس کو پر رونق اور آباد گلیوں سے دور لے آئے۔ پھر اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ پھر اس کا کٹا پھٹا سر حضرت محمدؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپؐ نے ان کے اس کام کو بڑی گرمجوشی سے سراہا۔

دوسرے روز آپؐ نے اعلان کر دیا کہ ہر مسلمان کے لئے شر پسند یہودی کو مارنا جائز ہے۔ اس فرمان سے اہل مسجد (مسلمان) بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد کسی یہودی کی جرأت نہ ہوئی کہ وہ غروب آفتاب، کے بعد گھر سے باہر نکلے۔ آخر کار یہودیوں کا وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ قتل کی اس مہم کی وجہ دریافت کریں اور یہ بھی کہ اس کا مداوا کیا جا سکتا ہے۔

حضرت محمدؐ نے وضاحت سے بتایا کہ یہودی اپنے اوپر یہ آفتیں خود لائے ہیں۔ ان کی نظمیں، ان کے تبصرے، ان کی پھبتیاں اور ان کی سنگ باری بلا کسی اشتعال کے تھے اور جو کچھ مسلمانوں نے کیا وہ تو جوابی کارروائی تھی لیکن اگر یہودی معاہدے کی پابندی کرنے کے لئے تیار ہیں تو وہ اس کا بندوبست کر دیں گے کہ ان کو کچھ نہ کہا جائے۔ چنانچہ ایک اور معاہدہ مرتب کیا گیا اور مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان عارضی طور پر کچھ دیر امن رہا۔

---

[1] کعب کی طرف سے زیادہ فتنہ انگیزی کا خدشہ ہوا تو آنحضورؐ نے بعض صحابہ سے شکایت کی۔ حضرت محمدؐ بن مسلمہ نے کچھ لوگوں کو ساتھ لے جا کر اس کو قتل کر دیا۔ (سیرت النبی)

اس عرصہ کے دوران جس میں حضرت محمدؐ یہ اندرونی جھگڑے طے کر رہے تھے اور جس نے ۶۲۴ء کا زیادہ تر حصہ لے لیا، مدینہ کے باہر بھی آپؐ کی کچھ مصروفیتیں رہیں۔

بدر کی شکست کی شرم نے ابوسفیان کو تقریباً پاگل بنا دیا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک وہ حضرت محمدؐ سے اس کا بدلہ نہیں لے لیتا نہ تو وہ سر منڈائے گا، نہ خوشبو لگائیگا اور نہ ہی کسی عورت کے نزدیک جائے گا۔ اس سلسلے میں اس کا پہلا انتقامی اقدام یہ تھا کہ اس نے مدینہ پر چھاپے مارنا، کھجوروں کو کاٹنا، فصلوں کو جلا دینا اور آس پاس موجود مسلمانوں کو مار ڈالنا شروع کر دیا۔ گو حملہ آور اچھی طرح مسلح اچھے جانوروں پر سوار اور تعداد میں بھی کافی ہوتے تھے، وہ حضرت محمدؐ کے لوگوں سے کھل کر مقابلہ کرنے سے بچتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی انہیں معلوم ہو جاتا کہ حضرت محمدؐ جوابی کارروائی کے لیئے آ رہے ہیں۔ جو آپؐ عام طور پر مدینہ کے نواح میں قریش کی موجودگی کے وقت ہی کرتے تھے، تو حملہ آور سر پہ پیر رکھ کر مکہ کی طرف بھاگ جاتے تھے۔ اور بعض اوقات تو وہ اتنی سراسیمگی اور جلدی میں بھاگتے کہ مسلمانوں کو اونٹوں کی شکل میں کچھ نہ کچھ مال غنیمت ہاتھ آ جاتا۔

کچھ عرصے بعد ہی ابوسفیان کو اندازہ ہو گیا کہ اس بھڑ کے چھتے سے دور رہنے میں ہی عافیت ہے اس سے حضرت محمدؐ کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ آپؐ کے چھاپہ مار دستے قافلوں کی تلاش میں مسلسل گشت کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ کچھ دیر بعد مکہ والوں میں اتنی جرأت نہ رہی کہ وہ اپنا سامانِ تجارت شام کی منڈیوں یا شمالی ممالک میں بھیج سکیں۔ چند ماہ کے اندر اندر تجارت کا توازن اس حد تک خراب ہو گیا کہ ابوسفیان کو کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کرنا پڑا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ کچھ نہ کر سکا تو مکہ تباہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے ایک اتنا بڑا کارواں بھیجنے کا فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کبھی مکہ سے نہیں گیا اور اس کو ایک قدیم متروکہ اور بے آب راستے سے روانہ کر دیا لیکن حضرت محمدؐ کے مستعد جاسوسوں نے یہ خبر فوراً اپنے صدر مقام کو پہنچا دی۔

اس مرتبہ اچھی طرح سے مسلح ایک سو سواروں کے چھاپہ مار دستے کی قیادت زیدؓ بن حارث کو سونپی گئی۔ زیدؓ بڑی خاموشی اور تیزی سے روانہ ہوئے اور چلتے قافلے کو جا لیا۔ چند ہی لمحوں میں قافلہ تتر بتر ہو کر رہ گیا۔ جو قریش مارے جانے سے بچ رہے وہ بھاگ کھڑے

ہوئے اور زیدؓ اتنی بڑی غنیمت کے ساتھ مدینے لوٹے کہ اس سے پہلے کبھی مسلمانوں کے ہاتھ نہ آئی تھی۔ چاندی کی سلاخوں، قیمتی کپڑے اور اونٹوں کے علاوہ ایک لاکھ طلائی دینار بھی تھے۔ ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ حضرت محمدؐ کو دولت ہاتھ لگی تھی۔ آپؐ نے حضرت زیدؓ کو جرنیل کے عہدے پر ترقی دے دی اور باقیماندہ لوگوں میں سے ہر ایک کو مناسب انعام و اکرام دیا۔ البتہ قریش کے حصے میں مایوسی ہی آئی۔ وہ افسردہ اپنے بتوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور حیران تھے کہ شیطان کی لائی ہوئی اس آفت سے کس طرح نجات حاصل کی جائے جو شاید تھوڑے دنوں تک مکے کو ایک غیر اہم گاؤں بنا کر رکھ دے گی۔

حالانکہ شہر مکہ کے متعلق آپؐ کا ایسا کوئی خیال نہ تھا کیونکہ آپؐ کی لڑائی تو اس کے چند مکینوں سے تھی لیکن آپؐ نے ان پر واضح کر دیا کہ آئندہ ہر قافلے کے ساتھ اسی قسم کی جارحانہ کارروائی کی جائے گی جیسی زیدؓ نے کی ہے۔ حالانکہ آپؐ نے اس کا برسرِ عام اعلان نہیں کیا لیکن فوری طور پر آپؐ یہ ہی کچھ کر سکتے تھے۔ آپؐ ابھی تک اتنے طاقتور نہیں تھے کہ عام چڑھائی کر سکتے۔ اس کے علاوہ آپؐ کے کچھ گھریلو مسائل بھی تھے۔

حضرت عمرؓ کی لڑکی حفصہؓ کے شوہر[1] جنگ بدر میں شہید ہو گئے تھے۔ اس دوران آپؐ کی صاحبزادی اور حضرت عثمانؓ کی بیوی حضرت رقیہؓ فوت ہو گئی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے سوچا کہ اگر حضرت عثمانؓ حفصہؓ سے شادی کر لیں تو شاید ان کے غم کا مداوا ہو جائے۔ لیکن حضرت عثمانؓ کسی خاص وجہ سے اس کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ حضرت حفصہؓ کی خودسری اور مغلوب الغضبی کا شہرہ سن چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے بڑی نرمی سے اس تجویز کے لئے معذرت کر لی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور انہیں بھی یہ پیش کش کی۔ لیکن انہوں نے بھی اسی سبب سے اتنی بڑی عزت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

حضرت عمرؓ بھی اتنے ہی مغلوب الغضب تھے جتنا ان کی بیٹی۔ چنانچہ آپ کو طیش آ گیا اور دراتے ہوئے حضرت محمدؐ کے پاس تشریف لے گئے اور ان دونوں حضرات سے بہت برا سلوک

---

[1] حضرت حفصہؓ کے پہلے شوہر کا نام خنیسؓ تھا۔ یہ سابقون الاولون میں سے تھے اور جنگ بدر میں اسلام کی خاطر لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔

کرنے کی دھمکی دی کیونکہ انہوں نے ان کی دامادی قبول نہ کرکے ان کی بے عزتی کی تھی۔

حضرت محمدؐ نے بڑی ہوشیاری سے اپنے دوست کا غصہ ٹھنڈا کیا اور کہا کہ ہو سکتا ہے حفصہؓ کو ان دونوں سے زیادہ بہتر شوہر ملے اور آخر میں فیصلہ کن انداز میں کہا "عمرؓ۔ درحقیقت میں خود حفصہؓ سے شادی کروں گا"۔

چنانچہ آپؐ نے یہی کیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی دوسری بیٹی ام کلثومؓ کا بھی حضرت عثمانؓ سے رشتہ طے کر دیا۔ چنانچہ ایک سہ پہر کو حضرت محمدؐ، حضرت عمرؓ کے داماد اور حضرت عثمانؓ کے خسر بن گئے۔ پہلے ہی حضرت ابی بکرؓ کے داماد اور حضرت علیؓ کے خسر ہونے کے علاوہ ان نئے رشتوں نے اسلام کے ان اکابر اور قائدین کو آپس میں پہلے سے بہت زیادہ مضبوط رشتوں میں منسلک کر دیا۔

صرف ایک شخصیت ایسی تھی جس کے لئے خاندانوں کے اس اتحاد میں کوئی مسرت نہ تھی اور وہ تھیں حضرت عائشہؓ۔ ان کے نقطہ نظر سے یہ جدی اور سیاسی رشتے اس سے زیادہ کوئی معنی نہ رکھتے تھے کہ حرم میں انہیں ایک رقیب سے واسطہ پڑیگا۔

حضرت حفصہؓ ابھی بیس سال کی ہوئی تھیں اور جسمانی طور پر جتنی پرکشش تھیں اتنی ہی خوبصورت بھی تھیں۔ ادھر حضرت عائشہؓ ابھی صرف بارہ سال کی تھیں لیکن آپ نے ذہن اپنے سے بہت بڑی عمر والوں کا پایا تھا۔ وہ بڑی حاضر جواب بھی تھیں اور خوش مزاج بھی۔ انہوں نے حضرت حفصہؓ کو بہت جلدی سمجھ لیا۔ ان کے مزاج اور طبیعت سے واقف ہو گئیں۔ جب بھی موقع ملتا وہ ان کی کمزوریوں کو حضرت محمدؐ کے سامنے ان کے خلاف خوب استعمال کرتیں۔ چند ہفتوں میں ہی حضرت عائشہؓ اس طرف سے مطمئن ہو گئیں کہ نئی شادی کے باوجود ان کے شوہر (حضرت محمدؐ) اب بھی ان سے اتنے ہی قریب تھے جتنے اس شادی سے پہلے تھے۔ وہ یہ بھی سمجھ چکی تھیں کہ حضرت محمدؐ کو حضرت حفصہؓ کا قرب تنوع تو ضرور مہیا کر سکتا تھا۔ لیکن وہ ان کی جگہ نہیں لے سکتیں۔

جب حضرت عائشہؓ کو اس طرف سے مکمل اطمینان ہو گیا تو آپ نے حضرت حفصہؓ سے محبت اور پیار کا رشتہ قائم کر لیا اور دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کی مخلص اور ہمدرد بن گئیں۔ درحقیقت حضرت محمدؐ کو بعد میں کئی بار دخل دینا پڑا جب یہ دونوں نوجوان خواتین سیدھی

سادھی اور بوڑھی حضرت سودؓا کے سامنے اپنی جوانی اور زندہ دلی کا ضرورت سے زیادہ مظاہرہ کرتیں۔

تاریخ میں حضرت حفصہؓ کی شہرت زیادہ تر قرآن کریم کے پہلے قلمی نسخے کی محافظ کی حیثیت سے ہے۔ ان کے شوہر کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ نے ایک تجویز پیش کی کہ اس سے پہلے کہ حضرت محمدؐ نے جو کچھ بتایا یا لکھایا ہے بھلا دیا جائے قرآن مجید کا ایک صحیح ترین نسخہ تیار کرایا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کام کی تکمیل کرائی اور اس دستاویز کو حضرت حفصہؓ کی تحویل میں دے دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کو اپنی لڑکی حضرت عائشہؓ کو کیوں نہیں دیا اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ غالباً آپؓ نے حضرت حفصہؓ کی تند مزاجی اور متلون طبیعت کو اس کام کے لئے زیادہ موزوں سمجھا۔ اس طرح حضرت حفصہؓ اس عظیم کتاب کی محافظ بن گئیں جو نیرہ صدیاں گزرنے پر بھی جوں کی توں موجود ہے۔

بشمول مسلمانوں کے صرف چند ہی لوگ ہیں جو تیزی سے حضرت محمدؐ کی تمام ازدواج کے نام بتا سکیں لیکن پھر بھی غالباً حضرت سودؓا اور زینبؓ بنت خزیمہ کے سوا، ان میں سے ہر ایک نے اسلام کی ترقی میں مختلف نوعیت اور اہمیت کے کردار ادا کئے ہیں۔

بارھواں باب

دوسری لڑائی

(غزوہ اُحد)

جنوری ۶۲۵ عیسوی

جنگ بدر کے پورے ایک سال بعد اہل مکہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ اگر کھویا ہوا وقار حاصل کرنا ہے تو اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرنا ہوگا۔ ان کا یہ اندیشہ کہ حضرت محمدؐ سے کسی اچھی بات کی توقع فضول ہے۔ اب بھی سوہان روح بنا ہوا تھا۔ شروع شروع میں وہ آپؐ کو ناپسند کرتے تھے۔ پھر آپؐ سے نفرت کرنے لگے اور اب آپؐ سے خوف کھانے لگے تھے۔ مکہ میں اس خوف کے سبب زندگی اپنی دلکشی اور شادمانی سے محروم ہو گئی تھی اور چونکہ اہل مکہ ہمیشہ سے شان و شوکت اور رنگ رلیوں کے دلدادہ تھے اس کی بحالی کے لئے اس خوف و اندیشے کی جڑ کو ختم کرنا لازمی تھا۔

چنانچہ جنوری ۶۲۵ عیسوی میں ابوسفیان نے تین ہزار کا لشکر تیار کیا جن میں سے اکثر زرہ پوش تھے اور دو سو گھوڑ سوار تھے۔ یہ رسالہ خالد بن ولید کی کمان میں تھا جو مستقبل میں لشکر اسلام کے ایک بہترین جنرل کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ قریب قریب قریش کے تمام اہم سرداروں نے اس لشکر کشی میں حصہ لیا۔ اس کے علاوہ قتل و خون کی دلدادہ پندرہ[1] عورتیں بھی

---

[1] ان میں سے چند عورتوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) ہند بنت عتبہ زوجہ ابوسفیان۔

(۲) ام الحکیم بنت الحارث بن ہشام بن مغیرہ۔ عکرمہ بن ابوجہل کی بیوی۔

(۳) فاطمہ بنت الولید بن مغیرہ۔ زوجہ حارث بن ہشام اور حضرت خالد بن ولید کی بہن۔

اس لشکر میں اصرار کر کے شامل ہو گئی تھیں جو مسلمانوں سے انتقام لینے جا رہا تھا۔ ان عورتوں کی سرغنہ رسوائے زمانہ ہند تھی جو سردار لشکر ابو سفیان کی بیوی تھی اور جس کے باپ عتبہ کو حضرت حمزہؓ نے جنگ بدر میں قتل کر دیا تھا۔

ہند ایک خوبصورت، عیاش طبع، ذہین اور بے رحم عورت تھی۔ حضرت محمدؐ کے خلاف یہ انتقامی مہم زیادہ تر اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس نے اپنے خاوند ابو سفیان اور اپنے دیگر پرستاروں کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس وقت تک ان سے کوئی علاقہ نہ رکھے گی جب تک کہ اس کے باپ کے خون کا بدلہ نہیں لے لیا جاتا۔ اور وہ اہل قریش کو جنگ بدر میں شکست کھانے کا طعنہ دینے سے بھی کبھی باز نہ آئی[1] بلکہ یہاں تک ہوا کہ ایک حبشی غلام کو جس کا نام وحشی تھا اور جو ایک ماہر نیزہ انداز تھا قول دیا کہ اگر وہ اس جنگ میں حضرت حمزہؓ کو مار ڈالے تو وہ اس کو آزاد کر دے گی۔ دوسری عورتیں بھی ہند کی طرح ہی خون کی پیاسی تھیں اور جب یہ لشکر مکے سے روانہ ہوا تو وہ لشکریوں کے درمیان خوشی سے دف کی آواز پر اچھل اچھل کر ناچ[2]

---

(۴) برزہ یا برہ۔ زوجہ صفوان بن امیہ بن خلف
(۵) ریطہ بنت منبہ۔ زوجہ عمرو بن عاص بن وائل
(۶) سلافہ بنت سعد۔ زوجہ طلحہ بن ابی طلحہ
(۷) خناس بنت مالک والدہ مصعبؓ بن عمیر۔ اپنے دوسرے بیٹے ابی عزیز کے ساتھ جنگ میں شامل ہوئیں۔
(۸) عمرہ بنت علقمہ بن حارث بن عبد مناۃ۔ اس نے جنگ احد میں قریشی لشکر کی تھوڑی دیر کے لئے علمبرداری بھی کی۔ (تاریخ طبری۔ جلد اول۔ حصہ سوم)

[1] طبری نے لکھا ہے کہ وحشی جبیر بن مطعم کا غلام تھا اور بلا کا نیزہ انداز تھا۔ اس کا برچھا کبھی خطا نہیں کرتا تھا۔ اسے خاص طور پر حضرت حمزہؓ کو قتل کرنے کے لئے ساتھ لیا تھا کیونکہ جبیر کے ایک عزیز کو بھی حضرت حمزہ نے ہی قتل کیا تھا۔ وہ حبشیوں کی طرح چھوٹا اور تلوار سے زیادہ تیز پھل والا حربہ یا نیزہ استعمال کرتا تھا۔

[2] یہ مشرک خواتین ہند کی سرکردگی میں راستے میں اور جنگ کے دوران دف پر یہ اشعار گا کر جوانوں کا دل بڑھا رہی تھیں:

نحن بنات الطارق ——— ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں۔
نمشی علی النمارق ——— ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں
ان تقبلوا نعانق ——— اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گی۔
او تدبروا نفارق ——— اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گی
فراق غیر وامق ——— اور اس جدائی کی ہمیں کوئی پرواہ نہ ہوگی۔ (طبری)

(سیرت النبی۔ علامہ شبلی) (طبری۔ جلد اول حصہ سوم)

رہی تھیں اور کعبہ کے ایک بت کی[1] جسے قریش نے ساتھ لے لیا تھا اور جو ایک اونٹ کی پشت پر تھا، تعریف کے گیت گاتی جا رہی تھیں۔

اس مرتبہ قریش نے اپنے اس لشکر کی نقل و حرکت کے متعلق کسی رازداری سے کام نہیں لیا۔ یہ کوئی تجارتی قافلہ بھی نہیں تھا جس کے بچانے کی ان کو فکر ہوتی اور نہ ہی انہیں رات سے پہلے پہلے شب باشی کے لئے کسی محفوظ مقام پر پہنچنے کا خیال تھا۔ وہ سب ایک ہی مقصد لے کر روانہ ہوئے تھے اور وہ تھا حضرت محمدؐ کی تلاش اور ان کا خاتمہ۔ وہ اپنی تعداد اور اسلحہ کی برتری کے پیش نظر کہیں بھی اور کسی وقت بھی جنگ کر سکتے تھے چنانچہ اس دفعہ وہ قافلوں کے عام راستے سے روانہ ہوئے جو سیدھا مدینہ کو جاتا تھا۔ یہ راستہ ابوا[2] سے ہو کر گزرتا تھا جہاں حضرت محمدؐ کی والدہ حضرت آمنہ مدفون تھیں۔ ہند نے کوشش کی کہ آپ کی قبر کی بے حرمتی کرے اور ہڈیاں نکال پھینکے۔ لیکن ابوسفیان نے ایسا کرنے سے باز رکھا اور کہا کہ آمنہ تو اس وقت انتقال کر چکی تھیں جب اسلام کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اس لئے وہ اپنے بیٹے کے جرائم کی کسی صورت سے ذمہ دار نہیں ہو سکتیں۔

لیکن عجیب اتفاق تھا کہ اس دفعہ قریش نے جتنی غفلت برتی اور بے پروائی سے کام لیا حضرت محمدؐ کے جاسوس بھی اس معاملے میں اتنے ہی غافل رہے۔ انہیں ابوسفیان کی اس زبردست مہم کا اس وقت تک بالکل پتہ نہ چلا جب تک کہ لشکر واقعی طور پر مکہ سے روانہ نہیں ہو گیا۔ مزید براں یہ کہ اس کی خبر سیدھی مکہ سے آپؐ کو پہنچائی گئی۔ حضرت عباسؓ کو جو بدر کی لڑائی میں زرفدیہ دے کر آزاد ہوئے تھے، مدینے کے قیام کے دوران مسلمانوں کے بے پناہ جوش اور جذبہ کو دیکھنے

---

[1] طبری نے ابن عباس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قریش اپنے ساتھ 'لات' و 'عزیٰ' کو لائے تھے۔ بعض نے ہبل لکھا ہے
[2] ابوا۔ حضرت آمنہؓ کی وفات اور ابوا میں ان کے دفن ہونے کا حال آپ دوسرے باب میں پڑھ چکے ہیں۔
[3] اس کتاب میں مصنف نے حضرت عباسؓ کو ہر جگہ ایک موقع پرست اور مصلحت اندیش فرد کی حیثیت سے پیش کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ شروع سے ہی آنحضورؐ کے مرید و مددگار تھے۔ بلکہ میں آپ کے قیام کا سبب یہ تھا کہ آپؐ کے خلاف قریش کے عزائم اور ان کی ہر قسم کی نقل و حرکت سے آپؐ کو مطلع کرتے رہتے تھے گویا ایک طرح سے آپ مکہ میں آنحضورؐ کے لئے خفیہ خبر رسانی کا ذریعہ تھے جو وقت کی بڑی ضرورت تھی۔ فتح مکہ کے وقت جب آپ کو یہ یقین ہو گیا کہ اب مکہ میں آپ کے مزید قیام کی ضرورت نہ ہوگی تو آپ مع اہل و عیال راستے میں آنحضورؐ سے جا ملے اور علانیہ طور پر مسلمان ہو گئے اس لئے شروع سے ہی آنحضورؐ کی امداد اور اسلام کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔

کا کافی موقعہ ملا تھا اور ان کا پہلا خیال کہ ان کے بھتیجے (حضرت محمدؐ) ایک دن دنیا کے چند مشہور لوگوں میں سے ہوں گے اور مستحکم ہو گیا تھا۔ گو وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی مدینے میں ضرورت سے زیادہ قیام کو پسند کیا تھا لیکن انہوں نے ابوسفیان کی سرکردگی میں قریشیوں کے لشکر بھیجنے کے سلسلہ میں بھی کسی مشورے میں حصہ نہیں لیا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اہل قریش کا لشکر جمع ہو گیا ہے، اور روانگی کے لئے تیار ہے تو انہوں نے ایک تیز رفتار شتر سوار قاصد کو مدینے بھیج دیا تاکہ وہ ان کے بھتیجے کو خبردار کر دے۔ قاصد نے حضرت محمدؐ کو قباؔ[1] کے ایک باغ میں پایا۔ یہ اچانک خبر سن کر آپؐ حیران رہ گئے اور فوراً مدینہ واپس آ گئے۔ آتے ہی اپنے اصحاب حضرات ابوبکرؓ۔ عمرؓ۔ عثمانؓ۔ حمزہؓ اور علیؓ کو طلب کیا۔ آپؐ نے عبداللہ بن ابی کو بھی بلایا۔ گو اب یہودیوں سے آپؐ کے تعلقات دوستانہ نہیں تھے اور ایک دوسرے کی مخالفت میں سرگرم تھے لیکن چونکہ اب مدینہ شہر کو بیرونی حملے کا خطرہ درپیش تھا اس لئے حضرت محمدؐ نے مناسب سمجھا کہ مدینہ کی مخالف یہودی جماعت کے سربراہ کو بھی اس جنگی مشورے میں شریک کر لیا جائے۔

عمر رسیدہ لوگوں نے جن میں خود حضرت محمدؐ بھی شریک تھے فیصلہ کیا کہ اتنی بڑی طاقت سے مقابلے کے لئے معقول ترین تجویز یہ ہو گی کہ شہر کی چار دیواری کے اندر رہ کر دشمن کا انتظار کیا جائے۔ لیکن حضرت علیؓ کرم اور حمزہؓ اس تجویز کے خلاف تھے۔ جب نوجوانوں کو معلوم ہوا کہ مجلس شوریٰ میں کیا ہو رہا ہے تو انہوں نے بھی شوریٰ کے جواں سال ارکان کی تائید کی۔ ان میں سے بہت سے بدر کی جنگ میں شرکت کر چکے تھے اور کچھ حال ہی میں حضرت زیدؓ کی سرکردگی میں قریش کے تجارتی قافلوں کے خلاف کامیاب مہم میں حصہ لے چکے تھے۔ وہ ان دونوں مقابلوں میں سے کسی کو بھی خطرناک مہم نہیں گردانتے تھے اور سب ہی ان کی کامیابی سے مطمئن تھے۔ بلکہ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم چار دیواری کے اندر بیٹھ کر دشمن پر پتھر پھینکتے رہے جو اتنی دور سے چل کر ہم سے لڑنے کی غرض سے آ رہا ہے تو تمام عرب والے ہمیں بزدل سمجھیں گے اور ہمارا مذاق اڑائیں گے۔

نوجوانوں کا یہ مطالبہ اتنی شدت اختیار کر گیا کہ حضرت محمدؐ نے اپنی صائب تر رائے کے خلاف

---

[1] قبا۔ مدینہ کی نواحی بستی اور نخلستان۔ ہجرت کے وقت آنحضورؐ نے پہلے یہاں ہی قیام کیا تھا۔

ان کی تجویز پر، جو آپؐ کے نزدیک نہایت غیر دانشمندانہ طریقۂ کار تھا، کاربند ہونے کا فیصلہ کر لیا اور جمعہ کے روز صبح کی نماز کے بعد مسجد نبوی میں اس کا اعلان کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ لوگوں کو یہ تنبیہہ بھی کی کہ اگر فتح چاہتے ہو تو دین پر مضبوطی سے قائم رہو۔ اس کے بعد آپؐ حضرت عائشہ کے حجرے میں آرام کے لئے چلے گئے۔

اس اثنا میں حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ نے مدینے سے جہاد کے لئے لوگوں کو اکٹھا کیا۔ یہ سارے مشکل سے ایک ہزار تھے، جن میں دو سو کے پاس زرہ تھی اور پہلی جنگ کی طرح صرف دو گھوڑے[1] تھے۔ مکّہ کے پوری طرح مسلح لشکر کے مقابلے میں اسے کوئی معقول فوج نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال فیصلہ ہو چکا تھا اور اب پیچھے ہٹنے کا سوال نہ تھا۔ لہٰذا مدینہ میں رہ کر دفاع کرنے کی ایک دو تجاویز کو مسترد کرتے ہوئے آپؐ نے لشکر کی کمان سنبھال لی۔

حضرت محمدؐ جب اپنے حجرے سے باہر نکلے اور مسجد کے میدان میں موجود لشکر کا معائنہ کیا تو آپؐ ایک پُر رعب شخصیت معلوم ہو رہے تھے۔ آپؐ نے سینے اور پشت پر چمکدار چار آئینہ زیب تن کیا ہوا تھا۔ بائیں طرف چمڑے کی پیٹی سے ایک تلوار لٹک رہی تھی۔ ہاتھ میں کمان تھی۔ سر پر ایک لمبی نوک والا خود تھا اور اس کے گرد آپؐ نے سیاہ عمامہ باندھا ہوا تھا۔ شانے پر لٹکتی ہوئی ڈھال آپؐ کے اسلحہ کی تکمیل کر رہی تھی۔ یہ اطمینان کر کے کہ ہر شخص موجود تھا آپؐ نے ایک سفید پرچم مصعب ابن عمیرؓ کے ہاتھ میں دیا اور خود ایک گھوڑے پر سوار ہو گئے اور اس طرح ایک مرتبہ پھر آپؐ کعبہ کے بتوں کے مقابلے میں خدائے برتر کا لوہا منوانے کے لئے مدینے سے باہر نکلے۔

ان ایک ہزار لشکریوں میں تین سو یہودی اور غیر مسلم عرب بھی عبداللہ بن ابی کی سرکردگی میں شامل تھے۔ مدینے سے باہر نکل کر آپؐ ایک جگہ رُکے اور باآواز بلند اعلان کیا کہ آپؐ نہیں

---

[1] بعض روایات کے مطابق آپؐ کے ساتھ اس وقت پچاس گھوڑے تھے لیکن بعد کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے ساتھ صرف دو گھوڑے تھے اور اسی پر اجماع ہے۔ ایک گھوڑا آپؐ کا اور ایک ابوبردہؓ کا۔ (طبقات ابن سعد)

چاہتے کہ اس لشکر میں مسلمانوں کے علاوہ کوئی اور بھی شامل ہو۔ عبداللہ نے اس بات کا بڑا برا منایا اور اس سے پہلے کہ لڑائی شروع ہو وہ اپنے آدمیوں کو لے کر مدینے واپس[1] چلا گیا۔ اس طرح حضرت محمدؐ کے لشکر کی تعداد صرف سات سو رہ گئی یعنی اہلِ مکّہ کے لشکر کے مقابلے میں ایک چوتھائی سے بھی کم۔

مکہ کے لشکر سے جنگ کرنے کے لئے آپؐ نے اپنی سپاہ کے لئے کوہ اُحد[2] کی ڈھلوان کو چنا۔ جبل اُحد حضرت ہارون علیہ السلام کے مدفن ہونے کے سبب بڑی تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ اس پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر پتھر کی ایک قبر یا نشان اس ہستی کی یادگار تھا جس کی معاونت کے بغیر حضرت موسیٰؑ فرعون جیسے جابر بادشاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

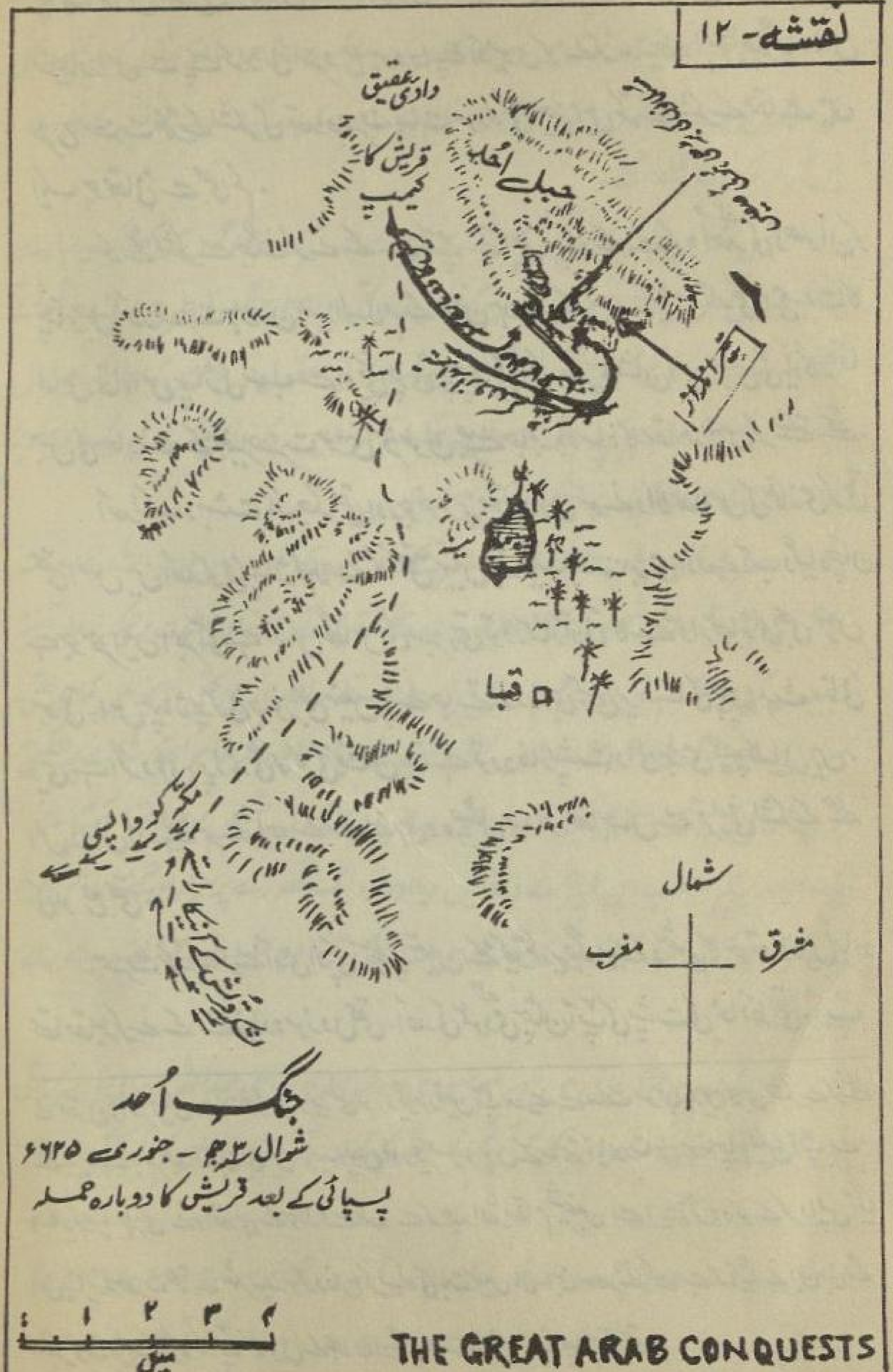
اُحد ایک دہشت ناک جگہ تھی اور جو خونریز معرکہ وہاں ہونے والا تھا اس کی غمازی کرتی تھی اصل میں اُحد کوئی پہاڑ کہلانے کا مستحق نہیں بلکہ ایک بہت بڑی اور بے آب وگیاہ چٹان ہے جو صحرا میں ابھر آئی ہے۔ جہاں گھاس کی سبز پتی تو درکنار کوئی کانٹے دار جھاڑی بھی نہیں ہوتی۔ اس پہاڑ پر کوئی جانور بھی نہیں پائے جاتے اور نہ ہی کسی پرندے کی چہچہاہٹ سنائی دیتی ہے اگر وہاں پر زندگی کا کوئی نشان ملتا ہے تو وہ خارپشت والی بڑی چھپکلیاں ہیں۔ اس ویران اور تپتے ہوئے احد کے سامنے ہی وہ چٹیل میدان تھا جہاں سے قریشی لشکر کے حملے کی توقع تھی۔

حضرت محمدؐ نے اپنے آدمی اونچی سطح پر متعین کئے کیونکہ یہ جگہ ایسے دشمن کا جو تعداد میں زیادہ تھا مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ موزوں تھی۔ اُحد کی عمودی چٹان آپؐ[3] کی پشت کی محافظ تھی۔ آپؐ

---

[1] بقول ڈاکٹر ہیکل (حیات محمدؐ) سید امیر علی اور دیگر مورخین آپؐ مدینے سے سات سو مجاہدین کا ہی لشکر لے کر نکلے تھے مدینہ سے باہر عبداللہ بن ابی تین سو یہودیوں اور غیر مسلم عربوں کے ساتھ آیا اور شامل ہونا چاہا لیکن آپؐ نے انکار کر دیا۔ طبری نے واقدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عبداللہ مقام شیخین سے اپنے گروہ کو لے کر واپس آگیا اس بنا پر کہ حضرت محمدؐ نے شہر بند ہو کر دفاع کرنے کی بات نہیں مانی۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ آپؐ نے ابن ابی کے لشکر کو شامل نہ کیا کیونکہ آپؐ مسلمانوں کے علاوہ اور کسی کو ساتھ نہیں لینا چاہتے تھے۔

[2-3] جبل اُحد مدینہ کے شمال میں دو ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے۔ جنگ کی صف آرائی کے لئے نقشہ ۱۲ ملاحظہ ہو)


نقشہ - ۱۲
وادی عقیق
قریش کا کیمپ
جبل احد
قبا
شمال
مشرق
مغرب
جنگ احد
شوال ۳ھ - جنوری ۶۲۵ء
پسپائی کے بعد قریش کا دوبارہ حملہ
۱ ۲ ۳ ۴
میل
THE GREAT ARAB CONQUESTS
BY J.B. GLUBB

نے اپنے شمشیر زن سپاہیوں کو کندھے سے کندھا ملا کر اس طرح کھڑا کیا کہ وہ لشکر قریش کے حملے کو ایک دیوار کی طرح روک سکیں۔ پاس ہی کے ایک بلند ٹیلے (جبل رماۃ) پر جو قلب کے مورچوں سے ذرا پیچھے تھا۔ اپنے تیر اندازوں کو متعین کیا۔ آپؐ نے ان کو سخت احکام دیئے کہ وہ ان کے حکم کے بغیر کسی حال میں بھی اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔ انہیں ہر حال میں اپنی جگہ پر رہنا تھا اور اسلامی لشکر کے بازوؤں کو بچانا تھا۔ آپؐ اس ہدایت پر بے حد مُصر تھے کیونکہ آپؐ خوب جانتے تھے کہ ایک رسالے کے بغیر وہ کتنے غیر محفوظ اور ہر وقت دشمن کے حملوں کی زد پر تھے۔ آپؐ نے خالد کے تیزی سے حرکت کرنے والے سوار دستے کا خطرہ بھی محسوس کر لیا تھا۔ البتہ آپؐ کو اتنا یقین تھا کہ آپؐ کی فوج کا حوصلہ قریشی لشکر سے زیادہ تھا اور یہ کہ اگر آپؐ کی ہدایت کی پوری تعمیل کی گئی تو ان کا یہ حوصلہ دشمن کی دیگر تمام برتریوں کی کمی پوری کر دے گا۔

جس وقت آپؐ اپنے لشکر کو صف آرا کر رہے تھے۔ قریشی لشکر بھی پہاڑی کے نیچے میدان میں پہنچ گیا تھا۔ دونوں لشکروں نے آمنے سامنے مورچے جما لئے اور عربی طرز کی لڑائی کا پہلا مرحلہ شروع ہو گیا۔ بکیوں کے ساتھ جو بہت سی عورتیں آئی تھیں وہ اپنے دف لئے مسلمانوں کی ہتک اور توہین کر رہی تھیں۔ پھر ہند کی باری آتی جو اونٹ پر رکھے ہوئے ہبل[۲] کے گرد ناچتی اور پھر سب مل کر جنگی ترانے گاتیں۔

لڑائی کا پہلا مرحلہ شروع ہوا تو قریشی لشکر کا موروثی پرچم بردار طلحہ سب سے آگے بڑھا اور مقابل کے لئے للکارا۔ جونہی وہ ابوسفیان کی صفوں سے آگے بڑھا حضرت محمدؐ کے لشکر سے حضرت علی کرمؓ نکلے۔ دونوں نبرد آزما لشکروں کے درمیانی میدان میں آمنے سامنے ہوئے اور بغیر کسی تمہیدی بات چیت یا رجز خوانی کے مقابلہ شروع ہو گیا۔ طلحہ اور علی کرمؓ کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کی تلوار صبح کی دھوپ میں چمکی اور قریشیوں کے علمدار کا سر اس کے شانوں سے علیحدہ

---

[۱] نقشہ نمبر ۱۲

[۲] ہبل کعبہ کا ایک بڑا اور مشہور بت تھا۔ جسے قریش ساتھ لائے تھے۔ دوسری روایات کے مطابق ہبل کی بجائے "لات" اور "عزیٰ" کے بت ساتھ تھے۔

ہو کر اچھلا اور ریت پر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ یہ دیکھ کر حضرت محمدؐ نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور جواب میں تمام مسلمانوں نے جو بے چینی سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے نعرہ ہائے تکبیر بلند کئے۔

طلحہ کے قتل ہونے پر اس کا بھائی عثمان مکّے کے لشکر سے نکلا اور حمزہؓ پر حملہ کرنے کے لئے تیزی سے بڑھا۔ حضرت حمزہ خود پہنے اور چار آئینے میں شتر مرغ کا وہی پر لگائے (جو انہوں نے بدر کی لڑائی میں بھی لگایا تھا) کھڑے پر شکوہ معلوم ہو رہے تھے۔ اسلام کی تلوار ایک مرتبہ پھر چمکی اور ایک مرتبہ پھر ایک مکّی کا بے سر جسم زمین پر گرنے سے پہلے لڑکھڑا رہا تھا۔ عثمان کو قتل کرتے ہی حضرت حمزہؓ نے بآواز بلند رجز پڑھا "میں اس کا بیٹا ہوں جسے حاجیوں کو پانی پلانے کی سعادت حاصل تھی۔ میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں" بعد ازاں طلحہ کے خاندان کے دوسرے افراد باری باری اپنے عزیزوں کا بدلہ لینے کے لئے آئے لیکن ہر دفعہ حضرت علیؓ یا حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں ان کے سر لڑھکتے دیکھے گئے۔

اب آفتاب کافی بلند ہو چکا تھا اور دھوپ کی تیزی کے سبب خون کی بو ہوا میں ملنا شروع ہو گئی تھی۔ ادھر مسلمان مجاہد اپنی صفوں میں بے چین ہو رہے تھے۔ ان کے بہادروں کی کامیابی نے ایک اور بدر کا نقشہ جما دیا تھا۔ چنانچہ حضرت محمدؐ انہیں ان کی صفوں میں زیادہ دیر نہ روک سکے اور نعرے لگاتے ہوئے وہ بلندی پر قائم شدہ مورچوں سے نکل کر نیچے کی طرف بڑھے اور جنگجو مینڈھوں کی طرح وہ قریشیوں سے ٹکرا گئے۔ قریشیوں کی صفیں ڈگمگائیں اور ان کے قدم اکھڑ گئے۔ مسلمانوں کی جانبازی کے آگے دشمن کی اسلحہ اور تعداد کی برتری کچھ کام نہ آئی۔ خالد کے سوار بھی ناکام ہو کر رہ گئے۔ جب بھی وہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے بڑھتے حضرت محمدؐ کے ماہرانہ انداز میں متعین شدہ تیر اندازان کے گھوڑوں کو چھید کر رکھ دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لڑائی ختم ہو گئی اور ہاری جا چکی ہے لیکن حقیقت میں ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور کامیابی ابھی بہت دور تھی۔

چند سال بعد تو اسلامی فوجوں کو نہ صرف اچھی قیادت مل گئی بلکہ سپاہ میں بڑا نظم و ضبط پیدا ہو گیا تھا جس پر نازک ترین حالات میں بھی بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ حکم دینے کے بعد اس کی تعمیل یقینی تھی لیکن ۶۲۵ء میں یہ نظم و ضبط موجود نہ تھا۔ عرب کبھی کبھی اپنی روایات کے تحفظ یا بدلہ لینے کے لئے لڑتے تھے لیکن ان کی لڑائی کا سب سے بڑا محرک لوٹ مار ہوتا تھا

وہ یہ ہمیشہ سے کرتے آئے تھے اور اب اس بات سے منع کرنے یار اسلام کی خاطر) چند فوجی جھڑپیں لڑ لینے سے ان کی فطرت فوری طور پہ نہیں بدل سکتی تھی۔ حضرت محمدؐ نے اونچی جگہ کا انتخاب جوانوں کی تعداد۔ اسلحہ اور تیز نقل وحرکت کے ذرائع (رسالے) کی کمی پوری کرنے کے لئے کیا تھا۔ اگر آپؐ کی ہدایات پہ پوری طرح عمل ہوتا اور لڑائی آپؐ کی ہدایات کے مطابق لڑی جاتی تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس لڑائی میں بھی آپؐ ہی کی جیت ہوتی لیکن اگر آپؐ فتح یاب نہ ہو سکے تو اس کی ساری ذمہ داری آپؐ کے اپنے لوگوں پہ آتی ہے جن کا رویہ اس لڑائی میں نہایت غیر ذمہ دارانہ رہا۔

جونہی مسلمانوں نے قریش کے قلب میں شگاف ڈال دیا تو دائیں اور بائیں بازو کے دستے بھی اپنے آپ کو سمیٹنے لگے۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ اپنی ہلاکت آفریں تلوار کے ساتھ ہر جگہ موجود تھے۔ چنانچہ جلد ہی دشمن اپنے پڑاؤ سے بھی پیچھے ہٹ گیا۔ مسلمانوں کے لئے غنیمت حاصل کرنے کے اس نادر موقعہ سے فائدہ نہ اٹھانا بہت مشکل تھا چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ اس غلبے اور برتری سے پورا فائدہ اٹھاتے انہوں نے خیموں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اُدھر ٹیلے پر سے تیر اندازوں[1] نے دیکھا کہ نیچے کیا ہو رہا ہے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ لڑائی ختم ہو گئی ہے اور ان کے ساتھی بیش قیمت غنیمت اکٹھی کر رہے ہیں۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ حضرت محمدؐ کا منشا یہ تھا اور اگر ایسا ہی تھا تو وہ پیچھے کیوں رہیں۔ ان کے سامنے ایک ایسا منظر تھا کہ جس سے ایک عام عرب اپنے آپ کو نہیں روک سکتا تھا۔ چنانچہ پیچھے دیکھے بغیر وہ بے ترتیبی سے نیچے میدان کی طرف دوڑے اور بغیر دم لئے لوٹ مار میں شریک ہو گئے۔

خالد بن ولید نے کوئی باقاعدہ فوجی تربیت حاصل نہیں کی تھی لیکن ان میں حضرت محمدؐ کی طرح فوجی قیادت کی ایک پیدائشی اور فطری صلاحیت تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک جنگجو اور

---

[1] تیر انداز حضرت عبداللہؓ بن جبیر کی کمان میں تھے۔ لوٹ مار شروع ہوئی تو آپ کے بار بار روکنے کے باوجود صرف چند لوگ آپ کے ساتھ ٹھیرے باقی سب چلے گئے۔ ابن جبیرؓ ان چند تیر اندازوں (ایک روایت کے مطابق صرف نو) کے ساتھ آخر دم تک لڑے اور شہید ہو گئے۔ (تاریخ طبری۔ طبقات ابن سعد جز وثانی)

دلیر شہ سوار تھے اور نیزے اور تلوار کو اسی مہارت سے چلا سکتے تھے جس طرح وہ اپنی فوج کو لڑا سکتے تھے۔ جنگ کے دوران ان کی نگاہ ہر وقت تیر اندازوں پر رہی اور جب بھی ان کی طرف سے ذرا تساہل دیکھتے وہ ان سے قریب ہونے کی کوشش کرتے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ تیر اندازوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے اور اسلامی سپاہ کے بازو اور عقب پر حملے کا راستہ کھل گیا ہے تو انہوں نے ذرا توقف نہ کیا۔ اپنے دستوں کو لے کر پلٹے اور مسلمانوں کی غیر منضبط صفوں پر ٹوٹ پڑے۔ یہ حملہ جتنا اچانک اور حیران کن تھا اتنا ہی شدید اور طوفانی بھی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لڑائی کا سارا نقشہ پلٹ گیا۔ یا تو مسلمان لڑائی جیتنے کے بعد خوشی خوشی مال غنیمت اکٹھا کر رہے تھے یا اب خالد کے نیزہ بردار سواروں نے ان کو چھید کر رکھ دیا اور وہ ایک چیختے چلاتے زخموں کے گروہ میں تبدیل ہو کر رہ گئے تھے۔

حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ نے ان بکھرے دستوں کو مجتمع کرنے کی لاحاصل کوشش کی۔ اسی طرح حضرت محمدؐ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ کے احکام سنا کر ان کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مسلمانوں کو ایک طرف سے خالد کے سوار نیزوں سے چھید رہے تھے تو دوسری طرف دشمن کے پیدل دستے تھے جو میدان میں واپس آ گئے تھے اور انہوں نے مسلمانوں کو تلوار کی باڑ پر رکھ لیا تھا۔ اس وقت ان کو اگر کوئی فکر تھی تو صرف یہ کہ اس جہنم زار سے کیسے نکلا جائے۔ جلدی ہی ان کے قائدین کی آوازیں بھی کہیں ڈوب گئیں۔

وحشی، ہند کا خرید کردہ قاتل، موقع کی تلاش میں تھا کہ وہ حضرت حمزہؓ کو قتل کر کے آزادی حاصل کرے۔ چنانچہ جب خالد بن ولید نے اپنے سواروں کے ساتھ چکر کاٹ کر حملہ کیا تو حضرت حمزہؓ اس وقت ایک مکی کو جس کا نام سباع یا سیباع تھا۔ "او ابن ختانہ" کہہ کر للکار رہے تھے۔ حضرت حمزہؓ نے "او امّ انمار" کے بچے سیباع" کہہ کر دو مرتبہ تلوار گھما کر اس پر حملہ کیا اور اس کو زمین پر گرا دیا لیکن اس کا سر اس کے جسم سے بالکل علیحدہ نہیں ہوا اور آپ اس کا سر کاٹنے کے لئے جھکے۔ جونہی وہ جھکے وحشی نے، جو قریب ہی تاک میں تھا، اپنا ہاتھ بلند کیا اور پوری طاقت سے اپنا برچھا حضرت حمزہؓ پر پھینکا۔ حضرت حمزہؓ ابھی اٹھ ہی رہے تھے کہ برچھا ان کی کمر میں زرہ سے ذرا نیچے پیوست ہو کر پار ہو گیا۔ حضرت حمزہؓ لڑکھڑائے اور گر پڑے۔ آپ نے اٹھنے

کی کوشش کی لیکن خون فوارے کی طرح نکل کر ریت پر بہہ رہا تھا۔ اور جلدی ہی آپ کا جسم بے حس و حرکت ہو گیا۔ جب یہ یقین ہو گیا کہ حمزہؓ فوت ہو چکے ہیں۔ تو وحشی دبے پاؤں اٹھا۔ اپنا نیزہ آپ کے جسم سے کھینچ کر نکالا اور ہند کو مژدہ سنانے چل دیا۔

ہند اس وقت ان لوگوں کو بڑھاوا دے رہی تھی جو مسلمانوں کی فتح کو تیزی سے شکست فاش میں تبدیل کر رہے تھے۔ وحشی کو دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ کیا کہنے آیا ہے۔ اس کے حسین چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حبشی غلام کا ہاتھ پکڑا اور اس کے ساتھ وہاں پہنچی جہاں مسلمانوں کے ممتاز سردار حضرت حمزہؓ چمکدار چار آئینہ پہنے اور شتر مرغ کا پر لگائے خون میں نہائے پڑے تھے۔ خوشی میں اس نے ایک چیخ ماری اور آپ کے سینے پر سوار ہو گئی اور نوچنا شروع کر دیا۔ اس نے جوش کینہ میں آپ کے کان چیر ڈالے، ناک کاٹ لی۔ اور آپ کی آنکھیں نکال ڈالیں پھر خنجر آپ کے پہلو میں اتار دیا اور آپ کا کلیجہ نکال لیا جو تا حال گرم تھا اور اس میں اپنے دانت گاڑ دیئے۔ اس وقت تک بچے کھچے مسلمان جا چکے تھے اور صرف شہدا کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ جب دوسری عورتوں نے دیکھا کہ ہند کیا کر رہی ہے تو دیکھا دیکھی انہوں نے بھی (دستور کے مطابق) مردہ جسموں کا مثلہ کرنا شروع کر دیا اور ان کی ناکیں، کان اور انگلیاں کاٹ کر گلے کے ہار بنا لئے۔

اس اثنا میں حضرت محمدؐ کی اپنی خطرناک صورت حال اور زیادہ مایوس کن ہونے لگی۔ خالد کے سواروں کے سخت اور پے در پے حملوں نے آپؐ کے لشکر کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ صرف حضرات عمرؓ، علی کرم اللہ، ابو بکرؓ اور چند دوسرے رفقاء ہی اپنے قائد کے گرد کھڑے رہ گئے تھے۔ آپؐ اپنی اور اپنے نصب العین کی حفاظت کے لئے تیر چلاتے رہے یہاں تک کہ آپؐ کی کمان ٹوٹ گئی۔ دشمن کا ایک لشکری اُحد کی ڈھلوان پر بالکل اس چٹان پر پہنچ گیا جہاں آپؐ دفاع کر رہے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ آپؐ پر حملہ کرے آپؐ نے جلدی سے اپنے محافظ کا نیزہ لے کر حملہ آور کی گردن میں اتار دیا۔ اتنے ہی میں چند اور قریشی آپؐ پر حملہ کے لئے بڑھے۔ وہ آپؐ کے خون کے پیاسے تھے اور آپؐ کو مارنے کے لئے سو مرتبہ مرنے کے لئے تیار تھے اور اگر وہاں پر حضرت عمرؓ اور حضرت علی کرم اللہ کی تلواریں نہ ہوتیں تو انہیں کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ ہوا میں ہر طرف تیر۔ نیزے اور پتھر تیر رہے تھے۔ چنانچہ حضرت محمدؐ کے بھی ایک پتھر آ لگا۔ پہلے منہ پر پھر ایک طرف چہرے پر۔ یہ پتھر اتنے زور سے لگا کہ آپؐ کے خود کی

ایک کڑی آپ کے رخسار کے اندر گھس گئی اور ایک اور پتھر نے آپؐ کی پیشانی کو بری طرح زخمی کر دیا۔

ایک اور رکی عبداللہ ابن قمیہ، جو مسلمانوں کا دشمن تھا اور جس نے مسلمانوں کے علمبردار مصعب بن عمیرؓ کو شہید کیا تھا حضرت عمرؓ اور حضرت علی کرم اللہ کی آنکھ بچا کر آگے بڑھ آیا اور حضرت محمد صلعم پر ننگی تلوار لے کر ٹوٹ پڑا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس اب اسلام کا خاتمہ ہے لیکن طلحہ بن عبداللہ، جو شروع میں ہی مسلمان ہو گئے تھے اور حضرت ابوبکرؓ کے داماد بھی تھے، بجلی سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اپنے آقا کے آگے آگئے اور وار کو اپنے اوپر لے لیا۔ اس دھکے سے حضرت محمدؐ گر پڑے اور بیہوش ہو گئے۔ ابن قمیہ کو اپنے اس حملے کی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ اصل میں کیا ہوا۔ وہ پلٹا اور پہاڑی پر سے نیچے کی طرف دوڑتے ہوئے چلایا کہ اس نے (نعوذ باللہ) حضرت محمدؐ کو قتل کر دیا ہے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اس خبر نے مسلمانوں کی شکست کو مکمل تباہی سے بچا لیا۔ کیونکہ ایک طرف تو باقیماندہ مسلمانوں نے مایوس ہو کر جوابی حملے کی تمام کوششوں کو ترک کر دیا تھا اور دوسری طرف اہل قریش کو مزید قتل و غارت سے روک دیا۔ بدر اور دوسری

لہ طبری نے ابوجعفر کے حوالے سے لکھا ہے کہ رسول اللہ کے سامنے کے جبڑے میں سے نیچے کے دانت ٹوٹ گئے آپؐ کے ہونٹ پھٹ گئے۔ رخسار اور بالوں کی جڑ کے پاس سے پیشانی زخمی ہوئی۔ آپؐ کو عتبہ بن ابی وقاص نے زخمی کیا تھا۔ انسؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کے سامنے کے دانت ٹوٹے۔ خون آپؐ کے چہرے پر بہ رہا تھا۔ آپؐ اسے پونچھتے جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ جس قوم نے اپنے نبی کا چہرہ خون سے رنگین کیا ہو کیونکر فلاح پا سکتی ہے مگر اس حال میں بھی انہیں فلاح کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ یہاں پر ہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے لیس لک من الامر شیئ کی آیت نازل ہوئی (یعنی اس معاملے میں تمہارا کوئی دخل نہیں)۔

لہ حضرت طلحہ نے وار اپنے ہاتھ پر روکا جس سے ان کی انگلیاں کٹ گئیں لیکن پھر بھی تلوار کا اچٹتا ہوا وار آپؐ کے سر اور پہلو کے بائیں حصہ پر پڑا اور ہلکا زخم آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مصعبؓ ابن عمیرؓ کی شکل رسول اللہ سے بہت ملتی جلتی تھی چنانچہ ابن قمیہ نے ان کو شہید کرتے ہی چلا چلا کر یہ اعلان کرنا شروع کر دیا تھا کہ نعوذ باللہ اس نے آنحضور کو قتل کر دیا ہے۔ اس غلط خبر سے مسلمانوں کی صفوں میں مایوسی اور افراتفری پھیل گئی اور جنگ میں کوئی دلچسپی نہ رہی بلکہ اپنی اپنی جان بچانے کی فکر پڑ گئی۔ (طبقات ابن سعد۔ طبری۔ حیات محمد۔ سیرت النبی)

لڑائیوں کی طرح عربوں کی اس جنگ کا محرک بھی انتقام لینا اور بدلے چکانا تھا۔ ابوسفیان مکّہ سے اس لئے آیا تھا کہ حضرت محمدؐ سے بدلہ لے اور یہ کہ اس کی بیوی ہند کی آرزو کہ حضرت حمزہؓ مارے جائیں پوری ہو جائے۔ چونکہ اب دونوں مقاصد پورے ہو گئے تھے۔ اس لئے لڑائی جاری رکھنے کا اب کوئی جواز نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے لشکریوں کو اکیلے دو کیلے مسلمانوں کا تعاقب کرنے سے روکا اور انہیں جھنڈے تلے از سر نو منظم کیا۔

حضرت محمدؐ صرف بیہوش ہوئے تھے۔ گو طلحہؓ زخمی تھے لیکن انہوں نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مل کر اپنے قائد کو اٹھایا اور چٹانوں کے درمیان ایک محفوظ شگاف میں لے گئے جہاں ان کے کچھ ساتھیوں نے بھی پناہ لے ہوئی تھی۔ جونہی ان لوگوں نے دیکھا کہ ان کے آقا حضرت محمدؐ زندہ ہیں ان کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو سہارا مل گیا۔ اور اگر آپؐ کی طرف سے تھوڑی سی حوصلہ افزائی مل جاتی تو وہ پھر لڑائی جاری رکھنے کو تیار تھے لیکن حضرت محمدؐ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ پچھلے ایک گھنٹے کے دوران آپؐ موت کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے اور مزید قریب پہنچنے میں کوئی فائدہ نہیں تھا۔ علاوہ ازیں غالباً آپؐ یہ بھی جانتے تھے کہ آپؐ کے لوگ بکھر چکے ہیں اور اب آپؐ کے پاس کوئی معتد بہ فوج نہیں رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ آپؐ آئندہ قدم اٹھانے کے لئے کوئی فیصلہ کریں آپؐ اپنے حواس مجتمع کرنا چاہتے تھے۔ سب سے پہلے تو ضرورت اس بات کی تھی کہ آپؐ کے رخسار میں گڑھی ہوئی خود کی زنجیر کی کڑی، جو سخت تکلیف دے رہی تھی، نکالی جائے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کرم اپنی ڈھال میں کچھ پانی لائے اور کڑی نکالنے کا تکلیف دہ عمل شروع ہوا۔ لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی یہاں تک کہ شروع میں ایمان لانے والوں میں سے ایک صحابی حضرت ابوعبیدہ (یہ جنگ بدر میں شہید ہونے والے ابوعبیدہ نہیں تھے) نے لوہے کی کڑیوں کو اپنے دانتوں سے پکڑ کر کھینچا تب کہیں جا کر آپؐ کے چہرے کے گوشت کے اندر گڑھی ہوئی کڑی باہر نکلی۔

جونہی یہ جراحی ختم ہوئی اور آپؐ کے زخموں پہ پٹی باندھ دی گئی حضرت محمدؐ نے ایک نیا خود سر پر رکھا اور نیچے میدان کی طرف دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ آپؐ نے دیکھا کہ ابوسفیان اور اس کا عملہ مسلمان شہدا کی لاشوں کی بغور پڑتال کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون کون

سے مشہور مسلمان مارے گئے لیکن یہ دیکھ کر انہیں مایوسی ہوئی کہ سوائے حضرت حمزہؓ اور مصعب بن عمیرؓ کے حضرت محمدؐ کے خاص صحابیوں میں سے اور کسی کی لاش ان میں نہ تھی اور حضرت محمدؐ کا تو کہیں نشان نہ تھا۔

کچھ دیر بعد ابوسفیان نے ڈھلتی دھوپ میں جبل اُحد کی چمکتی اطراف پر نظر دوڑائی تو کچھ افراد کو چٹانی شگاف کے باہر کھڑے دیکھ کر زور سے آواز لگائی "کیا تم میں محمدؐ۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ ہیں"؟ حضرت محمدؐ نے اپنے ساتھیوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے کہا "چلو اچھا ہوا کہ یہ سب ہی مر گئے اور ہمیں ان سے نجات ملی"۔

فاروق اعظم اس طعنہ کو برداشت نہ کر سکے اور حضرت محمدؐ کے اشارہ کا خیال نہ کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور جوابی ہانک لگائی "ہرگز نہیں۔ ہم سب زندہ ہیں اور تم میں سے ہر شخص سے لڑنے کو تیار ہیں"۔ اور پہاڑی پر موجود سارے مسلمان لڑنے کے لئے مستعد ہو گئے لیکن سب حیرت میں رہ گئے۔ جب قریشی سردار نے اس چیلنج کو نظر انداز کر دیا اور بجائے اس کے کہ وہ اپنے جوانوں کو اکٹھا کر کے حملہ کرتا ابوسفیان نے جواب دیا۔

"ہم نے آج بدر کا بدلہ لے لیا ہے۔ یہ ہبل کی کرامت ہے۔ ہبل[۱] ہمارا ہے تمہارا نہیں"۔

حضرت عمرؓ نے جواب دیا "اللہ ہمارا ہے تمہارا نہیں"۔

ابوسفیان نے کہا "ہم ایک سال کے بعد پھر بدر پر ملیں گے"۔

حضرت عمرؓ نے چیلنج قبول کرتے ہوئے کہا "انشاءاللہ"

طعنہ زنی ختم ہوتے ہی ابوسفیان نے اپنے لشکر کو تیاری کا حکم دیا اور مخالف سمت یعنی مکہ کی جانب کوچ کر دیا۔

جونہی قریش لشکر کا آخری سپاہی نظروں سے اوجھل ہوا حضرت محمدؐ اپنے محافظتی دستے کے ساتھ بڑی احتیاط سے پہاڑ سے میدان میں اترے مبادا دشمن کی یہ ایک اور چال ہو لیکن

۱۔ سیرۃ النبی کے مطابق ابوسفیان نے عزیٰ کا نام لیا تھا۔ (لنا العزیٰ ولا عزیٰ لکم) حضرت عمرؓ کا جواب تھا۔ (اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم)۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ آپ کے کون کون سے ساتھی اسلام کی راہ میں کام آئے آپؐ بڑے بے چین تھے اور مزید انتظار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اپنے محبوب چچا حمزہؓ، بہادر مصعبؓ ابن عمیر اور بہت سے دوسرے صحابہ کی لاشیں دیکھ کر آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ ان لاشوں میں سے نہ کسی کو چھوا جائے اور نہ ہی اٹھایا جائے بلکہ جہاں وہ شہید ہوئے ہیں وہاں ہی ان کو دفن کیا جائے تاکہ ان کے مزارات رہتی دنیا تک ان کی وفاداری اور جاں نثاری کی شہادت دیں۔

حضرت محمدؐ کے جاں نثار ساتھیوں کی ستر سے زائد قبریں آج بھی انہی جگہوں پر دیکھی جا سکتی ہیں جہاں وہ آج سے ایک ہزار تین سو ستر سال سے کچھ زیادہ عرصہ پہلے مکہ کے قریشیوں کے نیزوں اور تلواروں کا نشانہ بنے تھے۔ وہ کوئی شاندار قبریں نہیں ہیں بلکہ لال پتھر کے ٹکڑوں کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر ہیں۔ بہادر شہیدوں کے سرہانے اور پائینتی کی سمت متعین کرنے کے لئے دونوں سروں پر ناتراشیدہ دھاریدار پتھر نصب ہیں۔ صرف حضرت حمزہؓ کا مقبرہ پرشکوہ[1] ہے جو ایک مسجد بھی ہے، جو تراشیدہ پتھر سے بنائی گئی ہے۔ اس کا ایک مینار بھی ہے اور اس میں ایک گنبد بھی ہے۔ جس کے سایہ میں ایک سیاہ پتھر کے بڑے سے بلاک کے نیچے حضرت حمزہؓ آرام فرما ہیں۔ ان کے بازو میں کسی خاص وجہ سے عبداللہ بن جحشؓ کی قبر[2] بھی ہے۔ یہ وہی عبداللہ ہیں۔ جنہوں نے حضرت محمدؐ کے مکہ سے مدینہ آنے کے بعد پناہ کے مہینہ میں مکہ کے قافلے پر حملہ کیا تھا۔

شہدا کی تدفین سے فارغ ہونے کے بعد حضرت محمدؐ نے رات میدان جنگ میں گزاری۔ زندہ بچ نکلنے والے مجاہد بھی واپس آ چکے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ مرد اور عورتیں، جن میں حضرت فاطمہ زہراؓ بھی شامل تھیں، مدینہ سے آ گئے تھے تاکہ حضرت محمد صلعم کی وفات کی افواہ کی تصدیق

۱۔[1] حضرت حمزہؓ اور عبداللہ بن جحشؓ کی قبروں پر اب قبے یا گنبد نہیں ہیں بلکہ ان دونوں حضرات کی قبریں بالکل برابر برابر ایک کھلے اور پارک نما میدان میں ہیں جن کے گرد کافی وسیع احاطہ ہے اور جنگلا لگا ہوا ہے۔ عبداللہ بن جحشؓ بھی جنگ احد میں شہید ہوئے۔ آپ حضرت حمزہؓ کے قریبی رشتہ دار بھی تھے اور ایک ہی میدان میں شہید ہوئے۔ مسجد اب علیحدہ ہے۔ [2] یہ بات مصنف نے ۱۹۵۴ء میں پاکستان میں چھپنے والے ایڈیشن کے پیش لفظ لکھتے وقت کی ہے۔

ہو سکے۔ آپؐ کو موجود پا کر ان کی پریشانی دور ہو گئی لیکن آپؐ نے انہیں خبردار کیا کہ جب تک یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ قریش کے دل میں کیا ہے اور وہ کوئی مزید کارروائی تو نہیں کریں گے شکرانہ ادا نہ کیا جائے۔ کیونکہ جتنا کچھ آپؐ اسے جانتے تھے آپؐ کو ڈر تھا کہ ابوسفیان اپنے لشکر کو از سر نو درست کر کے مدینہ پر حملہ نہ کر دے۔ اور اگر ایسا ہوا تو اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں روک سکتا۔[1]

لیکن ابوسفیان نے حملہ نہیں کیا۔ مکّہ والوں کا مدینہ والوں سے کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ ان کی دشمنی تو حضرت محمد صلعم اور ان کے رشتہ داروں سے تھی جنہوں نے مکّہ کے تقدس کو پامال کیا تھا۔ حضرت حمزہؓ سے وہ نمٹ چکے تھے۔ اگلی دفعہ وہ حضرت محمدؐ، حضرت عمرؓ یا ابوبکرؓ میں سے کسی پر قابو پا سکتے تھے۔ مزید برآں وہ مدینے کے شہر میں اپنی سپاہ لے کر داخل ہونے کے خیال کو اس لئے بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ مبادا انہیں گھیرے میں لے لیا جائے اور وہ اپنے مرکز سے کٹ کر رہ جائیں۔ پھر وہ بہت تھکے ہوئے بھی تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے اونٹوں کو بار کیا اور آہستہ آہستہ مکّہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اسی وقت حضرت محمد صلعم بھی اپنی بچی کھچی مختصر سی فوج کو لے کر مدینے واپس آ گئے۔ شہر کی گلیاں عورتوں کے بین سے گونج رہی تھیں جن کے شوہر، باپ، بیٹے یا بھائی اس لڑائی میں شہید ہو گئے تھے۔ آپؐ نے انہیں ایسا کرنے سے نہ روکا۔ اور سیدھے اپنے مکان پر پہنچے جہاں عائشہؓ، حفصہؓ اور حضرت سودہؓ آپؐ کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے نہایت آرام سے آپؐ کے زخم صاف کئے۔ کھانا پیش کیا اور صاف کپڑے بدلوائے، اس وقت آپؐ نے بہت کم بات چیت کی۔ آپؐ تھکے ہوئے تھے اور بڑی تکلیف محسوس کر رہے تھے لیکن آپؐ ہرگز بد دل یا مایوس نہیں ہوئے تھے۔ کئی گھنٹے گہری نیند کے بعد آپؐ پھر تازہ دم ہو گئے اور دوبارہ ہتھیار لگا

---

[1] آنحضور کا خیال بالکل درست تھا جیسا کہ بعد کے واقعات بتاتے ہیں ابوسفیان مدینہ سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر روحاء کے مقام پر ٹھیر کر مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری میں مصروف ہو گیا اور اگر آپؐ اس کا تعاقب نہ کرتے اور وہ مسلمانوں کے جوش و جذبے سے خوفزدہ نہ ہو جاتا تو پلٹ کر بے خبری میں مدینے پر حملہ کرنا یقینی تھا۔

لئے۔ بلالؓ کو بلا کر آپؐ نے حکم دیا کہ لوگوں کو مسجد میں بلانے کے لئے اذان دیں۔

جب سب لوگ جمع ہو گئے اور نماز ختم ہو گئی تو آپؐ نے اعلان کیا کہ آپؐ فوری طور پر قریشی لشکر کے تعاقب میں روانہ ہو رہے ہیں اور ابھی لوگوں کی حیرانی دور نہ ہونے پائی تھی کہ آپؐ اُحد میں لڑنے والی سپاہ کے باقی ماندہ مجاہدین کو لے کر شہر سے نکل کھڑے ہوئے۔[۱]

جنگ کے دوسرے روز رات کا اندھیرا ہوتے ہوتے اسلامی لشکر نے قریش کی فوج کو جا لیا۔[۲] آپؐ نے قریش کے لشکر سے کچھ فاصلے پر ٹھہرنے کا حکم دیا اور رات کو پڑاؤ کیا جب تاریکی پھیل گئی تو آپؐ کے حکم سے دشمن کے کیمپ کے متوازی اونچی ٹیکریوں پر سینکڑوں جگہ پڑاؤ کی آگ روشن[۳] کی گئیں۔ نتیجہ بالکل آپؐ کی منشا کے مطابق نکلا۔ ابوسفیان یہ سمجھا کہ حضرت محمدؐ نے مدینہ سے مزید فوج اکھٹی کی ہے اور اب وہ اُحد کا بدلہ لینے آ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ ڈیرہ ڈنڈا اٹھا کر جنوب کی سمت تیزی سے روانہ ہو گیا اور جب تک مکہ نہ پہنچ گیا اور فصیل کے اندر داخل نہ ہو گیا اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھا۔ جب آپؐ مطمئن ہو گئے کہ آپؐ کی چال پوری طرح کامیاب ہو گئی ہے تو آپؐ پلٹے اور تیزی سے مدینے آ گئے اور لوگوں کو باور کرا دیا کہ اہل قریش اب بھی اتنے ہی بزدل ہیں جتنا کہ جنگ بدر میں تھے۔ غالباً یہ کارنامہ حضرت محمدؐ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ آپؐ نے یہ

---

[۱] عام روایات کے مطابق (بشمول طبری) آنحضورؐ جمعہ کو مجاہدین کو لے کر مدینہ سے نکلے اور جنگ احد، شوال ۳ھ بروز ہفتہ ہوئی لیکن طبری نے عکرمہ بن ابوجہل سے بھی ایک روایت کی ہے کہ جنگ ۱۵ شوال کو ہوئی اور ۱۶ شوال کو آنحضورؐ قریش کے تعاقب میں نکلے۔ دن وہی ہفتہ کا تھا۔

[۲] طبری اور علامہ شبلی کے بیان کے مطابق آپؐ نے صرف حمراء الاسد تک تعاقب کیا جو مدینہ سے آٹھ میل ہے اور تین روز وہاں قیام کیا کیونکہ ابوسفیان تھوڑے ہی فاصلے پر روحاء پارہ جا میں مقیم تھا اور دوبارہ مدینہ پر حملہ کی تیاری کر رہا تھا لیکن جب اسے معبد الخزاعی سے آنحضورؐ کے تعاقب اور تیاری کے متعلق معلوم ہوا تو فوری طور پر مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ آنحضورؐ بھی مدینے واپس آ گئے۔ آپؐ کے اس تعاقب اور حوصلے نے قریش کو دل شکستہ کر دیا اور وہ مرعوب ہو کر مکے چلے گئے۔

[۳] آپؐ نے قریش کے لشکر کے نزدیک پہنچ کر پانچ سو جگہ پڑاؤ کی آگ روشن کرنے کا حکم دیا۔ (طبقات ابن سعد)

قدم اٹھا کر یہ ظاہر کر دیا کہ آپؐ کو انسانی نفسیات کو سمجھنے اور اس کے مطابق لوگوں سے کام لینے کا کتنا زبردست ملکہ حاصل تھا۔

حضرت محمدؐ کو اُحد پر بڑی بُری ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ گو اس میں ان کی اپنی کوئی غلطی نہیں تھی اور یہ آپؐ کے احکام کی نافرمانی کا نتیجہ تھا لیکن بہر صورت آپؐ ہار گئے تھے اور لوگوں کی نظروں میں بحیثیت پیغمبر آپؐ کا وقار کچھ گر گیا تھا اور اگر آپؐ شکست تسلیم کر لیتے تو مزید گرنے کا احتمال تھا چنانچہ آپؐ نے شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس سے پہلے کہ عورتیں ان کے سپاہیوں کے گرد جمع ہو کر بے سروپا باتیں بنائیں آپؐ نے ان کو صف آرائی کا حکم دے دیا حالانکہ آپؐ زخمی تھے، جسم میں اکڑاؤ تھا بہت تھکے ہوئے تھے اور آپؐ کی عمر بھی چھپن سال کی ہو چکی تھی لیکن آپؐ فوراً گھوڑے پر سوار ہو گئے اور اس طرح روانہ ہوئے گویا آپؐ کسی ہارے ہوئے اور پست ہمت دشمن کے تعاقب میں جا رہے ہوں یہ ایک بے مثال جنگی چال اور شاندار نفسیاتی قدم تھا جو ایک تباہ شدہ فوج کا حوصلہ بحال کرنے کے لئے کسی بڑے سے بڑے جنرل کے ذہن میں بھی شاید ہی کبھی آیا ہو۔

چنانچہ جب آپؐ مدینہ لوٹے تو نہ آپؐ نے آرام کیا اور نہ ہی کسی شکست خوردگی کا مظاہرہ کیا بلکہ اس کے برخلاف آپؐ نے ایک تحکمانہ بلکہ تہدید آمیز رویہ اختیار کیا۔ شکرانے کی نماز پڑھاتے ہی آپؐ منبر پر تشریف لے گئے اور تقریر کی۔ آپؐ نے لوگوں کو بتایا کہ اُحد میں جو کچھ ہوا اس کا سبب یہ ہے کہ ابھی آپ لوگوں نے اللہ کے رسول کی اطاعت کرنا نہیں سیکھا۔ اگر آپؐ یہ سمجھ لیتے کہ میرے احکام اللہ تعالیٰ کے احکام تھے اور اگر آپ ان کی پوری تعمیل کرتے تو یقینی طور پر فتح آپ کی ہی ہوتی۔ بالکل اسی طرح جیسے بدر میں ہوا تھا۔ آپؐ نے کچھ توقف کیا اور پھر ان کو اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ اہم پیغام سنایا جو اس سے پہلے کبھی پیش نہیں کیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری کتنی بھی امداد کیوں نہ کرے۔ میری حیثیت آپ ہی کی طرح کے ایک انسان سے زیادہ کچھ نہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا ایک ترجمان اور پیغمبر منتخب کیا ہے لیکن اس سے میں الوہیت کا حامل اور لافانی نہیں ہو گیا۔ آپؐ نے ایک مرتبہ پھر ان سے درخواست کی کہ وہ اس حقیقت کو جان لیں کیونکہ جنگ کے میدان میں دیکھا گیا کہ جونہی

میری موت کی افواہ پھیلی تو آپ لوگوں میں خوف وہراس پھیل گیا۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ اگر مجھے موت بھی آجائے تب بھی آپ کے نصب العین میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیئے۔ آخر کبھی نہ کبھی تو مجھے بھی موت آنی ہے تو پھر کیا ہوگا؟ کیا آپ لوگ جو یہاں جمع ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے بہشت کا وعدہ صرف اس وقت تک کیا ہے جب تک آپ کا قائد اور اللہ کا رسول زندہ ہے۔ آخر ایسا کیوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیئے۔"

پھر آپ نے اللہ تعالیٰ کا وہ حکم سنایا جو قرآن کریم کی تیسری سورۃ میں موجود ہے۔

"وما محمدٌ اِلّا رسُول ج قد خلت من قبلِہِ الرُّسُل ط .... وسیجزی اللہ الشّاکرین ہ"

ترجمہ: "اور محمدؐ تو ایک رسول سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں پھر اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم پھر جاؤ گے الٹے پاؤں۔ اور جو کوئی پھر جاوے گا الٹے پاؤں وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا اور اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں اور شکر کرنے والوں پر یقینی طور پر انعام کرے گا۔"

خطبہ ختم کر کے حضرت محمدؐ منبر سے اترے اور آہستہ آہستہ لوگوں کی خاموش صفوں میں سے گزرے۔ ایک سال پہلے یہ لوگ بڑا مال غنیمت ہاتھ لگنے کی خوشی منا رہے تھے لیکن آج وہ زیادہ سنجیدہ تھے لیکن شاید یہ جان کر دل میں زیادہ خوش ہوں گے کہ خواہ مال غنیمت ملے یا نہ ملے وہ اب ایک ایسے قائد کے ساتھ ہیں جو کبھی ان کی سبکی یا بے عزتی نہیں ہونے دے گا۔

تیرھواں باب

مدینہ کا محاصرہ

غزوہ خندق - ذیقعد ۵ ہجری - مطابق ۶۲۷ عیسوی

مدینہ کے پس منظر میں حضرت محمدؐ عورتوں میں گھرے نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود آپؐ کی حاکمانہ اور روحانی زندگی پر خواتین کا کوئی اثر نہ تھا۔ حالانکہ حضرت عائشہؓ کا آپؐ پر کافی اثر تھا، آپؐ ان کی صحبت میں خوش رہتے تھے اور وہ آپؐ کے لئے باعث آرام وسکون بھی تھیں۔ لیکن انہیں آپؐ کے سیاسی، انتظامی یا دینی معاملات میں کوئی دخل نہ تھا۔ ۶۲۶ء اور ۶۲۷ء میں شادیوں کے اس تسلسل سے نہ تو حضرت محمدؐ نے خواتین کے خیال کو اپنے اوپر غالب آنے دیا اور نہ ہی ان کے باعث آپؐ کے مزاج یا طبیعت میں کوئی کمزوری واقع ہوئی۔ جب بھی ضرورت پڑتی آپؐ ہر وقت اپنے لوگوں کی قیادت تنظیم اور حوصلہ بڑھانے کے لئے موجود رہتے۔

۶۲۷ء[1] میں خبر ملی کہ اہل مکہ پھر لڑائی کی تیاری کر رہے ہیں۔ وہ بدر پر اپنا مقصد حاصل نہ

---

[1] جنرل گلب نے اپنی کتاب THE GREAT ARAB CONQUESTS (عربوں کی عظیم فتوحات) میں فروری ۶۲۷ء لکھا ہے۔ طبقات ابن سعد (جزو ثانی) اور سیرۃ النبی جلد اول میں لکھا ہے کہ غزوہ خندق ذیقعد ۵ھ میں ہوا۔ سیرۃ النبی کے بیان کے مطابق جنگ احزاب میں مدینہ کا محاصرہ تقریباً ایک ماہ جاری رہا اور اس کے فوراً بعد مسلمانوں نے بنو قریظہ کو پچیس روز یا تقریباً ایک ماہ محصور رکھا۔ طبقات میں بھی دونوں غزوات کی مدت تقریباً ڈیڑھ دو ماہ کے لگ بھگ لکھی ہے لیکن ساتھ ہی بڑے وثوق سے لکھا ہے کہ ۷ اور ۸ ذی الحجہ ۵ھ کو یہودیوں (بنو قریظہ) کی گردنیں ماری گئیں اور اس غزوہ سے فارغ ہو کر رسول اللہؐ نے ۱۰ ذی الحجہ کو قربانیاں دیں۔ ان بیانات کے مطابق ان غزوات میں ڈیڑھ دو ماہ سے کم عرصہ نہیں لگا اور اس طرح غزوہ خندق ۸ ذیقعد کی بجائے نصف شوال کے بعد کے ایام میں شروع ہونا زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ جنرل گلب کی یہ روایت صحیح ہے کہ عرب مورخین تاریخوں کے تعین میں کبھی صحت اور یقین سے کام نہیں لیتے۔ اسی لئے بعد کے مورخین اور سیرت نگاروں نے بھی صرف مہینہ یا سال ہی لکھا ہے۔ (مترجم)

کر سکے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ حضرت محمدؐ سے اپنے جھگڑے کو بھول گئے تھے پچھلی سردیوں میں ابوسفیان ایک بڑا لشکر تیار کرنے میں مصروف رہا تھا۔ اتنا طاقتور کہ کامیابی یقینی ہو جائے۔ اس نے اپنے ساتھ بنو غطفان کو بھی ملا لیا تھا جو صحرائے عرب کا ایک مشہور جنگجو قبیلہ تھا۔ اور بنو نضیر (یہودی قبیلہ جسے آپؐ نے مدینہ سے نکال دیا تھا) کے ان لوگوں کو بھی اپنا حلیف بنا لیا تھا جو خیبر میں جا بسے تھے۔ آگے اپنی باری میں ان لوگوں نے دوسرے یہودیوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا تاکہ وہ ملک کو اس میودد دشمن اور تباہی لانے والے مصلح دین سے نجات دلا سکیں نعوذ باللہ چند دوسرے خانہ بدوش گروہ بھی، جن پر مسلمانوں نے حملے کئے تھے، قریش کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ چنانچہ جب ابوسفیان نے مکہ سے باہر لشکر کو آراستہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ تعداد دس[1] ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ تقریباً ہر شخص کے پاس اس کا اپنا اونٹ تھا۔ تین سو گھوڑ سوار تھے۔ اور معدودے چند ہی ایسے لوگ تھے جن کے پاس زرہ نہ تھی۔ جب ابوسفیان نے آنکھوں میں ان چکا چوند پیدا کرنے والی صفوں میں گشت لگایا تو بڑا فخر اور اعتماد محسوس کیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانوں کی تباہی میں صرف میدان جنگ میں ان سے مڈبھیڑ کی دیر تھی۔ لیکن حقیقت میں یہ ہی وہ بات تھی جس سے حضرت محمدؐ بچنا چاہتے تھے۔

حضرت محمدؐ کے لشکر کی تعداد بھی اب بڑھ کر تین ہزار تک پہنچ گئی تھی لیکن اب بھی آپؐ کے پاس اسلحہ کی بڑی کمی تھی۔ آپؐ کا رسالہ نہ تو تربیت یافتہ تھا اور نہ ہی تعداد میں پچاس سواروں سے

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ کے لئے قریش کو یہودی قبیلہ بنو نضیر کے سرداروں نے آمادہ کیا جنہیں آنحضورؐ نے ان کی عہد شکنی کے سبب مدینہ سے جلا وطن کر دیا تھا اور وہ خیبر میں جا بسے تھے۔ قریش کو اکسانے کے بعد لالچ دے کر بنو غطفان کو بھی ساتھ ملا لیا۔ بنو اسد غطفان کے حلیف تھے اور بنو سعد یہودیوں کے۔ اور بنو سلیم سے قریش کی قرابت تھی۔ اس طرح مسلمانوں کی مخالف فوج میں قریش کے علاوہ بنو نضیر، بنو غطفان، بنو اسد اور بنو سلیم کے لشکر شامل تھے جن کی تعداد دس ہزار تھی۔ اس کے علاوہ مدینہ کا یہودی قبیلہ بنو قریظہ بھی عین جنگ کے دوران حیّ بن اخطب، سردار بنو نضیر کی سازش سے عہد شکنی کر کے دشمنوں سے مل گیا اور بیرونی حملہ آوروں کے علاوہ مسلمانوں کو اس اندرونی دشمن کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ ابوسفیان اس ساری فوج کا سپہ سالار تھا۔ (سیرت النبی۔ جلد اول)

زیادہ تھا۔ شروع میں دو کے مقابلے میں اب پچاس سوار ہو جانا یوں تو بڑی بات تھی لیکن صرف اتنا کافی نہ تھا۔ ابھی سارے لشکر کی سواری کے لئے اونٹوں کی بڑی کمی تھی۔ ان خامیوں کے علاوہ حالات مسلمانوں کے خلاف ہو جانے کی صورت میں وہاں پر عبداللہ بن ابی مسلمانوں کی پشت میں چھرا گھونپنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ اور ان یہودیوں کے متعلق جو مدینہ میں رہ گئے تھے یہ شک نہ کرنے کا تو سوال ہی نہ تھا کہ وہ حضرت محمدؐ سے کئے ہوئے عہد پر قائم رہیں گے۔

علاوہ ازیں کچھ لوگوں کے تحت الشعور میں اُحد کی شکست فاش کی یاد ابھی تک تازہ تھی۔ اور اس سبب سے کچھ پست حوصلگی تھی۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر مدینے سے باہر جاکر اپنے سے بہت بڑے اور بہتر طور پر مسلح لشکر سے مقابلہ کرنا سراسر بیوقوفی تھی۔ اس کی متبادل صورت یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر دفاع کیا جائے لیکن یہ بھی اتنا آسان نہ تھا۔

شہر کے بیرونی کنارے پر کافی دور تک مکانات ایک ہی قطار میں ایک دوسرے سے اس طرح ملے ہوئے تھے کہ یہ ایک نہ ٹوٹنے والی فصیل کا کام دیتے تھے۔ شمالی راستوں[۲] کی حفاظت عمودی چٹانوں کی ایک دیوار کر رہی تھی۔ بنو قریظہ یہودیوں کا واحد قبیلہ[۱] جو اب مدینے میں رہ گیا تھا حضرت محمدؐ کے عقب کا محافظ تھا۔ ان کے پاس ایک چھوٹا مگر مضبوط قلعہ بھی تھا جسے سر کئے بغیر دشمن شہر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا وہ اس کا دفاع کریں گے۔ حضرت محمدؐ کو اس کا صحیح علم نہ تھا لیکن آپ ایسا قیاس کرنے پر مجبور تھے اور آپؐ انہیں یہ بھی تاثر دینا چاہتے تھے کہ آپؐ کو ان پر پورا بھروسہ تھا۔ چنانچہ اس وقت فوری مسئلہ شہر کی جنوب[۳] اور جنوب مشرقی اطراف کا تھا جو غیر محفوظ تھیں اور جس طرف کے بازار اور گلیاں شہر کے بیرون میں باغات تک چلے گئے تھے۔ شہر کا یہ حصہ ایک زوردار حملے سے زیر کیا جا سکتا تھا اور اس طرح باقی اطراف کی حفاظتی تدابیر بیکار ہو کر رہ جاتی تھیں۔

اور یہ حضرت سلمان فارسیؓ تھے جنہوں نے اس مشکل مسئلہ کو حل کر دیا جو عربوں کو بیحد پریشان

---

[۱] بنو قریظہ ... کا آنحضورؐ سے معاہدہ تھا۔ اس لئے یہ لوگ بنو قینقاع اور بنو نضیر کے جلا وطن ہو جانے کے بعد بھی تاحال مدینہ میں رہائش پذیر تھے

[۲] لاوے کی چٹانی دیواریں مشرق اور مغرب کی طرف تھیں [۳] اصل میں شمالی اطراف کھلی تھیں اور ادھر ہی خندق بنائی گئی۔ (نقشہ ۱۳) اور ادھر ہی سے حملہ ہُوا۔

کر رہا تھا۔ سلمانؓ پہلے ایک عیسائی غلام تھے جنہیں شروع میں ایک یہودی مدینے لے آیا تھا۔ اسلام لے آنے کے سبب آپ کو غلامی سے نجات مل گئی اور آپ حضرت محمدؐ کے ایک جاں نثار پیرو بن گئے۔ چنانچہ جب آپ کو یہ موقع ملا کہ ان احسانات کے عوض جو اسلام نے آپ پر کئے تھے۔ آپ کوئی خدمت بجالائیں تو آپ نے بلا پس و پیش ایک تجویز پیش کی۔ اپنے ملک (ایران) میں بھی اور عراق میں آپ کو قلعہ بند اور محصور ہو کر لڑنے کا تجربہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ آپ کے لئے یہ تجویز کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ شہر کے کھلی طرف ایک چوڑی اور گہری خندق کھودلی جائے۔

بظاہر یہ ایک بڑی آسان اور سادہ سی تجویز تھی اور یہ تجویز کوئی بھی بتا سکتا تھا لیکن عربوں کے لئے جو ہمیشہ سے دست بدست جنگ کے عادی تھے یہ ایک بالکل نئی بات تھی اور لڑنے کا یہ ایک ایسا انوکھا اور غیر معمولی طریقہ کار تھا کہ آپکے رفقا کا پہلا ردِعمل یہ تھا کہ ایسا کرنا بزدلی ہو گی۔ لیکن حضرت محمدؐ اپنے شہر کے بچاؤ کے لئے ہر ممکن تدبیر پر غور کرنے کے لئے مجبور تھے۔ آپؐ شہر کا دفاع بہت موثر طریقے سے کرنا چاہتے تھے اور چونکہ حالات کے پیش نظر یہ ہی ایک تجویز تھی جو معقول نظر آتی تھی اس لئے آپؐ نے اسے اختیار کر لیا۔

البتہ وقت بہت کم تھا۔ اہل قریش مکہ سے روانہ ہو چکے تھے۔ گو لشکر کی تعداد زیادہ ہونے کے سبب ان کی رفتار سست تھی لیکن مدینے کے حفاظتی مورچے چند روز کے اندر اندر تیار ہو جانا ضروری تھے۔ نہ کھدائی کا سامان موجود تھا اور نہ ہی کوئی انجینئر اور نہ ہی ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے کبھی کوئی ایسا کام کیا ہو۔ خندق کی کھدائی کے متعلق اگر کوئی کچھ جانتا تھا تو وہ صرف سلمانؓ تھے اور انہوں نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دکھایا۔

حضرت محمدؐ کی رہنمائی میں کام شروع ہو گیا۔ سلمانؓ ہدایات دیتے تھے اور ساتھ ساتھ مشورے دیتے اور درستی بھی کرتے جاتے تھے۔ ادھر حضرت محمدؐ بڑے زور شور سے خندق کھودنے، کدال چلانے اور مٹی باہر نکالنے کے کام میں ہمہ تن مصروف تھے۔ آپؐ کی کمر ننگی تھی۔ بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ ڈاڑھی سینے کو چھو رہی تھی اور آپؐ الفاظ سے، اشعار سے اور خود کام کرنے کی مثال پیش کر کے اپنے لوگوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ مدینے کی غیر محفوظ اطراف میں ایک گہری اور اتنی چوڑی خندق جسے گھوڑا نہ کود سکے بنتی چلی گئی اور جب ابوسفیان کے پہلے مخبر سپاہی قریب کی پہاڑیوں پر نمودار ہوئے

تو خندق تیار ہو چکی تھی۔[1]

حضرت محمدؐ اور آپ کے صحابہ نے اپنے آپ کو مسلح کیا اور تین ہزار سپاہ کو لے کر خندق کے پیچھے مورچے[2] سنبھال لئے۔ اشد ضرورت کے لئے نئے قائم شدہ سوار دستے کو قلب لشکر میں بطور محفوظ دستہ رکھا گیا اور اس سے پہلے کہ دشمن مدینے کے میدان میں نمودار ہو محافظین حملہ روکنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔

قریش نے بھی شہر کے دفاع کے اس نئے طریقہ کار کے متعلق کبھی نہیں سنا تھا جس طرح مسلمان ایک ہفتہ پیشتر اس سے لاعلم تھے۔ چنانچہ مدینے کی سپاہ کو کچلنے کے لئے وہ پورے لشکر کے ساتھ بڑھتے چلے آئے جو دیکھنے میں ان کے مقابلے میں بہت تھوڑی تھی۔ وہ حیران رہ گئے جب انہوں نے دیکھا کہ ان کا راستہ ایک خندق نے روک لیا ہے۔ جس کے پیچھے سے مسلمان تیر انداز بالکل قریب سے ان پر تیروں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ چنانچہ وہ فوراً پیچھے ہٹ گئے اور ان کے تیروں کی زد سے کافی دور اپنے پرے جمائے۔

چند روز تک دونوں لشکر ایک دوسرے کا جائزہ لیتے رہے۔ قریش نے جنگ کا یہ نیا طریقہ کار اختیار کرنے پر مسلمانوں پر بڑی طعنہ زنی اور دشنام طرازی کی اور اسے مردانگی کے خلاف بتایا۔ مسلمان ان باتوں کا جواب تیروں کی بارش اور سنگ باری سے دیتے رہے لیکن کسی طرف سے اصل

---

[1] طبقات ابن سعد (جزو ثانی) میں البراء بن عاذب سے روایت کی گئی ہے اور شبلی بھی سیرت النبی میں یہی لکھتے ہیں کہ احزاب میں رسول اللہ مٹی ڈھو رہے تھے۔ شکم مبارک پر گرد پڑی ہوئی تھی اور آپؐ اشعار پڑھ رہے تھے۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ عجیب منظر تھا۔ جاڑے کی راتیں تھیں اور تین تین دن کے فاقے لیکن آپ مہاجرین و انصار کے ساتھ مٹی خندق سے باہر پھینک رہے تھے اور وہ لوگ جوش محبت میں کہتے جاتے تھے۔

نحن الذی بایعوا محمداً - علی الجہاد ما بقینا ابداً

[2] آنحضرت نے خندق کے حدود خود قائم کئے۔ داغ بیل ڈال کر دس دس آدمیوں کو دس دس گز زمین کھدائی کے لئے تقسیم کی۔ خندق کی گہرائی پانچ گز تھی۔ تین ہزار افراد نے بیس دن میں تیار کی۔ (سیرت النبی) چوڑائی کے متعلق کہیں واضح طور پر نہیں لکھا گیا لیکن صرف چند چٹانی جگہوں کو چھوڑ کر ساری خندق اتنی چوڑی تھی کہ گھوڑا نہیں کود سکتا تھا اور ناقابل تسخیر تھی (مصنف) (نقشہ ۱۳) صاحب "حیات محمد" لکھتے ہیں کہ رات دن کی مسلسل محنت سے مسلمانوں نے خندق کی کھدائی چھ روز میں مکمل کر لی تھی۔

لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔

ابوسفیان نے جسے توقع تھی کہ وہ حضرت محمدؐ کو ایک دن میں شکست دے دے گا اور دس روز کے اندر اندر مکہ واپس پہنچ جائے گا، اس تاخیر پر بہت پیچ وتاب کھایا۔ اس نے اپنے معاونین کو یقین دلایا تھا کہ انہیں بہت جلد اور بغیر کسی دقت کے مال غنیمت ملے گا اور اب وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس تعطل کی ساری ذمہ داری اس پر ڈالی جارہی ہے۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کی صفوں میں بے اطمینانی اور پست حوصلگی پھیلنا شروع ہوگئی ہے اور اگر ایک مرتبہ اس بے اطمینانی نے قدم جمالئے تو فوج کا وہ حصہ جو صرف لوٹ میں حصہ بٹانے کے خیال سے ساتھ آگیا تھا اپنی چراگاہوں کو لوٹ جائے گا اور وہ حضرت محمدؐ کے جھگڑے کو فراموش کردیں گے۔

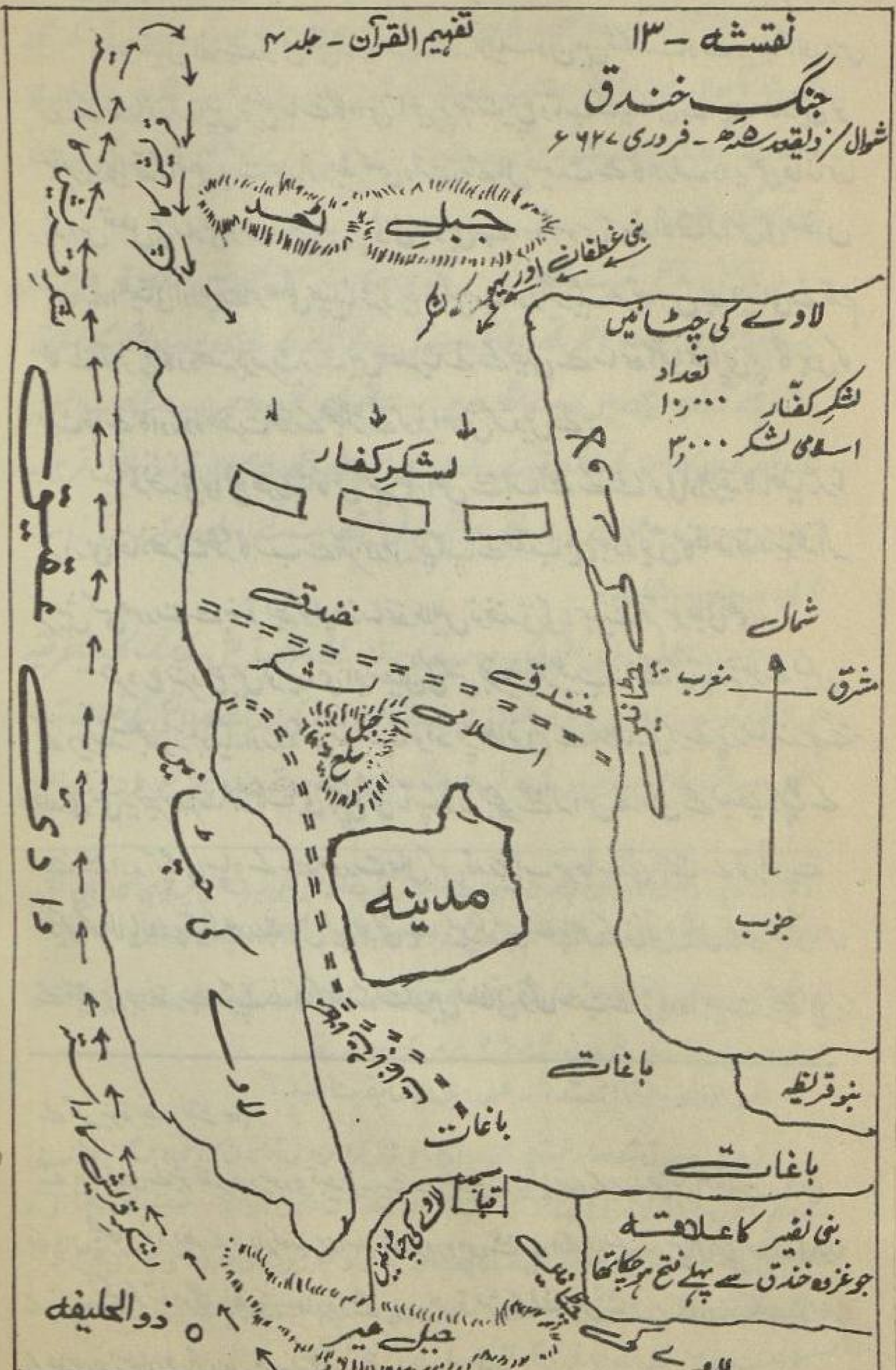
چونکہ خندق واضح طور پر ناقابل تسخیر تھی اس لئے اب حملے کے لئے کوئی اور طریقہ کار اختیار کرنا ضروری تھا۔ حضرت محمدؐ کا سب سے کمزور مورچہ آپ کے عقب میں یہودیوں[1] کا قلعہ تھا۔ کیونکہ اگر قریش کسی صورت سے بنو قریظہ کو اپنے ساتھ ملالیں تو خندق کی اہمیت ختم ہوجاتی تھی۔

شروع شروع میں تو یہودی ابوسفیان کی کسی تجویز یا ترغیب کو سننے کو تیار نہ ہوئے لیکن کچھ دیر بعد سمجھوتہ ہوگیا۔ اور وہ کسی مناسب موقعہ پر مسلمانوں سے بدعہدی کرنے پر رضا مند ہوگئے۔[2] جلدی ہی یہ خبر حضرت محمدؐ تک بھی پہنچ گئی۔ آپؐ فوراً سمجھ گئے کہ اس غداری کے سبب آپؐ کے اپنے لئے اور آپؐ کی سپاہ کے لئے صورت حال کس قدر خراب ہوجائے گی۔ آپؐ نے فوراً اپنے نائبین کو بلایا اور بتایا کہ صورتِ حال کیا ہوگئی ہے۔ کیونکہ کسی کے پاس کوئی قابل عمل تجویز نہ تھی اس لئے آپؐ ہی بولتے رہے۔ آپؐ نے کہا کہ مکہ کے لشکر میں غطفانی لوگ سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

---

[1] قلعہ بنو قریظہ (نقشہ ۱۳)

[2] ابوسفیان نے بنو نضیر (وہ یہودی قبیلہ جو مدینے سے جلاوطن کردیا گیا تھا) کے سردار حیّ بن اخطب کو بنو قریظہ کے پاس بھیجا۔ بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد نے شروع میں ملنے سے انکار کیا لیکن بعد میں حیی بن اخطب کی باتوں میں آکر عہد شکنی کو تیار ہوگیا۔ (طبری) معاہدہ توڑ کر یہودی بھی قریش کے لشکر میں شامل ہوگئے اور ان قلعوں کا محاصرہ کرلیا جن میں مسلمان عورتیں اور بچے پناہ گزین تھے۔ (سیرت النبی)


نقشہ - ۱۳
جنگِ خندق
شوال / ذیقعدہ ۵ھ - فروری ۶۲۷ء
تفہیم القرآن - جلد ۴
جبلِ اُحد
لاوے کی چٹانیں
تعداد
لشکرِ کفار ۱۰,۰۰۰
اسلامی لشکر ۳,۰۰۰
لشکرِ کفار
خندق
جبل سلع
مدینہ
شمال
مغرب
مشرق
جنوب
باغات
بنو قریظہ
باغات
باغات
قبا
بنی نضیر کا علاقہ
جو غزوہ خندق سے پہلے فتح ہو چکا تھا
ذوالحلیفہ
جبلِ عیر

اس لئے یہ مناسب ہوگا کہ ان کو مدینہ کی کھجوروں کی فصل کے تیسرے حصے کا لالچ دے کر ابو سفیان سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ تجویز کو خاموشی سے سنا گیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ حضرت محمدؐ نے کھلے طور پر طاقت کی بجائے کسی اور ذریعہ سے صورت حال کو قابو میں لانے کی تجویز کی تھی۔ مدینہ کے قبیلے بنی اوس کے سردار سعد بن معاذؓ نے بولنے میں پہل کی اور دریافت کیا "آپؐ یہ تجویز اللہ کے حکم سے کر رہے ہیں یا یہ صرف آپؐ کا اپنا خیال ہے"؛ چونکہ آپؐ کے اپنے خیال میں بھی یہ تجویز زیادہ معقول نہ تھی اس لئے آپؐ نے فرمایا: "اگر یہ حکم الٰہی ہوتا تو میں آپ لوگوں سے مشورہ نہ کرتا۔ بہر حال ہم ایک آفت میں گھر گئے ہیں اور یہ اس سے بچ نکلنے کا ایک راستہ ہے"۔

سعدؓ نے اپنا سر نفی میں ہلایا اور بلند آواز سے کہا "یا رسول اللہ جب ہم غطفانیوں کی طرح بت پرست تھے اس وقت بھی وہ ہم سے مدینہ کی کھجور بغیر قیمت ادا کئے نہ لے سکے تو کیا اب جبکہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں اور آپؐ کی قیادت میں ہیں انہیں یہ مفت دے دیں گے، خدا کی قسم ایسا ہرگز نہ ہوگا اور اگر وہ ہماری کھجور حاصل کرنے کے درپے ہی ہیں تو وہ صرف تلوار کے ذریعہ ہی لے سکتے ہیں"۔

سعدؓ سے کسی نے اختلاف نہ کیا اور اس طرح یہ تجویز مسترد ہو گئی۔ سعدؓ نے مزید کہا —— "بنو قریظہ کی غداری ابھی تک صرف ایک افواہ ہے۔ میں خود اور میرا قبیلہ بہت سالوں تک ان یہودیوں سے کاروبار میں شراکت کرتے رہے ہیں اور کبھی کوئی شکایت کا موقعہ نہیں آیا۔ اس لئے کچھ اور کرنے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ بنو قریظہ کا عندیہ معلوم کیا جائے"۔ چنانچہ حضرت سعدؓ جنگی مجلس سے باہر نکل آئے اور سوار ہو کر اپنے سابقہ شرکائے کار یہودیوں سے ملنے چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر ان کے اکابر کو اپنے طور پر دوستانہ بات چیت کے لئے بلایا اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ ان کے جواب سے ان تمام باتوں کی تصدیق ہو گئی جس کا حضرت محمدؐ کو ڈر تھا۔ حضرت سعدؓ کو جواب دیئے بغیر انہوں نے عہد شکنی کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی۔ انہوں نے کہا: "محمدؐ کون ہوتے ہیں اور پیغمبر خدا ہے کون جس کی ہم اطاعت کریں؟ ان کے اور ہمارے درمیان کوئی معاہدہ یا عہد و پیمان نہیں ہے"۔

حضرت سعدؓ حضرت محمدؐ کے ہیڈ کوارٹر کی طرف لوٹ آئے اور سوچ رہے تھے کہ ان کے

غطفانیوں کو کھجور کا لالچ دینے کی تجویز کا مذاق اڑانے میں کہاں تک معقولیت تھی۔ ادھر یہودیوں نے جو جواب دیا وہ جتنا غلط تھا اتنا ہی باغیانہ تھا لیکن اس قسم کی باتیں سوچنے سے اس وقت مسلمانوں کو کیا فائدہ ہوگا۔ بہر حال ان باتوں پر سوچ بچار کرنے کا ان کے پاس وقت نہ تھا کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ اگلی صفوں میں لڑائی کا غلغلہ تھا اور ہلچل مچی ہوئی تھی۔

شہر حوالے کرنے کے لئے بنو قریظہ کے فیصلے کے انتظار کے دوران ہی ابو سفیان نے خندق پر ایک بڑا حملہ کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ تین قریش جنگجو[1] عکرمہ بن ابو جہل، حضرت خدیجہؓ کے ایک چچا عمرو (بن عبدود) اور نوفل جو جنگ بدر سے پہلے پناہ کے مہینے کے دوران عبداللہ بن جحش کے حملے کا نشانہ بننے والے مشہور قافلے کے سالار تھے، اپنے گھوڑے کو دا کر ایک جگہ سے خندق پار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے کچھ اور لوگ بھی خندق کے اس طرف آ گئے تھے۔ یہ حضرت محمدؐ اور ان کے لوگوں کے لئے بڑا نازک لمحہ تھا اور یہ شکست کا موجب بھی ہو سکتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ ہر اس پھیلے حضرت علیؓ اور چند دوسرے شمشیر زنوں نے حملہ آوروں کو ان کے دوسرے ساتھیوں سے علیحدہ کر کے نرغے میں لے لیا۔ اسی وقت حضرت محمدؐ نے خطرے کی جگہ کمک بھیج دی۔ طرفین میں ذرا کی ذرا خاموشی رہی۔ اس کے بعد عمرو اور اس کے ساتھیوں نے ایک سے ایک کے مقابلے کا مطالبہ کیا۔

حضرت علیؓ فوراً آگے بڑھے اور عمرو کے مقابلے میں آ گئے۔ جب بوڑھے جنگ آزمانے دیکھا

---

[1] طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ یہ لوگ عکرمہ ابن ابو جہل، عمرو بن عبدود، نوفل بن عبداللہ، ضرار بن الخطاب (حضرت عمرؓ کے بھائی) اور ہبیرہ بن ابی وہب تھے۔ عبدود کی عمر نوے سال ہو چکی تھی لیکن بہادری اور شجاعت میں ہزار سواروں کے برابر مانا جاتا تھا۔ اس کو حضرت علیؓ نے قتل کیا۔ علامہ شبلی نے سیرت النبی میں اس معرکے کی پوری تفصیل دی ہے۔

[2] جونہی قریش کے کچھ سوار خندق پار کر کے مسلم صفوں کی طرف بڑھے حضرت علیؓ نے چند مسلمانوں کو لے کر فوراً خندق کے اس حصے پر قبضہ کر لیا جہاں سے انہوں نے گھوڑے کدائے تھے اور ان کا واپسی کا راستہ بند کر دیا اور ان کو گھیرے میں لے لیا۔ (طبری۔ جلد اول۔ حصہ سوم)

کہ اس کے مقابلے میں کون ہے تو وہ ہنسا۔ وہ علیؑ کو بچپن سے جانتا تھا اور ابھی تک انہیں بچہ ہی سمجھتا تھا۔ لیکن علیؑ بالکل نہ ڈرے۔ اور کسی دشمن پر جھپٹے جواب گھوڑے سے اتر کر ان کا منتظر تھا۔ اس نے بھاری بھرکم زرہ پہنی ہوئی تھی اور اس کی سفید ڈاڑھی چار آئینے پر لہرا رہی تھی۔ کافی معمر[1] ہونے کے باوجود وہ ابھی تک ایک نامی گرامی شمشیر زن گنا جاتا تھا۔ حضرت علیؑ نے جلد ہی یہ بات بھانپ لی کیونکہ بھرپور حملوں اور اپنی تیزی اور پھرتی کے باوجود اس نے آپؑ کو قریب نہ پھٹکنے دیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ ہار جائیں گے۔ جلدی ہی آپ اس کے تابڑ توڑ اور بجلی ایسی تیزی کے حملوں کو روکتے ہوئے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ شیر عرب (حضرت علیؑ) کا خاتمہ قریب ہے لیکن اس نازک لمحہ میں کہ حضرت علیؑ اپنے بچاؤ کے علاوہ اور کچھ نہیں کر رہے تھے۔ عمرو نے محسوس کیا کہ کوئی اس کی پشت سے حملہ کر رہا ہے اور اس نے سر گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اس میں شاید ایک لمحے سے زیادہ نہ لگا ہو لیکن حضرت علیؑ کے لئے یہ بہت کافی تھا آپؑ فوراً جھپٹے اور جھک کر اپنی تلوار کے ایک ہی وار سے اس کی ایک ٹانگ کاٹ ڈالی۔ نامور قریش ایک لمحہ ٹھٹکا اور ایک ٹانگ پر لڑکھڑاتے ہوئے علیؑ اور اس کے خاندان کو برا بھلا کہا۔ پھر اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کو اٹھا کر اپنی پوری طاقت سے حضرت علیؑ پر دے مارا۔ یہ اس کا آخری وار تھا۔ اس ضرب سے علیؑ سن ہو کر رہ گئے لیکن دوسرے ہی لمحے آپ سنبھل گئے اور اپنی تلوار عمرو کے جسم میں اتار دی۔

اسی اثنا میں دوسرے مقابلے بھی ہو رہے تھے۔ سعد بن معاذؓ زخمی ہو گئے۔ اور نوفل پیچھے ہٹتے ہوئے خندق میں جا گرا۔ حضرت خدیجہؓ کے ایک اور بھتیجے حضرت زبیر (بن عوام) اس کے پیچھے خندق میں کود ے اور اس کا سر کاٹ لیا۔ عکرمہ برچھے کا ایک زخم کھا کر خندق کے دوسرے کنارے واپس جاتے ہیں کامیاب ہو گیا۔ دوسرے لوگوں میں سے کچھ مارے گئے اور کچھ بچ کر نکل گئے۔ بہر صورت مدینہ کی لڑائی کے اس واحد دست بدست معرکے میں مسلمان فتح یاب رہے۔

بایں ہمہ ابو سفیان اس سے مایوس نہیں ہوا۔ اس کے خیال میں اگر چند لوگ خندق پار

---

[1] عبدود کی عمر اس وقت ۹۰ (نوے) سال کی تھی۔

کر سکتے تھے تو باقی بہت سے بھی کر سکتے تھے چنانچہ اس وقت سے اس نے دن اور رات مسلمانوں کی صفوں پر مسلسل حملے جاری رکھے۔ کبھی رسالے کے کچھ سوار خندق کے تنگ حصے پر یلغار کرتے۔ کبھی کچھ تیر انداز رات کے اندھیرے میں بڑھ کر خندق کے کسی اور حصے پر پہنچ جاتے اور دشمن کی صفوں پر تیر اندازی کرتے اور اس سے پہلے کہ کوئی جوابی کارروائی ہو وہاں سے پیچھے ہٹ جاتے۔ خندق کے کنارے کہیں نہ کہیں مسلسل طور پر کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ دفاع کرنے والوں کو نماز پڑھنے کا وقت بھی نہ ملتا تھا[1]۔ اس سے حضرت محمدؐ کو بہت پریشانی ہوتی تھی اور جب بھی موقع ملتا آپؐ جتنے آدمی بھی اکٹھے ہو سکتے جمع کرتے اور مورچوں کے پیچھے نماز ادا کر لیتے لیکن اس پر بھی نماز بہت مختصر کرنا پڑتی اور کمر لگائے لگائے ہی ادا کی جاتی۔ چنانچہ اعصاب پر ضرورت سے زیادہ بوجھ اور کھچاؤ اثر دکھانے لگا۔ سپاہ میں تھکاوٹ کے آثار نظر آنے لگے اور ایسا دکھائی دیتا تھا کہ اگر مکے والوں اور ان کے معاونین نے اپنے یہ پریشان کن حربے جاری رکھے تو مسلمان اتنے تھک جائیں گے کہ لڑنے کے قابل ہی نہ رہیں گے۔ مسلم قائدین کے لئے عقب سے یہودیوں کا خطرہ ایک اضافی پریشانی تھی۔ اب تک بنو قریظہ نے کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا تھا۔ وہ ایک ایسے مناسب موقعہ کی تلاش میں تھے کہ کوئی بڑا خطرہ مول لئے بغیر لڑائی میں شریک ہو جائیں۔ ان کی یہ احتیاط ہی حضرت محمدؐ کو بچا گئی[2]۔

چونکہ خندق کے دونوں طرف کے لوگ ایک ہی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی کی کوئی مخصوص وردی نہ تھی اور یہ کہ سب کے سب ایک ہی زبان بولتے تھے، جاسوسوں کے لئے کسی شبہ کے بغیر ادھر سے ادھر جانے آنے میں کوئی دقت نہ تھی۔ حضرت محمدؐ نے اس سے فائدہ

---

[1] بڑے معرکے کے دن تو سارا دن نماز پڑھنے کا موقعہ نہ ملا اور رات کو ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں یکے بعد دیگرے قضا پڑھی گئیں۔ (طبقات ابن سعد۔ جزو ثانی)

[2] سیرت النبی کے مطابق بنو قریظہ نے جنگ میں علانیہ شرکت کی اور ان قلعوں کا محاصرہ کر لیا جن میں مسلمانوں کی عورتیں اور بچے پناہ لئے ہوئے تھے اور ابو سفیان اور اس کے لشکر کے فرار کے بعد اپنے قلعہ میں واپس چلے گئے کیونکہ اب مسلمانوں سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اپنے صحابہ سے مشورہ کئے بغیر آپ نے کچھ لوگوں[1] کو بنو قریظہ اور ابوسفیان کی سپاہ کے درمیان بداعتمادی اور شکوک پیدا کرنے کے لئے بھیجا۔ اس کام کے انجام دینے کا طریقہ جتنا آسان تھا اتنا ہی موثر بھی تھا۔

بنی قریظہ کو خبردار کر دیا گیا کہ وہ پہلے اس کا تو اطمینان کر لیں کہ آیا واقعی ابوسفیان کی نیت ان سے اچھا سلوک کرنے کی ہے بھی یا نہیں۔ اگر انہوں نے اس معاملے میں احتیاط نہ کی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں سے لڑنے کے لئے اکیلے رہ جائیں۔ اور اہل مکہ تماشہ دیکھتے رہیں۔ جاسوسوں نے انہیں سمجھایا کہ عقلمندی کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ کوئی ایسا قدم اٹھائیں جو پھر واپس نہ ہو سکے ابوسفیان سے ضمانت کے طور پہ یرغمالوں کا مطالبہ کریں۔

اسی طرح ابوسفیان اور اس کے جرنیلوں کو مشورہ دیا گیا کہ بنی قریظہ کا حضرت محمدؐ سے بدعہدی کرنے یا ان کا ساتھ چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اگر ان کو لڑنے کا حکم دیا جائے تو وہ اس سے بچنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ تراش لیں گے اور وہ ان سے ضرور یرغمال طلب کریں گے۔ شکوک و شبہات کے یہ بیج بو کر جاسوس مسلم کیمپ میں واپس آ گئے اور ان کے پھوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔

اب ہر بات حضرت محمدؐ کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ ابوسفیان نے یہودی سبت[2] (ہفتہ، سنیچر) کے دن بڑا حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور جب بنو قریظہ سے امداد کی درخواست کی گئی تو انہوں نے

---

[1] یہ نعیم ابن مسعود ایک عطفانی رئیس تھے۔ قریش اور یہود دونوں ان کو مانتے تھے وہ اسلام لا چکے تھے لیکن کفار کو اس کا علم نہ تھا۔ انہوں نے قریش اور یہودیوں سے علیحدہ علیحدہ باتیں کہیں اور دونوں میں ایک دوسرے کے خلاف بدگمانی اور شکوک پیدا کر کے پھوٹ ڈال دی۔ اور دونوں کا اشتراک پارہ پارہ کر دیا۔ (سیرت النبی)

[2] سبت SABBATH یا ہفتہ کا دن یہودی کے ہاں مقدس ہوتا ہے اور وہ کوئی کام نہیں کرتے مذہبی طور پر اس روز لڑنا بھی منع ہے۔ اس لئے یہودیوں نے اس روز قریش کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر حملہ کرنے اور لڑنے سے انکار کر دیا۔

جواب میں کہلا بھیجا کہ یہودیوں کے لئے سبت کے دن لڑنا منع ہے اور اس پیغام کے ساتھ ہی یہ تجویز بھی بھیجی کہ اپنے سابقہ حلیفوں کے ساتھ لڑنے سے پہلے وہ چند اہل مکہ کو بطور یرغمال اپنے پاس رکھنا چاہیں گے۔

ابوسفیان پر اس مطالبے کا اثر ایسا ہوا جیسے اس پر برف کا پانی انڈیل دیا گیا ہو۔ اس نے حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے لشکر کے عقب اور بازوؤں کو دغاباز یہودیوں کے امکانی حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔ اس نے اپنے لوگوں کو صاف صاف بتا دیا کہ اب مدینہ والوں کو شکست دینے کے لئے توقع سے کہیں زیادہ وقت لگے گا اور اس طرح پست حوصلگی خندق کے اس طرف کے مسلمانوں سے اہل قریش والے کنارے کی طرف منتقل ہو گئی۔

مکیّوں کی تکالیف میں اضافہ کرنے کے لئے موسم بھی ان کے خلاف ہو گیا۔ سردیوں میں صحرا میں سخت سردی پڑتی ہے اور مدینہ جیسی جگہ پر خاص طور سے کیونکہ وہ سطح سمندر سے بلندی پر واقع ہے جنوری اور فروری کے مہینوں میں چراگاہیں پالے کے سبب ختم ہو جاتی ہیں۔ اور خانہ بدوش لوگ عرب کے نسبتاً گرم علاقوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اسی لئے مکانات کی موجودگی اور مدنی میزبانوں کی تواضع کے باوجود مکّہ کے مہاجرین کے لئے مدینہ کی آب و ہوا سے موافقت پیدا کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اہل مکّہ (قریش) جو باہر میدان میں خیمہ زن تھے موسم سے متاثر ہونے لگے. وہ بیمار پڑ گئے اور ان کے جانور مرنے لگے۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہو رہی تھی جس سے انہیں متوقع مال غنیمت حاصل کرنے کی امید بندھتی۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔

یہ ایک بڑی تیز اور سرد بارش تھی۔ یہ اس قسم کی بارش تھی جو چراگاہوں کے لئے تو مسیحائی کرتی ہے لیکن ان انسانوں اور جانوروں کے لئے مصیبت بن جاتی ہے جنہیں اس برستے مینہ میں رہنا پڑے خواہ وہ بارش تھوڑی دیر ہی کیوں نہ رہے۔ بارش کے ساتھ ہی سرد اور یخ کر دینے والی ہوا چلنی شروع ہو گئی جو ہر روز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی اور جلدی ہی اس نے ایک زوردار جھکڑ کی شکل اختیار کر لی۔ تند ہوا جھاڑیوں میں سیٹیاں بجاتی اور درختوں میں چیختی چنگھاڑتی گزر رہی تھی اور ان کے تنوں کو اتنا جھکا دیتی تھی گویا یہ کھجور کے درخت نہیں بلکہ بانس ہیں۔ اہل قریش نے اپنے خیموں کی رسیاں کھول دیں اور دبک کر اندر بیٹھ گئے۔ بارش

کے سبب ان کی آگیں بجھ گئی تھیں۔ ان کا کھانا بھیگ گیا تھا۔ ان کی ہانڈیاں الٹ گئی تھیں۔ اور تیز اور سرد ہوا بدن کو یخ کئے دے رہی تھی۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی جسے کوئی عرب بھی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا اور جب ہوا کے ایک تیز جھونکے نے ایک خیمہ اکھاڑ پھینکا اور وہ ہوا میں اڑ گیا اور جانوروں میں بھاگڑ مچ گئی تو ابو سفیان[1] کے لشکر والے بھی اپنے مایہ ناز نصب العین کو بھول گئے اور رات کے اندھیرے میں صحرا[2] میں غائب ہو گئے۔

ان کے جاتے ہی طوفان بھی ختم ہو گیا۔ کیونکہ جب صبح ہوئی تو آفتاب صاف نیلے آسمان سے مدینے کے شہر اور اس کے میدانوں پر ضیا پاشی کر رہا تھا۔ مسلمانوں نے سوندھی سوندھی گرم ہوا میں اطمینان کا سانس لیا لیکن جب انہوں نے خندق کے پار نظر دوڑائی تو ان کا یہ اطمینان پہلے حیرانی اور پھر جوش مسرت میں بدل گیا۔ ان ہزاروں افراد میں سے جنہوں نے اپنے اونٹوں، گھوڑوں، گدھوں اور خچروں کے ساتھ ان پر حملہ کیا تھا چند گرے ہوئے خیموں اور کچھ مردہ جانوروں کے سوا وہاں پر کچھ نہ بچا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ پھر ایک معجزے نے اسلام کو بچا لیا تھا۔

اسی وقت اذان[3] کی آواز بلند ہوئی اور اس نے حیرانی سے ملی جلی آوازوں کو دبا دیا اور مکہ کی طرف رُخ کر کے ساری سپاہ نے یک زبان ہو کر "اللہ اکبر" کہا۔ پھر ہر ایک نے اپنے ہاتھ جو کانوں

---

[1] ابو سفیان نے اپنے لشکر والوں سے کہا: "رسد ختم ہو چکی ہے۔ موسم کا یہ حال ہے۔ یہود نے ساتھ چھوڑ دیا ہے اب محاصرہ بے کار ہے۔" (سیرت النبی)

بارش اور آندھی کے طوفان سے قریش میں افراتفری مچ گئی۔ خود ابو سفیان اپنے اونٹ پر پاؤں کی رسی کھولے بغیر سوار ہو گیا اور جب اونٹ تین پیروں پر کودا اور آگے نہ بڑھ سکا تو پاؤں کی رسی کھولی گئی۔ قریش کا لشکر بڑی تیزی سے بھاگا۔ ابو سفیان نے مسلمانوں کے تعاقب سے بچنے کے لئے عمرو بن عاص اور خالد بن ولید کو دو سو سواروں کے ساتھ لشکر کے پچھلے حصہ کی حفاظت کے لئے چھوڑا۔

[2] یہ محاصرہ تقریباً ایک ماہ رہا۔ (سیرت النبی)

[3] فجر کی نماز سورج نکلنے سے بہت پہلے ہوتی ہے۔ لیکن مصنف نے کئی جگہ یہ غلطی کی ہے کہ فجر کی نماز سورج نکلنے کے بعد دکھائی ہے۔

تک بلند کئے تھے۔ نیچے کر لئے اور سینہ پر ہاتھ باندھ لئے اور اپنے سپہ سالار اور اللہ کے نبی کی امامت میں بڑے خشوع وخضوع سے صبح کی نماز ادا کی۔

"سُبحانکَ اللّٰھُمَّ۔ وَبِحَمدِکَ۔ وتبارکَ اسمُکَ۔ وَتعالیٰ جدُّکَ۔
وَلا اِلٰہَ غیرُکَ ؁"

بڑی باقاعدگی اور وقوف سے انہوں نے رکوع وسجود کئے۔ ان کی آوازوں میں دل کش اتار چڑھاؤ تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہہ کر نماز ختم کی۔ پھر آہستہ آہستہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنے ہتھیار سنبھالے اور اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

لیکن ابھی مشکل سے انہوں نے ہتھیار اتارنا شروع کئے ہی ہوں گے کہ گھنیرے کھجوروں کے درمیان سے جو ہوا میں لہرا رہے تھے دوسری بار حضرت بلالؓ کی آواز گونجی۔ یہ عام اذان نہ تھی۔ یہ تو صف بندی کا حکم تھا، ایک لمحہ تو مجاہدوں نے خیال کیا کہ شاید ابو سفیان نے کوئی چال چلی۔ تلواریں اور نیزے سنبھالے اور تیزی سے مسجد کی طرف لپکے۔

یہاں پہنچ کر دیکھا کہ حضرت محمدؐ اور ان کے جرنیل ابھی تک زرہ پوش اور مسلح تھے۔ آپؐ کے برابر میں حضرت علی کرم اسلام کا جنگی پرچم لئے کھڑے تھے۔ سواروں کے ساتھ ان کے گھوڑے بھی موجود تھے۔ جونہی سالاروں نے اپنے اپنے دستوں کی حاضری کی رپورٹ پیش کی حضرت محمدؐ نے کوچ کا حکم دے دیا۔ فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے آپؐ آگے آگے روانہ ہوئے۔ آپؐ لشکر کو لے کر چلے لیکن واپس خندق کی طرف نہیں بلکہ بنی قریظہ کے قلعہ کی جانب۔

جونہی یہودیوں نے مسلمانوں کو دیکھا وہ سمجھ گئے کہ ان کے آنے کا مقصد کیا ہے۔ جلد ہی قلعہ میں داخل ہو کر انہوں نے دروازے بند کر لئے ——————— اور ایک اور

لہ خندق سے سپاہ ہٹاتے وقت آنحضورؐ نے بھی اسید بن حضرمی کی سرکردگی میں دو سو مسلمانوں کو خندق پر حفاظت کے لئے چھوڑا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد خالد بن ولید نے پلٹ کر حملہ کیا۔ وحشی بھی ساتھ تھا۔ جس نے اپنے نیزے سے طفیل ابن النعمان کو شہید کیا۔ تھوڑی دیر مقابلہ ہوا لیکن پھر یہ لوگ واپس چلے گئے اور قریش کے لشکر کے ساتھ جا ملے۔ (طبقات ابن سعد۔ جزو ثانی)

محاصرہ[1] شروع ہوگیا۔ شاید اس دفعہ بھی یہودیوں نے قلعہ میں رسد کا ذخیرہ اکٹھا نہیں کیا تھا۔ اس لئے وہ جلدی ہی بھوکوں مرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ایک وفد حضرت محمدؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ صلح کی شرائط معلوم کی جاسکیں۔

آپؐ نے بتایا کہ بنو قریظہ نے بہرطور اُن سے کئے ہوئے معاہدے کو توڑ دیا اور علانیہ دشمن سے سازباز کر لی اور یہ کہ یہ صرف دغابازی ہی نہیں بلکہ کھلی غداری اور بغاوت تھی۔ حضرت محمدؐ نے اپنی شرائط بتائیں کہ اگر یہودی اپنا مذہب چھوڑ دیں اور انہیں اپنا پیشوا تسلیم کرلیں تو ان سے کوئی بدلہ نہیں لیا جائے گا[2]۔ نہ ہی ان کے خلاف کوئی جوابی کارروائی کی جائے گی اور نہ ہی انہیں کوئی سزا دی جائے گی۔ یہودیوں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا اور وفد قلعہ میں واپس چلا گیا[3]۔ محاصرہ جاری رہا۔

آخر کار یہودیوں کے پاس ہار ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا ورنہ وہ بھوکوں مر جاتے۔

---

[1] حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ بنی قریظہ کا محاصرہ پچیس دن یا ایک ماہ تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ عاجز آگئے۔ ابن اسحٰق کے بیان کے مطابق پچیس راتیں۔ ابن اسحٰق ہی کا بیان ہے کہ بنی قریظہ کا واقعہ (قتل) ذی قعدہ کے آخر یا شروع ذی الحجہ ۵ھ میں ہوا۔ (تاریخ طبری۔ جلد اول۔ حصہ سوم)

[2] بنو قریظہ مقابلے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس لئے صلح جوئی بیکار تھی۔ حضرت علی جب ان کے قلعوں کے پاس پہنچے تو علانیہ آنحضورؐ کو گالیاں دیں۔ (سیرت النبی)

[3] جب یہودیوں پر یہ واضح ہوگیا کہ رسول اللہ بغیر فیصلہ کن لڑائی کے واپس نہ ہوں گے تو ان کے سردار کعب بن اسد نے ان کے سامنے تین باتیں رکھیں۔

(۱) حضرت محمدؐ یقینی طور پر نبی مرسل ہیں اس لئے ہم اسلام اختیار کریں۔ اس طرح جان و مال بھی محفوظ رہے گا۔ (۲) ہم اپنی عورتوں اور بچوں کو خود قتل کر دیں اور مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں اور لڑ کر جان دے دیں (۳) آج سبت (ہفتہ) کے دن مسلمان ہماری طرف سے غافل ہوں گے۔ اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر حملہ کر دیا جائے۔

لیکن یہودیوں نے ایک بات بھی نہ مانی۔ آخر کار ہتھیار ڈالنے پڑے اس شرط پر کہ سعد بن معاذؓ جو فیصلہ کر دیں گے ہمیں منظور ہوگا۔ (تاریخ طبری۔ جلد اول۔ حصہ سوم)

انہوں نے کہا کہ وہ اسلام اختیار کر لینے کے علاوہ ہر شرط مان لیں گے اور درخواست کی کہ کسی غیر جانبدار شخص کو حکم مقرر کر دیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ ان کے سابقہ حلیف بنو اوس کے کوئی سردار اچھے ثالث ثابت ہوں گے۔ حضرت محمدؐ نے یہ بات منظور کر لی اور کہا کہ کسی مخصوص شخص کا نام تجویز کریں۔ یہودیوں نے بلا تامل سعد بن معاذؓ کا نام لے دیا۔

سعدؓ لشکر میں موجود نہ تھے۔ جو زخم انہیں خندق کی لڑائی میں لگا تھا۔ زہر آلود ہو گیا تھا اور وہ گھر پر[1] ہی آرام کر رہے تھے۔ وہ سخت تکلیف میں تھے اور چل پھر نہ سکتے تھے۔ بہرحال جب حضرت محمدؐ کا بلاوا پہنچا کہ وہ آئیں اور اپنا فیصلہ سنائیں تو انہوں نے خود کو اٹھوا کر ایک گدھے پر سوار کرایا جس پر کمبل اور گدے بچھا دیئے گئے تھے۔ راستے کے ہچکولوں نے ان کے مزاج اور طبیعت کو اور زیادہ منغض کر دیا۔ بنی قریظہ کے قلعہ تک پہنچتے تک ان کا رویہ یہودیوں کے خلاف بڑا معاندانہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ ایک طرح سے وہ ہی ان کے ان زخموں کا سبب تھے۔

اب شام ہو رہی تھی۔ کھجوروں کے سائے قلعہ کے سامنے والے میدان میں لمبے ہو کر پھن پھیلائے سانپوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ مکانات کی دیواروں پر زرد دھوپ پھیل رہی تھی اور مسلمان سپاہیوں کے ہتھیاروں پر چمک پیدا کر رہی تھی جو منظم صفوں میں پرے جمائے کھڑے تھے۔ ان سے کچھ آگے حضرت محمدؐ چار آئینہ لگائے خود پہنے اور پہلو میں تلوار لگائے کھڑے تھے۔ آپؐ سے ذرا پیچھے حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ تھے۔ دوسرے اکابر ان سے ذرا اور پیچھے تھے۔ ان کے آگے اسلحہ۔ قالینوں اور دوسرے گھریلو سامان کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ جو یہودی اپنے گھروں سے لائے تھے اور فاتحین کے سامنے ڈال دیئے تھے۔ دائیں اور بائیں اطراف میں خود یہودی کھڑے تھے۔ ایک طرف کمر کے پیچھے ہاتھ بندھے مرد اور دوسری جانب عورتیں اور بچے تھے۔ مرد خاموش تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ناراض کئے جانے پر حضرت محمدؐ بہت سختی اختیار کر لیتے تھے۔ وہ جنگ کے دوران غداری کے مرتکب ہوئے تھے اور وہ کسی رعایت کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ صرف ایک امید بندھی

---

[1] طبری نے لکھا ہے کہ رسول اللہ نے ان کے لئے مسجد نبوی کے صحن ہی میں ایک خیمہ لگوا دیا تھا تاکہ آپ خود ان کی دیکھ بھال کر سکیں اور وہ وہاں تھے۔ (طبری)

تھی کہ شاید سعدؓ بن معاذؓ گذشتہ رفاقت اور پرانے تعلقات کا کوئی لحاظ کریں۔ عورتیں بھی کوئی بحث و تمحیص نہیں کر رہی تھیں۔ وہ تو اپنے خاوندوں، بھائیوں اور بیٹوں کے لئے دردناک انداز میں روئے جا رہی تھیں۔ جنہیں مسلمانوں کی تلواروں نے ان سے جدا کر دیا تھا۔

سعد بن معاذؓ کو سہارا دے کر گدھے سے اتار گیا اور وہ لنگڑاتے ہوئے وہاں تک پہنچے جہاں حضرت محمدؐ ان کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے پہلے رسمی سلام پیش کیا اور پھر یہودیوں کی طرف دیکھا۔ آخری دفعہ وہ جب یہودیوں سے ملنے آئے تھے تو انہوں نے ان کو بُری طرح دھتکار دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ پیغمبر خدا ہوتے کون ہیں اور وہ ان کی اطاعت کیوں کریں اور جب انہوں نے رسول اللہ کے سامنے ان کی نیک نیتی کی ضمانت دی تھی تو یہودیوں نے ایک طرح سعدؓ کو بیوقوف بنوایا تھا۔ حضرت سعدؓ نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر یہودیوں سے یوں مخاطب ہوئے "کیا آپ لوگ خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کرتے ہیں کہ میں جو بھی فیصلہ کروں وہ آپ کو منظور ہو گا۔[۲]

یہودیوں نے سر جھکا کر رضامندی دے دی۔ سعدؓ نے پھر توقف کیا اور پھر مسلمانوں کو حیرانی میں ڈالنے اور یہودیوں کو سراسیمہ کرنے والا یہ فیصلہ دیا۔

"میرا فیصلہ یہ ہے کہ تمام یہودی مرد[۳] قتل کر دیئے جائیں۔ عورتوں اور بچوں

---

[۱] کہا جاتا ہے کہ جب حضرت سعد بن معاذؓ کو رسول اللہ کے پاس لے جا رہے تھے تو آپ کی قوم نے ان سے اپنے حلیفوں (بنو قریظہ) کے ساتھ نرمی اختیار کرنے کی سفارش کی۔ لیکن حضرت سعدؓ نے جواب دیا کہ سعد کا اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اسے اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے۔ لوگوں نے اس سے اندازہ لگا لیا آپ ان کے قتل کا فیصلہ دیں گے۔ (طبری)

[۲] طبری نے لکھا ہے کہ پھر حضرت سعدؓ نے مسلمانوں کی طرف اشارہ کر کے کہا اور جو لوگ اس سمت میں ہیں (یعنی مسلمان) ان کو بھی منظور ہو گا" تو خود رسول اللہ نے جواب دیا ہاں ہمیں بھی منظور ہو گا۔ چنانچہ آپ نے دونوں فریقوں کی رضامندی لے کر فیصلہ دیا۔ [۳] مولانا شبلی نے سیرت النبی میں لکھا ہے کہ فیصلہ یہ تھا کہ لڑنے والے یہودی مرد قتل کر دیئے جائیں۔ عورتیں اور بچے قید ہوں اور مال و اسباب غنیمت قرار دیا جائے۔

کو غلام بنا لیا جائے اور مال و اسباب لشکر میں تقسیم کر دیا جائے۔"

یہ فیصلہ سن کر مسلمانوں کی صفوں میں ایک بے یقینی کی دبی دبی آواز پیدا ہوئی۔ اسی دم یہودیوں کی طرف سے خوف کی ایک چیخ سنائی دی۔ وہ گھٹنوں کے بل گر گئے اور رحم کی بھیک مانگی۔ وہ روئے اور چلائے اور اپنے بال نوچنے لگے لیکن کسی نے توجہ نہ کی۔ حضرت محمدؐ کی طرف سے فوری کارروائی کے چند مختصر احکام ملے۔ عورتوں اور بچوں کو گھسیٹ کر ایک طرف کر دیا گیا اور مردوں کو کھینچ کر دوسری طرف لے جایا گیا۔ سعدؓ کو دوبارہ گدھے پر سوار کرا کے ان کے گھر پہنچا دیا گیا۔

رات کے وقت مسلمانوں نے پھر ایک خندق کی کھدائی شروع کر دی۔ یہ خندق اتنی گہری اور لمبی تو نہ تھی جتنی مدینہ کے دفاع کے لئے کھودی گئی تھی لیکن اس میں زیادہ مُردوں کو دفن ہونا تھا۔ صبح ہوتے ہی قتل شروع ہو گیا۔ اپنے عملے کے لوگوں کے درمیان حضرت محمدؐ ایسی جگہ بیٹھے تھے جہاں سے وہ قتل کی کارروائی دیکھ سکیں۔ قتل کی اصل کارروائی حضرت علیؓ اور زبیرؓ کے حکم پر ہو رہی تھی۔ ایک وقت میں چھ یہودیوں کو اس باڑے سے نکالا جاتا جہاں انہوں نے رات گزاری تھی۔ خندق کے کنارے ان کو جھکا کر ان کے سر قلم کر دیئے جاتے تھے اور ان کے جسم تیار شدہ خندق میں ڈھکیل دیئے جاتے۔ سارا دن گردنیں ماری جاتی رہیں۔ یہاں تک کہ ہوا میں بھی خون کی بدبو سرایت کر گئی اور جب سورج مغرب کی جانب ڈوب رہا تھا۔ اور نخلستان کی جانب سے ہوا چلی اس وقت بھی قتل جاری تھا۔ اور اندھیرا ہو جانے پر بھی بند نہ ہوا۔ مشعلوں کی روشنی میں مسلمانوں کی تلواریں چمکتیں اور ایک اور یہودی کا سر لڑھک جاتا۔ آخر کار جب آخری یہودی خندق کی نذر ہو گیا تو حضرت محمدؐ اپنی قیام گاہ پر واپس گئے۔ آپؐ اپنے ساتھ ایک خوبصورت یہودی عورت ریحانہ[1] کو بھی لے گئے۔ اس کے تمام مردرشتہ دار

---

[1] ریحانہ کے متعلق تین روائتیں ہیں:۔

(۱) آپؐ نے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اپنے خاندان والوں کے پاس جا کر پردہ نشین ہو کر رہیں۔ (ابن مندہ)

(۲) آپؐ نے ان کو آزاد کر کے نکاح کی پیش کش کی لیکن انہوں نے شادی سے انکار کیا اور آپؐ کی کنیز کی حیثیت سے رہنے کو ترجیح دی۔ (ابن اسحٰق)

(۳) آنحضورؐ نے ان کو مختار بنا دیا تو انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور آپؐ نے ان سے نکاح کیا۔ اور یہ زیادہ صحیح ہے۔ (واقدی)

امام زہری نے بھی زوجیت ہی کی تائید کی ہے لیکن ہمارے نزدیک پہلی روایت محقق ہے۔ (سیرۃ النبی)

اس روز کے قتل عام ہیں مارے گئے تھے۔ حضرت محمدؐ نے اسے شادی کی پیش کش کی تاکہ اس کا غم غلط ہو جائے لیکن یہ اس نے منظور نہ کیا۔ اس نے اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو جانے سے بھی انکار کر دیا آخرکار وہ آپ کی کنیز بن کر آپؐ کی خدمت میں رہی لیکن وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہی۔ وہ غالباً آٹھ سو یہودیوں[1] کے قتل عام کے صدمے سے نہ سنبھل سکی۔ حضرت عائشہؓ نے جو غالباً اس روز وہاں موجود تھیں، ایک مرتبہ کہا کہ جو کچھ انہوں نے اس روز دیکھا اس کی ہیبت وہ کبھی نہ بھلا سکیں۔

اس فیصلے کا دینے والا بھی آخر اپنے انجام کو پہنچا۔ سعد بن معاذؓ گدھے کی سواری برداشت نہ کر سکے۔ ان کے زخم پھر کھل گئے اور زہر سرایت کر گیا۔ غالباً جس وقت آخری یہودی قتل ہو رہا تھا خود سعدؓ بھی چل بسے۔ ان کے آخری الفاظ مذہب اسلام پر ان کے یقین کی تصدیق کرتے ہیں:۔

"السلام علیک یا رسول اللہ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ بے شک اللہ کے رسول ہیں"

یہودیوں کا اتنی بڑی تعداد میں قتل عام فطری طور پر حضرت محمدؐ پر ایمان لانے والوں اور منکروں کے درمیان ایک مابہ النزاع مسئلہ بن گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب لوگ مذہب کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو جاتے ہیں تو جنونی بن جاتے ہیں اور اپنے مذہب سے اختلاف کرنے والوں کو قتل کر ڈالنا اچھا سمجھتے ہیں۔ اور عام طور سے ان کو بہت بے رحمی سے اور بہت بڑی تعداد میں مار ڈالتے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کی پیدائش کے فوراً بعد ۱۰۳۵ قبل مسیح کے لگ بھگ حضرت داؤد علیہ السلام نے عمانیوں کو شکست دی اور شہر ربہ RABBACH کو تاراج کر دیا۔ سیموئل کی دوسری کتاب کے بارھویں باب میں ہمیں بتایا جاتا ہے:۔

"وہ (حضرت داؤد) ان لوگوں کو جو اس شہر کے اندر تھے باہر نکال لائے اور

---

[1] اکثر ارباب سیر نے مقتولین کی تعداد چھ سو لکھی ہے لیکن صحاح میں چار سو ہے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی جس نے قلعہ پر سے ایک بڑا پتھر گرا کر ایک مسلمان کو شہید کر دیا تھا۔ (سیرت النبی)

طبری نے مسلمان شہید کا نام خلاد بن سوید اور عورت کا نام نبانہ بتایا ہے۔

ان کو آروں، لمبی میخوں والے سہاگوں HARROW اور لوہے کی کلہاڑیوں سے چروا دیا اور انہیں اینٹ کے بھٹوں میں سے گزرنے کا حکم دیا"

اسی طرح بادشاہ ساؤل[2] نے اس سے چند سال پہلے، مذہب سے زیادہ اپنی ذاتی دشمنی کے سبب، حضرت داؤد کو پروہتوں کے شہر ناب NOB کو بھیجا جنہوں نے وہاں کے مردوں عورتوں اور دودھ پیتے بچوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔

درحقیقت اگر مدینے کے یہودی اس معاملے پر ذرا غور کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ حضرت محمدؐ نے بھی بلاکم و کاست انہی ہدایات[3] پر عمل کیا تھا جو خود ان یہودیوں کے لوگوں نے وضع کر کے دترونومی[4] DEUTRONOMY کے بارھویں باب میں درج کی تھیں۔

اور وہ یہ تھیں۔

"اور جب تم کسی شہر سے لڑنے کے لئے اس کے نزدیک پہنچو تو ان کو امن و صلح

---

[1] HARROW مٹی کے بڑے ڈھیلوں کو توڑنے اور ہل چلانے کے بعد زمین کو ہموار کرنے کا آلہ کشاورزی۔ قدیم زمانے میں بڑی بڑی آہنی میخوں والے وزنی سہاگے مجرموں کو سزا دینے اور ان کو چروانے کے لئے ان پر پھروا دیتے تھے۔ یہاں وہ ہی سہاگے مراد ہیں۔

[2] بادشاہ ساؤل SAUL (قرآن مجید میں اس بادشاہ کا نام طالوت آیا ہے اور جالوت GOLIATH فلسطیوں کا نامی گرامی پہلوان تھا جسے حضرت داؤدؑ نے مارا تھا۔

[3] مولانا شبلی نے سیرت النبی میں لکھا ہے کہ عام معاملات میں جب تک قرآن پاک میں کوئی خاص حکم نہیں آتا تھا آنحضورؐ تورات کے احکام پر ہی عمل کرتے تھے مثلاً قبلہ۔ نماز۔ رجم۔ قصاص وغیرہ میں جب تک خصوصی احکام نہ آئے آپ نے تورات کے احکام پر ہی عمل کیا۔ حضرت سعدؓ کا یہ فیصلہ بھی تورات کے احکام کے عین مطابق تھا یعنی لڑنے والے مرد قتل کئے جائیں۔ عورتیں اور بچے قید ہوں اور مال اسباب غنیمت قرار دیا جائے اور یہ فیصلہ کوئی نیا یا حیران کن نہ تھا۔ خود یہودی بھی یہی کرتے تھے چنانچہ رسول اللہ نے بھی فرمایا سعدؓ تم نے آسمانی فیصلہ کیا (یہ اشارہ توریت کی طرف ہی تھا) (سیرت النبی۔ جلد اوّل) طبری نے بھی یہی لکھا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا "سعدؓ تم نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا"

[4] دترونومی (پرانا عہد نامہ۔ کتاب استثناء) تورات کی کتب خمسہ میں سے پانچویں کتاب۔

کی پیش کش کرو۔ اگر وہ تمہاری صلح کا جواب صلح ہیں دیں اور تم پر شہر کے دروازے کھول دیں تو یہ ہونا چاہئے کہ جتنے لوگ بھی اس میں ہیں وہ سب تمہارے غلام اور حلیف بن جائیں اور تمہاری اطاعت کریں لیکن اگر وہ تم سے صلح نہ کریں اور تمہارے خلاف جنگ کریں تو تم اس شہر کا محاصرہ کرلو اور جب خداوند اور تمہارا رب وہ شہر تمہیں فتح کرادے تو تم وہاں کے ہر مرد کو تہ تیغ کردو اور عورتیں۔ بچے اور جانور اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہو اس شہر میں ہو یہاں تک کہ مال غنیمت بھی وہ سب تمہارا ہوگا"

حضرت محمدؐ تاریخ میں مذکور کسی ایسے مذہبی پیشوا سے زیادہ سخت گیر نہ تھے جسے اپنی اطاعت کا لوہا منوانا پڑا ہو اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس وقت حضرت محمدؐ کے لئے یہ کتنا اشد ضروری تھا کہ کسی کو آپؐ کی حاکمیت کے متعلق کوئی شک و شبہ نہ رہے۔

حضرت محمدؐ اس وقت عرب میں یکہ و تنہا تھے اور سب آپؐ کے مخالف تھے ایک ایسے ملک میں جس کا رقبہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تہائی کے برابر تھا اور جس کی آبادی تقریباً پچاس لاکھ تھی۔ آپؐ کی اپنی ریاست اس وقت سنٹرل پارک سے زیادہ بڑی نہ تھی اور اپنے مشن کی تکمیل کے لئے آپؐ کے پاس صرف معمولی اسلحہ سے لیس تین ہزار سپاہ تھی اگر آپؐ کمزوری دکھاتے یا غداروں کو سزا نہ دیتے تو اسلام ہرگز زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ یہودیوں کا یہ قتل ایک سخت اقدام ضرور تھا لیکن مذہب کی تاریخ میں نیا نہ تھا۔ اور مسلمانوں کے نقطہ نظر سے بھی جائز تھا چنانچہ اس واقعہ کے بعد سے عرب قبائل اور اسی طرح یہودی بھی آپؐ سے اختلاف کرتے وقت کافی سوچ بچار کرنے لگے تھے۔ کیونکہ بدیہی طور پر آپؐ ہر بات اپنی مرضی کے مطابق چاہتے تھے۔

چودھواں باب

حضرت عائشہؓ کا ہار

عام خیال کے برعکس عرب عورتیں گھریلو معاملات میں بہت دخل رکھتی ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ حرم کی چار دیواری میں بند ہونے یا الگ تھلگ خیموں میں رہنے کے سبب وہ مردوں کے آرام کا خیال رکھنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ مرد اس قسم کا خیال رکھتے ہوں لیکن جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے عورتوں کے متعلق مردوں کی قیاس آرائیاں غلط ہوتی ہیں۔

عرب عورتیں اپنی مغربی بہنوں جیسی آزادی نہ رکھتے ہوئے، حاسدانہ چشمکوں کو بھڑکانے، گھر سے بھاگ نکلنے یا جذبات کو ابھارنے والے لباس پہننے کے مواقع نہ رکھتے ہوئے بھی اپنے شوہروں پر پوری طرح قابو رکھتی ہیں۔ انہیں رام کر لیتی ہیں۔ اور انہیں ایسے طریقوں سے بیوقوف بناتی ہیں جو خود کسی طرح جادوگری سے کم نہیں ہوتا۔ عرب کے لوگ اپنی ان پردہ نشین خواتین کی اپنے مغربی بھائیوں کی اکثریت کے مقابلے میں زیادہ عزت کرتے ہیں اور ان کا کہیں زیادہ خیال رکھتے ہیں حالانکہ دراصل مغربی لوگوں کو اپنی خواتین کی نگرانی کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔

حضرت محمدؐ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ آپؐ کو بھی گھر کا بڑا خیال تھا۔ اور آپؐ اپنی بیویوں کی، جو مسجد کے گرد جھونپڑیوں میں رہتی تھیں، بڑی عزت و تکریم کرتے تھے۔ آپؐ کہا کرتے تھے کہ عورتیں مردوں کا نصف توام یا جڑواں حصہ ہیں۔ ایک مسلمان کو اپنی بیوی سے کسی صورت میں بھی نفرت نہیں کرنی چاہیئے اگر اسے اپنی بیوی کی ایک عادت اچھی نہیں لگتی تو اس کی دوسری اچھی عادتوں سے تو خوش ہونا چاہیئے۔

مدینہ میں آپؐ کی ازواج نے آپؐ کی ذات سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھایا اور ان کے سبب آپؐ کو بھی اوروں کی طرح کسی حد تک بیوقوف بننا پڑا یا نہیں اس کا ایک واقعہ کے علاوہ کسی کتاب میں کوئی ذکر نہیں ملتا اور وہ یہ کہ حضرت عائشہؓ پر ایک مرتبہ بہتان لگایا گیا لیکن یہ بھی شک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

حضرت محمدؐ جب کسی سفر یا چھاپہ مار مہم پر جاتے تو ہمیشہ اپنی ایک یا دو[1] ازواج کو ساتھ لے جاتے وہ ٹوکری کی سی بناوٹ کے ایک کھٹولے میں، جسے محمل یا ہودج کہتے ہیں سفر کرتیں اس پر شاخوں سے گتھا ہوا ایک سائبان یا ڈھکنا ہوتا اور یہ سارا ہودج اونٹ کے کوہان پر باندھ دیا جاتا تھا۔ اس ہودج میں بیٹھنے والی سواری بالکل چھپی ہوئی ہوتی تھی اور جب تک سائبان کو نہ اٹھایا جائے یہ نہیں معلوم کیا جا سکتا تھا کہ اس کے اندر کوئی ہے یا نہیں۔

حضرت محمدؐ نے قبیلہ بنی مصطلق[2] کے خلاف سرکوبی کی مہم سر کر لی تھی۔ وہاں سے آپؐ نے اپنی آٹھویں بیوی حضرت جویریہؓ حاصل کی تھیں اور مدینے کی طرف اپنی سپاہ، اونٹوں اور غنیمت کے ساتھ واپس آرہے تھے۔ گھر کی طرف آخری منزل کی مسافت لمبی تھی۔ اس لئے علی الصبح ہی پڑاؤ اٹھا کر کوچ کرنا تھا۔ جونہی انہیں جگایا گیا حضرت عائشہؓ اٹھ کر ذرا دور ایک نشیب کی طرف حوائج ضروری کے لئے چلی گئیں۔ اتنے آپ واپس آئیں آپ کا خیمہ اکھاڑا جا چکا تھا اور آپ کا اونٹ محمل سمیت آپ کے انتظار میں تھا۔ آپ محمل میں بیٹھنے ہی لگی تھیں کہ آپ نے دیکھا کہ اپنا گلے کا ہار کہیں گرا آئی تھیں۔ کسی کو بتائے بغیر آپ فوراً اس کی تلاش کے لئے واپس دوڑیں۔ منہ اندھیرے پتھروں اور جھاڑیوں میں نشیب کے ہار کا تلاش کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ وہ ملے صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ وہ اس کو گلے میں پہن کر کارواں کی طرف آئیں لیکن کارواں جا چکا تھا اور وہاں پر اس کے تھوڑی دیر پہلے ہونے کے نشان بس اتنے تھے کہ پڑاؤ کی بچی کھچی

---

[1] یہ مہم بنو مصطلق کے خلاف تھی اور اس غزوہ میں حضرت عائشہ ساتھ تھیں۔

[2] غزوہ بنی مصطلق ۵ھ میں ہوا اِسے غزوہ مریسیع بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ ایک چشمہ تھا اور یہاں ہی بنو مصطلق سے جنگ ہوئی تھی۔ اس غزوہ میں مال غنیمت کے علاوہ بنی خزاعہ کے بہت سے مرد عورتیں قیدی بنے۔ قبیلے کے سردار حارث کی بیٹی حضرت جویریہؓ بھی ان ہی میں تھیں جو رسول اللہ کی زوجیت میں آگئیں۔ اس شادی کے سبب مسلمانوں نے بنی مصطلق کے سارے قیدی رہا کر دیئے۔ یہ علاقہ مکہ کے قریب ہے۔

اگ وہاں موجود تھیں۔ حضرت عائشہؓ کے بار برداری کے ذمہ دار ساربانوں نے یہ یقین کر کے کہ محترم خاتون سوار ہو گئی ہوں گی محمل کو اونٹ پہ بار کر دیا۔ حضرت عائشہؓ کا قد چھوٹا اور جسم ہلکا پھلکا تھا اس لئے کسی کو یہ احساس بھی نہ ہوا کہ آپ اس کے اندر ہیں بھی یا نہیں۔ جب کارواں روانہ ہوا تو یہ لوگ بھی ایک بے سوار اونٹ کو لے کر اس کے ساتھ چل دیئے۔

حضرت عائشہؓ کچھ دیر کھڑی ویرانے کے خلاؤں میں جھانکتی رہیں۔ صبح صادق اب دن کے اجالے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اور سورج اب اپنی سفید روشنی اور چکا چوند کرنے والی کرنیں پتھریلی زمین پر ہر سو پھیلا رہا تھا۔ وہ دور تک اپنے لوگوں یا اپنے کارواں کا کوئی نشان نہ دیکھ سکیں۔ آپ نے مایوسی میں اپنے شانے سکیڑے اور بیٹھ گئیں۔ ہراساں اور پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہ تھا اور دوڑ کر کارواں کو جا پکڑنے کی کوشش کرنا بھی بے سود تھا۔ جہاں ان کو آخری مرتبہ دیکھا گیا تھا۔ وہاں ہی بیٹھ کر انتظار کرنا زیادہ مناسب تھا تاکہ جب بھی ان کے لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ محمل خالی ہے تو وہ ان کی تلاش میں یہاں آجائیں۔ جب دن گرم ہو گیا تو آپ کو اونگھ آنے لگی۔ چنانچہ اپنی چادر اوڑھ کر آپ ایک ببول کی جھاڑی کے نیچے سمٹ کر لیٹ گئیں اور جلدی ہی آنکھ لگ گئی۔ جب آپ کی آنکھ کھلی تو سورج کافی بلند ہو چکا تھا اور اب آپ وہاں اکیلی نہیں تھیں۔

ایک قد آور اور تیز رفتار سانڈنی کی پشت پہ بیٹھا ایک نوجوان ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے اپنی آنکھیں ملیں اور اٹھ بیٹھیں۔ نوجوان نے اونٹ کو بٹھایا اور صفوان ابن معطل کے نام سے اپنا تعارف کرایا۔ حضرت عائشہؓ کے بیان کی رو سے انہیں اپنا تعارف کرانے کی ضرورت پیش نہ آئی غالباً صفوان آپ کو دیکھ کر پہچان گیا تھا کیونکہ اس نے آپ کو عائشہؓ بنت ابی بکرؓ کہہ کر مخاطب کیا۔ صفوان نے دریافت کیا کہ وہ عرب کے اس صحرا میں بیٹھی کیا کر رہی تھیں۔ حضرت عائشہؓ نے واقعہ[1]

---

[1] حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ مجھے لیٹا دیکھ صفوان میرے پاس آئے وہ بھی کسی ضرورت سے لشکر سے پیچھے رہ گئے تھے مجھے دیکھ کر (جگانے کے خیال سے) انہوں نے اِنّا للہ واِنّا الیہ راجعُون پڑھا اور دریافت کیا کہ اے زوجہ رسول آپ کیسے پیچھے رہ گئیں۔ میں اپنی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے ایک لفظ نہ کہا۔ انہوں نے اپنا اونٹ میرے قریب کر دیا اور کہا آپ اس پر سوار ہو جائیں اور خود ہٹ گئے میں سوار ہو گئی پھر انہوں نے اونٹ کی نکیل پکڑ لی اور تیزی سے روانہ ہو گئے۔ (طبری)

بیان کیا۔ صفوان ہنسا۔ پھر آپ کو مدینہ لے جانے کے لئے اپنی سانڈنی پیش کی۔ حضرت عائشہؓ نے قبول کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے آپ کو سوار کرایا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

اس دوران میں مسلمانوں کا قافلہ یہ جانے بغیر کہ حضرت عائشہؓ اس میں نہیں تھیں چلتا رہا۔ ان کے موجود نہ ہونے کا علم پہلی مرتبہ اس وقت ہوا جب اونٹ کو حضرت محمدؐ کے دروازے پر بٹھانے پر محمل خالی پایا گیا۔ اسی وقت ہنگامہ شروع ہو گیا۔

شتربانوں نے، جن کو پورا یقین تھا کہ وہ پڑاؤ سے حضرت عائشہؓ کو لے کر چلے تھے، جنوں کو ان کی غیبت کا ذمہ دار ٹھیرایا۔ چونکہ راستے میں قافلہ کہیں نہ ٹھیرا تھا، اس لئے اس بات کو مان لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ حضرت محمدؐ، جو ان توہمات کے قائل نہ تھے۔ ابھی ان کی تلاش کے لئے ایک جماعت تیار کر ہی رہے تھے کہ مدینہ کی تنگ گلیوں میں سے ایک اونٹ برآمد ہوا جس کے آگے آگے ایک نوجوان چل رہا تھا اور اس کی پشت پر سپیدہ سحر کی طرح خوبصورت عائشہؓ بیٹھی ہوئی تھیں۔ اونٹنی گھر کے دروازہ کے سامنے بیٹھی اور حضرت عائشہؓ اتر کر گھر میں چلی گئیں۔

حضرت محمدؐ اپنی چہیتی بیوی کو بخیریت دیکھ کر اتنے خوش ہوئے کہ آپؐ نے بغیر کچھ پوچھے گچھے انہیں خوش آمدید کہا۔ جہاں تک آپؐ کی ذات کا تعلق تھا بات ختم ہو گئی تھی اور یہ شاید بالکل ہی ختم ہو جاتی اگر عبداللہ بن ابی اسے درمیان سے نہ اچک لیتا۔

میرے عرب دوستوں میں سے کبھی کوئی نہ بتا سکا کہ عبداللہ بن ابی کی شکل و صورت کیسی تھی۔ اور نہ ہی جو کتابیں میں نے پڑھیں ان میں کہیں اس کا حلیہ دیا ہوا ہے۔ لیکن وہ یقینی طور پر ایک ناپسندیدہ کردار ہوگا۔ دھوکے باز۔ شرارتی، بدلحاظ، بے مروت اور بزدل۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کردار میفستوفلیز[۱] MEPHISTOPHELES ایاگو[۲] IAGO یوریا ہیپ[۳] URIAH HEEP اور

---

[۱] MEPHISTOPHELES ۔ گوئٹے کے 'فاسٹ' FAUST کا شیطان جو لوگوں کو ورغلا کر اور ستا کر خوش ہوتا تھا۔

[۲] ایاگو IAGO شکسپیر کے ڈرامے OTHELO (اوتھیلو) کا بدی کا کردار۔ وہ اوتھیلو کے منصب اور اور اقتدار سے جلتا ہے اور اوتھیلو کو اس کی بیوی DESDA MONA سے بدظن کر کے دونوں کی زندگی تلخ کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اوتھیلو اپنی بیوی کو بے وفا سمجھ کر مار ڈالتا ہے۔

[۳] URIAH HEEP چارلس ڈکنز کے مشہور ناول ڈیوڈ کوپرفیلڈ DAVID COPPERFIELD کا متنفی کردار۔

یا تاریخ یا ناول کے دوسرے بدی کے کرداروں جیسا ہوگا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ حضرت محمدؐ کو ستا کر ہی خوش ہوتا تھا۔ چنانچہ جونہی اس نے سنا کہ حضرت عائشہؓ غیر معمولی حالات میں مدینے پہنچی ہیں اس نے فوراً اس پر داستان طرازی شروع کردی۔ واقعات کی جانچ پڑتال کئے بغیر اس نے فوراً یہ بہتان تراشا کہ صفوان حضرت عائشہؓ سے محبت کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اس کے لئے حضرت عائشہؓ کو الزام نہیں دیتا۔

البتہ صرف چند لوگوں نے ہی اس گپ میں عبداللہ کی تائید کی۔ ان ہی میں ایک حضرت زینبؓ بنت جحش (آنحضورؐ کی ایک بیوی) کی بہن حمنہ تھیں۔ یہ خیال کرکے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی ان کی شادی حضرت محمدؐ سے کرائی ہے حضرت زینبؓ نے کوشش کی کہ کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور حضرت محمدؐ سے تقرب حاصل کرکے حضرت عائشہؓ کی جگہ لے لیں۔ اب تک وہ اپنی اس کوشش میں ناکام ہو چکی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کی یہ رسوائی ان کے لئے ایک اچھا موقعہ تھا۔ گو وہ دل سے حضرت عائشہؓ کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھیں اور جیسا کہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کے خلاف اس اتہام پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ لیکن جب عبداللہ ابن ابی نے ان افواہوں کے لئے مواد فراہم کیا اور (ان کی بہن) حمنہ انہیں پھیلانے کے لئے موجود تھیں تو آپ نے بھی جو ہو رہا تھا ہونے دیا۔ اس طرح حرم کے اندر اور باہر افواہیں پھیلتی رہیں اور مدینے میں ہر ایک کی زبان پر حضرت عائشہؓ اور صفوان ابن معطل کے متعلق ایک نئی کہانی تھی اور یہ بات بڑھتی رہی۔ اور جیسا کہ ایسے معاملات میں اکثر ہوتا ہے شوہر کو سب سے بعد میں پتہ چلا۔ چنانچہ جب آپؐ کے کانوں تک یہ باتیں پہنچیں تو سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں۔

حضرت محمدؐ کو حضرت عائشہؓ سے محبت تھی۔ حضرت خدیجہؓ سمیت، لیکن ایک مختلف نظریئے سے آپؐ حضرت عائشہؓ کو اپنی دوسری تمام خواتین سے زیادہ چاہتے تھے جو آپ کی شریک زندگی بنیں۔ اس لئے آپؐ کو اس کا یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ کمسن خاتون جو ہمیشہ سے آپؐ کی اتنی اچھی رفیقہ اور آپؐ کی بیوی بھی تھیں آپؐ کو جان بوجھ کر دھوکا دے سکتی تھیں۔ درحقیقت جو باتیں آپؐ کو بتائی جاتی تھیں انہیں سن کر بہت پریشان تھے لیکن آپؐ حضرت عائشہؓ پر بلاواسطہ الزام نہ لگا سکتے تھے البتہ آپؐ نے ان

لہ یہ مصنف کا اپنا خیال ہے۔ اس نے یہاں واقعہ کو رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

سے علیحدگی اختیار کر لی۔

حضرت عائشہؓ نے، جن کو خود بھی حضرت محمدؐ سے بیحد لگاؤ تھا، محسوس کیا کہ اب آپؐ کچھے کچھے رہتے ہیں، فوری طور پر تو اس کا سبب معلوم نہ کر سکیں لیکن جب ان کو اصل وجہ معلوم ہوئی تو اس جھوٹی تہمت پر بڑا طیش آیا۔ آنسو بہاتے ہوئے انھوں نے اپنی پاکدامنی کی قسم کھائی اور اسی وقت اپنے والدین کے گھر چلی گئیں۔ ان کی والدہ اور بہن نے انہیں تسلی دی اور یقین دلایا کہ ان کی خوبصورتی کے سبب ان کے حاسدوں نے یہ بہتان تراشا ہے اور اگر وہ بدلہ لئے بغیر کچھ دیر انتظار کریں تو سب ٹھیک ہو جائیگا۔ حضرت ابوبکرؓ خاموش تھے۔ حضرت محمدؐ نے ان سے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اپنے کمرے سے باہر نکلنا بند کر دیا۔ اور قرآن کی تلاوت میں مصروف رہتے۔ حضرت محمدؐ نے حضرت عمرؓ سے بھی اس معاملے میں کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔ آپؐ کو غالباً ڈر تھا کہ عمرؓ اخلاقی اصولوں میں بڑے سخت ہیں ایسا نہ ہو کہ وہ طلاق یا کسی اور سخت اقدام کا مشورہ دیں۔ البتہ آپؐ نے حضرت علیؓ سے اس کا تذکرہ کیا۔

حضرت علیؓ بھی عورتوں کے طرفدار نہ تھے۔ وہ تو ایک مسلمان مجاہد تھے اور وہ یہ ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ عورتیں ان کے سپہ سالار کی زندگی میں اتنا عمل دخل حاصل کر لیں۔ چنانچہ آپ نے حضرت محمدؐ کو جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ ساری ہی عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں اور حضرت عائشہؓ بھی ان سے کچھ مختلف نہیں۔

اس دوران میں صفوان بھی سارے مدینہ میں قسمیں کھا کھا کر یہ یقین دلاتے پھر رہے تھے کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کے متعلق کبھی اس قسم کا خیال تک نہیں کیا اور انہیں صحرا میں ایک مرتبہ دیکھنے کے علاوہ اور کبھی نہیں دیکھا۔

بالآخر حضرت محمدؐ اس نتیجہ پر پہنچے کہ غلطی خود آپؐ کی اپنی ہے۔ جب تک آپؐ تذبذب کا شکار رہیں گے یہ بہتان تراشی جاری رہے گی۔ اب یہ آپؐ کا فرض تھا کہ حضرت عائشہؓ کے حق میں یا ان کے خلاف کوئی فیصلہ کریں۔ چنانچہ جنگ کے حالات کی طرح آپؐ نے فوراً ایک فیصلہ کن انداز اختیار کر لیا۔

چنانچہ دوسری نماز میں اپنے خطبے میں یہ سرزنش شامل کر دی۔

"اے لوگو! دوسروں کو اس کا کیا حق ہے کہ میرے اہل خانہ کے معاملات میں دخل دے کر مجھے پریشان کریں اور ان کو بلا وجہ بدنام کریں۔ حالانکہ میں نے کبھی ان میں کوئی برائی نہیں دیکھی اور پھر تم لوگوں نے صفوان پر بھی بہتان باندھ دیا ہے حالانکہ

میں نے اس میں کبھی کبھی کوئی برائی نہیں دیکھی۔"

یہ کہہ کر آپؐ حضرت عائشہؓ کے پاس گئے۔ وہ اس وقت اپنے والدین کے ہاں تھیں۔ آپؐ ان کے پاس چٹائی پر بیٹھ گئے اور اس طرح بات شروع کی۔

"اے عائشہؓ۔ تم نے سن لیا ہے کہ لوگ تمہارے متعلق کیا کہتے ہیں۔ اللہ سے ڈرو کیونکہ اگر واقعی تم قصوروار ہو تو اللہ کی جناب میں توبہ کرو۔ وہ مالک حقیقی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔"

حضرت عائشہؓ نے ایک لمحہ توقف کیا کہ شاید ان کے والدین ان کی طرفداری میں کچھ کہیں لیکن جب وہ خاموش رہے تو آپ مشتعل ہو گئیں اور حضرت محمدؐ سے کہا کہ انہیں کسی بات کی توبہ نہیں کرنی۔ اور اس کے متعلق خود ان (حضرت محمدؐ) سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ بڑے جوش اور شدت سے بولتی چلی گئیں اور پھر زار وقطار رونے لگیں۔

حضرت محمدؐ نے ان کی باتیں سنیں لیکن روتی دھوتی بیوی کی کوئی تشفی نہ کی۔ آپؐ انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ پھر آپؐ آہیں بھرنے لگے۔ اور جلدی ہی آپؐ نے آنکھیں بند کر لیں اور چٹائی پر گر گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے آپؐ کو چادر اڑھادی۔ کچھ دیر تک آپؐ پر دورے کی سی کیفیت رہی حضرت عائشہؓ نے بھی رونا دھونا بند کر دیا اور زور زور سے سانس لیتے شوہر کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر اچانک حضرت محمدؐ نے چادر اتار پھینکی اور کھڑے ہو گئے۔ آپؐ کی آنکھیں جوش مسرت سے چمک رہی تھیں۔

آپؐ نے بلند آواز سے کہا۔ "عائشہؓ۔ مبارک ہو۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہیں بے گناہ قرار دے دیا ہے" اور لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے آپؐ گھر سے باہر چلے گئے۔ مسجد کے سامنے کھڑے ہو کر آپؐ نے ایک وحی کے نزول کا اعلان کیا۔

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ (سورۃ النور)

ترجمہ:۔ وہ جو شادی شدہ عورتوں پر عیب لگاتے ہیں اور اس کے لئے چار گواہ نہیں لاتے ان کی سزا اسّی کوڑے ہے۔ اور اس کے بعد ان کی شہادت قبول نہ کرو۔ کیونکہ وہ لوگ نافرمان اور بے حکم ہیں۔

چند منٹ تک آپؐ بولتے رہے اور مشتبہ بدکاری کے متعلق شرعی ضابطوں کی وضاحت کرتے رہے۔ یہ ضابطے بعد میں بڑی تفصیل کے ساتھ قرآن کی چوتھی اور پانچویں سورتوں میں جگہ پا گئے۔

ساری بات ختم کرنے کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ جو سزا ابھی ابھی مقرر کی گئی ہے اس کی حد حسانؓ[1] بن ثابت، حمنہ بنت جحش اور ابو بکرؓ کے ایک دوست مصطح پر جاری کی جائے کیونکہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کے متعلق جھوٹی افواہ پھیلانے میں تعاون کیا ہے۔ اس سزا کا کسی نے بھی بُرا نہ منایا۔ اور حضرت محمدؐ کے متعلق حضرت حسان کی عقیدت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بعد ازاں انہی حسان بن ثابتؓ نے حضرت عائشہ کی مدح میں ایک قصیدہ کہا جس میں ان کی ستودہ صفات کی تعریف کی۔

البتہ عبداللہ بن ابی کو جو دراصل سارے فساد کا ذمہ دار تھا کچھ نہ کہا گیا چونکہ وہ مسلمان نہ تھا اس لئے اس پر قرآنی احکام کا اطلاق نہ ہوتا تھا۔ اپنی بڑھتی ہوئی طاقت کے باوجود اب بھی حضرت محمدؐ اس منتفنی شخص سے کھلا جھگڑا مول لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ آپؐ نے کبھی اس سے انتقام بھی نہ لیا۔ عبداللہ آپؐ سے پہلے فوت ہو گیا لیکن اپنی زندگی کی طرح مرتے دم تک حضرت محمدؐ کے پہلو کا کانٹا بنا رہا۔

بدکاری اور عیب لگانے کی سزا کے متعلق وحی کے نزول کے سبب حضرت محمدؐ نے شادی اور طلاق کے متعلق بھی قوانین وضع کئے۔

زمانہ ماقبل اسلام میں ایک عرب کے لئے شادی کا مقصد صرف لڑکے پیدا کرنا ہوتا تھا کیونکہ اگر جانوروں کی گلہ بانی کے لئے مرد نہیں ہوں گے تو خانہ بدوش قبیلہ ختم ہو جائے گا۔ صحرانورد قبائل میں عورت کا کوئی درجہ یا حیثیت نہ تھی۔ ایک مرد اپنی استعداد کے مطابق کتنی ہی بیویاں رکھ سکتا تھا۔ سب سے بڑے لڑکے کو باپ کے چھوڑے ہوئے گلوں اور خیموں کے ساتھ اس کی بیوہ عورتیں بھی وراثت میں ملتی تھیں۔ بیٹے اور سوتیلی ماں میں زن و شو کے تعلقات نہ صرف جائز سمجھے جاتے تھے بلکہ لازمی ہوتے تھے۔ بکہ میں بدکاری اور عیاشی بالکل اسی پیمانے پر تھی جو کبھی سدوم[2] اور عمرہ[3] میں ہوتی تھی اور عصمت فروشی

---

[1] حسانؓ بن ثابتؓ۔ برگزیدہ صحابی اور اسلام کے مشہور اور بے بدل شاعر۔

[2] سدوم۔ بحیرہ مردار کے کنارے قدیم عرب کا ایک شہر جہاں حضرت لوط علیہ السلام کے زمانے میں لواطت حد کو پہنچی ہوئی تھی۔ حضرت لوط کی بددعا سے اس شہر پر عذاب نازل ہوا۔ اور تباہ ہو گیا۔ انگریزی لفظ SODOMIST اسی لفظ سدوم سے ہی مشتق ہے۔

[3] عمرہ۔ یہ بھی قدیم عرب کا ایک شہر تھا جہاں بدکاری بہت زیادہ تھی۔

بے عزتی نہیں سمجھی جاتی تھی۔

حضرت محمدؐ نے آہستہ آہستہ یہ سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ آپؐ نے ہر صحتمند فرد کو شادی کرنے کا مشورہ دیا بلا تخصیص اس کے کہ وہ امیر ہے یا غریب۔ آپؐ نے شادی کو اچھے معاشرے کی بنیاد قرار دیا اور بدکاری اور فحاشی اور اسی قسم کی اور باتوں کی، جو گھریلو نظام کو کمزور کرنے والی ہیں مذمت کی۔

قرآن میں لکھا ہے :۔

"اللہ نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے ساتھ رہو اور تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کی۔"

اور اپنے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں عورتوں سے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ وہ تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور خالائیں ہیں۔ کامل ترین مسلمان وہ ہے جس کا کردار اچھا ہے اور تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں سے سب سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔"

آپؐ نے فرمان جاری کر دیا کہ آئندہ سے شادی کے لئے کسی مذہبی رسم کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہاں ایک مرتبہ صحرا پھر قرون اولیٰ کے مسلمانوں پر اثر انداز دکھائی دیتا ہے۔ آپؐ جانتے تھے کہ بدوی لوگ شادی کرنے کے لئے صحرا میں کسی مولوی کو نکاح پڑھانے کے لئے اور کسی مسجد کو شادی کی رسم ادا کرنے کے لئے کہاں تلاش کر سکیں گے۔ چنانچہ مرد اور عورت کو شادی کے بندھن میں متحد کرنے کے لئے کسی درمیانی شخص یا کسی مقدس جگہ کی ضرورت کو ختم کر دیا گیا۔ صرف جس چیز کی ضرورت رہ گئی وہ متعلقہ فریقین میں ایک تحریری معاہدہ (نکاح) تھا۔ اس معاہدے میں سب کچھ ہوتا ہے یعنی مرد کی طرف سے دیا جانے والا مہر اور عورت کا جہیز اور یہ بھی کہ طلاق کی صورت میں ان اشیاء کے متعلق کیا کیا جائے گا۔ اس طرح ان قوانین نے عرب میں عورت کی وقعت اس وقت کے مغربی ممالک کے مقابلے میں زیادہ بلند کر دی۔ درحقیقت آج بھی ایک مسلمان مرد کو اپنی بیوی کی جائیداد پر اتنے حقوق نہیں ہیں جتنے اکثر یورپین ممالک میں شوہر کو ہیں۔ اسلام نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عورت کو اپنی ملکیت کے حقوق میں شوہر سے قطعی آزاد اور خود مختار بنا دیا تھا۔

ایک مرتبہ پھر قرآن میں ہم پھر پڑھتے ہیں۔

وآتوا النساء صدقتهن نحلة ط فان طبن لكم عن شئ منه نفسا فكلوه هنيأ مريأ ٥ (سورۃ النساء)	عورتوں کو ان کے مہر بغیر کسی رکاوٹ کے دے دو لیکن اگر وہ خود خوشی سے تمہیں کچھ چھوڑ دیں تو اس کو کھاؤ پیو اور خرچ کرو جس طرح چاہو۔

اور اسی سورۃ میں آگے آتا ہے :۔

للرجال نصیب مما ترک الوالدان ...... نصيبا مفروضا ٥ (سورۃ نساء)	مردوں کو حصہ ہے اس میں سے جو اُن کے والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ مریں اور اسی طرح عورتوں کو حصہ ہے اس میں سے جو ان کے والدین اور قریبی رشتے دار چھوڑ یں۔ یہ تھوڑا ہو یا زیادہ ان کو مقرر حصہ ملتا ہے۔

جہاں حضرت محمدؐ نے مسلمانوں کو بت پرست اور مشرک عورتوں سے شادی کرنے کے لئے منع فرمایا وہاں یہودی یا عیسائی (اہل کتاب) عورتوں سے شادی کرنے میں کوئی امر مانع نہیں بتایا۔ اس کی تصدیق قرآن سے ہوتی ہے۔

"اور تمہیں اجازت ہے کہ ایمان والی نیک عورتوں سے شادی کرو اور
ان نیک عورتوں سے بھی جن پر تم سے پہلے (اللہ کی) کتاب نازل ہوئی۔

آپؐ نے اس کا بھی واضح طور پر حکم دیا کہ ایک مسلمان کو ایک وقت میں چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں۔ یہ بات کہ آپؐ خود اس تعداد سے آگے کیوں بڑھے اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ آپؐ اولاد نرینہ کے خواہشمند تھے اور کچھ اس کا سبب سیاسی تھا۔ حضرت محمدؐ کی بیویوں میں سے صرف حضرت عائشہؓ ہی کنواری تھیں ورنہ باقی تمام ازواج یا تو مطلقہ تھیں یا بیوہ اور ان تمام میں سے پانچ کے علاوہ باقی سب معمولی شکل و صورت کی تھیں۔

حضرت محمدؐ نے طلاق کے متعلق بھی بڑے واضح قوانین وضع کئے۔ طلاق کو بھی آپؐ اتنا ہی ناپسند کرتے تھے جتنا تعداد ازدواج کو، لیکن آپؐ جانتے تھے کہ یہ بھی ان ہی باتوں میں سے ایک ہے جو ناگزیر تھیں۔ البتہ طلاق پانے والی خاتون سے اچھا سلوک کرنے پر آپؐ نے بڑا زور دیا۔ قرآن کی دوسری سورۃ میں ہم یہ احکام دیکھتے ہیں۔

اطلاق مرتٰن فامساكٌ بمعروفٍ	طلاق ہے دو بار تک۔ پھر ہے رکھنا موافق دستور کے یا
او تسریحٌ باحسان ط ولا یحل لکم	رخصت کرنا اچھائی سے اور تم کو روا نہیں کہ تم جو کچھ
ان تاخذ وممآ اتیتموھن شیأً	ان کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو۔

...... (سورۃ بقرہ)

جب کوئی شخص ان احکام کو اور اسی قبیل کے اور بہت سے احکام کو پڑھتا ہے جو حضرت محمدؐ نے اپنی زندگی میں وضع کئے تو اس ضمن میں آپؐ کو بدنام کرنے والوں کی بے انصافیوں پر حیران رہ جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ عورت کے متعلق اسلام کی تعلیمات کی دل کھول کر بدگوئی کر کے اور مسلمان عورت کو دنیا کی دوسری عورتوں کی نظروں میں ذلیل اور بے عزت کر کے خوش ہوتے ہیں۔ گو ان کے سبب آپؐ کو پریشانی بھی اٹھانی پڑیں لیکن حرم کی چشمکوں اور رشک و حسد کے واقعات کے باوجود حضرت محمدؐ عورتوں اور ان کی ہر طرح کی باتوں سے حظ اٹھاتے تھے۔ آپؐ ان سے محبت بھی کرتے تھے لیکن اس کے علاوہ وہ آپؐ کو اچھی بھی لگتی تھیں اور ان کی عقل و دانش کی قدر بھی کرتے تھے۔ آپؐ ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ عورتیں پھر کم و بیش اسی غلامی کی حالت میں آجائیں جس میں وہ چند سال پہلے تک تھیں۔ البتہ صرف ایک معاملے میں آپؐ نے ان سے سختی روا رکھی تھی اور وہ یہ کہ آپؐ نے کبھی ان کی بے جا ناز برداری نہ کی اور نہ سر چڑھایا۔ آپؐ کی حرم کی زندگی اسی قدر مرتاضانہ اور درویشانہ تھی جتنا آپؐ کے جانشینوں نے چند صدیوں بعد اسے عیاشی اور تن آسانی میں بدل دیا۔

گو آپؐ اپنی جسمانی ضروریات کا کافی خیال رکھتے تھے۔ یعنی آنکھوں میں سرمہ ڈالتے تھے۔ جسم پر عطر ملتے تھے اور جب بال سفید ہونا شروع ہوئے تو خضاب بھی استعمال کرتے تھے اور اپنے ہاتھوں اور پیروں کی نگہداشت بھی کرتے تھے لیکن آپؐ کا کھانا پینا اور رہن سہن کا طریقہ بالکل سادہ تھا۔ کھجور، روٹی، دودھ اور کبھی کبھی گوشت کی عام خوراک میں کوئی تنوع نہ تھا۔ البتہ موسم میں ککڑی اور تربوز بھی کھانے میں شامل ہو جاتے تھے لیکن اس کے علاوہ عام طور پر اور کوئی زائد چیزیں نہیں ہوتی تھیں۔ بارش کے پانی کو آپؐ دیگر تمام مشروبات پر ترجیح دیتے تھے۔ آپؐ ہمیشہ اپنے ہر کھانے میں کسی نہ کسی کو، جو بھی وہاں موجود ہوتا، شریک کر کے خوش ہوتے تھے۔ صرف لہسن اور پیاز ایسی چیزیں تھیں جنہیں آپؐ پسند نہ کرتے تھے۔ کھانا آپؐ چٹائی پر بیٹھ کر کھاتے تھے جیسا کہ

اب تک عرب میں دستور ہے اور ہر کھانا انگلیوں سے نوش جان کرتے تھے۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے آپ یہ دعا پڑھتے۔

"خداوندا۔ اس میں برکت عطا فرما اور مجھے اس سے بہتر اشیاء کھانے کو دے"

اگر دستر خوان پر دودھ بھی ہوتا تو آپؐ ان الفاظ کا اضافہ کر دیتے"۔ اور اس میں اضافہ فرما" کیونکہ آپؐ کا خیال تھا کہ دودھ ہی ایسی شے ہے جس میں غذائیت اور مشروب دونوں موجود ہیں اور نئے آنے والوں کو بتاتے کہ اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہوتا ہے جو کھانے اور پینے کے بعد اس کا شکر ادا کرتے ہیں"

ان گھریلو اور قانون سازی کے معاملات کے علاوہ آپؐ اپنے جانوروں کی تعداد بھی بڑھاتے رہے۔ دودھ دینے والی اونٹنیوں کے علاوہ آپؐ کے پاس دو تیز رفتار سانڈنیاں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک مشہور القصوہ تھی جس پر سوار ہو کر آپؐ مکہ سے مدینہ تشریف لائے تھے اور ایک اس سے بھی زیادہ تیز رو العدبہ تھی۔ آپ کے پاس خچر اور گدھے بھی تھے اور جوں جوں وقت گزرتا گیا گھوڑے بھی اس میں شامل ہو گئے۔ ان میں سے بعض کو آپؐ اپنے رسالے کے سواروں کے ساتھ خود سوار ہو کر دوڑاتے تھے۔ عربوں کی گھوڑ دوڑ عام طور پر لمبی اور ناہموار زمین پہ ہوتی ہیں۔ کوئی اپنی باگ نہیں کھینچتا اور ہر ایک جیتنے کا عزم لئے ہوتا ہے۔ حضرت محمدؐ نے بھی اکثر اوقات ان دوڑوں میں حصہ لیا۔ ساٹھ سال کی عمر ہو جانے کے باوجود آپؐ اپنی سپاہ کے بہت سے سواروں سے زیادہ اچھے شہ سوار تھے۔

آپؐ کے پاس مدینہ میں کئی جائیدادیں تھیں۔ ان میں سے ایک بنی نضیر (یہودی قبیلہ) سے ضبط کی گئی تھی۔ ایک دوسری آپؐ کو ایک یہودی مسمی مقیرشؓ[1] نے دی تھی۔ یہ شخص کبھی مسلمان نہیں ہوا لیکن آپؐ کا قدر دان تھا اور آپؐ سے اپنی عقیدت کے نشان کے طور پر آپؐ کو کچھ دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب وہ فوت ہوا تو حضرت محمدؐ نے اسے مسلمانوں کے قبرستان کے باہر بالکل نزدیک دفن کرایا۔

---

[1] مولانا شبلی نے سیرت النبی میں اس یہودی کا نام مخیریق لکھا ہے۔ اور یہ بھی کہ اس نے یہ باغ اُحد کی جنگ کے موقعہ پر آپ کو ہبہ کیا تھا۔ آپؐ نے یہ باغ اسی وقت مستحقین میں تقسیم کر دیا تھا۔

حضرت محمدؐ کے رہائشی مکانات کوئی نمود و نمائش نہ رکھتے تھے۔ مسجد کے نزدیک موجود مکانات کو کنبے میں اضافے کے باعث بڑھا لیا گیا تھا۔ اب بھی وہ چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھے۔ جن کو کھجور کی شاخوں سے بنی ہوئی ٹٹیوں پر گارا لیپ کر ایک دوسرے سے جدا کیا ہوا تھا۔ دروازوں کے پردے سیاہ بالوں سے بنے کمبل کے ہوتے تھے۔ کمروں کے اندر چٹائیاں یا دریاں اور چند بھس بھرے گدّے ہوتے تھے۔ دیواروں پر کوئی آرائش نہ تھی۔ اوڑھنے کے لئے کمبل مفقود تھے۔ جب سردی زیادہ ہوتی تو کمرے کے مکین ایک اور سوزنی یا چادر اوڑھ لیتے۔

حضرت محمدؐ کا ذاتی تعیش کا سامان لے دے کر ایک بلور کا پانی پینے کا کٹورا، جس پر چاندی کا جال تھا۔ ایک مسی (تانبے کی) سلاچی (ہاتھ دھونے کا پیالہ نما برتن) اور ایک ہاتھی دانت کا کنگھا تھے۔ آپؐ کے پاس چند غلام بھی تھے۔ جو آپؐ کی بیویوں کا ہاتھ بٹاتے تھے جو گھر کا کام کاج اکثر خود کرتی تھیں۔ آپؐ کے ایک نجی معتمد (سیکرٹری) بھی تھے جن کا نام زیدؓ بن ثابت تھا۔ مدینہ میں شروع شروع میں حضرت محمدؐ نے چند عبرانی (یہودی) ملازم رکھے تھے جو لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ لیکن جب آپؐ کا یہودیوں سے اختلاف بڑھ گیا تو آپؐ نے ان کی جگہ اچھے پڑھے عرب رکھ لئے تھے۔ یہ زیدؓ ہی تھے جنھوں نے قرآن کے بکھرے ہوئے مسودات کو اکٹھا کر کے کتاب مقدس (قرآن) کو موجودہ شکل دی۔

جو شخص کبھی عرب میں نہ رہا ہو اس کے لئے آپؐ کی بیویوں کی اس مشقت بھری زندگی کا بعد کے حرم کی روایتی زندگی کے مقابلے میں یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ وہ صحرا کے لوگ تھے اور یہ کہ صحرا کے لوگ دنیا کے دوسرے تمام لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔

صحرا نشین لوگوں کے لئے کھانا ایک معمول کی بات نہیں۔ درحقیقت اصل خانہ بدوش تو دن میں صرف ایک وقت ہی کھانا کھاتے ہیں۔ یعنی رات کو سونے سے پہلے اور ان کے دستر خوان کی وسعت کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ وہ سال کیسا گزر رہا ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ لیجئے کہ بارش کیسی ہوئی۔ اچھی چرائی جانوروں اور شکار کے متعلق نظریے میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے باوجود گوشت ان کے لئے ایک عیاشی سے کم نہیں اور روز میسر نہیں آتا۔ صحرائے عرب کے بادیہ پیما صرف زندہ رہنے کے لئے کھاتے ہیں۔

البتہ مقیم عرب یعنی شہری لوگ جو نخلستانوں کے قصبوں میں رہتے ہیں نسبتاً آرام میں رہتے ہیں کیونکہ وہ اناج کی کمی کھجور اور سبزیوں سے پوری کر لیتے ہیں لیکن انہیں بھی صحرا نشینوں کے مقابلے میں اس سے زیادہ اور کوئی نعمت میسر نہیں آتی۔ کیونکہ ان کا انحصار بھی بارش پر ہی ہوتا ہے جس کے سبب صحرا نشین لوگ بھیڑیں اور اون فروخت کرنے اور روپیہ کمانے کے قابل ہوتے ہیں جو وہ شہروں میں خرچ کرتے ہیں۔

صحرا کے لوگ دوسری جگہ کے لوگوں سے کسی بات میں بھی نہیں ملتے۔ یہ عرب ہو یا لیبیا یا افریقہ کا صحرائے اعظم ان لوگوں کی بود و باش اور رہن سہن کے طریقے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ صدیاں گزرنے کے باوجود ان طریقوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اور کوئی تبدیلی ہو بھی نہیں سکتی جب تک کہ کوئی موجد مصنوعی بارش کا طریقہ ایجاد نہ کرے۔

چنانچہ یہ حسین خواتین جن پر حضرت محمدؐ کا حرم مشتمل تھا۔ یہ ابوبکرؓ اور عمرؓ جیسی عظیم ہستیاں، یہ بہادر سپاہی اور کھجور کی کاشت کرنے والے لوگ کفایت شعاری کی زندگی اس لئے نہیں گزارتے تھے کہ ان کے کفایت شعار پیشوا نے انہیں ایسا کرنے کے لئے مجبور کر دیا تھا بلکہ اس لئے کہ ایسا کرنا صحرا کے لوگوں کی سرشت میں داخل تھا۔ یہ ان کا دستور تھا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود بنا لیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے جہاں ان کو دجلہ و فرات کی پھلوں سے بھری وادیوں اور دریائے نیل (مصر) اور دریائے سندھ (ہند و پاکستان) اور دریائے وادالکبیر[1] (ہسپانوی زبان میں اس کے معنی بڑا دریا یا دریائے کبیر ہے) تک حکمران بنانے کا وعدہ کر لیا تھا وہاں ان کی صحرائی زندگی کو تبدیل نہیں کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ہونے والے خلفاء تو ان علاقوں میں جا بسے جہاں خوراک اور پانی کی بہتات تھی وہ طرح طرح کی نعمتیں کھا کر موٹے ہو گئے لیکن ان کے عوام، وہ لوگ جو حقیقی معنوں میں اسلام پھیلانے والے تھے، اسی طرح سادہ زندگی گزارتے رہے جس طرح ان کے پیشوا نے گزاری تھی۔

ایک امریکن یا انگریز یا جاوی مسلمان حضرت محمدؐ کی زندگی میں ایک طرح کی قدامت محسوس کرتا ہے۔ ایسے ہی جیسے آج کل کی کشتی میں لنگر لگا ہوا اور اس کا اتباع اتنا ہی ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے جیسے حضرت عیسٰی کی زندگی ایک عام عیسائی کے لئے لیکن ایک عرب کے لئے زندگی گزارنے کا صرف یہ ہی ایک راستہ اور طریقہ ہے جو وہ جانتا ہے۔

---

[1] GUADAL QUIVIR وادالکبیر۔ اسپین کا ایک مشہور دریا

پندرھواں باب

قرآن

اگرچہ اس کتاب میں قرآن کے بہت سے حوالے دیئے گئے ہیں لیکن اب تک اس کے اصل مضمون و مافیہا اور دین اسلام میں اسکے مقام کے متعلق نہ تو کہیں غور کرنا مقصود رہا اور نہ ہی اس سے بحث کی گئی ہے۔

قرآن ایک معرکۃ الآرا صحیفہ ہے۔ یہ حضرت محمد صلعم کو منعکس کرتا ہے بلکہ درحقیقت یہ ہی محمدؐ ہے۔

لیکن مسلمانوں یا اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کے سوا بہت تھوڑے لوگ ایسے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ قرآن کیا ہے؟ انگریزی۔ فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں اس کے بہت سے اچھے ترجمے ہونے کے باوجود مغرب کے لوگوں میں سے شاید ہی کچھ لوگ ہوں، جنھوں نے اس کو پڑھا ہو۔ میں نے بعض کو یہ بھی کہتے سنا ہے کہ یہ حضرت محمدؐ کے عہد کی تاریخ ہے۔ بعض کے نزدیک یہ اسی طرح کے اقوال کا ایک مجموعہ ہے جسے کنفیوشسؔ[1] سے منسوب کیا جاتا ہے یا یہ اسلامی قوانین کی ایک کتاب ہے یا انجیل کا لفظی مفہوم۔ یہاں تک کہ حضرت محمدؐ کے بعض مغربی سوانح نگار بھی اس کتاب کے مثبت تجزیئے یا وضاحت سے پہلو تہی کرتے نظر آتے ہیں جو درحقیقت سارے اسلام کی بنیاد ہے۔

چنانچہ جو کچھ مشرقی علماء اس ضمن میں پہلے لکھ چکے ہیں اس پر مزید تبصرے کا اضافہ کئے بغیر

---

[1] کنفیوشس (۵۵۱ تا ۴۷۹ ق م) چین کا ایک عظیم مفکر اور دانشور اور دنیا کے ایک بڑے مذہب کا بانی۔ اس کے ہاں مافوق الفطرت قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کی تعلیمات عام عقل اور سمجھ بوجھ پر مبنی تھیں اور انسانیت کی برتری اور بلندی اس کا نصب العین تھا۔ (چیمبرز انسائیکلوپیڈیا)

میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ قرآن اصل میں کن نظریات کی ترجمانی کرتا ہے۔

قرآن لفظ قرأ ء سے لیا یا بنایا گیا ہے۔ جس کا مطلب پڑھنا یا بلند آواز سے زبان سے دہرانا یا سنانا ہے۔ گو اب ساری کتاب کو بھی القرآن کہا جاتا ہے لیکن شروع میں ہر وحی کو قرآن کہتے تھے۔

قرآن میں ۱۱۴ سورتیں یا ابواب ہیں۔ جن میں طویل ترین سورۃ البقرہ میں ۲۸۶ اور سب سے چھوٹی میں تین آیات ہیں۔ ہر سورۃ کا ایک عنوان ہے جو سورۃ کی عبارت کے شروع یا اس کے قریب موجود کسی لفظ یا فقرے سے لیا گیا ہے۔ لیکن کسی سورۃ کے مضمون کا اس کے عنوان سے مطابقت کرنا ضروری نہیں۔

مثال کے طور پر چوہترویں[1] سورۃ (سورۃ روم) کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ "الٓمٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۙ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ ...... " جس میں بادشاہ فارس کے ہاتھوں ۶۱۵ عیسوی میں رومیوں کی شکست کا حوالہ ہے لیکن چند آیات کے بعد اس سورۃ میں رومیوں کا مزید ذکر نہیں ملتا۔

طویل ترین سورۃ، جو دوسری سورۃ ہے، البقرہ کہلاتی ہے لیکن اس سورۃ کا اس جانور (گائے) سے کوئی تعلق نہیں سوائے اس کے کہ اس کا صرف ایک موقعہ پر ذکر آتا ہے جہاں حضرت موسیٰؑ نے (کتاب تعداد و استثناء[2]) اس کی قربانی کے لئے حکم دیا ہے۔

نویں سورۃ (سورہ توبہ) کے سوا ہر سورۃ کا آغاز 'بسم اللہ الرحمن الرحیم' کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ (شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو بہت مہربان اور رحم والا ہے)

اکثر و بیشتر آیات کے آغاز میں قُل (کہہ دو اے محمدؐ) کے تاکیدی لفظ کا اضافہ ملتا ہے

---

[1] سورۃ روم۔ یہ تیسویں[30] سورۃ ہے۔ چوہترویں نہیں۔ غالباً مصنف کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس میں رومیوں کی شکست کا ذکر ہے اس لئے اس کا نام سورہ روم ہے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ رومی جلد غالب آئیں گے۔ یہ دونوں واقعات رسول کریم کے زمانے میں پیش آئے۔ انگریز مترجموں نے رومیوں کو یونانی لکھا ہے۔

[2] پرانے عہد نامے (توریت) کے ترجمے میں BOOK OF NUMBERS اور DEUTRONOMY کو کتاب تعداد اور کتاب استثنا کہتے ہیں۔ کتاب استثنا میں وہی قوانین دہرائے گئے ہیں جو کتاب خروج میں مذکور ہو چکے ہیں۔

اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ مسلم عقیدے کے مطابق قرآن کی ہر سطر پیغام الہٰی ہے جو اللہ کی طرف سے حضرت محمدؐ پر نازل ہوئی۔

مثال کے طور پر ایک سو چودھویں سورۃ کے الفاظ یہ ہیں:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ	کہ دو (اے محمدؐ) میں پناہ چاہتا ہوں لوگوں کے
مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ	رب کی لوگوں کے بادشاہ کی، لوگوں کے معبود کی
مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۙ	چھپ کر وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے اور اس کے
الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ	خلاف جو بُرے خیال ڈالتا ہے لوگوں کے دلوں
مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝	میں جنوں اور انسانوں میں سے۔

(سورۃ والناس)

اُن چند موقعوں پر جب اہل قریش نے حضرت محمدؐ کی باتیں سنیں تو انھوں نے کہا کہ یہ قرآن اتنا فصیح و بلیغ ہے کہ وہ آپؐ کا کلام نہیں ہو سکتا۔ آپؐ نے جواب دیا کہ ان کا کہا سچ بھی تھا اور غلط بھی کیونکہ اللہ کے سوا ایسا کلام کوئی اور کہہ ہی نہیں سکتا۔

چنانچہ چھبیسویں سورۃ (سورہ شعرا) کی ایک سو بانوے آیت میں لکھا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝	اور یہ قرآن اتارا ہے جہان کے رب نے
نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ۙ	اور یہ روح الامین (حضرت جبرئیل)
عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ۙ	اسے لے کر اترے تیرے دل پر تاکہ تو
بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ ۝	لوگوں کو ڈر سنا دے صاف اور کھلی
(رکوع ۱۱)	عربی میں۔

چنانچہ یہ وحی آپؐ پر مکہ اور مدینے میں وقتاً فوقتاً حضرت جبریل کے ذریعہ نازل ہوئیں۔ جونہی وحی نازل ہو چکتی آپؐ اسے لکھا دیتے تھے۔ صرف کاغذ جیسی اشیاء

یا تختیوں[1] پر ہی نہیں بلکہ جو چیز بھی اس وقت دستیاب ہوتی۔ اس لئے قرآن کا پہلا نسخہ بھیڑ کے شانے کی ہڈیوں، سیپیوں، لکڑی اور پتھر کے ٹکڑوں اور چمڑے کی چوڑی پٹیوں پر لکھا گیا تھا اور بعض آیات تو کھجور کی بھدی شاخوں اور چمڑے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں پر لکھی گئی تھیں۔

حضرت محمدؐ کی وفات کے ایک سال بعد حضرت عمرؓ کے مشورہ پر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو ان تمام آیات کو اس طرح مجتمع کرنے اور اس کی ترتیب و تدوین کرنے کا حکم دیا کہ وہ آسانی سے پڑھی جا سکیں[2]۔ انہوں نے اس کی تعمیل کی اور ان آیات کو بھی شامل کر دیا جنہیں لکھوانے کی بجائے حضرت محمدؐ نے اپنے بعض صحابیوں کو حفظ کرا دیا تھا۔ البتہ (حضرت زید) نے آیات کو کسی خاص طریقے پر ڈھالنے یا ان کے درمیان وضاحت اور ربط پیدا کرنے کے لئے فقروں کا اضافہ کرنے کی کوشش نہ کی۔ انہوں نے ناقابلِ یقین حد تک محنت اور لگن سے کام کیا۔ چنانچہ جب قرآن کی تدوین ختم ہوئی تو اس صحیفہ نے ایک ایسی کتاب کی شکل اختیار کر لی جو واقعی طور پر اپنے مصنف اور خالصتاً مصنف کی ہی تصنیف معلوم ہوتی تھی۔

قرآن کا یہ نسخہ وہی نسخہ تھا جو حضرت حفصہؓ کی تحویل میں دیا گیا اور جسے قرآن مجید کا صحیح ترین اور مستند نسخہ قرار دیا گیا۔

بہرحال اس اعلان پر سختی سے عمل نہیں کیا جا سکا اور جلدی ہی قرآن کے ان نسخوں

---

[1] SCROLL AND TABLETS اس وقت تک کاغذ موجود نہیں تھا اس لئے چمڑے، بھیڑ بکریوں کی کھالوں اور ہڈیوں پر لکھا گیا تھا۔ بہت سی آیات اونٹ کی ہڈیوں پر محفوظ کر لی گئی تھیں SCROLL کا لفظ غالباً اس لئے استعمال کیا ہے کہ کھالوں کے پارچے لکھنے کے بعد لپیٹ لئے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی بہن کے ہاں جو قرآنی سورۃ دیکھی وہ بھی ایک بھیڑ کی کھال پر لکھی ہوئی تھی۔

[2] قرآن پاک کی ترتیب بعینہٖ وہ ہے جو نبی کریم صلعم نے مقرر فرمائی تھی۔ ہر وحی کے نزول کے بعد آپؐ ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ اسے قرآن پاک میں کس موقعہ پر شامل کیا جائے۔ حضرت زید کی تدوین بالکل اسی ترتیب کے مطابق ہوئی ہے۔

میں تبدیلیاں نظر آنے لگیں جو بڑھتی ہوئی اسلامی دنیا میں مختلف جگہ موجود تھے۔

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں صورت حال اتنی خراب ہو گئی کہ حذیفہؓ نے جو ایک مشہور مسلمان جنرل تھے اور جنہیں مہمات کے سلسلے میں شام، آرمینیہ اور عراق جانا پڑا یہ رپورٹ بھیجی کہ اگر فوری طور پر کوئی سخت قدم نہیں اٹھایا گیا تو مسلمانوں میں بھی قرآن کی عبارت کے متعلق اتنے ہی اختلافات ہو جائیں گے جیسے عیسائیوں میں انجیل کے متعلق موجود تھے۔

حضرت عثمانؓ نے فوراً زید بن ثابتؓ کو بلایا جو اب ادیٹر ہو چکے تھے اور حکم دیا کہ وہ تین قریشی عالموں کو اپنے ساتھ لے کر حضرت حفصہؓ کے صندوق میں محفوظ مستند قرآنی نسخہ کی ایک باضابطہ نقل تیار کریں۔ یہ نسخہ اہل مکہ کی زبان[له] میں تیار کیا گیا جس کو عرب کی خالص ترین زبان کہا جاتا تھا اور اس طرح نادانستہ طور پر مکہ کی زبان کو مستند اور معیاری قرار دیا گیا۔ آج بھی اپنی وسیع سلطنت کے مختلف حصوں میں رہنے والے عربوں اور دنیا کے دوسرے حصوں کے بہت سے مسلمانوں کے درمیان مکہ کی یہ بولی اور زندہ زبان باہمی رسل و رسائل کا بنیادی ذریعہ ہے۔ یہ بات کسی اور مذہب میں نہیں ملتی۔

جب قرآن کا یہ مستند نسخہ تیار ہو گیا تو باقی تمام نقول (جن میں کوئی اختلاف پایا جاتا تھا) جلا دی گئیں۔ ان کی جگہ نئے نسخے تیار کر لئے گئے اور یہ ہدایت کر دی گئی کہ اس میں ہرگز کسی قسم کی کمی بیشی نہ کی جائے۔ اس ہدایت پر بڑی فرض شناسی سے عمل کیا گیا اور آج بھی بلا شک و شبہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیائے اسلام میں جہاں بھی مسلمان ہیں اور قرآن پڑھا جاتا ہے وہ قرآن حضرت حفصہؓ کے مستند قرآنی نسخے کی من و عن نقل ہے۔ درحقیقت اب بھی ایسے مسلمان موجود ہیں جو اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت محمدؐ کی وفات کے پندرہ سال بعد حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں جاری کردہ قرآنی نسخے کی چند نقول اب بھی موجود ہیں۔ گو ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اسے غلط کہا جائے لیکن میری کسی ایسے عرب سے ملاقات نہیں ہوئی جس کی نظر سے کوئی ایسا نسخہ گزرا ہو۔ قرآن کا قدیم ترین قلمی نسخہ جسے کسی

له قرآن پاک کے اس نسخہ کی زبان اور الفاظ وہی ہیں جو وحی کے ذریعہ آنحضورؐ پر نازل ہوئے۔

کسی باقاعدہ مرتب فہرست کتب CATALOGUE میں شامل کیا گیا ہو نویں صدی عیسوی کا ہے۔ یعنی حضرت محمدؐ کی وفات سے دو سو سال بعد کا۔ بہر حال یہ بات پرانے نسخوں کے متلاشی لوگوں کے سوا اور کسی کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اصل اہم بات یہ ہے کہ قرآن ہی صرف ایسی کتاب ہے جس کی عبارت بارہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے پر بھی بغیر کسی اضافے اور تحریف کے جوں کی توں موجود ہے۔ نہ تو یہودی مذہب میں اور نہ ہی عیسائیت میں کوئی ایسی چیز ہے جو اس کی ذرا سی بھی ملتی جلتی مثال پیش کر سکے۔

قرآن کی عبارت کے تاحال بے ردّ و بدل رہنے کے خلاف صرف ایک ہی بات جاتی ہے اور وہ ہے اس کی ترتیب کی خامی۔ کچھ حد تک یہ خامی دور بھی کر دی گئی ہے۔

جہاں رسول اللہؐ کے صحابیوں کی بیان کردہ روایات سے یہ اشارے ملتے ہیں کہ آپؐ تمام وحی اور آیات کو ان کی نزول کی تاریخ کی بجائے ان کے مضمون اور موضوع کے مطابق ترتیب دینے کے خواہشمند تھے وہاں چند مشرقی علماء نے جن میں یورپین اور ایشیائی دونوں شامل ہیں، مختلف زبانوں میں ایسے قرآن شائع[۱] کئے ہیں جن میں سورتیں نزول کے اعتبار سے صحیح ترتیب میں ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ ان کی ترتیب بتمام وجوہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس میں انہیں کافی محنت و کاوش کرنا پڑی ہے۔ کیونکہ دوسری رکاوٹوں کے ساتھ ساتھ قرآن میں عملی طور پر کوئی تاریخی یا دوسرے مشہور نشانات نہیں ملتے۔ خود حضرت محمدؐ کا نام سارے قرآن میں صرف پانچ مرتبہ آیا ہے اور آپؐ کے ہمعصروں کے متعلق صرف دو حوالے ملتے ہیں۔ سورتوں کے نزول کی تاریخ کا اندازہ صرف ان کے لہجے اور انداز سے ہوتا ہے۔

شروع زمانے کی سورتوں پر خصوصیت سے شاعرانہ انداز غالب ہے۔ آیات میں اثر آفرینی ہے اور قدرتی مناظر کا ذکر زیادہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی حق کا مخلص متلاشی یا کسی نظریہ کا داعی اپنے خیالات کو ایسے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو لوگوں کو

---

[۱] ہماری نظر سے ایسے کوئی نسخے نہیں گزرے اور کم از کم ہند و پاکستان میں ایسے کسی قرآن کا پتہ نہیں چلتا۔ ہو سکتا ہے یورپ یا برطانیہ کی لائبریری میں ہوں۔

ہمنوا بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ دل کش ہو۔ پس منظر اور مستعمل الفاظ سے جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک صحرا نشین گلہ بان، ایک نظریہ پرست انسان، ایک شاعر یا پھر ایک نبی کی ہو سکتی ہے۔

پھر جب حضرت محمدؐ کے اختیار و اقتدار کا آغاز ہوتا ہے تو سورتیں خبردار کرنے کا لہجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ عبارت زیادہ سادہ، مبنی بر حقیقت اور احکامات سے متعلق ہو جاتی ہے یہ ایک ایسے مبلغ کی زبان معلوم ہوتی ہے جس کا مشن لوگوں کو تبدیل مذہب کی ترغیب دینا ہو اور جوں جوں اسلام ترقی کرتا ہے سورتوں کی ہیئت بھی بدلتی جاتی ہے۔ مکہ کا مبلغ بتدریج ایک قانون ساز، جنگی قائد اور مطلق العنان حکمران بن جاتا ہے اور لوگوں سے اطاعت (اطیعو اللہ و اطیعو الرسول) کا خواہاں ہوتا ہے۔ سورتوں میں سے شاعرانہ تخیل بڑی حد تک کم ہو کر پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ اب کبھی کبھی ایسی آیتیں نازل ہوتی ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول کے انعامات اور اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی کا ذکر کرتی ہیں۔ درحقیقت جوش و جذبہ سے سرشار ایک تجارتی گماشتے سے ترقی کر کے عرب کے حکمران بن جانے والے شخص کے ذہن کا تدریجی ارتقار ان تاریخ وار مرتب سورتوں سے زیادہ کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ (سورتیں) اس موضوع پر والٹیر[1] کی رائے کی نفی کرتی ہیں اور گوئٹے[2] کے اس خیال کو صحیح ثابت کرتی ہیں۔

"جتنی مرتبہ بھی ہم قرآن کو دیکھتے ہیں تو پہلی مرتبہ تو یہ مایوس کر دیتا ہے۔
پھر آہستہ آہستہ اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، حیرت میں ڈال دیتا ہے اور آخر
میں تعریف کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔"

مزید براں ان لوگوں کو جو قرآن کو پڑھنے میں اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ قرآن کے نزول کا منشاء ہی یہ ہے کہ اس کو پڑھا جائے۔ یہ پڑھنے اور سننے کے لئے ہی آیا ہے۔ پھر اس کی شہادت بھی موجود ہے کہ حضرت محمدؐ اس کے پڑھنے کے صحیح طریقے پر بہت زور دیتے تھے۔ آپؐ نے بارہا فرمایا: "اچھی قرأت یا خوش الحانی جادو

---

[1] والٹیر VOLTAIRE اٹھارویں صدی کا ایک مشہور انقلابی فرانسیسی مفکر۔
[2] مشہور جرمن فلسفی اور مفکر شاعر مشرق علامہ اقبال بھی اس کے کلام سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔

کا اثر رکھتی ہے"۔ آج بھی ایسا ہی ہے۔ عرب کے مدرسوں میں بچوں کو قرآن[1] حفظ کرایا جاتا ہے۔ اکثریت اس کو یاد رکھتی ہے۔ میرا صحرانشین دوست مدنی قرآن کو جہاں سے بھی کہا جاتا سنا سکتا تھا۔ میں خود قرآن کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتا تھا کہ اس کی صحت کو جانچ سکوں لیکن یہ یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس کو پورا قرآن حفظ تھا۔ بعض اوقات میں نے دیکھا ہے کہ مسجد میں نماز کے دوران جب بھی امام کوئی آیت غلط پڑھے تو مقتدی فوراً ٹوک کر درست کر دیتے ہیں۔

ایک شخص قرآن کی عبارت کو بڑی آسانی سے ایک بڑے خطیب کے برجستہ اور والہانہ خطبات کو مختصر نویسی میں لکھی ہوئی سطور سے مشابہت دے سکتا ہے۔ عین اسی طرح جیسے مقرر کے تمام جذبات، تقریر کے سیاق و سباق اور موقع و محل پنسلی خطوط میں سمو جاتے ہیں۔

اگرچہ یہ کوئی بڑا نقصان بھی ہو تب بھی ترجمے سے قرآن کے حسن و خوبی میں بڑی کمی آ جاتی ہے۔ اپنے اسلوب بیان اور مضمون کے علاوہ قرآن کی خوبی بڑی حد تک حسن الفاظ میں مضمر ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے عام لاطینی زبان میں لکھی انجیل VULGATE[2] ملکہ ایلزبتھ[3] کے عہد کی انگریزی میں ترجمہ ہو جانے سے نئے عہد نامے کی لاطینی زبان کی مٹھاس اور شیرینی کھو بیٹھتی ہے، یا پرانے عہد نامے (توریت) کے جیمز[4] اوّل کے عہد کے مستند انگریزی ترجمے

---

[1] یہ تقریباً تمام اسلامی دنیا میں ہی ہے خصوصاً عرب ممالک، ترکی، برصغیر پاک و ہند ملائشیا اور انڈونیشیا میں اور رمضان کے مہینہ میں تراویح میں حفاظ سارا قرآن سناتے ہیں بلکہ ایک رات میں سارا قرآن سنانے کے لئے شبینے بھی منعقد کئے جاتے ہیں۔ (۲) ولگیٹ VULGATE سینٹ جیروم کی چوتھی صدی عیسوی کی عام اور روزمرہ لاطینی میں لکھی ہوا انجیل ولگیٹ کہلاتی ہے جو بڑے تاثر کی حامل شمار ہوتی ہے۔ (۳) ایلزبتھ۔ انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ اوّل (سترھویں صدی) کے زمانے میں انجیل کا پہلی مرتبہ باضابطہ انگریزی ترجمہ ہوا۔

(۴) جیمز اول۔ شاہ انگلستان جو ملکہ ایلزبتھ کے بعد تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں پرانے عہد نامے کا ترجمہ ہوا جو دلکش اور مستند شمار ہوتا ہے۔

کے علاوہ دوسرے تمام تراجم ایک بار بار دہرائی جانے والی تاریخ اور قوانین کا مجموعہ بن گئے ہیں۔ قرآن بھی عربی سے کسی اور زبان میں ترجمہ ہو جانے کے سبب اپنی ترتیل کا وجدانی زیر و بم کھو بیٹھتا ہے جس شخص نے کسی عرب کو اپنے اثر آفریں لحن میں قرآن پڑھتے نہیں سنا یا کسی مسجد کے منارے سے اذان کی سحر انگیز آواز نہیں سنی وہ یہ اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ قرآن کے انگریزی فرانسیسی اور جرمن ترجمے اصل میں کسی چیز سے محروم ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے شکسپیئر[۲] کا کسی غیر زبان میں ترجمہ یا ویگنیر[۳] کا اطالوی زبان میں۔

کیا قرآن کی سورتوں اور آیات کو شاعری کہا جا سکتا ہے۔ یہ اپنا اپنا خیال ہے۔ وہ یقینی طور پر عرب کے قصیدہ کی طرح کی شاعری تو نہیں ہے جو زمانہ ماقبل اسلام کی شاعری کی بہترین مثال تھی۔ البتہ یہ سورتیں بڑی جاذب، دلکش اور ولولہ انگیز ہیں اور اطالوی زبان کی طرح الفاظ خود بخود قافیوں میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔

سورۃ التکویر (۸۱) کا پہلا نصف حصہ جو درج ذیل کیا جاتا ہے جب عربی زبان میں تلاوت کیا جائے تو اپنے اندر اتنی گونج اور عظمت رکھتا ہے کہ شاہ جیمز کے عہد کی انجیل کے کسی حصے میں بھی ایسی کوئی مثال ملنا مشکل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ ۝۱	جب سورج کو تہ کر دیا جائے گا یعنی اس کی روشنی اور تمازت ختم کر دی جائے گی۔
وَاِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ ۝۲	اور جب ستارے گر پڑیں گے یا میلے ہو جائیں گے۔

---

[۱] پرانا عہد نامہ توریت و زبور پر مشتمل ہے۔ نئے عہد نامے میں حضرت عیسیٰؑ کے حالات اور ان کی تعلیمات ہیں۔

[۲] شکسپیئر۔ انگلستان کا مشہور ڈرامہ نگار۔ اس کے منظوم ڈرامے اور زبان انگریزی ادب کا مستند اور نادر نمونہ ہیں۔

[۳] ویگنیر WAGNER ایک جرمن نغمہ نواز اور موسیقی اور ڈرامے میں ایک نئے طرز کی ہم آہنگی کا موجد۔

وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝	اور پہاڑ چلائے جائیں گے (اور روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔)
وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝	اور جب بیائی بچے والی اونٹنیاں چھٹی پھریں گی (اور کوئی ان کا رکھوالا نہ ہوگا)
وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝	اور جب جنگل کے جانور (خوف کے مارے) اکٹھے ہو جائیں گے
وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝	اور جب سمندروں کا پانی کھولنے لگے گا۔
وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝	اور جب روحیں اپنے جسموں سے مل جائیں گی (اور مردے جی اٹھیں گے)
وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝	
بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝	اور جب جیتی بیٹی کے گاڑے جانے پر پوچھا جائیگا کہ کس گناہ پر ماری گئی۔
وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝	اور جب اعمالنامہ پیش کیا جائے گا۔
وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝	اور جب آسمان سے ہر چیز چھلکے کی طرح اتار لی جائیگی
وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝	اور جب دوزخ کی آگ بھڑکائی جائے گی۔
وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝	اور جب جنت نزدیک آجائے گی۔
عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ۝	تو ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے دنیا میں کیا اعمال کئے تھے۔

اتفاق سے اس سورۃ کا نام اس کی پہلی آیت کے آخری دو لفظوں کی مناسبت سے (سورہ تکویر) ہے جس کے معنی لپیٹنا یا تہ کرنا ہے۔

ان شاعرانہ صفات کے باوجود قرآن مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور مدنی ضوابط کا ایک مجموعہ اور اجتماعی عبادات اور دعاؤں اور قدیم مذہبی واقعات و قصص کی کتاب ہے اور یہ سب کچھ ایک ہی کتاب میں ہے۔ ایسی آئتیں بھی ہیں جو خصوصیت سے توبہ و استغفار، منافقوں کو برا بھلا کہنے ان پر لعنت و ملامت کرنے اور اللہ تعالیٰ کے اوصاف کے پرجلال مظاہر سے متعلق ہیں۔ اس (قرآن) میں معرفت الٰہی کی روح بھی ہے جس نے عربوں پر

حیرت انگیز اثر کیا۔ اس نے سیدھے سادے گلے بانوں، تاجروں اور عرب کے خانہ بدوشوں کی کایا پلٹ کر کے ان کو جنگجو مجاہدوں، سلطنتیں قائم کرنے والوں، بغداد، قرطبہ اور دہلی جیسے شہروں کی تعمیر کرنے والوں، عالموں، حکمرانوں اور ریاضی دانوں میں تبدیل کر دیا۔ بلاشک وشبہ یہ ہی کتاب تھی جس کے سبب ان لوگوں نے ایرانیوں اور رومنوں سے زیادہ بڑی دنیا فتح کر ڈالی۔ اور اس کے لئے انھوں نے اپنے پیشروؤں کی ہر صدی کے مقابلے میں صرف دس سال لئے۔ گو فونیقی ان سے زیادہ دور تک چلے گئے تھے اور انھوں نے ہر اس جگہ جہاں تجارت تھی اپنے پاؤں مضبوطی سے جما لئے اور یہودی بھی باہر کے ممالک میں گئے لیکن پناہ گزین ہو کر یا قیدی بن کر۔ لیکن ان کے برخلاف یہ عرب اپنی اس کتاب کے ساتھ حکمران بن کر پہلے افریقہ گئے اور پھر یورپ میں در آئے۔

جب ۶۵۷ء میں مسلمان آپس میں لڑ رہے تھے اور معاویہ بن ابوسفیان سالار افواج شام کو حضرت علیؓ کے بہادروں کے ہاتھوں شکست ہونے لگی تو اس نے مقدس کتاب (قرآن) کی اسی روحانی خاصیت کا سہارا لیا تھا۔ لڑائی تقریباً ختم ہو چکی معلوم ہوتی تھی اور شامیوں کے قدم اکھڑ گئے تھے کہ انھیں اپنے نیزوں پر قرآن بلند کرنے کا حکم دیا گیا۔ جونہی حضرت علیؓ کی فوج نے یہ دیکھا تو انھوں نے اپنی تلواریں نیچی کر لیں اور لڑائی سے ہاتھ روک لیا اور لڑائی کا فیصلہ ثالثی کے ذریعہ کرنا پڑا۔

آج بھی جب کوئی رباط (مراکش)، یا آگرے (ہندوستان)، کا قاضی (مسلم مجسٹریٹ) شرع محمدی میں کوئی ایسا فیصلہ تلاش کرنے میں ناکام رہتا ہے جو اس کے سامنے پیش ہونے والے مقدمے پر منطبق ہو سکے تو وہ قرآن کو سر پر رکھ لیتا ہے اور (اس کی روحانی رہبری میں) عقل انسانی اور موجودہ قانون کے مطابق فیصلہ کر دیتا ہے۔

دنیا کی آبادی کا ساتواں حصہ اپنے سارے کام اس کتاب کے احکام کے مطابق کرتا ہے۔ کوئی شخص تاحال اس کی کوئی معقول وجہ نہیں بتا سکا۔

تخلیق کائنات، حضرت آدمؑ کا جنت سے اس دنیا میں آنا، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ کی دعوت حق، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب علیہم السلام اور دوسرے نبیوں

کا ذکر اس میں موجود ہے۔ یہودیوں کا منتخب اُمّت قرار دیا جانا، حضرت موسیٰؑ کے قوانین اور قاعدے پیغمبروں اور نبیوں اور خاص طور پر حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے حالات پہلی مرتبہ اس کتاب میں تاریخ کی حیثیت سے درج کئے گئے ہیں۔

چنانچہ جہاں تک "نئے عہد نامے" کا تعلق ہے قرآن حضرت عیسیٰ کے مسیح موعود تسلیم کئے جانے سے متفق ہے۔ یہ حضرت عیسیٰؑ کا معجزاتی طور پر روح القدس کے دم سے رحم مادر میں آنا بھی تسلیم کرتا ہے۔ اسی طرح حضرت مریمؑ کی پاک پیدائش[1] حضرت یوحنّا[2] کی پر اسرار ولادت اور حضرت عیسیٰؑ کے پیشرو کی حیثیت سے ان کا کردار بھی تسلیم کرتا ہے۔ اسی طرح یہودیوں کا حضرت عیسیٰؑ کو پیغمبر ماننے سے انکار، آپ کو اذیتیں دینا اور پھر آپ کو سولی پر چڑھانے کا ذکر بھی اس میں موجود ہے اور آخر میں قرآن میں یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے جسم سمیت مرنے سے پہلے ہی آسمان پر اٹھا لئے گئے تھے اور یہ کہ وہاں پر وہ خدائے تعالیٰ اور انسانوں کے درمیان رابطے کا کام کریں گے۔ (سورہ ۳-۴)

جہاں قرآن میں انجیل میں سے ایک قول من وعن ملتا ہے یعنی :-

"میرے نیک بندے اور صالح لوگ ہی زمین کے وارث ہوں گے۔"

زبور PSALMS

وہاں بہت سی آیات ایسی بھی ہیں جن کے الفاظ "پرانے عہد نامے" کی بہت سی آیات اور فقروں سے بہت زیادہ ملتے جلتے ہیں۔

بعض مثالیں درج ذیل ہیں :-

انجیل :- تو دلائے گا جان کے بدلے جان، دانت کے بدلے دانت، داغ کے بدلے داغ

---

[1] حضرت مریم کی پیدائش۔ عیسائیوں میں عقیدہ ہے کہ حضرت مریم بھی حضرت عیسیٰ کی طرح پاک طریقہ سے پیدا ہوئی تھیں اور اس عقیدے کو عقیدہ حمل بے گناہ یا FREE OF ORIGIONALISM کہتے ہیں۔

[2] یوحنا JOHN THE BAPTIST قرآن میں ان کا نام حضرت یحییٰؑ آیا ہے، حضرت عیسیٰؑ کے ہم سن اور دست راست تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کی تبلیغ کرتے تھے اور آپ کی زندگی میں ہی قتل کر دیئے گئے ان کی پیدائش بھی قرآن کی رو سے ایک معجزہ تھی کیونکہ یہ اس وقت پیدا ہوئے جب حضرت ذکریا سو سال کے تھے اور فرشتے کی بشارت سے پیدا ہوئے تھے۔

اور زخم کے بدلے زخم ۔"

قرآن: "ہم نے حکم دے دیا ہے کہ وہ دیں گے جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا بھی قصاص لیا جائیگا۔"

انجیل: "تو خاک ہی ہے اور خاک کی طرف ہی لوٹ جائے گا۔"

قرآن: "ہم نے تجھے مٹی سے ہی پیدا کیا اور اسی کی طرف لوٹا دیں گے۔"

دونوں پیغمبروں میں تیسری مماثلت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ کا شروع کا پس منظر اور ماحول بڑی حد تک ایک جیسا تھا۔ جہاں حضرت عیسیٰؑ ایک بھیڑ کے گلے سے بچھڑ جانے کا افسوس اور اس کے دوبارہ پا لینے کی خوشی کا ذکر کرتے ہیں وہاں حضرت محمدؐ ایک گناہگار کی توبہ کی قبولیت کو ایک صحرانشین کی اس خوشی سے مشابہت دیتے ہیں جو اسے اپنی کھوئی ہوئی بھیڑ کے مل جانے سے ہوتی ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے حضرت محمدؐ کی یہودی اور عیسائی صحیفوں سے واقفیت کے اسباب پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ انجیل کے ایک عربی ترجمے کو ورقہ بن نوفل سے نسبت دی جاتی ہے لیکن اس بات کی معمولی سی بھی شہادت نہیں ملتی کہ حضرت محمدؐ نے کبھی اسے دیکھا ہو۔ اس سلسلہ میں آپؐ کی ورقہ سے بات چیت صرف مذہب کی عام باتوں تک محدود رہی اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ورقہ آپؐ کے حضرت جبرئیل کے لائے ہوئے پیغامات کو کوئی شکل دینے سے پہلے ہی فوت ہو گئے اور اس سے تو بہت پہلے کہ آپؐ قرآن مرتب کرتے : پرانے عہد نامے کا سب سے پہلے عربی ترجمہ جو ہمارے علم میں ہے حضرت عیسیٰؑ کے نو سو سال بعد اور حضرت محمدؐ کی وفات کے تقریباً تین سو سال بعد وجود میں آیا۔ اور نئے عہد نامے (انجیل) کا باضابطہ عربی ترجمہ تو اس کے بھی تقریباً دو سو سال بعد ہوا۔ عرب لوگ حیران کن حد تک یادداشت کے حامل ہوتے ہیں اس لئے یہ ممکن ہے کہ حضرت محمدؐ نے سفر کے دوران سنی ہوئی باتوں کو ذہن میں محفوظ رکھا ہو۔ یہ ایک حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے لیکن صرف یہی اس کی ایک قابل قبول توجیہ ہو سکتی ہے ورنہ پھر بصورت دیگر بلا چوں وچرا اسے خالصتاً الہامی اور اللہ کا کلام تسلیم کر لینا ہوگا۔

ان لوگوں کے فائدے کے لیئے جو قرآن کے الفاظ اور اس کے موضوعات کے متعلق کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ جے ایم۔ روڈویل J.M. RODWELL کے ترجمے سے یہاں وہاں سے چند اقتباسات درج ذیل کیئے جاتے ہیں۔

انیسویں سورۃ (اس کا نام سورۃ مریم ہے اور کسی حد تک اپنے موضوع کے مطابق ہے، اس میں حضرت مریم کے پاک حمل کا ذکر ہے)

وَاذْکُرْ فِی الْکِتَابِ مَرْیَمَ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ذٰلِکَ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ ۔۔۔۔۔۔ فِیْہِ یَمْتَرُوْنَ ہ (رکوع ۱۰ - سورہ مریم)

"اور اس کتاب میں ذکر کر دو حضرت مریمؑ کا جب وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ ہو کر مشرق کی طرف چلی گئیں اور ان کی نظروں سے چھپنے کے لیئے ایک پردے کے پیچھے ہو گئیں اور ہم نے اپنا فرشتہ (جبرئیل) اس کی طرف بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔"

"اس (مریمؑ) نے کہا:- میں تجھ سے بچنے کے لیئے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اور اگر تجھے اس کا خوف ہے تو میرے پاس سے چلا جا۔

"فرشتے نے جواب دیا۔ میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ایک پیغامبر ہوں تاکہ میں تجھے ایک بیٹا دوں۔"

"اس نے کہا:- میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے۔ جبکہ کسی مرد نے مجھے چھوا تک نہیں اور میں بدکار کبھی نہ تھی۔

"وہ بولا:- اسی طرح ہو گا۔ تیرے رب نے کہا ہے کہ یہ میرے لیئے آسان ہے اور ہم اسے بنائیں گے ایک نشانی بنی نوع انسان کے لیئے اور رحمت اپنی جانب سے۔ اور اس کا ہونا ٹھیر چکا ہے۔"

"پھر اس نے حمل قبول کر لیا اور اس کو لے کر دور ایک طرف چلی گئی اور پھر لے آیا اس کو وضع حمل کا درد ایک کھجور کے تنے کی جڑ میں۔

"اور اس نے کہا:- کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور ہو جاتی بھولی بسری۔"

"پھر آواز آئی اس کو اپنے نیچے سے۔ غم نہ کھا۔ تیرے رب نے تیرے قدموں کے نیچے

ایک چشمہ بہا دیا ہے۔ اس کھجور کو اپنی طرف ہلا تاکہ اس سے پکی کھجوریں تجھ پر گریں۔ پھر انہیں کھا اور پانی پی۔ اور (بچے سے) اپنی آنکھ ٹھنڈی رکھ۔ اور اگر کوئی مرد نظر آئے تو کہہ دے۔

"میں نے مانا ہے رحمٰن کا ایک روزہ اور میں آج کسی سے بات نہ کروں گی"

"پھر اپنے بچے کو اٹھائے ہوئے وہ اپنے لوگوں کے درمیان آئی"

"انہوں نے کہا۔ اے مریم تو نے تو یہ کام کیا طوفان اٹھانے والا۔ اے ہارون کی بہن تیرا باپ بُرا آدمی نہ تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکار تھی"

"اس پر اس (مریم) نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔

"وہ بولے: ہم اس سے کیونکر بات کریں کہ وہ ابھی پنگوڑے میں ہے اور بچہ ہے۔

"بچہ بولا۔ میں بندہ ہوں اللہ کا۔ مجھے اس نے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے" اور بنایا ہے مجھے برکت والا جس جگہ میں ہوں اور حکم دیا ہے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا جب تک میں زندہ رہوں اور (تاکید کی ہے) اچھے سلوک کی اپنی ماں سے۔ اور نہیں بنایا مجھ کو مغرور اور شقی اور سلامتی ہوئی مجھ پر جس روز پیدا ہوا۔ جس روز مجھے موت آئے گی اور جس دن میں دوبارہ جلایا جاؤں گا۔

"اور یہ ہے عیسیٰؑ ابن مریم کا صحیح اور سچا احوال۔ جس کے متعلق وہ (تجھ سے) جھگڑتے ہیں"

تیسری سورۃ (اس سورۃ کا عنوان "آل عمران" یا عمران کی اولاد ہے۔ لیکن ان عمران کا ان سے کوئی تعلق نہیں جنہیں حضرت محمدؐ[2] حضرت مریم کا والد کہتے ہیں۔ ان آیات کے مخاطب یہودی اور عیسائی ہیں)

یا اھل الکتاب لم تحاجون فی ابراھیم .... اولا تعقلون	اے اہل کتاب کیوں جھگڑتے ہو ابراہیمؑ[1] کے متعلق توریت اور انجیل تو اس کے بعد اتریں۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے

(رکوع ۷)

---

[1] یہودی اور عیسائی حضرت ابراہیم کے متعلق جھگڑتے تھے یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم یہودی تھے اور عیسائی کہتے تھے کہ وہ عیسائی تھے۔ چنانچہ ان قرآنی آیات میں معاملہ صاف کر دیا گیا۔

[2] مراد قرآن۔

..... فلم تحاجون فیما لیس لکم بہٖ علم ط واللہ اعلم و انتم لاتعلمون ہ (رکوع ۷)

اب کیوں جھگڑتے ہو جس کے متعلق تمہیں خبر نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

ماکان ابراھیم یہودیاً وّ لانصرانیاً....... واللہ ولی المومنین ہ (رکوع ۷)

ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ تو سب کچھ چھوڑ کر صرف مسلم تھے اور نہ تھے شرک والے لوگوں میں زیادہ مناسبت ابراہیم سے اُن کو تھی جو اس کا اتباع کرتے تھے۔ اور اس نبی کو اور ایمان والوں کو۔ اور اللہ والی ہے مسلمانوں کا۔

دوسری سورۃ :- (یہ اقتباس اس طویل ترین اور مشہور سورۃ سے ہے جس کا عنوان البقرہ ہے۔ یہ آیات مذہب میں ظاہری رسوم کو غیر ضروری قرار دیتی ہیں۔ ان کا فوری تعلق بیت المقدس کی بجائے کعبہ کو قبلہ قرار دینے سے ہے)

لیس البرّان تولّوا وجوھکم قبل المشرق........ واولٰئک ھُمُ المتقوُن ہ (رکوع ۲۲)

نیکی یہی نہیں کہ منہ کرلو اپنے مشرق کی طرف یا مغرب کو۔ لیکن اصل نیکی وہ ہے کہ ایمان لائے اللہ پر آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور نبیوں پر اور دے مال اس کی محبت میں ناتے والوں کو، یتیموں کو، محتاجوں کو اور راہ کے ضرورتمند مسافر کو اور مانگنے والوں کو اور غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے اور قائم کرے نماز اور ادا کرے زکوٰۃ اور پورا کرنے والا ہو اپنے عہد اور اقرار کا اور ٹھیرنے والا تکلیف اور سختی میں اور لڑائی (جہاد) میں یہ وہی لوگ ہیں جو سچے ہیں۔ اور وہی ہیں جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔

ساتویں سورۃ :- اس کا عنوان الاعراف ہے۔ اس سورۃ کے شروع میں شیطان

کا جنت سے نکالے جانے اور حضرت آدمؑ وحوا کا آسمان سے زمین پر اتارے جانے کا ذکر ہے۔

فوسوس لھم الشیطٰن یبدی لھما ماوری ....
قال فیھا تحیون وفیھا تموتون ومنھا تخرجون ۝

(سورہ اعراف رکوع ۲)

پھر بہکایا ان کو شیطان نے تاکھولے ان کو جو ڈھکے تھے ان سے ان دونوں کے عیب۔ وہ بولا تم کو تمہارے رب نے اس درخت سے اس لئے منع کیا ہے تاکہ تم نہ ہوجاؤ فرشتے یا ہوجاؤ ہمیشہ جینے والے۔ اور اس (شیطان) نے ان کے سامنے قسم کھائی کہ میں تمہارا بھلا چاہنے والا ہوں پھر بہکایا ان کو فریب سے۔ پھر جب چکھا دونوں نے درخت کھل گئے اُن پر اُن کے عیب اور لگے ڈھانپنے اپنے جسم بہشت کے پتوں سے اور پکارا ان کو ان کے رب نے۔ میں نے منع نہ کیا تھا تم کو اس درخت سے اور کہا نہ تھا کہ تم کو کہ شیطان تمہارا دشمن ہے صریح۔ وہ بولے اے رب ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر اور اگر تو نہ بخشے ہم کو اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ہوجائیں گے نامراد اور تباہ حال۔ حکم ہوا تم اُترو یہاں سے۔ آج سے تم ایک دوسرے کے دشمن ہوئے۔ تم کو زمین پر ٹھہرنا ہے اور رہنا ہے ایک مدت تک اور کہا تم جیوگے اسی میں اور اسی میں تم مروگے اور اسی سے تم دوبارہ اٹھائے جاؤگے۔"

چوبیسویں سورۃ:۔ اس کا نام سورہ نور ہے۔ نیچے دی ہوئی تین آیتوں سے عربی زبان کا شاندار زیروبم دکھانا مقصود ہے۔)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

والذین کفروا اعمالھم کسراب
بقیعۃٍ یحسبہُ الظمآن ماءً ط
حتیٰ اذا جاءَہٗ لم یجدہُ شیئاً و
وجدَ اللہ عندہٗ فوفّٰہُ حسابہٗ ط
واللہ سریعُ الحساب لا (رکوع ۵)

اور جو لوگ منکر ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے
صحرا میں سراب کہ پیاسا جانے اس کو پانی یہاں
تک کہ جب پہنچا اس پر اس کو کچھ نہ پایا اور اللہ کو
پایا اپنے پاس پھر اس کو پہنچا دیا اس کا حساب
اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

او کظلماتٍ فی بحرٍ لجّیٍ یغشٰہُ
. . . .
نوراً فمالہٗ من نورٍ ہ
(رکوع ۵)

یا جیسے اندھیرے گہرے سمندر میں چڑھی آتی
ہے ایک لہر دوسری لہر پر۔ اس پر گہرے بادل
کے اندھیرے ہیں۔ ایک پر ایک۔ اور جب کوئی
نکالے اپنا ہاتھ تو وہ اسے سجھائی نہ دے اور جس
کو اللہ نے نہ دی روشنی اس کو کہیں نہیں روشنی۔

الم تر انّ اللہ یزجی السحاباً
. . . .
یذھب بالابصار ہ
یقلب اللہ الیل والنہار ط
انّ فی ذالک لعبرۃً لاولی
الابصار ہ
(رکوع ۶)

کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ ہانک لاتا ہے بادل پھر
ان کو ملاتا ہے۔ پھر ان کو رکھتا ہے تہ بر تہ۔ پھر تو
دیکھے مینہ نکلتا ہے۔ اس کے بیچ سے اور اتارتا ہے
آسمان سے اس میں جو پہاڑ ہیں اولوں کے۔ پھر وہ
ڈالتا ہے جس پر چاہے اور بچا دیتا ہے جس کو چاہے
ابھی اس کی بجلی کی کوندے جاوے آنکھوں کی
روشنی۔ اللہ بدلتا ہے رات اور دن۔ اس میں
عبرت ہے عقل والوں کے لئے۔

خیال ہے کہ ان چند منتخب اقتباسات[1] سے قرآن کے بہت سے مختلف مضامین اور موضوعات

---

[1] مصنف نے قرآن کی مندرجہ بالا آیات پکتھال PICKTHAL اور روڈویل RODWELL
کے انگریزی تراجم سے لی ہیں۔

کے متعلق کچھ نہ کچھ پتہ چل گیا ہوگا۔ اور اس سے حضرت محمدؐ کی افتادِ طبع کا بھی کچھ اندازہ ہو جانا چاہئے۔ یہ بات بڑی حیران کن معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ یہ سب کچھ کس طرح جانتے تھے۔ یہ سب کچھ آپؐ کے ذہن میں کس طرح آیا اور ایسی غنائیہ اور مقفیٰ نثر لکھنا آپؐ نے کہاں[1] سے سیکھا۔

حضرت محمدؐ کی پرورش، آپؐ کا ماحول اور آپؐ کے ابتدائی مشاغل اس کتاب میں بیان کئے جا چکے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بات بھی اس کی نشان دہی نہیں کرتی کہ آپؐ کسی وقت ایک مذہبی اور اخلاقی قوانین کے صحیفے، قدیم مذہبی عقائد اور انبیاء اور گزری قوموں کے قصص کے ایک مجموعے اور عبادات کی ایک کتاب کے مصنف[2] ہوں گے۔ اور پھر یہ سب کچھ ایک بڑی دلکش زیر و بم رکھنے والی اور گونج دار عربی میں ہوگا۔ غالباً یہ سب کچھ الہامی تھا۔

حضرت محمدؐ فرمایا کرتے تھے کہ قدرت کے خزانے میں ان سے بھی زیادہ بڑے معجزے ہیں جو اب تک دکھائے جا چکے ہیں۔ اور قرآن خود ایک معجزہ ہے۔ غالباً آپؐ صحیح فرماتے تھے۔ انجیل بہت سے لوگوں کی کوششوں سے لکھی گئی اور ایسا کرنے میں انہیں صدیاں لگ گئیں۔ لیکن حضرت محمدؐ نے قرآن تن تنہا[3] لکھا اور ایسا کرنے میں آپؐ کو صرف بیس سال لگے۔

حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد لوگ حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کرتے تھے: "ہمیں رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کے متعلق کچھ بتائیں۔"

حضرت عائشہؓ کا جواب ہوتا: "آپ لوگوں کے پاس قرآن ہے۔ کیا آپ لوگ عرب نہیں اور عربی پڑھنا نہیں جانتے۔"؟

---

[1] [2] [3] بعض مسلمانوں کی طرح مصنف کا بھی یہ خیال ہے کہ وحی کے نزول کے بعد آنحضور اسے اپنے الفاظ میں لکھا دیا کرتے تھے لیکن اسلامی عقائد کی رو سے قرآن خالص الہامی صحیفہ ہے۔ رسول اللہ نے خود نہیں لکھا بلکہ جو وحی اور احکامِ الٰہی جبرئیلؑ لاتے تھے آپؐ اسے من و عن فوراً لکھا دیتے تھے۔ قرآن اور حدیث کی زبان اور اندازِ بیان میں فرق اس کا ایک بڑا ثبوت ہے۔ سورہ والنجم میں قرآن خود کہتا ہے: "وما ینطق عن الھوٰی ۝ ان ھو الا وحی یوحیٰ ۝" یعنی رسول اللہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کہتے مگر وہی جو حکم انہیں پہنچتا ہے۔

وہ کہتے "جی ہاں - درست ہے" آپ فرماتیں "تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو - کیونکہ قرآن ہی رسول اللہؐ کا اسوہ حسنہ ہے"

حضرت محمدؐ کے کردار کا تجزیہ کرنے، آپؐ کی کامیابی کا صحیح اندازہ لگانے اور آپؐ کی فوری اور صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو سمجھنے کے لئے قرآن کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

سولہواں باب

صلح حدیبیہ

(۶۲۸ عیسوی)

حضرت محمدؐ کو مکّہ سے ہجرت کیے ہوئے چھ سال گزر چکے تھے۔ ہجرت کے وقت آپؐ کی حیثیت ایک بے خانماں اچھوت کی سی تھی اور آپؐ یہ گمان بھی نہیں کر سکتے تھے کہ آپؐ زندہ بھی رہ سکیں گے لیکن اب آپؐ عرب میں نسبتاً ایک اہم شخصیت شمار ہوتے تھے۔ مدینہ اب آپؐ کا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے قبیلے جو ارد گرد کے علاقوں میں اپنے جانور چراتے تھے آپؐ کو اپنا حاکم تسلیم کرتے تھے۔ البتہ بعض قبائل نے ابھی تک ایک مرکزی حکومت کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے کی عرب ذہنیت قائم رکھی ہوئی تھی۔ کچھ قبیلے ابھی تک مخالف تھے اور معاندانہ کارروائیاں کرتے رہتے تھے اور ایسے سب قبیلوں کے ساتھ حضرت محمدؐ نے ایک ہی حکمت عملی اختیار کی ہوئی تھی یعنی طاقت۔ اب آپؐ کے پاس گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ایک مختصر سی لیکن تیزی سے نقل و حرکت کرنے والی فوج بھی تھی۔ مخالفین اس بات سے واقف تھے اور وہ اپنی معاندانہ کارروائیوں کو "مارو اور بھاگو" والے حملوں تک ہی محدود رکھتے تھے۔

۶۲۷ء کی خزاں میں اس قسم کے دو حملوں کے سبب حضرت محمدؐ کی شہرت اور وقار کو کافی نقصان پہنچا تھا۔ پہلے میں عینیہ بدوؤں کے سردار نے مدینہ کے نخلستان پر حملہ کرنے کی جرات کی اور حضرت محمدؐ کی دودھ دینے والی ذاتی اونٹنیوں کے ایک گلّے کو گھیر لیا تھا۔ انھوں نے چرواہوں کو مار دیا اور عورتوں کو اٹھا کر لے گئے۔ گو حضرت محمدؐ نے تین سو سواروں کو تعاقب میں بھیجا لیکن لوٹے ہوئے مال میں سے صرف نصف ہی واپس مل سکا اور وہ حملہ آوروں کے خلاف کوئی

موثر انتقامی کارروائی بھی نہ کر سکے۔ دشمن کے اس حملے میں صرف ایک فرد بچا جس نے اس واقعہ کی روداد سنائی۔ وہ ایک چرواہے کی بیوی تھی اور کسی نہ کسی طرح اپنے اونٹ سمیت بچ کر نکل آئی تھی۔ جب وہ گھر پہنچی تو اس نے شکرانے کے طور پر اپنے اونٹ کو قربان کرنا چاہا۔ حضرت محمدؐ نے منع کیا اور کہا کہ وہ اس اونٹ کو کیوں ذبح کرتی ہے جس نے اس کی جان بچائی۔ عورت یہ بات نہیں جانتی تھی۔ چنانچہ اونٹ کی جان بچ گئی۔

حضرت محمدؐ جانوروں کی قدر کرتے تھے۔ گو آپؐ مقررہ اوقات پہ قربانی دیتے تھے لیکن آپؐ صرف مارنے کی خاطر مارنا پسند نہ کرتے تھے اور زندہ جانوروں کو تکلیف دینا بہت برا سمجھتے تھے۔ قربانی دنیا کی ایک بڑی پرانی رسم تھی جسے نئے دین سے خارج نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے ہوتے ہوئے بھی حضرت محمدؐ اس کے متعلق دکھاوے اور ریاکاری کے قائل نہ تھے۔ جانور کو آخری ضرب لگانے سے پہلے رسمی کلمے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی بجائے آپؐ نے الفاظ اس طرح بدل دیئے "بسم اللہ۔ اللہ اکبر۔ اللہ تعالیٰ تجھے صبر عطا فرمائے اس تکلیف پہ جو اس نے تیرا مقدر کر دیا ہے۔"

آپؐ نے یہ اصول بنا دیا کہ آپؐ کے اپنے جانوروں اور دوسرے ان جانوروں سے بھی جو آپؐ کی خدمت میں ہوں برا برتاؤ نہ کیا جائے۔ بڑی مشکل سے آپؐ نے اونٹ کو اس کے مالک کی قبر سے باندھ کر مرنے کے لئے چھوڑ دینے کی رسم کو ختم کیا۔ زندہ پرندوں کو نشانہ بازی کی مشق کے لئے استعمال کرنا بھی ممنوع قرار دے دیا۔ اسی طرح آپؐ نے اس مکھیوں کی بہتات والے ملک میں گھوڑوں کی ایال اور دُمیں کاٹنے سے بھی منع فرمایا۔ جب کبھی آپؐ لوگوں کو گدھوں اور خچروں پر ضرورت سے زیادہ بوجھ لادے دیکھتے تو آپؐ انہیں گرفتار کر لیتے۔ البتہ کتا ایک ایسا جانور تھا جسے آپؐ پسند نہ کرتے تھے اور غالباً یہ صحیح بھی تھا کیونکہ صحرا کے کتے کھجلے اور وحشی جانور ہوتے ہیں جنہیں کوئی پالنا پسند نہیں کرتا۔

آپؐ نے ایک فاحشہ کا قصہ سنایا۔ اس کا گزر ایک کنوئیں کے پاس سے ہوا ایک کتا پیاس سے مر رہا تھا۔ اس عورت نے اپنا ایک جوتا اتارا اور اپنے پٹکے یا کمر بند کے سرے سے باندھ کر کتے کے لئے پانی نکالا۔ اس نیکی کے سبب اس کے گناہ معاف کر دئے گئے۔

حضرت محمدؐ نے فرمایا یہ سچ ہے کہ چوپایوں سے اچھا برتاؤ کرنے اور انہیں پانی پلانے کا بھی

ثواب ملتا ہے۔ اسی طرح ہر زندہ جانور سے اچھا سلوک کرنے کا بھی ثواب ہے۔

قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ کی نظر میں جانوروں اور انسانوں کی جانیں ایک ہی جیسی ہیں۔ قرآن کہتا ہے "کوئی جانور بھی روئے زمین پر ایسا نہیں اور نہ ہی کوئی ایسا پرندہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ایسی ہی مخلوق نہ ہو جیسا انسان، اور سب کو اپنے خالق کی طرف لوٹ جانا ہے"

اور جب بھی کہیں کوئی مسلمان کسی بیمار جانور سے کام لیتا نظر آجاتا ہے تو دس میں سے نو صورتوں میں وہ کسی ایسے علاقہ کا باشندہ ہوتا ہے جس پر کسی مغربی طاقت کی حکومت ہوتی ہے۔ یعنی جہاں پر اسلام دب کر رہ گیا ہے ورنہ ایک سچا عرب اپنے گھوڑے اور اونٹ کا اتنا ہی خیال رکھتا ہے جتنا اپنے کنبے کے افراد کا۔ اس میں کچھ منفعتی پہلو بھی ہے لیکن زیادہ تر بے زبان جانوروں کی طرف اس طبعی میلان کا اثر ہے جو اس نے بانی اسلام سے ورثہ میں پایا ہے۔

اپنے لوگوں کے لئے حضرت محمدؐ کے پسندیدہ احکام میں سے ایک یہ تھا "ان بے زبان جانوروں کے متعلق خدا سے ڈرتے رہو اور ان پر صرف اس وقت سواری کرو جب یہ سواری کے قابل ہوں اور جب وہ تھک جائیں تو ان پر سے اتر آؤ"

دوسرا حملہ جس سے حضرت محمدؐ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے متزلزل ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، غطفانیوں نے کیا جو ایک بار مدینہ کے محاصرے (جنگ خندق) میں آپؐ کے خلاف حصّہ لے چکے تھے۔ اس مرتبہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت پر بے خبری میں حملہ ہوا۔ مسلمانوں کو شکست ہو گئی اور بہت سے مارے گئے۔ اس دفعہ بھی جوابی کارروائی محدود رہی اور صرف جانوروں کے ریوڑ، خیمے اور گھریلو سامان ہی ہاتھ آیا اور دشمن کا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔

قبیلوں کا ایک دوسرے پر حملہ کرنا عرب کی ایک ایسی رسم تھی جو حضرت محمدؐ سے بہت پہلے سے رائج تھی اور بہت بعد تک جاری رہی اور اب بھی جاری ہے (مصنف کے قیام کے دوران پہلی جنگ عظیم کے بعد) اور یہ صرف اس وقت رکتی ہے کہ یا تو کوئی کافر حملہ کر دے یا پھر حملہ آور بیرونی ہو۔ بہر حال اس وقت تو وہ متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں اور اسے نکال دیتے ہیں لیکن اس کے فوراً بعد وہ از سر نو پھر اپنے حملے شروع کر دیتے ہیں۔ بظاہر یہ ایک بڑی غیر معقول بات ہے اور ایک دوسرے کی چیزیں چرانے یا چھین لینے کے مترادف ہے

لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ ان کی روزی کا ایک ذریعہ ہے اور اب بھی جاری ہے۔

ستمبر ۶۲۷ء میں مکہ اور مدینہ والوں میں ایک مرتبہ پھر جھڑپ ہو گئی۔ یہ خیال کر کے کہ حضرت محمدؐ اپنے مقامی جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اہل قریش نے ایک بہت زیادہ مال و متاع والا تجارتی کارواں ساحل کے ساتھ ساتھ شام کی طرف روانہ کیا۔ حضرت محمدؐ کو بھی پتہ چل گیا۔ ایک شکاری عقاب کی طرح آپؐ کا ایک طوفانی دستہ اہل مکہ پر جا پڑا اور بڑی مقدار میں چاندی اور بہت سے اونٹ لے کر مدینے لوٹا۔ قیدیوں میں آپؐ کا داماد ابوالعاص بھی تھا۔

خیال رہے کہ ابوالعاص جنگ بدر میں بھی قیدی بن چکا تھا اور اپنے زرفدیہ کے طور پر اپنی بیوی زینبؓ (حضرت محمدؐ کی صاحبزادی) کو مدینے بھیجنا پڑا تھا۔ زیدؓ (بن حارثہ) مکہ جا کر زینبؓ کو لے آئے تھے۔ لیکن مکہ سے روانہ ہونے سے قبل بعض اہل قریش نے، جن کے دل میں بدر کی شکست ابھی کھٹک رہی تھی، ان سے کچھ بدسلوکی کی تھی جس سے ان کا اسقاط ہو گیا تھا۔ حضرت زینبؓ اس کے بعد صحیح طور پر کبھی نہ پنپ سکیں۔ اس کے بعد سے وہ اپنے والد کی سرپرستی میں تھیں۔ اب ساڑھے تین سال بعد ابوالعاص ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہو گیا تھا۔

گو ابوالعاص ابھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا لیکن رشتہ داریوں کا تقاضا تھا کہ اسے مسلمان ہو جانا چاہئے تھا۔ حضرت محمدؐ کے داماد ہونے کے علاوہ حضرت خدیجہؓ اس کی خالہ بھی تھیں۔ اور اس رشتہ سے وہ آپؐ کا بھانجا بھی لگتا تھا۔ بعد میں وہ رشتہ میں اور قریب آ گیا یعنی اس کی لڑکی حضرت علیؑ کی دوسری بیوی بنیں اور یہ کہ وہ مذہب کے معاملے میں اختلاف رکھتا تھا۔ اس کا سبب وہی تھا جو اکثر خاندانوں میں ہوتا ہے لیکن اس اختلاف کے باوجود اس نے اپنے دوہرے رشتہ دار یعنی خالو اور خسر (حضرت محمدؐ) کی عزت و تکریم میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔

جس رات مسلمان حملہ آور مال غنیمت اور قیدیوں کے ساتھ مدینے لوٹے ابوالعاص کسی نہ کسی طرح قید سے باہر نکل آیا اور حضرت زینبؓ تک پہنچ گیا۔ وہ اپنے شوہر کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ انہیں گھر آنے پر خوش آمدید کہا اور دوسری صبح کو اپنی چھت پر چڑھ کر اعلان کر دیا کہ وہ اپنے قیدی شوہر کو پناہ دے رہی ہیں۔ حضرت محمدؐ کو اعلان سننے پر ہی اس واقعہ

کا پتہ چلا۔ بلا تامل آپؐ نے اس معاملہ کو مسجد میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔ ہر ایک ابو العاص کو آزاد کرنے پر متفق ہو گیا۔ مسلمانوں کی اس فراخدلی سے ابو العاص اتنے متاثر ہوئے کہ وہ اپنے معاملات نمٹانے کے لئے مکہ گئے اور فارغ ہو کر مدینہ واپس آ گئے جہاں وہ مسلمان ہو گئے۔ البتہ زینبؓ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں جن کی وفات کا حضرت محمدؐ اور ان کے شوہر کو بہت صدمہ ہوا۔ بایں ہمہ آپؐ کو اس بات سے ضرور سکون تھا کہ حضرت خدیجہؓ کا ایک عزیز آپؐ کے پاس تھا اور ان کے مسلمان ہو جانے نے اس زنجیر میں ایک اور کڑی کا اضافہ کر دیا تھا جو آپؐ قریش کے گرد آہستہ آہستہ تنگ کر رہے تھے۔

یہ اس سال کے اواخر کا ذکر ہے کہ ہم پہلی مرتبہ حضرت محمدؐ کے بیرون عرب ممالک میں سیاسی سفارتیں بھیجنے کا ذکر سنتے ہیں۔ آپؐ نے ایک سفیر کو دوستانہ پیغام لے کر بازنطینہ کے رومن شہنشاہ ہرقل HERACLIUS کے دربار میں بھیجا۔ البتہ آپؐ کا سفیر شام سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کیونکہ رومن گورنر نے اس کا وہاں پر ہی ایک سفیر کی شان کے مطابق استقبال کیا اور تحائف دے کر وہاں ہی سے واپس کر دیا۔ گورنر یہ سمجھ نہ سکا کہ وہ سفیر کس کی نمائندگی کر رہا تھا اور نہ ہی وہ ایک لمحہ کے لئے یہ خیال کر سکا کہ وہ دن دور نہیں جب اس کے شہنشاہ کو بھی اس غیر معروف عرب کی خدمت میں سفارتیں اور وفود بھیجنے پڑیں گے۔ لیکن آپؐ کے سفیر کی عزت و تکریم نے حضرت محمدؐ کو مطمئن کر دیا۔ کیونکہ یہ اس بات کا کھلا اظہار تھا کہ آپؐ اس چھ سال کے عرصہ میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے تھے۔

اور غالباً یہ اندازہ کر لینے کے بعد کہ آپؐ کی قسمت آپؐ کو کس بلندی پر لے جانے والی تھی آپؐ نے اس معاملہ پر بڑی سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا جو کچھ دیر سے آپ کے زیر غور تھا۔ یعنی فتح مکہ۔

ہجرت کا چھٹا سال قریب الختم تھا لیکن اپنے جدی شہر مکہ کو کسی ترغیب سے جیت لینے کی توقع تاحال اتنی ہی دور تھی جتنا پہلے تھی۔ لڑائی بھڑائی اور حملوں نے مسلمانوں اور اہل قریش کے درمیان اختلافات کو اور سنگین بنا دیا تھا۔ ابو سفیان اب بھی حضرت محمدؐ سے دشمنی اور اسلام کی مخالفت میں اتنا ہی سخت تھا جتنا کہ وہ مسلمانوں کو ایذائیں پہنچانے کے دور میں تھا۔ اس

میں ہندؔ (اس کی بیوی) خالد بن ولید، عکرمہ بن ابوجہل اور عمرو بن العاص اور دوسرے تمام قریش اکابر اس کے معاون تھے۔ دوسری متبادل صورت یہ تھی کہ تمام ذرائع فوج پر لگا دیئے جائیں اور مکہ کو بزور شمشیر فتح کر لیا جائے لیکن اگر اس میں کامیابی ہو بھی جائے تب بھی مقدس شہر کو تباہ کرنا آپؐ کی فطرت کے خلاف تھا اور ایسی فتح شاید مستقل فتح بھی ثابت نہ ہو۔ لے دے کر صرف ایک ہی حل رہ جاتا تھا اور وہ یہ کہ صلح کر لی جائے لیکن اس کے لئے باعزت طریقہ کیا ہو۔ ایسا کیونکر کیا جائے۔ پھر حضرت محمدؐ کے ذہن میں ایک نہایت اچھی تدبیر آئی کہ کیوں نہ اپنی سپاہ کو بغیر ہتھیاروں کے لے کر کعبہ کے لئے حج میں شرکت کی جائے۔ اور اگر حرمت کے مہینوں میں ایسا کیا جائے تو حملہ کیا جانے کا سوال بھی نہیں پیدا ہوتا تھا اور شاید اس طرح کسی فریق کے ہتھیار ڈالے بغیر مکہ واپس لیا جا سکے۔[1]

جونہی آپؐ نے اس تجویز کے متعلق فیصلہ کر لیا آپؐ نے اپنے جرنیلوں سے اس کا ذکر کیا۔ ان کا ردعمل متفقہ طور پر تجویز کی موافقت میں تھا۔ پھر آپؐ نے کچھ مقامی قبیلوں کو بھی شامل کر لینے کا خیال ظاہر کیا۔ صرف چند لوگ ہی ساتھ دینے پر آمادہ ہوئے ورنہ اکثریت نے محتاط رویہ اختیار کیا اور شامل نہ ہوئے۔ اگر غنیمت ملنے کی توقع ہوتی تو شاید ضرور ساتھ دیتے لیکن یہ لوٹ مار کرنے والی جماعت نہ تھی۔

فروری ۶۲۸ عیسوی تک سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ پندرہ[2] سو زائرین قاعدے

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ ایک دن علی الصبح آنحضرت صلعم نے اصحاب کو تازہ بشارت سے آگاہ کیا اور فرمایا کہ ہم عنقریب انشاء اللہ اپنے سروں کے بال منڈوا کر امن و سلامتی سے بلا خوف و خطر حرم کی حدود میں داخل ہوں گے چنانچہ آپؐ نے ذی قعد کے مہینہ میں عمرے کیلئے تیاری کی۔ احرام باندھا اور قربانیوں کے جانور ساتھ لئے۔ آپؐ ذی قعد میں روانہ ہوئے اور ہجرت کا چھٹا سال قریب الختم تھا۔ (حیات محمدؐ) علامہ شبلی نے سیرۃ النبی میں لکھا ہے کہ اس خیال سے کہ قریش کو کوئی اور احتمال نہ ہو، آنحضورؐ نے حج کی بجائے عمرے کا احرام باندھا۔

[2] حیات محمدؐ۔ تاریخ طبری اور اکثر دوسری روایات کے مطابق تعداد ایک ہزار چار سو تھی۔ صرف کسی کسی نے پندرہ سو لکھا ہے۔

کے مطابق سفید کپڑے کی دو بے سلی چادروں میں ملبوس اپنے اونٹوں سمیت مدینہ کے باہر جمع ہو گئے۔ ان کے پاس نیام[1] شدہ تلواریں اور تیر و کمان تو تھے لیکن وہ جنگ کے لئے مسلح نہ تھے اس سلسلہ میں آپؐ نے صرف ایک ہی احتیاطی قدم اٹھایا اور وہ یہ تھا کہ آپؐ نے بیس سواروں کا ایک جاسوسی دستہ جائزہ لینے کے لئے آگے بھیج دیا تھا تاکہ دشمن کی طرف سے کسی رکاوٹ یا خلل اندازی کا خطرہ ہو تو وہ خبردار کر دیں۔ حضرت عائشہؓ یا حفصہؓ اس مہم میں آپؐ کے ساتھ نہ تھیں۔ زائرین کے اس قافلے میں آپؐ کی ازواج میں سے صرف حضرت اُمّ سلمہؓ ہمراہ تھیں۔

دیکھنے میں یقینی طور پر یہ ایک بڑا شاندار نظارا ہوگا۔ کہ بے شمار لوگ مدینہ کے جھولتے ہوئے کھجوروں کے سامنے جمع تھے۔ ان میں مکہ کے مہاجرین بھی تھے جو اسلام کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ آئے تھے اور اس میں وہ مدینے والے بھی تھے۔ جنہوں نے ایک نصب العین کی خاطر اتنا بڑا ایثار کیا تھا۔ اپنے برف جیسے رسوماتی لباس (احرام) میں وہ صف در صف اونٹوں پر تن کر بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی زرہ یا خود دھوپ میں نہیں چمک رہا تھا۔ بلکہ تلواریں بھی ہر شخص کی بائیں ران[2] کے نیچے چھپی ہوئی تھیں۔ مجمع کے ایک بازو کی طرف ستر بے سوار اونٹ تھے۔ یہ سب قربانی کے جانور تھے اور رسم کے مطابق ان کی گردنوں میں ہار پڑے ہوئے تھے۔ ان قربانی کے اونٹوں میں ستم ظریفی کے طور پر ابوجہل کی وہ اونٹنی بھی تھی جو بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کے ہاتھ لگی تھی۔

حضرت محمدؐ نے اپنی سانڈنی القصوہ کی پشت پر سوار ہو کر صفوں میں گشت کیا یہ وہی القصوہ تھی جو آپؐ کو مصائب کے اس دور میں مکہ سے مدینہ لائی تھی۔ جب آپؐ کی حفاظت کے لئے آپ کے صرف ایک پرانے وفادار دوست ہی ساتھ تھے۔ اب اس مجمع میں بہت سے نئے چہرے تھے۔ لیکن ایسے بھی تھے جو اسلام کے آغاز میں ہی ایمان لے آئے تھے۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ، قوی الجثہ

---

[1] تلوار رکھنے کی ہر مسافر کو اجازت تھی تاکہ اپنی حفاظت کر سکے۔ نیام شدہ تلوار جنگی ہتھیاروں میں شمار نہ ہوتی تھی اس قافلے میں کسی کے پاس تلوار کے سوا اور کوئی ہتھیار نہ تھا۔ دوسرے مورخین نے بھی یہی لکھا ہے

[2] جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے تلوار رکھنے کی عام اجازت تھی اس لئے اسے ران کے نیچے چھپانے کا سوال نہ تھا مصنف نے اس سلسلہ میں کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ (مترجم)

عمرؓ، حضرت عثمانؓ، شیر عرب علیؓ، حضرت زیدؓ اور حضرت بلالؓ اور غزوات بدر، احد اور خندق کے نبرد آزما۔ ان لوگوں کی طرف حضرت محمدؐ خاص طور پر بڑے فخر سے دیکھتے تھے کیونکہ یہ انہی کی بدولت تھا کہ آپؐ کے سامنے آج یہ بڑا مجمع یہ ثابت کر رہا تھا کہ آپؐ کی تبلیغ رائیگاں نہیں گئی۔

سفر کی ابتدائی منزلیں بغیر کسی واقعہ کے گزر گئیں۔ ذوالحلیفہ[1] کے مقام پر ایک لمبا قیام کیا۔ تاکہ زائرین غسل وغیرہ سے فارغ ہو لیں۔ پھر آپؐ روانہ ہو گئے اور چند روز بعد لبیک اللّٰھم لبیک (میں حاضر ہوں۔ اے اللہ میں حاضر ہوں) کی تلبیہ بلند آواز سے کہتے ہوئے آپؐ مقدس سرزمین میں داخل ہو گئے۔ جس نے مکہ کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔

اس مرحلہ پر یہ پرامن ماحول مکدر ہو گیا۔ خبر آئی کہ حضرت محمدؐ کے دعوے کتنے ہی پرامن کیوں نہ ہوں۔ اہل قریش ان پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہیں علاوہ ازیں یہ کہ خواہ حضرت محمدؐ اپنے عزائم میں پرخلوص ہی کیوں نہ ہوں ابوسفیان نے یہ طے کر لیا تھا کہ آپؐ کو یا آپ کے ساتھیوں کو کسی صورت میں بھی مکہ میں داخل نہیں ہونے دے گا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابوجہل کو مکہ کے لڑاکا سوار[2] رسالے کے ساتھ جنگ کے لئے مسلح کر کے شہر سے باہر بھیج دیا گیا ہے۔

آپؐ نے جلدی سے ایک فیصلہ کیا۔ جہاں آپؐ کا اہل قریش سے لڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا وہاں آپؐ اس مہم کو ترک کرنے والے بھی نہیں تھے۔ اندھیرا ہوتے ہی آپؐ نے اصل راستہ چھوڑا اور اپنے لوگوں کو لے کر ایک سخت ناہموار پہاڑی راستے سے روانہ ہوئے ——— اور حدیبیہ کے مقام پر خالد کے لشکر کے عقب میں دوبارہ اصل راستے پر ایسی جگہ نکل آئے جو مکہ سے[3] تین میل

---

[1] ذوالحلیفہ۔ مدینہ منورہ سے چھ یا سات میل کے فاصلے پر مکہ کی طرف ہے۔ طبری نے لکھا ہے کہ ذوالحلیفہ کے مقام پر حضرت عمرؓ نے آنحضورؐ کو مشورہ دیا کہ دشمن کے علاقہ میں بغیر ہتھیاروں کے جانا مناسب نہیں۔ چنانچہ مدینہ سے مزید تلواریں، تیر کمان اور جانور منگا لئے گئے۔ جو لشکر سے علیحدہ اور پیچھے رہے۔ مدینہ سے حج کے لئے جانے والے لوگ۔ یہاں سے ہی احرام باندھتے ہیں۔ (نقشہ ۱۳)

[2] خالد بن ولید کے رسالے کی تعداد دو سو سوار تھی۔

کے فاصلہ[1] پر تھا۔ یہاں آپؐ نے اپنا پڑاؤ ڈالا۔ یہاں پانی کی قلت تھی لیکن آپؐ کے لوگ ایسی مہمات کے عادی تھے۔ اس لئے انہوں نے جلد ہی بند کنوؤں کے گڑھوں کو کھود کر پانی نکال لیا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ وہاں جم گئے اور انتظار کرنے لگے کہ اب قریش آئندہ کیا قدم اٹھاتے ہیں۔

ہر شخص چوکنا اور مستعد تھا اور خالد اور ان کے رسالے کے دوبارہ آجانے کی صورت میں فوری کارروائی کے لئے ہمہ تن تیار تھا۔ بہر حال قریش نے جب یہ دیکھا کہ حضرت محمدؐ تو مکہ کے بالکل قریب ہی پہنچ گئے ہیں تو انہوں نے خالد کو واپس بلا لیا اور کچھ دنوں تک خاموشی رہی۔

حضرت محمدؐ کے سپاہیوں نے آپؐ کی ہدایات کے تحت گلے بانوں اور مقامی لوگوں کو بھی جو حدیبیہ پر صرف یہ دیکھنے نکل آئے تھے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے، یہ تاثر دیا کہ حضرت محمدؐ صرف عمرے کی نیت سے ہی مکے آئے تھے۔ جب قریش نے اس بیان میں صداقت محسوس کی تو انہوں نے یہ دریافت کرنے کے لئے کہ حضرت محمدؐ کے دل میں کوئی اور بات تو نہیں اپنے سفیر اور ایلچی بھیجنے شروع کر دیئے۔ آپؐ نے ان کے تمام شکوک کی نفی میں جواب دیا اور ہر ایک کے سامنے اپنے پرامن مقاصد دہراتے رہے۔

ابوسفیان کے داماد عروہ بن مسعود نے حضرت محمدؐ کو دھمکیاں دینے اور مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے آپؐ کے لوگوں کو حج کے لباس میں ہونے کا مذاق اڑایا اور انہیں یقین دلایا کہ اس کے خسر (ابوسفیان) کا اس بھیڑ و بنگاہ کو مکہ کی حدود میں داخل ہونے کی اجازت دینے کا کوئی خیال نہیں۔ درحقیقت وہ خود اتنا مشتعل ہو گیا تھا کہ اس نے حضرت محمدؐ کی داڑھی[2] پکڑ لی۔

لہ حدیبیہ جدہ روڈ پر مکہ سے کوئی سات آٹھ میل ہے۔ طبری نے لکھا ہے کہ آپ اس راستے سے حدیبیہ کے آخری سرے پر ثنیۃ المرار کے مقام پر نکل آئے تھے جو مکہ سے اتنا قریب تھا کہ خالد کے دستے کو مکہ کی حفاظت کیلئے واپس چلا جانا پڑا۔

(۲) باتوں کے دوران ایک دوسرے کی داڑھی کے ہاتھ لگانا یا اسے پکڑ لینا عرب کا دستور تھا لیکن یہاں معاملہ اختلاف اور اشتعال کا تھا۔ عروہ نے کئی مرتبہ مشتعل ہو کر آنحضورؐ کی ریش مبارک کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن مغیرہ بن شعبہؓ جو آپ کے قریب ہی کھڑے تھے ہر بار تلوار کے قبضہ سے اس کا ہاتھ جھٹک دیتے تھے اور کئی مرتبہ دھمکی دی کہ وہ اپنا ہاتھ ہٹالے ورنہ یہ ہاتھ پھر واپس نہیں جا سکے گا۔ عروہ مسلمانوں کی اس عقیدت اور جان نثاری سے بہت متاثر ہوا اور قریش سے جا کر کہا کہ وہ قیصر و کسریٰ کے دربار بھی دیکھ چکا ہے لیکن جو عقیدت و احترام رسول اللہ کا ہے وہ ان بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں۔ (سیرۃ النبی۔ حصہ اول)

خوف واستعجاب کی ایک چیخ بلند ہوئی اور سینکڑوں ہاتھ سفید کپڑوں کے نیچے چھپی ہوئی تلواروں تک پہنچ گئے۔ عروہ نے یہ دیکھا تو داڑھی چھوڑ دی اور جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ پھر وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر مکہ واپس چلا گیا۔

مکہ پہنچ کر اس نے حضرت محمدؐ کے بارے میں دوسرے ایلچیوں کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کی کہ آپؐ ان چند سالوں کے اندر اندر اتنے بدل گئے ہیں کہ آپؐ کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ اور یہ کہ مسلمانوں میں (نعوذ باللہ) اس بے وقعت مبلغ کی ایک شہنشاہ کی طرح عزت کی جاتی ہے۔ آپؐ دربار لگاتے ہیں اور یہ کہ اس صاف ذہن مدبر میں اُس بے یار و مددگار اور خوابوں کی دنیا میں بسنے والے اس شخص کی ذرا سی بھی مشابہت نہیں پائی جاتی جسے تھوڑے عرصہ پہلے مکہ سے نکال دیا۔

اس نے کہا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ (مسلمان) اس پانی کے ایک پیالے کے لئے کیوں جھگڑتے ہیں جس سے ان کے قائد نے غسل کیا ہو۔ وہ اسے پیتے ہیں اور زخموں پر لگاتے ہیں۔ ان کی نظروں میں ہر وہ چیز متبرک ہو جاتی ہے۔ جو حضرت محمدؐ کے جسم سے چھو جائے۔

جو کچھ عروہ نے بتایا واقعی ایسا تھا یا نہیں لیکن یہ یقینی بات ہے کہ یہ رسم حضرت محمدؐ کے خانوادے میں بعض لوگوں میں ابھی تک جاری ہے۔ آغا خان[1] کے غسل کا پانی مذہبی طور پر محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ پھر اسے بوتلوں میں بند کر کے دنیا کے تمام ممالک میں ان کے عقیدتمندوں کو بھیجا جاتا ہے۔ آغا خان خواہ لندن کے رٹز[2] میں غسل کریں یا نیویارک کے سینٹ رگیس[3] یا مونٹی کارلو[4] یا ریوڈی جنرو[5] میں ان کا صابن آلودہ پانی اسی طرح سے محفوظ کر لیا جاتا ہے جس طرح سے ۶۲۸ء میں حضرت محمدؐ کے غسل کا پانی۔

بہرحال ایک انسان کی اتنی قدر افزائی اور عزت اہل قریش کے لئے ایک اچنبھے کی بات تھی۔

---

[1] آغا خان، مسلمانوں کے اسمٰعیلی فرقہ کے امام اور مذہبی پیشوا۔

[2] [3] ہوٹلوں کے نام ہیں۔

[4] مونٹی کارلو۔ جنوبی فرانس کی چھوٹی سی آزاد ریاست جو سیر تفریح۔ جوئے خانوں اور عیش پرستی کا مرکز ہے۔

[5] ریوڈی جنرو RIO DE GENERIO جنوبی امریکہ کے بڑے ملک برازیل کا ایک مشہور شہر۔

[6] مونٹی کارلو۔ جنوبی فرانس کی چھوٹی سی آزاد ریاست مناکو کا شہر جو سیر تفریح جوئے خانوں اور عیش پرستی کا مرکز ہے۔

اور وہ اس سے بہت متاثر ہوئے۔ لیکن بایں ہمہ وہ آپؐ کے سامنے نہیں جھکے۔ وہ کچھ خوفزدہ ضرور تھے کہ نہ معلوم حضرت محمدؐ کیا کر گزریں لیکن زیادہ تر اس وجہ سے بھی نہیں جھکے کہ وہ ان کے سامنے اپنی بے عزتی اور سبکی نہیں چاہتے تھے۔ حضرت محمدؐ نے انہیں ہمیشہ مدینے سے دور رکھا اور جب انہوں نے آپؐ کے خلاف دس ہزار کا لشکر لے کر چڑھائی کی تھی تو ان کو بیوقوف بنایا چنانچہ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ آپؐ کو ایک ایسی جمعیت کے ساتھ مکہ میں داخل ہونے دیا جائے جو بظاہر تو غیر مسلح تھے لیکن حقیقت میں تو وہ فوج تھی۔

چنانچہ مسلمانوں کے لشکر میں ایک پیغام بھیجا گیا کہ اگر حضرت محمدؐ اس دفعہ واپس چلے جائیں تو وہ اگلے سال آکر عمرہ کر سکتے ہیں۔ حضرت محمدؐ نے جواب دیا کہ وہ اس تجویز کے متعلق بات چیت کرنے کے لئے تیار ہیں اور یہ کہ انہیں مزید تفصیلات بھی درکار ہیں۔ اس کے جواب میں بڑی تاخیر ہوئی اور ایک تعطل سا پیدا ہوگیا۔ کعبہ کے گرد اہل قریش بحث تمحیص میں مصروف تھے۔ کونسل کا کوئی زیادہ جوشیلا رکن کہہ اٹھتا کہ مکہ سے باہر نکل کر حضرت محمدؐ پر حملہ کرکے انہیں بھگا دیا جائے۔ لیکن جب ان کی نظریں ان پہاڑیوں کے دامن کی طرف جاتیں جہاں مسلمانوں کے پڑاؤ کی آگ روشن تھیں تو وہ سوچ میں پڑ جاتے۔ آخرکار اگلا قدم حضرت محمدؐ نے ہی اٹھایا۔

آپؐ نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ ایک وفد لے کر اہل قریش کے پاس جائیں۔ عمرؓ ہچکچائے۔ مکہ آپ کے دشمنوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور ان میں سے ہر ایک کے پاس کسی نہ کسی کے قتل کے قصاص کا بہانہ موجود تھا۔ بات حضرت محمدؐ کی سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو بلایا۔

حضرت عثمانؓ نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اول تو یہ کہ وہ کئی سال سے مکہ سے باہر تھے۔ اس سے پہلے کہ اصل جھگڑا شروع ہو وہ حبشہ کو ہجرت کر گئے تھے اور ان سے اہل قریش کا کوئی ذاتی یا مذہبی جھگڑا ابھی نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ خود بنی امیہ سے تعلق رکھتے تھے اور اس طرح ابوسفیان سے ان کی رشتہ داری بھی تھی۔ چنانچہ وہ بلا کسی حیل وحجت اور بڑی سادگی سے مکہ چلے گئے۔ جہاں ان کے رشتے کے ایک بھائی[1] ملے۔ اور ان کے ضامن بن گئے۔ بہرحال

---

[1] ان کا نام ابان بن سعید تھا۔ انہوں نے قریش کے سامنے اپنی شرائط پیش کرنے تک حضرت عثمان کو اپنی

وہاں جاکر ان کو معلوم ہوا کہ اہل قریش حضرت محمدؐ کے اس سال مکہ میں داخلے کے بیحد مخالف تھے۔ ادھر حضرت عثمانؓ بھی اسی طرح داخلے کے لیئے ضد پر اڑے ہوئے تھے اور اس طرح بات چیت طول پکڑ گئی اور کئی رات دن چلتی رہی۔

اس تاخیر سے پڑاؤ میں مسلمانوں میں تشویش شروع ہوگئی۔ جلدی ہی ایک افواہ اڑی کہ حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے۔ حضرت محمدؐ نے تمام حجاج کو جمع کیا اور ایک ببول کے پیڑ کے سایہ میں کھڑے ہو کر آپؐ نے سب سے حلف لیا کہ اگر خدانخواستہ عثمانؓ کو کچھ ہو گیا تو وہ ان کے خون کا بدلہ لیں گے۔ چنانچہ پندرہ سو افراد ایک ایک کر کے آگے بڑھے اور آپؐ کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر جان نثاری کی قسم کھائی لیکن اس سے پیشتر کہ جلد بازی میں کوئی قدم اٹھایا جاتا حضرت عثمانؓ آگئے۔ وہ قریش کے خیالات تبدیل کرنے میں ناکام رہے تھے لیکن وہ اپنے ساتھ ایک شخص کو لے آئے تھے۔ جس کو اہل قریش نے صلح کی شرائط طے کرنے کے متعلق کلی اختیار دیا تھا۔ اس کا نام سہیل بن عمرو تھا۔

سہیل سے حضرت محمدؐ مکہ کے ابتدائی ایام سے واقف تھے کیونکہ مصائب کے دور میں یہ مسلمانوں کی مخالف جماعت کا ایک فرد تھا۔ وہ جنگ بدر میں قید کر لیا گیا تھا اور بھاگ نکلنے پر پھر پکڑ لیا گیا تھا۔ حضرت محمدؐ نے اس کی جان بچائی تھی اور اس کے زر فدیہ آنے تک اسے پابہ زنجیر کر کے اپنے گھر میں رکھا تھا لیکن دونوں ایک دوسرے کو پسند نہ کرتے تھے۔ بایں ہمہ سہیل اس وقت قریش کا بااختیار نمائندہ تھا اور جو کچھ وہ طے کر لیتا اس کی توثیق ہو جاتی تھی۔

بڑی بحث و تمحیص کے بعد صلح کی جو شرائط طے ہوئیں وہ یہ تھیں۔

حضرت محمدؐ اور ان کے لوگ فوری طور پر مدینے چلے جائیں گے۔ آئندہ سال وہ واپس آسکیں گے اور ان کو تین دن تک کا وقت دیا جائے گا جس میں وہ کعبہ کے گرد ضروری مناسک ادا کر سکیں گے۔

پناہ میں لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ قریش نے آپ سے اچھا سلوک کیا اور کعبہ کا طواف کرنے کی بھی پیشکش کی لیکن آپ نے انکار کر دیا کہ وہ رسول اللہ کے بغیر اکیلے طواف نہیں کریں گے۔

[1] یہ بیعت تاریخ میں بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے۔ بعد میں اس کے متعلق ایک وحی بھی نازل ہوئی۔
لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ ..... فَتْحًا قَرِیْبًاO (سورۃ فتح رکوع ۳)

ان ایام میں اہل قریش شہر خالی کر کے شہر پناہ کے باہر خیموں میں قیام کریں گے۔ زائرین اپنے ساتھ نیام شدہ تلوار کے علاوہ جس کی مسافروں کو ذاتی حفاظت کے لئے رکھنے کی اجازت ہوتی ہے اور کوئی ہتھیار نہیں لائیں گے اور اس تاریخ (مارچ ۶۲۸ء) سے مسلمانوں اور قریش کے درمیان دس[1] سال کے لئے عارضی صلح رہے گی۔ اس عرصہ میں مکے اور مدینے کے قافلے ایک دوسرے کے علاقوں سے بحفاظت گزر سکیں گے۔ اس دوران مکہ کا کوئی شخص اپنے خاندان والوں کی مرضی کے خلاف مسلمان ہونے کی غرض چھپ کر مدینہ جائے گا تو اسے مکہ واپس[2] بھیجنا ہوگا۔

یہ صلح کی بڑی بڑی شقیں تھیں۔ جونہی چھوٹی تفصیلات بھی طے پا گئیں تو حضرت علیؓ کو صلح نامہ لکھنے کے لئے بلایا گیا اور حضرت محمدؐ نے لکھانا شروع کیا۔ مسلمانوں کی عام رسم کے مطابق آپؐ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ابتدا کی۔ سہیل نے حضرت علیؓ کو وہیں روک دیا اور کہا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو ان القاب سے خطاب کرتے کبھی نہیں سنا اور وہ اسے پسند نہیں کرتا۔ اس لئے حضرت محمدؐ سے کہا کہ ابتدا دستور کے مطابق کی جائے یعنی بِسْمِكَ اللّٰهُمَّ (تیرے نام سے۔ اے اللہ) حضرت محمدؐ نے لکھانا شروع کیا: "تیرے نام سے اے اللہ۔ صلح کی یہ شرائط طے پائی ہیں محمد الرسول اللہ اور......"

اس مرتبہ سہیل اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ ناراض تھا۔ کچھ حیران اور کچھ مرعوب، چند سال سے بھی کم عرصے پہلے جس شخص کے سر کی قیمت لگ چکی ہو۔ اس کا اتنی خود اعتمادی سے باضابطہ طور پر یہ لقب اختیار کر لینے کی گستاخی کرنا ناقابل یقین تھا۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ مسلمان اس کے گرد کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے اور ان میں سے ہر ایک کے پاس تلوار موجود تھی۔ اس نے کہا:-

---

[1] ابن سعد کے مطابق یہ معاہدہ صرف دو سال کیلئے ہوا تھا۔ سیرۃ النبی میں مدت معاہدہ کا کوئی ذکر نہیں۔

[2] دیگر شرائط یہ تھیں کہ اگر کوئی مسلمان مکہ آجائے گا تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔ مکہ کے مسلمان مکہ میں ہی رہیں گے اور قبائل عرب فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ کر لیں۔ اس شرط کے علاوہ باقی تمام شرائط مسلمانوں کے خلاف جاتی تھیں اور محسوس ہوتا تھا کہ مسلمانوں نے دب کر صلح کی ہے۔

"اگر میں آپؐ کو اللہ کا رسول مانتا تو میں آپؐ سے کبھی نہ لڑتا۔ اس وقت اس اختلافی بات کو درمیان میں لانے کی بجائے عرب کے دستور کے مطابق آپؐ کا اپنا نام اور والد کا نام لکھا جانا چاہیئے۔"

موجود زائرین میں ایک ہلچل سی مچ گئی لیکن حضرت محمدؐ نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور جلدی سے لکھوایا "محمدؐ ابن عبداللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان۔"

جب حضرت علیؓ لکھ چکے اور دستاویز کی ایک نقل بھی تیار کر لی گئی تو دونوں نمائندوں نے اپنے دستخط کئے۔ نیچے گواہوں کے دستخط ہوئے۔ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ مسلمانوں کی طرف اور حویطب بن عبدالعزیٰ اور مقراض ابن حفص اہل قریش کی جانب سے۔ نیچے یہ بھی لکھا گیا کہ اس دستاویز کے کاتب علیؓ تھے۔ پھر مٹی کی بنی ہوئی مہریں لگائی گئیں۔ اصل دستاویز حضرت محمدؐ نے رکھ لی۔ اور نقل مکہ کے محافظ خانے میں رکھنے کے لئے سہیل کے حوالے کر دی گئی۔

اس سے فارغ ہو کر مکہ کے سفیروں نے قدیم عرب کے دستور کے مطابق مسلمانوں کو سلام کیا اور اپنے کل کے دشمنوں کی روائتی سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ اپنے شہر مکہ واپس چلے گئے۔ لیکن جب مسلمان یہ رسمی دعائیہ الفاظ ادا کر رہے تھے تو ان کے الفاظ میں کوئی خلوص نہ تھا۔ زائرین کی اکثریت اور حضرت عمرؓ خصوصی طور پر اس بات پر سخت رنجیدہ تھے کہ حضرت محمدؐ اہل قریش کے سامنے تقریباً ہر بات میں جھک گئے تھے۔ یہ بات ان کے لئے حیران کن تھی کہ ان کا قائد، جو اہل قریش سے شکست کھانے کے باوجود ان کا فوری تعاقب کرنے سے ذرا نہ جھجکا۔ اتنی بڑی مسافت طے کرانے کے بعد آج ان کو منزل کے سامنے روک دے۔ اور یہ اس سے بھی زیادہ ناقابل یقین تھا کہ وہ مکہ کے سفارتی نمائندے کے سامنے اپنے آپ کو اتنا گرا دیں کہ وہ اللہ تعالےٰ

لے علامہ شبلی نے سیرۃ النبی میں صحیح مسلم کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ اچھا "محمد الرسول اللہ" کے الفاظ مٹا کر صرف "محمد بن عبداللہ" لکھ دو تو آپ نے جوش و محبت و عقیدت میں ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ آنحضورؐ نے "رسول اللہ" کے الفاظ خود اپنے ہاتھ سے مٹا دیئے اور اس کی بجائے "ابن عبداللہ" لکھوایا۔

کو اس کے صحیح نام سے مخاطب نہ کر سکیں اور خود اپنا لقب بھی استعمال نہ کر سکیں۔ محض اس لئے کہ یہ ایک کافر کا مطالبہ تھا۔ حضرت عمرؓ کا رنج و تعجب اِتنا بڑھا کہ وہ کہہ اٹھے "کیا آپؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟"

اس بات کا بُرا نہ مناتے ہوئے آپؐ نے جواب دیا "ہاں۔ میں ہوں" جب حضرت عمرؓ نے اصرار کیا کہ آپؐ کے بیجا طور پر اتنا جھک جانے سے اس کا یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تو آپؐ نے جواب دیا کہ وقت اس کو ثابت کر دے گا کہ جو کچھ آپؐ نے کیا وہ درست اور دانشمندی پر مبنی تھا۔

حضرت عمرؓ کو اس سے اطمینان نہ ہوا۔ انہوں نے جا کر حضرت ابی بکرؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت ابی بکرؓ نے جو حضرت محمدؐ کو ہر ایک سے زیادہ بہتر طریقہ پر جانتے تھے، اس بات کی تصدیق کر دی کہ یہ بات ضرور سچی ثابت ہوگی۔ حضرت عمرؓ کا پارہ چڑھنا شروع ہو گیا۔ ابی بکرؓ کے بعد وہ اور دوسرے مسلمانوں کے پاس گئے کہ دیکھیں ان کا اس کے متعلق کیا خیال تھا۔ ان کا خیال بھی حضرت ابوبکرؓ جیسا ہی تھا۔ دین اسلام کے شروع ہونے کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں میں بغاوت کے آثار نظر آ رہے تھے۔

حضرت محمدؐ نے تمام زائرین کو ہدایات جاری کیں کہ وہ اپنا سر منڈائیں، قربانی کریں اور وہ جہاں ہیں وہاں ہی عمرے کے تمام مناسک ادا کر لیں۔ زائرین نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ تین مرتبہ حکم دینے کے باوجود تعمیل[1] نہیں ہوئی۔ صورتِ حال اتنی خراب ہو گئی تھی کہ حضرت محمدؐ کو اس سے پہلے کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ ان باتوں پر سوچ بچار کرنے کے لئے آپؐ اپنے خیمہ میں چلے گئے۔ یہاں حضرت امِّ سلمہؓ اپنی عورت کی فطانت کام میں لائیں اور آپؐ سے کہا۔

"آپؐ[2] پندرہ سو افراد کو ایسا کام کرنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتے جو وہ نہیں

---

[1] علامہ شبلی نے سیرۃ النبی میں صحیح بخاری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آپ کے تین مرتبہ بار بار کہنے کے باوجود شکستہ دلی کے سبب کوئی اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ لیکن جب بعد میں آپؐ کو قربانیاں کرتے دیکھا اور یقین ہو گیا کہ اس فیصلہ میں اب کوئی تبدیلی نہیں ہوگی تو ایک ایک کر کے سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ قربانیاں کیں۔ بال منڈوائے اور احرام اتارا۔

[2] طبری اور علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے آپؐ کو یہ مشورہ دیا کہ آپؐ کسی سے کوئی لفظ نہ کہیں۔ باہر جائیں۔ خود اپنی قربانی کریں اور مناسک ادا کریں اور سر منڈوا کر احرام اتار دیں۔

کرنا چاہتے۔ لیکن آپؐ اُنکو اُن کی حماقت کا احساس تو ضرور دلا سکتے ہیں۔ آپؐ جائیں اور ضروری مناسک ادا کریں۔ اکیلے ہی اپنی قربانیاں کریں لیکن ایسی جگہ جہاں آپؐ کو سب دیکھ سکیں "

حضرت محمدؐ اس مشورہ کی تہ کو پہنچ گئے اور اس پر عمل کیا۔ صاف ستھرا احرام باندھا اور خیمہ سے باہر صحرا کی اُجلی دھوپ میں نکل آئے اور کعبہ کی طرف رُخ کر کے جو نیچے وادی میں چمک رہا تھا۔ آپؐ نے سر منڈوایا[لے] اور ناخن لئے۔ بعد ازاں آپؐ اس جگہ گئے جہاں قربانی کے جانور، جن کی گردنوں میں شوخ ہار لٹک رہے تھے، کھڑے تھے۔ سب سے پہلے آپؐ نے ابوجہل کے اونٹ کو لیا اس کی دونوں ٹانگیں باندھیں اور اس کے سر میں پشت کی جانب سے اپنی تلوار بر پا دی۔ اسی بے نیازی کے ساتھ آپؐ قربانی دعاؤں اور سجدہ و سجود میں مصروف رہے۔

ببول کے نیچے بیٹھے سپاہی اپنے قائد کی طرف بڑی خفگی اور بیزاری کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ اس انتظار میں تھے کہ ان کو کوئی حکم دیا جائے گا لیکن جب حضرت محمدؐ نے ان کی طرف کوئی توجہ ہی نہ کی، اس طرح گویا ان میں سے کوئی وہاں تھا ہی نہیں، اور تمام مناسک اکیلے ہی ادا کر لئے تو ان لوگوں کی بے اعتنائی دم توڑ گئی۔ جب آپؐ نے مخصوص دعائیں ختم کریں اور بلند آواز سے اللہ تعالیٰ کے ان الطاف اور مہربانیوں کا شکر ادا کیا، جن سے اُس نے آپ کو اس روز نوازا تھا۔ تو آرام سے بیٹھے لوگوں میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ ایک لمحہ کی طوفانی خاموشی کے بعد ان کے گلوں کی گہرائیوں سے ایک چیخ نکل گئی اور فوراً ہی بعد سب کے سب اپنے سر منڈوا رہے تھے بلکہ وہ ایک دوسرے کا سر مونڈ رہے تھے۔ اتنی تیزی سے کہ اکثروں کے سروں پر چرکے لگ گئے اور چند ہی لمحوں بعد پڑاؤ میں اونٹوں کی بلبلاہٹ کا شور برپا تھا۔ کیونکہ وہ بدحواسی میں قربانی کر رہے تھے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔

حضرت محمدؐ نے یہ سب کچھ اس طرح دیکھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جب تمام رسومات مکمل

لے مصنف نے یہ غلط لکھا ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے قربانی کی جاتی ہے پھر سر منڈا کر یا بال کترا کر احرام اتارا جاتا ہے۔

ہو گئیں تو آپؐ نے پڑاؤ اٹھانے کا حکم دیا۔ آپؐ القصوہ پر سوار ہوئے اور واپس مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ آپ نے حضرت عمرؓ سے کوئی بات نہ کی۔ کیونکہ ان سے کرنے والی کوئی بات تھی ہی نہیں۔ آپؐ جانتے تھے کہ آپؐ نے جو کچھ کیا وہ درست تھا اور آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ صلح اس بات کو ثابت کر دے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ صلح حضرت محمدؐ کی سیاست اور تدبر کا ایک عظیم شاہکار تھی۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی[1]۔ جب سہیل آپؐ کے سامنے کھڑا تھا تو شاید اس کے علاوہ کسی اور نے حضرت محمدؐ کی طرح گزشتہ واقعات پر غور نہ کیا ہو۔ اسی طرح ان دو حضرات[2] کے علاوہ شاید ہی کسی کو وہ مار پیٹ، پتھروں کا برساؤ۔ رات کو جان بچا کر نکلنے اور غار میں پناہ لینے کے واقعات یاد ہوں۔ حبشہ کو ستر افراد کی جلاوطنی کی مصیبتیں بھی کسی کو یاد نہ تھیں۔ اس وقت اور ان دنوں کے حالات کا تقابل ناقابل یقین اور ایک معجزے سے کم نہ تھا اور اس بات کا تو تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کہ اہل قریش آپؐ سے کسی طرح کا معاملہ یا صلح کرنے کو تیار ہو جائیں گے، آپؐ کو توجہ کے قابل شخصیت سمجھیں گے اور آپؐ کو عرب کی ایک قوم کا حکمران تسلیم کر لیں گے لیکن اپنی اس

---

[1] اس صلح کے دور رس اثرات یہ تھے:۔
(۱) آپ کو مسلمانوں کا قائد اور حکمران تسلیم کر لیا گیا۔ کل تک آپ کے سر کی قیمت لگ رہی تھی اور آج ایک قوم کے قائد کی حیثیت سے صلح کی گفت و شنید ہو رہی تھی۔ (۲) اسلام کی ایک مستقل دین کی حیثیت مان لی گئی۔ (۳) ایک عرصہ کے لئے قریش کے حملوں اور پیش قدمیوں سے اطمینان ہو گیا۔ (۴) بنو خزاعہ فوراً آپ کے حلیف بن گئے اور دوسرے قبائل نے آپؐ کو اپنا قائد تسلیم کرنا شروع کر دیا۔ (۵) اب کفار کا مدینہ میں آنا جانا شروع ہو گیا اور لوگ اسلام اور مسلمانوں سے متاثر ہونا شروع ہو گئے۔ چنانچہ دو سال میں مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے بڑھ کر دس ہزار سے زیادہ ہو گئی۔ حضرت خالد بن ولید اور عمرو بن عاص اس صلح کے فوراً بعد ہی مسلمان ہو گئے۔ (۶) مکہ کے لوگوں کی اکثریت اب یہ سمجھنے لگی تھی کہ آپؐ شروع سے ہی صحیح راستے پر تھے اور انہوں نے آپؐ پر بہت زیادتیاں کی تھیں۔ (۷) ایک سال بعد آپؐ کو عمرہ کرنے کا موقع مل گیا جو پہلے ناممکن تھا۔ (۸) کچھ عرصہ بعد مکہ کے مسلمانوں پر مدینہ جانے کی پابندی بھی خود قریش نے ہٹالی

[2] یہاں دو حضرات سے مراد غالباً خود نبی کریمؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔

ذاتی کامیابی کے علاوہ جو آپؐ نے ان لوگوں کے خلاف حاصل کی تھی جنھوں نے آپؐ کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ آپؐ نے اس صلح کے ان دور رس نتائج کا بھی صحیح اندازہ کر لیا تھا جو کوئی اور مسلمان نہ کر سکا۔ آپؐ چھوٹی چھوٹی باتوں اور غیر ضروری تفصیلات پر بحث کرنے والے نہ تھے۔ اگر سہیل کی چھوٹی ذہنیت ایک ایسے شخص کا، جو کچھ عرصہ پہلے ایک سفری گماشتہ تھا، ایک بڑا لقب اختیار کر لینے کے خلاف تھی تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرنے کے لئے مسلمانوں کے ایک مخصوص کلمہ سے ایک قریشی برہم ہوتا تھا تو یہ اتنی بڑی بات نہ تھی کہ اس کی وجہ سے صلح کی بات چیت کو ہی ختم کر دیا جائے۔

زیادہ اہم بات یہ تھی کہ آپ کو مکہ میں آنے جانے کی کھلی اجازت مل جائے۔ حضرت محمدؐ جانتے تھے کہ جس دن بھی آپؐ کو اور آپؐ کے لوگوں کو مقدس شہر میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی تو پھر وہاں پر مستقل قدم جمانے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔ اور اسی وقت سے آپؐ یہ فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہو جائیں گے کہ کعبہ میں کون عبادت کر سکتا ہے اور کون نہیں اور یہ بھی کہ آپؐ کو اور اللہ تعالیٰ کو کس طرح خطاب کیا جائے۔

سب سے بڑی بات جو آپؐ نے اہل مکہ سے کی گئی اس صلح میں پیش نظر رکھی یہ تھی کہ مقامی قبیلوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ اس معاملہ میں بھی آپؐ کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ اس صلح نامے پر دستخط ہونے کے چند روز کے اندر اندر جس کے سبب آپؐ کے اپنے لوگ اس قدر برافروختہ ہو گئے تھے، اردگرد کے قبیلوں کے سردار آپؐ کے سامنے حلف[1] وفاداری اٹھانے کے لئے آنا شروع ہو گئے۔

حضرت عمرؓ حیران رہ گئے۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر اتنے لوگ مسلمان ہو گئے جتنے پچھلے چھ سال میں بھی نہ ہوئے تھے۔

بہرحال اس کا اطمینان دلانے کے لئے کہ آپؐ کی سپاہ کے ذہنوں میں اس سلسلہ میں کوئی شک و شبہ نہ رہے کہ آپؐ نے سہیل کی شرائط صلح قبول کر کے عین دانشمندی کا ثبوت دیا تھا حضرت محمدؐ پر ایک وحی نازل ہوئی جس نے آپؐ کے اس درست اقدام کی توثیق کر دی۔ یہ وحی قرآن کریم

---

[1] اس قرارداد پر دستخط ہوتے ہی قبیلہ بنی خزاعہ فوری طور پر نبی کریمؐ اور مسلمانوں کا حلیف بن گیا۔

کی اڑتالیسویں سورۃ الفتح[1] میں مذکور ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	بیشک ہم نے تجھے فتح دی ایک قطعی فتح۔ تا معاف
انا فتحنا لک فتحا مبینا	کرے اللہ جو پہلے ہوئے تیرے گناہ اور جو پیچھے ہوئے
....	اور پورا کرے تجھ پر اپنا احسان اور چلا دے تجھ کو
وینصرک اللہ نصرا عزیزا ؕ	سیدھی راہ اور مدد کرے اللہ تیری زبردست امداد
.... (رکوع۔۱)	پھر آگے فرمایا۔ اللہ خوش ہوا ایمان والوں سے
لقد رضی اللہ عن المومنین	جب وہ اس درخت کے نیچے تیرے ہاتھ پر بیعت
اذ یبایعونک تحت الشجرۃ	کر رہے تھے اور اللہ جانتا تھا جو ان کے دل میں
.... واثابہم فتحا قریبا	تھا پھر اتارا ان پر چین اور انعام میں دی ان کو ایک
(رکوع۔۳)	جلد ہونے والی فتح۔

لیکن اگر اس مقدس معاہدے کو ایک بڑی کامیابی نہ بھی سمجھا جائے تب بھی صلح نامہ کی وہ شرط جس کی رو سے مسلمان ہو جانے والے قریش مکہ کو واپس کئے جانے تھے۔ آزمائش میں پوری نہ اتری اور خود اہل قریش نے ختم کر دی۔

ایک نوجوان مکی جس کا نام ابو بصیر تھا اپنے خاندان والوں سے چھپ کر مدینہ پہنچا تاکہ مسلمان ہو جائے۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی اس کے والدین کے نمائندے بھی پہنچ گئے تاکہ اس کو واپس لے جائیں حالانکہ آپؐ دل سے نہ چاہتے تھے لیکن آپؐ اپنی تحریر کے خلاف کچھ نہ کر سکتے تھے اور اسے ان کے حوالے کرنا پڑا۔ لیکن راستے میں ابو بصیرؓ اپنے نگہبانوں پر غالب آ گیا۔ اس نے ایک کو مار ڈالا اور دوسرے کو مدینہ کی طرف بھگا دیا اور خود خون آلود تلوار لیے جو ابھی تک بے نیام تھی حضرت محمدؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ یہاں آ کر اس نے عرض کیا کہ آپؐ نے تو اسے ان لوگوں کے حوالے کر کے اپنا عہد پورا کر دیا ہے۔ اس کے بعد آپؐ پر کوئی ذمہ داری نہیں آتی۔ حضرت محمدؐ نے کچھ دیر سوچا۔ پھر آپؐ مسکرائے اور بغیر کسی کو مخاطب کئے فرمایا۔ "کتنا غضب کا لڑاکا ہے۔ کاش اس کے ساتھ

---

[1] سورہ فتح آپ پر مکہ سے واپسی پر راستے میں نازل ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد حضرت عمرؓ اور دیگر اصحاب بالکل مطمئن ہو گئے کہ یہ معاہدہ واقعی عظیم فتح تھی۔ (سیرۃ النبی)

کچھ لوگ ہوتے۔"

یہ کہہ کر آپؐ نے جوان کو رخصت کیا۔ البتہ ابو بصیرؓ کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ آنحضرتؐ کا ان الفاظ سے کیا مطلب تھا۔ اس کے پانچ مکی دوست مدینے میں تھے۔ اس نے ان سب کو اکٹھا کیا اور مختصر صلاح مشورے کے بعد انکو لے کر صحرا میں چلا گیا۔ چند ہی دنوں میں انہوں نے شام کے اس کاروانی راستے پر اپنا تسلط جما لیا جو سمندر کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔

چونکہ اہل قریش اور مسلمانوں میں ان دنوں صلح تھی۔ تجارتی کارواں آجا رہے تھے۔ قیمتی تجارتی سامان سے لدے اونٹ اور خچروں کی لمبی لمبی قطاریں مکّہ سے باہر جا رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت ہاشم اور عبد المطلب کا زمانہ پھر سے لوٹ آیا ہے لیکن یہ دور زیادہ دیر نہ رہا۔ ابو بصیرؓ ان کی تاک میں تھا۔

جلد ہی کچھ اور مکی نوجوان مسلمانوں کو جو معاہدے کے سبب مدینہ نہیں جا سکتے تھے معلوم ہو گیا کہ بحیرہ قلزم کے ساتھ جانے والے راستے پر کیا ہو رہا ہے۔ چنانچہ وہ بھی مکّہ سے نکل کر ابو بصیرؓ کی جماعت[1] میں شامل ہو گئے۔ زیادہ دیر نہ لگی کہ مکہ کے قافلوں کے لئے سفر کرنا ناممکن ہو گیا اور ان دنوں سے بھی زیادہ خطرناک ہو گیا۔ جتنا مدینے والوں سے کھلی لڑائی کے زمانے میں تھا اور اس صورت میں اہل مدینہ اور ان کے قائدین کو الزام بھی نہیں دیا جا سکتا تھا۔

آخر کار صورت حال اتنی خراب ہو گئی کہ اہل قریش کا ایک وفد حضرت محمدؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ سے مدد کی درخواست کی۔ آپؐ نے کچھ تامل کیا اور کہا کہ اس سے آپؐ کا کوئی تعلق نہیں۔ اس پر اہل قریش نے اور زیادہ شد و مد سے التجا کی۔ بہر حال آخر میں آپؐ رضامند ہو گئے لیکن اس شرط پر کہ مسلمان ہو جانے والے مکیوں کو مدینہ میں پناہ نہ دینے والی شق معاہدے میں سے

---

[1] ستر مسلمان جو مدینہ نہیں جا سکتے تھے اور مکہ میں عذاب میں گھرے ہوئے تھے اس جماعت میں شامل ہو گئے۔ اور قریش کے تجارتی کاروانوں کا راستہ مسدود کر دیا۔ یہاں تک کہ قریش مجبور ہو کر آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مکہ کے مسلمانوں کے مدینہ نہ جانے کی شرط معاہدے سے خارج کرنے کے لئے خود مستدعی ہوئے۔

قلمزن کردی جائے۔ اہل قریش نے یہ بات منظور کر لی۔ اس طرح ایک مرتبہ پھر حضرت محمدؐ نے یہ ثابت کر دیا کہ آپؐ اتنے ہی بڑے مدبر بھی تھے جتنے بڑے سیاستدان اور جرنیل۔

کارواں لوٹنے والوں کو فوراً مدینہ واپس بلا لیا گیا۔ ابوبصیرؓ کے سوا اور سب واپس آگئے۔ یہ خوش تدبیر نوجوان ایک مہم میں ایسا زخمی ہوا کہ پھر اچھا نہ ہو سکا۔ البتہ جان آفریں کو جان سپرد کرنے سے پہلے اسلام کی خدمات بجا لانے کا صلہ اسے حضرت محمدؐ کی جانب سے تحسین و آفرین اور شہادت وجنت کی بشارت کی شکل میں مل گیا۔

جہاں حضرت محمدؐ کو اس قابل سالار کے وفات پا جانے کا افسوس ہوا وہاں آپؐ عام صورتحال سے ضرور مطمئن ہو گئے۔ درحقیقت ہر کام اب اتنے آرام وسکون سے ہو رہا تھا کہ خود آپؐ کو اس کی توقع نہ تھی اور یہ بھی امید تھی کہ انشاء اللہ اگلے سال آپؐ مکہ میں ہوں گے۔ وہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس اثنا میں آپؐ کو بہت کچھ کرنا تھا تاکہ حالیہ کامیابیوں کو استوار و مستحکم کر لیا جائے۔ آپؐ کو ابھی دو تین چھوٹے معاملے ان لوگوں سے بھی طے کرنے تھے جن کو ابھی تک آپؐ کو اللہ کا رسول تسلیم کرنے کا ہوش نہیں آیا تھا۔

ل‍ے قریش ابوبصیرؓ کی جماعت کی کارروائیوں سے خوفزدہ ہو گئے اور مسلمانوں کو مکہ میں روک رکھنے کو اپنے لئے خطرناک سمجھنے لگے۔ چنانچہ انہوں نے آنحضورؐ کو لکھ بھیجا کہ آپ مسلمانوں کو مدینہ بلالیں اور اس شق کو معاہدے سے قلمزن تصور کریں۔ (حیات محمدؐ)

سترھواں باب

سفارتیں۔ غزوہ خیبر

(۶۲۸ عیسوی)

حضرت محمدؐ اسلامی سلطنت کی عظمت اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔ آپؐ کے دورِ حیات میں کوئی ایسے یقینی آثار نہ تھے جس سے آپؐ کو یہ خیال ہو سکتا کہ کبھی اتنی زبردست سلطنت بن سکے گی لیکن آپؐ کو اس کا یقین ضرور تھا۔ آپؐ کو اس بات کا یقین بالکل اسی طرح تھا جیسے آپؐ کو اپنے روحانی پیغامات اور وحی پر اس وقت بھی یقین تھا جب آپؐ کا ساتھ دینے والے تعداد میں صرف چار تھے۔ آپؐ کی حدیبیہ سے واپسی پر جب افراد اور قبیلوں نے تیزی سے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تو آپؐ کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ دن دور نہیں جب دنیا اسلام کے نظریہ کے پھلنے پھولنے کے لئے سازگار ہو جائے گی۔ یہ درست تھا کہ اس وقت بھی چند مقامی گروہ ایسے تھے جنھوں نے آپؐ کی حکمرانی کو تسلیم نہیں کیا تھا لیکن ایسے لوگوں سے آپؐ بخوبی نمٹنا جانتے تھے۔ اب آپؐ کی توجہ کا مرکز وہ قومیں تھیں جو آپؐ کی موجودہ قلمرو سے باہر تھیں۔ آپؐ کا خیال تھا کہ ان قوموں کو مسلمان بنانے کے لئے صرف تھوڑی سی ترغیب اور تبلیغ کی ضرورت تھی۔

اس خیال کے پیشِ نظر سفیروں کا انتخاب کیا گیا تاکہ وہ جا کر ان لوگوں کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کریں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت محمدؐ کے سفرا کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس طرح کی طلاقتِ لسانی عطا فرما دی تھی جس طرح حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے پینٹیکوسٹ[۱] (توبہ کے دن) کے

۱ے پینٹیکوسٹ PENTECOST یا توبہ کا دن۔ یہ ایک یہودی تیوہار تھا۔ جو ایسٹر کے سات ہفتے کے بعد منایا جاتا تھا۔ (چیمبرز ڈکشنری)

تیوہار پر اپنے آپ کو مختلف زبانوں میں تقریر کرنے پر قادر پایا تھا۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو۔ لیکن حضرت محمدؐ نے جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ آپؐ نے اپنے سفیر[1] اُن لوگوں میں سے چنے جو کبھی تاجر رہ چکے تھے اور اس غرض سے دوسرے ممالک میں جایا کرتے تھے۔ وہ ان ممالک کی رسومات اور دستوروں کو بھی جانتے تھے اور اگر ایسے نہ ہوتے تو حضرت عمرؓ اور ابوبکرؓ جیسے مرتبے کے لوگ بھی صحرا کے جانے پہچانے ماحول سے باہر چلے جانے پر اجنبیت محسوس کرتے۔ یہ لوگ یونانیوں، رومنوں اور ایرانیوں کو اپنی بات سمجھانے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔

اپنے سفرا کو سفارتی نشان کے طور پر دینے کے لئے حضرت محمدؐ نے چاندی کی ایک بڑی مہر[2] یا تمغہ بنوایا جس پر (محمد الرسول اللہ) کے الفاظ کندہ تھے۔ یہ ایک بڑا بے ضرر اور سادہ سا خیال تھا۔ گو عبداللہ بن ابی اور اس کے دوستوں نے بڑی دیر تک اس کا مذاق اڑایا لیکن اس کے باوجود یہ نشان جلدی ہی رومن عقاب[3] سے کچھ زیادہ ہی عظمت کا حامل بن گیا۔

---

[1] آنحضورؐ نے مندرجہ ذیل سفرا باہر بھیجے :-

(۱) حضرت دحیہ کلبیؓ - قیصر روم کے دربار میں

(۲) حضرت عبداللہؓ بن حذافہ - خسرو پرویز (ایران)

(۳) حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ - عزیز مصر (مقوقس)

(۴) حضرت عمروؓ بن امیہ - نجاشی (شاہ حبش)

(۵) حضرت سلیطؓ بن عمر - رؤسائے یمامہ

(۶) حضرت شجاعؓ بن وہب - رئیس حدود شام (حارث غسانی)

سیرت النبی - حصہ اوّل)

[2] ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے حیاۃ محمدؐ میں ایک چاندی کی انگشتری کا ذکر کیا ہے جس پر یہ مہر کندہ تھی۔

[3] عقاب EAGLE رومن سلطنت کا سرکاری نشان تھا۔

پہلی سفارت ایک مرتبہ پھر قیصر[1] ہرقل کی طرف بھیجی گئی۔ سفارت کو گورنر نے بُصریٰ (شام) کے مقام پر ہی روک لیا اور پیغام ان سے لے کر شہنشاہ ہرقل کو بھیج دیا گیا۔ چاندی کی مہر کو ہرقل نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور خط کا اس نے ترجمہ کرایا۔ وہ یہ سن کر حیران ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی پرستش چھوڑ کر ایک نئے دین۔ ایک خدا کا دین۔ اختیار کر لینے کی دعوت ایک ایسے عرب کی جانب سے موصول ہوئی تھی جس کا اس نے کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ ہرقل نے وہ مہر اور خط بنظر استعجاب محفوظ کر لیا لیکن اس سے آگے کوئی کارروائی نہ کی۔

دوسری سفارت ایران کے شہنشاہ کی طرف بھیجی گئی۔ شہنشاہ خسرو کو اس کے لڑکے سیروز (عربی کتب میں اس کا نام شیرویہ لکھا ہے) نے حال ہی میں قتل کر دیا تھا اور یہ عجیب و غریب خریطہ اس کے سامنے[2] پیش کیا گیا۔ سیروز یا شیرویہ کو پیغام کا مضمون پڑھ کر ایک اچنبھا سا ہوا کیونکہ

---

[1] قیصر ہرقل HERACLIUS اس وقت کا بازنطینی رومن شہنشاہ۔ قیصر نے اس سفارت کیلئے بیت المقدس کے مقام پر دربار منعقد کیا اس نے یہ بھی حکم دیا کہ عرب کا کوئی اور شخص مل سکے تو اسے بھی لاؤ۔ اتفاق سے ابوسفیان اس وقت تجارتی کاروان لے کر غزہ کے راستے شام جا رہا تھا۔ غزہ پہنچا ہی تھا کہ ہرقل کے سپاہی اسے اور اس کے چند ساتھیوں کو پکڑ کر لے گئے اور ہرقل کے سامنے پیش کر دیا۔ ہرقل نے ابوسفیان سے رسول کریمؐ کے نام و نسب خاندان، اخلاق و کردار اور تعلیمات کے متعلق چند سوالات کئے اور یہ بھی کہ آپؐ کے پیرو کیسے لوگ ہیں اور وہ ان میں کتنے مقبول ہیں۔ جوابات سے ہرقل متاثر ہوا لیکن چونکہ اہل دربار اور بطاریق اس سفارت اور مبارک نامہ سے سخت برہم نظر آ رہے تھے اس لئے سفارت اور ابوسفیان وغیرہ کو رخصت کر دیا اور کوئی کارروائی نہ کی (سیرۃ النبی حصہ اول)

[2] صحیح بات یہ ہے آپؐ کا خریطہ حقیقت میں خسرو پرویز کے سامنے ہی پیش کیا گیا تھا جو اس وقت زندہ تھا اور اس نے ناراض ہو کر اپنے گورنر یمن (باذان) کو حکم بھیجا کہ آپؐ کو گرفتار کرے یا آپؐ کا سر اسے بھیجا جائے اور جب باذان نے دو نمائندے اس مقصد سے آپ کے پاس بھیجے تو آپؐ نے بصیرت پیغمبری سے انہیں بتایا کہ ان کا شہنشاہ تو قتل ہو چکا ہے۔ اور جب یہ لوگ یمن پہنچے تو پھر فی الواقع کسریٰ کے قتل کی تصدیق ہو گئی (سیرۃ النبی)۔ واقعدی کے مطابق شیرویہ نے اپنے باپ کو جمادی الاول ۷ ہجری کی تیرھویں شب میں چھ گھڑی رات گئے قتل کیا تھا۔ (سیرۃ النبی)

حضرت محمدؐ نے اس کو اس طرح مخاطب کیا تھا" محمدؐ بن عبداللہ۔ رسول اللہ کی طرف سے خسرو (آپؐ اس کو زندہ سمجھے ہوئے تھے) بادشاہ ایران کے نام"۔

صحرا کے ایک عرب کی اس کے نام سے پہلے اپنا نام لکھ دینے کی گستاخی سے سیروز بھڑک اٹھا خط کے پرزے پرزے کر دیئے اور اپنے یمن کے گورنر کو ہدایت کی "مدینہ میں قبیلہ قریش کا ایک جنونی (نعوذ باللہ) اپنے آپ کو پیغمبر خدا کہتا ہے۔ اس کا دماغ درست کر دو یا پھر اس کا سر مجھے بھیج دو"۔

جب آپؐ نے یہ بات سنی تو اپنے شانوں کو جنبش دی اور بڑی بے اعتنائی سے صرف اتنا کہا "جس طرح اس نے خط کے پرزے کئے ہیں۔ اسی طرح اللہ اس کی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا"[له] آپ کی پیشین گوئی جلد ہی پوری ہو گئی ـــ بیس سال بھی نہ گذرے تھے کہ ایران مملکت، اسلامیہ کی ایک باجگذار ریاست بن چکا تھا اور اس کا حاکم ایک ایسا شخص بنا جو (نعوذ باللہ) قریش کے اسی جنونی کا تربیت یافتہ تھا۔

وسطی عرب کے عیسائی قبیلے بنو حنیفہ کے سردار نے مسلمانوں کے سفیروں کی آؤ بھگت کی اور انہیں تحائف بھی دیئے۔ البتہ یہ شرط لگا دی کہ دین اسلام وہ صرف اس صورت میں قبول کرے گا کہ اسے حکومت میں شریک کیا جائے۔ حضرت محمدؐ نے جواب دیا کہ اگر وہ ایک کچی کھجور کا بھی حصہ مانگتا تو آپؐ اسے ہرگز نہ دیتے اور اس کے بعد آپؐ نے اس کے لئے ایک بُرے انجام کی واضح پیشنگوئی کی جو غالباً پوری ہو گئی۔ کیونکہ اگلے سال ہی وہ حریص رئیس فوت ہو گیا۔

سفیروں نے حبشہ میں اچھا وقت گزارا۔ آپؐ کی بعثت کے آغاز سے ہی نجاشی (شاہ حبش) نے مسلمانوں سے ہمیشہ اچھا سلوک کیا اور اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ ان میں سے ساٹھ افراد ابھی تک اس کے دربار میں تھے۔ جن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سوتیلے بھائی جعفرؓ بن ابی طالب بھی تھے۔ لیکن اس دوستانہ سلوک کے باوجود آپؐ نے نجاشی کو بھی وہی پیغام بھیجا جو رومنوں اور ایرانیوں کو بھیجا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نجاشی نے حضرت محمدؐ کا نیک مشورہ مان لیا تھا اور اس پر عمل پیرا بھی ہو گیا تھا لیکن تاریخ سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اہل حبش حضرت محمدؐ اور ان کی تعلیمات

[له] طبری نے عبدالرحمنؓ بن عوف سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے یہی ارشاد فرمایا تھا کہ جس طرح خسرو نے ہمارے خط کے پرزے کئے ہیں، اسی طرح اس کی حکومت بھی پارہ پارہ ہو جائے گی۔ (طبری)

کی بے حد عزت وتکریم کرتے تھے۔ کیونکہ نسطوری[1] عیسائی ہونے کے سبب ان کے اور اسلام کے عقائد میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ لیکن اہل حبش آج بھی اسی طرح عیسائی ہیں۔ بہر حال جو بھی نامہ وپیام عربوں اور حبشہ والوں میں ہوئے بہت ہی خوش آئند اور پر محبت تھے۔

حبشہ میں سفارت کو حضرت محمدؐ کی جانب مذہب سے ہٹ کر ایک اور قسم کا کام بھی انجام دینا تھا۔ ادیس ابابا میں چند مسلم خواتین رہ رہی تھیں۔ ان میں ایک ام حبیبہؓ بنت ابوسفیان بھی تھیں۔ یہ عبیداللہ ابن جحش کی بیوہ تھیں جو ابتدا میں اسلام قبول کرنیوالوں اور مکہ سے پہلی ہجرت کرنے والوں میں سے ایک تھے۔ عبیداللہ کی والدہ حضرت عبدالمطلب کی ایک لڑکی تھیں اور اس طرح وہ حضرت محمدؐ کے ابن عم بھی تھے۔ یہ عبیداللہ حضرت عبداللہ بن جحش اور ان حضرت زینبؓ کے بھائی بھی تھے۔ جن کی حضرت زید بن حارث کے طلاق دینے پر آنحضرتؐ سے شادی ہونے پر بڑی لے دے ہوئی تھی۔ ان پیچ در پیچ رشتوں کے باوجود حضرت محمدؐ اپنی اس عزیز بیوہ (ام حبیبہ) سے شادی کرکے اور مزید الجھنیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ آپؐ یہ شادی کرکے ابوسفیان کو نیچا دکھانے کے ساتھ ساتھ مکے میں اپنا مقام بھی مستحکم کرنا چاہتے ہوں۔ خیال یہ تھا[2]، کہ ابوسفیان اس رشتہ کو کتنا ہی برا کیوں نہ کہے اسے یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ (نعوذ باللہ) یہ باعث نفرت مبلغ اب اس کا داماد بھی بن گیا ہے۔ درحقیقت جو کچھ ابوسفیان نے اس شادی کی خبر سننے پر کہا وہ یہ تھا "یہ اونٹ[3] اتنا بے مہار ہوگیا ہے کہ کوئی نکیل اسے نہیں روک سکتی"

البتہ حضرت امّ حبیبہؓ آپؐ سے شادی کرکے بہت خوش تھیں۔ نجاشی[4] نے

---

[1] نسطوری عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسٰیؑ کی زندگی کے دو الگ الگ پہلو تھے یعنی روحانی اور مادی۔ اور یہ کہ حضرت مریمؑ صرف آپ کی والدہ تھیں اور انہیں تثلیث میں شامل کرنا یا خدا کا شریک ٹھہرانا غلط ہے۔

[2] یہ مصنف کا ذاتی خیال ہے۔

[3] طبری نے بھی اپنی تاریخ میں اسی قسم کے الفاظ لکھے ہیں۔

[4] نجاشی نے آنحضرتؐ کی طرف سے حضرت ام حبیبہؓ کا مہر ادا کیا جو چار سو اشرفی تھا اس کے بعد ان کو اور تمام مسلمانوں کو دو کشتیوں میں سوار کراکے مدینہ روانہ کردیا۔ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اس جماعت کے قافلہ سالار تھے یہ لوگ جب مدینہ پہنچے تو رسول کریمؐ غزوہ خیبر میں مصروف تھے۔ واپسی پر ملاقات ہوئی۔ ارباب سیر لکھتے ہیں کہ نجاشی نے ۹ھ میں انتقال کیا۔ (سیرۃ النبی - حصہ اول)

آپؐ کی طرف سے وکیل بن کر خود اس شادی کی رسومات سرانجام دیں۔ اس سے فارغ ہو کر حضرت جعفرؓ اور دوسرے مہاجر دلہن کو لے کر مدینہ واپس جانے کے لئے روانہ ہو گئے۔

ایک اور سفارت مصر بھیجی گئی۔ وہاں کے رومن گورنر مقیقس نے حضرت محمدؐ کے نامہ مبارک کی قدر و منزلت کی اور سفیروں سے بڑے اخلاق سے پیش آیا لیکن وہ قبول اسلام کرنے کا کوئی وعدہ نہ کر سکا۔ اس سے پیشتر کہ ایلچیوں کی یہ جماعت واپس ہو اس نے ان کے معزز آقا کے لئے بہت سے تحائف دیئے جو جواہرات، مصری کتان، شہد، مکھن، ایک گدھی، ایک سفید خچر،[1] ایک اچھے نسل دار گھوڑے پر مشتمل تھے۔ ان روائتی تحائف کے علاوہ دو حسین قبطی لڑکیاں بھی، جو حقیقی بہنیں بھی تھیں اور جن کے نام مریم (ماریہؓ) اور شیریں تھے، آپؐ کی خدمت میں روانہ کر دیں۔

کسی سبب سے حضرت محمدؐ نے حضرت مریمؓ (ماریہ) سے شادی نہیں کی بلکہ حرم میں کنیز کی حیثیت سے رکھا۔ ان کے حرم میں داخلے کے خلاف آواز اٹھانے میں سب شریک تھے۔ حضرت عائشہؓ سے لے کر حضرت زینبؓ تک سب نے اسے اپنی توہین گردانا۔ ایک مضبوط محاذ بنا کر آپؐ کی تمام بیویاں حضرت ماریہؓ کے خلاف ہو گئیں۔ درحقیقت حضرت ماریہؓ کے لئے وہاں رہنا اتنا دوبھر ہو گیا تھا کہ حضرت محمدؐ نے ان کو بالائی مدینہ (قبا) کے ایک مکان میں منتقل کر دیا لیکن اس پر بھی اطمینان نہ ہوا۔ آپؐ کے حرم نے حضرت ماریہؓ سے نفرت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور نفرت کا اظہار بھی اس حد تک کیا گیا کہ قریب تھا کہ آپؐ بیویوں کو طلاق دے دیں۔

غالباً حضرت ماریہؓ قبطیہ بذات خود اس جھگڑے کا اصل سبب نہ تھیں لیکن وہ حرم میں

---

[1] حضرت ماریہ (MARY) اور شیریں دونوں قبطی نسل کی بہت خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ مقوقس (گورنر مصر) نے لکھا تھا کہ دونوں ایک مصری معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس لئے انہیں لونڈی یا کنیز کہنا زیادتی ہو گی۔ حضرت ماریہؓ رسول اللہ کے حرم میں داخل ہوئیں اور شیریں حضرت حسان بن ثابت (مشہور شاعر اسلام) کو دے دی گئیں۔ یہ دونوں مدینے پہنچنے سے پہلے ہی اسلام لا چکی تھیں۔ اس لئے خیال اغلب ہے کہ رسول اللہ نے ان سے نکاح کیا ہو گا نہ کہ کنیز کی حیثیت سے رکھا ہو گا۔ سفید خچر کا نام دُلدُل تھا۔ (سیرۃ النبی حصہ اول)

آئی ایسے وقت تھیں جب ازواج رسول میں آپس میں رشک وحسد کی آگ بھڑکنے کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ امن وآشتی کی خاطر حضرت محمدؐ ہر بیوی کے گھر باری باری سے ایک رات گزارتے تھے اور جب مدینہ سے باہر جاتے تو ساتھ جانے کی سعادت حاصل کرنے کے لئے بیویاں آپس میں قرعہ اندازی کرتیں۔

آپؐ کے حرم میں اب دو سیاسی جماعتیں تھیں۔ حضرت عائشہؓ، حفصہؓ اور سودہؓ ایک طرف اور باقی ازواج دوسری طرف تھیں۔ حضرت سودہؓ نے غالباً اپنے بچاؤ کے لئے دو زیادہ مقبول بیویوں سے اتحاد کر لیا تھا۔ وہ اب بوڑھی ہو رہی تھیں اور ویسے بھی کوئی قبول صورت نہ تھیں۔ حضرت عائشہؓ کی پشت پناہی کے سبب وہ طلاق[1] کے ڈر سے محفوظ تھیں اور اس بچاؤ کو یقینی بنانے کے لئے آپؐ اپنی باری جواں سال اور چہیتی بیوی عائشہؓ کو دے دیتی تھیں۔

اس طرح حضرت عائشہؓ کی حیثیت اور ان کے مقام میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے موضوع کے علاوہ شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر آنحضرتؐ ان سے مشورہ نہ کرتے ہوں۔ آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کو ان لڑکیوں کے مقابلے میں ہمیشہ ایک بلند درجہ دیا۔

آپؐ حضرت خدیجہؓ کے عزیزوں میں اب بھی اسی طرح دلچسپی لیتے تھے اور بعض اوقات یہ کہہ کر کہ حضرت خدیجہؓ عورتوں میں سب سے اچھی تھیں، حضرت عائشہؓ کو برہم کر دیتے تھے۔ ایک دن حضرت خدیجہؓ کی بہن حالہ ملنے کے لئے مدینہ آئیں۔ ان کی آواز اور لب ولہجہ بالکل حضرت خدیجہؓ کا سا تھا جب حضرت محمدؐ نے ان کو حرم کے صحن میں بولتے سنا تو آپؐ کو غش آنے لگا جوں ہی وہ چلی گئیں تو حضرت عائشہؓ نے خفگی کے انداز میں کہا "آپؐ کیوں ہمیشہ ان اداس صورت قریشیوں کے لئے پریشان ہوتے ہیں۔ آپؐ کیوں ہر وقت اس پوپلی بڑھیا کے خیال میں کھوئے رہتے ہیں۔ جس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایک بہتر اور جوان بیوی دے دی ہے۔"

یہ سن کر آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آپؐ نے غصہ سے حضرت عائشہؓ کو ڈانٹ دیا

---

[1] یہ مصنف کا ذاتی خیال ہے۔

"نہیں ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے بہتر بدل نہیں دیا۔ وہ مجھ پر اس وقت ایمان لائیں جب سب نے انکار کر دیا تھا۔ جب سب لوگ مجھے جھوٹا کہہ رہے تھے تو انہوں نے میرے سچے ہونے کی تصدیق کی۔ جب میں قلاش تھا تو انہوں نے مجھے اپنی دولت میں شریک کیا۔ خدیجہؓ جیسا تو کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔"

جب حضرت عائشہ کو بہ امر مجبوری ایک قبطیہ کنیز کو، جس کا سب سے بڑا گناہ یہ تھا کہ وہ عرب عورتوں سے زیادہ خوبصورت تھیں، اپنا ہم پلہ اور رقیب تسلیم کرنا پڑا تو وہ غصہ سے بے قابو ہو گئیں۔ دوسری بیویاں، جو حضرت ماریہؓ پر اسی طرح معترض تھیں، حضرت عائشہؓ کی طرح بے باک تو نہ تھیں لیکن اس معاملے کو خاموشی سے برداشت کرنے والی بھی نہ تھیں۔ حرم کا ماحول آتشگیر ہو گیا تھا اور جس روز حضرت حفصہؓ نے حضرت ماریہؓ کو حضرت محمدؐ کے ساتھ اپنے ہی گھر میں دیکھ لیا تو یہ مادہ پھٹ پڑا۔ اور اس خبر کے پھیلنے کے پندرہ منٹ کے اندر اندر حرم میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ ان غصہ میں بھری ہوئی ازواج کو وعدے وعید اور تنبیہہ سے خاموش کرنے کی کوشش لاحاصل ثابت ہوئی۔ وہ سب کی سب ایک جنونیوں کا گروہ معلوم ہو رہی تھیں۔ بالآخر آپؐ کو بھی غصہ آ گیا اور آپ نے کہا: "زیادہ تر عورتیں ہی جہنم میں جائیں گی" اور مزید فرمایا "تم سب عورتیں مجھ سے زیادہ اللہ کی نافرمان ہو۔ جاؤ میں تم لوگوں کے پاس ایک مہینہ تک نہیں آؤں گا۔"

یہ کہہ کر آپؐ مسجد کے قریب ایک برج یا بالاخانے میں چلے گئے اور اسے اندر سے بند کر لیا۔ حضرت محمدؐ جیسے حلیم الطبع شخص کے اس طرح غضب ناک ہو جانے سے حرم پر اوس سی پڑ گئی۔ ایک نے دوسری کو بے یقینی سے یقین دلایا کہ جونہی آپؐ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے خود بخود واپس آ جائیں گے اور اپنے اپنے کمروں میں واپس چلی گئیں۔ یہاں وہ بڑی تشویش سے آپؐ کا انتظار کرتی رہیں لیکن حضرت محمدؐ واپس نہ آئے۔ آپؐ نہ اس رات واپس آئے نہ دوسرے دن اور دوسری رات۔ پھر یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ آپؐ نے تمام بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ اس سے

ل؎ آپ کی اکثر ازواج عرب کے بڑے بڑے اونچے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس لئے وہ ایک کنیز (حضرت ماریہ قبطیہ) کو برابر کا درجہ دینے پر معترض تھیں۔ آنحضورؐ کے سمجھانے پر بھی جب مطمئن نہ ہوئیں

شہر میں ایک ہیجان پھیل گیا۔ حضرت عائشہؓ کے ہار نے قصے کے بعد سے اتنی سرگرمی اور اتنی افواہ در افواہ دیکھنے اور سننے میں نہیں آئی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے باری باری اپنی لڑکیوں کو بہت سخت سست کہا اور رنجیدہ ہو کر اپنے گھروں میں جا بیٹھے۔ اپنے آقا کے ناراض ہو جانے کے علاوہ انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ اگر عائشہؓ اور حفصہؓ کو طلاق ہو گئی تو خود ان کے اپنے مستقبل پر بھی اثر پڑے گا۔

آخر کار جب حضرت محمدؐ نے تین ہفتے سے زیادہ تک کسی سے کوئی بات چیت نہ کی تو حضرت عمرؓ اس تعطل کو مزید برداشت نہ کر سکے۔ آپ برج کے اندر چلے گئے اور دریافت کیا کہ کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟ پہلے تو آپؐ خاموش رہے لیکن کچھ دیر بعد جب حضرت عمرؓ غصہ سے پیچ و تاب کھانے لگے تو آپؐ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ حضرت عمرؓ کو اس سے کچھ اطمینان ہوا تو باہر آئے اور مسجد کے قریب احوال دریافت کرنے والے مجمع کو بتایا کہ رسول اللہ کی حرم سے مفارقت عارضی ہے۔ آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو بھی اس کا یقین دلایا۔

اس غیر حاضری کے چوتھے ہفتے کے اختتام کے قریب حضرت محمدؐ حرم میں تشریف لائے اور سیدھے حضرت عائشہؓ کے ہاں چلے گئے اور ان کی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ آپؐ بالکل نہ مسکرائے اور انکی طرف شکایت آمیز نظروں سے دیکھا لیکن آپؐ کے اس رویہ سے متاثر ہونے کی بجائے حضرت عائشہؓ ہنسیں اور کہا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے۔ آپؐ نے کہا تھا کہ ایک ماہ تک نہیں آئیں گے۔"

آپؐ بھی جواب میں ہنس دیئے اور فرمایا "یہ مہینہ کل اٹھائیس[1] دن ہی کا تو ہے۔"

لیکن یہ مصالحت آپؐ کو حضرت ماریہؓ قبطیہ کے پاس جانے سے نہ روک سکی۔ انہیں آپؐ نے شہر میں منتقل کر دیا تھا اور آپؐ وہاں پر پابندی کے ساتھ جاتے رہے۔ ان کے حرم میں آنے

تو آپؐ کچھ عرصہ کے لئے کنارہ کش ہو گئے۔ یہ کوئی غیر فطری بات نہ تھی۔ لیکن منافقین نے اس میں بہت سے گل پھندنے لگا دیئے اور اس کے ساتھ بہت سی افواہیں اور غیر مصدقہ باتیں شامل ہو گئیں جیسا کہ مصنف نے بھی لکھا ہے۔ علامہ شبلی نے سیرۃ النبی میں صحیح واقعات تفصیل سے لکھے ہیں (مترجم)

[1] کوئی قمری مہینہ اٹھائیس دن کا نہیں ہوتا۔ غالباً انتیس مہینہ تھا۔

کے ایک سال بعد حضرت ماریہؓ قبطیہ سے آپؐ کے ہاں ایک لڑکا تولد ہوا جن کا نام ابراہیمؑ رکھا گیا۔ آپؐ بہت خوش ہوئے۔ لیکن اس اداسی کو محسوس نہ کر سکے جو اس خبر نے حرم میں پیدا کر دی تھی۔ بہر حال بچہ پاؤں چلنے سے پہلے ہی فوت ہوگیا اور حضرت محمدؐ کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ بایں ہمہ حضرت ماریہؓ مستقل طور پر آپؐ کے ساتھ رہیں اور آپؐ کی وفات کے پانچ سال بعد تک زندہ رہیں۔ یہ قیاس کر لینا ہرگز درست نہیں کہ چونکہ حضرت محمدؐ کا فرصت کا زیادہ وقت اپنی ازواج کے پاس گزرتا تھا تو آپؐ زن مرید قسم کے شوہر ہوں گے۔ وقت اور موقعہ کا لحاظ رکھتے ہوئے آپؐ اپنی بیویوں سے بڑے احسن طریقے اور حسن تدبیر سے عہدہ برا ہوتے تھے۔ درحقیقت آپؐ عورتوں کے متعلق بہت کچھ جانتے تھے۔ اس پیچیدہ مسئلہ پر جس نے ہر زمانے کے مردوں کو پریشان رکھا ہے۔ آپؐ کی ایک نصیحت انتہائی دانشمندانہ تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ عورتوں کی فطرت کو کتنی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ درحقیقت یہ اس قدر دانشمندانہ تھی کہ اگر اس پر کسی قوم کسی ملک اور کسی زمانے میں عمل پیرا ہوا جائے تو یہ عورتوں اور مردوں میں ہزار بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کا موجب ثابت ہو سکتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:۔

"اپنی عورتوں سے جو تمہاری ہی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں۔ نرمی سے پیش آؤ

---

۱ حضرت ابراہیمؑ ۸ ہجری میں پیدا ہوئے اور سولہ یا سترہ ماہ کی عمر میں ہی وفات پا گئے یہ غالباً ۶۳۰ء کا واقعہ ہے جب آپؐ غزوہ تبوک سے فارغ ہو کر واپس آچکے تھے۔ آپؐ کو ان صاحبزادے کی وفات پر بے حد صدمہ ہوا اور تقاضائے بشریت کے سبب شدتِ غم سے آپؐ پر سکوت طاری ہوگیا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا "اے ابراہیم۔ اگر موت ایک امر حق اور سچا وعدہ نہ ہوتا اور پیچھے رہ جانے والے آگے جانے والوں سے نہ جا ملا کرتے تو ہم تجھ پر اس سے بھی زیادہ غم کا اظہار کرتے" مزید فرمایا "آنکھ روتی ہے اور دل غمزدہ ہے لیکن ہم اس بات کے سوا جو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے والی ہو کوئی بات منہ سے نہیں نکالتے۔ اے ابراہیم ہم غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے ہیں" (حیات محمدؐ) حضرت ابراہیم کی قبر جنت البقیع میں حضرت ماریہؓ قبطیہ اور دیگر ازواج مطہرات کی قبور کے نزدیک ہی تاحال موجود ہے (مترجم) حضرت ابراہیم ذی الحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے جب آنحضورؐ کی عمر ۶۰ سال تھی (تاریخ طبری) وفات ۱۱ ربیع الاول ۱۰ھ طبقات ابن سعد

اور اچھا سلوک کرو۔ اگر تم پسلی کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی اور اس لئے وہ جیسی بھی ہیں انہیں ان کی تمام کمزوریوں کے ساتھ قبول کر لو۔"

آپؐ اپنے قدیم دوست حضرت ابوبکرؓ کی طرح نہیں تھے جو چار مرتبہ شادی کرنے کے باوجود کہا کرتے تھے:

"عورتیں ایک فتنہ ہیں لیکن بڑی خرابی یہ ہے کہ ان کے بغیر گذارہ بھی نہیں۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ آپؐ ہمہ گیر خوبیوں کے مالک تھے۔ آپؐ اپنے ذہن اور صلاحیتوں کو بیک وقت کئی طرف لگا سکتے تھے۔ اگر ایک طرف مہذب دنیا کے حکمرانوں کی طرف سفارتیں بھیج رہے ہیں تو دوسری طرف آپؐ ایک گھونگریالے بالوں والی کنیز کی طرف متوجہ ہیں اور حاسد بیویوں کے ہاتھوں اپنے لئے مصیبت کھڑی کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ آپؐ ایک لشکر تیار کرنے میں مصروف ہیں، جو تیزی سے نقل وحرکت کر کے کاری ضرب لگا سکے۔ ماتحت افسران کو تربیت دی جا رہی ہے۔ سپاہ کو منظم کیا جا رہا ہے۔ ہتھیاروں کو نئی ضرورت کے مطابق ڈھالا جا رہا ہے اور بدوی حملہ آوروں کے فرسودہ جنگی طریقوں کو چھوڑ کر نئے طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ اگست ۶۲۸ء میں حضرت محمدؐ نے اپنی نئی فوج کی آزمائش کی اور اس کو خیبر[1] کی یہودی بستی سے لڑانے کے لئے لے گئے جو شام کی شاہراہ کے پہلو میں واقع تھی۔

یہودی بھی، جن پر حملہ ہونا تھا ایک جنگجو قوم کے افراد تھے اور اس زمانے کے اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح وہ بھی مانے ہوئے لڑاکا تھے۔ جو آب اور ابنیر کے نبرد آزما یہودیوں کی اولاد ہونے کے سبب وہ بھی اسی طرح جنگ کر سکتے تھے جیسے عرب۔

اس لشکر کشی کی تین بڑی وجوہات یہ تھیں:۔

(۱) حضرت محمدؐ اپنے قرب میں یہودیوں کی موجودگی کو پسند نہ کرتے تھے۔ بار بار کی تنبیہہ کے باوجود غالباً انہوں نے کوئی سبق نہ سیکھا تھا۔ جب بھی موقعہ ملتا وہ مسلمانوں کے لئے کوئی

---

[1] خیبر مدینہ منورہ کے شمال میں یہودیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا اور کئی مضبوط قلعوں پر مشتمل تھا۔ علاقہ نخلستانی اور زرخیز تھا۔

نہ کوئی مصیبت کھڑی کر دیتے تھے۔ اور بنی نضر کے یہودی تو اکثر ایسا کرتے تھے۔ مدینہ سے صحیح و سالم نکل جانے کی اجازت ملنے پر ان لوگوں کو اس سے بہتر اور کوئی بات نہ سوجھی کہ قریش سے جا ملیں۔ ان میں سے کچھ خیبر کے نخلستان میں جا بسے تھے۔

(۲) آپؐ اس مایوسی اور دل شکستگی کی تلافی کرنا چاہتے تھے جو مسلمانوں کو ان کے نظریے کے مطابق حدیبیہ میں ہوئی تھی۔

(۳) اور غالباً ایک تیسرا سبب بھی تھا اور وہ یہ کہ آپؐ اپنی نئی فوج کو آزمانا چاہتے تھے۔

خیبر ایک ایسا علاقہ تھا جس میں باغات، کھیتی باڑی اور کھجوروں کے ذخیروں کے علاوہ کئی قلعے بھی تھے۔ درمیان میں ایک بڑا قلعہ بھی تھا جو بہت سے محاصروں کا مقابلہ کر چکا تھا یہ ایک ایسی مہم تھی جو یہ بتا سکتی تھی کہ آیا آپؐ کی فوج آپؐ کی توقع کے مطابق تربیت حاصل کر چکی ہے؟

مسلمانوں کے لشکر میں سولہ سو پوری طرح مسلح جنگجو تھے۔ جن میں سے دو سو بہت

لہ خیبر پر لشکر کشی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے سردار ابو رافع سلام بن ابی الحقیق نے تمام یہودی قبائل اور غطفانیوں کو ملا کر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں لیکن وقت پر پتہ لگ گیا اور سلام کو ایک خزرجی (مدنی) مسلمان نے اس کے قلعہ میں پہنچ کر رات کو سوتے ہوئے قتل کر دیا۔ اس کے جانشین اُسیر بن رزام نے طوفانی دورہ کر کے دوبارہ لشکر اکٹھا کیا۔ بنو غطفان کو اپنے ساتھ ملایا اور مدینہ پر فوج کشی کی زور شور سے تیاری کی۔ آنحضورؐ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کو تیس آدمی دے کر صورتحال کا عینی جائزہ لینے کے لئے بھیجا۔ انہوں نے خیبر کی حکومت مستقل طور پر دلانے کا لالچ دے کر اُسیر کو اتنے ہی آدمی لے کر مدینہ چلنے پر آمادہ کیا لیکن جب راستہ میں اس کی نیت خراب دیکھی تو اسے اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا۔ اس طرح خیبر پر فوج کشی ناگزیر ہو گئی اگر مسلمان غفلت کرتے تو مدینہ پر حملہ ہو جانا یقینی تھا۔ اب تک لڑائیاں دفاعی تھیں لیکن یہ اپنے دفاع میں پہلی فوج کشی تھی۔ یہ محرم ۷ ہجری کا واقعہ ہے۔ (سیرۃ النبی حصہ اول)

لہ خیبر میں چھ قلعے تھے۔ سالم۔ قموص۔ نطاۃ۔ قصارہ۔ شق اور مربط۔ قموص سب سے زیادہ بڑا اور مضبوط قلعہ تھا۔ مرحب اس قلعہ کا سردار تھا۔ ایک قلعہ ناعم بھی تھا۔ یعقوبی کے بیان کے مطابق ان قلعوں میں فوج کی مجموعی تعداد بیس ہزار سے کم نہ تھی۔ (سیرۃ النبی۔ حصہ اول)

کر چکی ہے۔

مسلمانوں کے لشکر میں سولہ سو پوری طرح مسلح جنگجو تھے جن میں سے دو سو بہت اچھے گھوڑوں پر سوار رسالے کے جوان تھے۔ باقی کے پاس تیز رفتار سانڈنیاں تھیں۔ حضرت محمدؐ کا مستقل عملہ معمول کے مطابق آپؐ کے ساتھ تھا یعنی حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؑ اور زیدؓ۔ خوش قسمتی سے ہمرکابی کا قرعہ حضرت اُم سلمہؓ کے نام نکلا تھا اور اس طرح وہ ایک مرتبہ پھر لشکر کے ساتھ تھیں۔ کچھ اور عورتیں بھی ساتھ تھیں۔

جنگی تاریخ میں یہ غالباً پہلا موقعہ تھا کہ حضرت محمدؐ اپنے ساتھ مجاہدین کی بیویوں کو زخمیوں کی دیکھ بھال کے لئے لے جا رہے تھے۔ اب تک عورتیں فوجوں کے ساتھ جنگی مہموں میں کنیزوں اور لونڈیوں کی حیثیت سے جاتی تھیں یا پھر سپاہیوں کو بہادری پر اکسانے کے لئے۔ جیسے ہند (ابوسفیان کی بیوی) اور اس کی ہمجولیاں اُحد کی لڑائی میں شریک ہوئی تھیں۔ لیکن اس سے پہلے عورتوں کو میدانِ جنگ میں ان سے ان کا صحیح اور فطری کام لینے کے لئے لے جانے کا کسی کو خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔

اور یہ بھی پہلا موقع تھا کہ اسلامی لشکر اپنے ساتھ مشہور سیاہ علم، جسے عقاب یا سیاہ عقابؒ کہتے تھے، لئے ہوئے تھا۔ یہ حضرت عائشہؓ کی ایک چادر سے بنایا گیا تھا۔ بعد کے سالوں میں یہ عَلَم حضرت خالد بن ولیدؓ اور ان کے طوفانی رسالے کا نشان ہونے کے سبب عساکرِ اسلام کے مشہور ترین نشانوں میں سے ایک نشان بن گیا تھا۔

لہ یہ پہلا موقع تھا کہ بڑے جھنڈے (رایة) ساتھ لئے گئے۔ ورنہ پہلے غزوات میں صرف "لوا" یا چھوٹے پرچم ہوتے تھے۔ اس لشکر کے ساتھ دو رایت یا بڑے جھنڈے تھے۔ ایک رایت سیاہ تھا۔ (جو حضرت عائشہؓ کی چادر سے بنایا گیا تھا) جس کا نام 'العقاب' تھا جو حضرت علیؑ کو دیا گیا تھا۔ دو اور جھنڈے سعد بن عبادہ اور حباب بن منذر کو دیئے گئے۔ آپؐ کا اپنا 'لوا' یا پرچم سفید تھا۔
(طبقات ابن سعد۔ جزو ثانی)

جن قبیلوں یا لوگوں نے مکہ کی مہم میں ساتھ جانے سے احتراز کیا تھا ان میں سے بعض نے اب اپنی خدمات پیش کیں لیکن حضرت محمدؐ نے انہیں ساتھ لے جانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا[1] کہ اگر وہ غیر منفعتی مہموں میں جانے کی تکلیف گوارا نہیں کر سکتے تو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اس منفعتی مہم میں شریک ہوں۔

مدینہ اور خیبر کا درمیانی فاصلہ ایک سو میل سے کچھ زیادہ ہے۔ معمول کے مطابق ایک فوج کو وہاں تک پہنچنے میں پانچ دن لگتے ہیں۔ حضرت محمدؐ جانتے تھے کہ اس قدر مسلح اور قلعہ بند دشمن کو زیر کرنے کے لئے صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ ان پر اچانک حملہ کیا جائے۔ آپؐ نے یہ فاصلہ لمبی منزلیں مار کر تین روز میں طے کر لیا اور چوتھی صبح کو منہ اندھیرے آپؐ دشمن کے علاقہ میں پہنچ گئے۔ اس ہونے والے حملہ کا کسی کو شبہ[2] تک نہ تھا۔ یہودیوں کو پہلے پہل اس بات کا علم اس وقت ہوا جب ابھرتے سورج کی کرنیں مسلمانوں کے خود اور چار آئینوں پر

---

[1] طبقات ابن سعد کے مطابق آپ نے یہ اعلان کیا تھا: "لا یخرجن معنا الا راغب فی الجهاد" یعنی ہمارے ساتھ صرف وہ لوگ آئیں جو طالب جہاد ہوں۔

ڈاکٹر ہیکل ' اپنی کتاب 'حیات محمدؐ' میں لکھتے ہیں کہ آنحضورؐ نے اس مہم میں صرف ان لوگوں کو شرکت کی اجازت دی جو حدیبیہ میں حاضر تھے اور سورہ فتح کی یہ آیت "سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ .... لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا"، آپؐ کے پیش نظر تھی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حدیبیہ میں شریک نہ ہونے والے لوگ جب تم مال غنیمت حاصل کرنے جاؤ گے تو کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ہمراہ لے چلو.... اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہ آؤ۔" (حیاۃ محمدؐ" مترجمہ مولانا وارث کامل)

[2] یہودیوں نے بنو غطفان کو بھی ساتھ ملا لیا تھا۔ آنحضورؐ کو اس کا علم تھا کہ یہ قبیلہ ضرور یہودیوں کی امداد کو آئے گا۔ چنانچہ آنحضورؐ نے رجیع کے مقام پر فوجیں اتاریں جو غطفان اور خیبر کے درمیان ہے۔ تاکہ یہود اور غطفان یکجا نہ ہو سکیں۔ خیبر پر لشکر کشی کی خبر سن کر غطفان نے خیبر کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن یہ دیکھ کر کہ اسلامی لشکر درمیان میں حائل ہے اور خود اپنا گھر خطرے میں ہے فوراً واپس چلے گئے۔ (سیرۃ النبی۔ حصہ اول)

پڑ کر چکا چوند پیدا کرنے لگیں۔ چنانچہ فوراً ہی ایک آواز یا منادی بلند ہو کر ایک باغ سے دوسرے باغ، ایک کھیت سے دوسرے کھیت اور ایک قلعہ سے دوسرے قلعہ تک گونجتی چلی گئی اور وہ آواز تھی "محمدؐ - واللہ محمدؐ - ان کا لشکر آگیا - ہوشیار"[1]

یہ سنتے ہی سب بھاگ کھڑے ہوئے اور قلعوں اور آبادیوں میں پناہ لے لی۔ حضرت محمدؐ جانتے تھے کہ اس مرتبہ کسی شاندار فتح یا دشمن کو محصور کرکے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دینے کا امکان نہ تھا اور یہ بھی کہ آپؐ کی یہ لڑائی منتخب اور چھٹے ہوئے یہودیوں سے تھی اور ان پر فتح حاصل کرنے کے لئے آپؐ کو فوج کو لڑانے کی تمام صلاحیتیں اور اپنی سپاہ کی تمامتر بہادری بروئے کار لانا ہوگی۔ آپؐ نے اپنی مہم کا آغاز چھوٹے قلعوں[2] کو ایک ایک کر کے سر کرنے سے کیا۔ جب ان چھوٹے قلعوں اور گڑھیوں سے فارغ ہو گئے تو خیبر کے سب سے بڑے قلعہ القاموص پر چڑھائی کی۔ یہ ایک بڑا مضبوط قلعہ تھا جس کی حوصلہ شکن فصیلیں کھڑی چٹانوں کو تراش کر بنائی گئی تھیں۔ تمام راستوں اور دروازوں کو بہت مستحکم طریقے پر مورچہ بند کر دیا گیا تھا اور قلعہ کے اندر ایک پوری طرح مسلح فوج رسد اور خوراک کے بھرپور ذخیروں کے ساتھ موجود تھی۔ حملہ کرنے سے پہلے حضرت محمدؐ نے سارے لشکر کو اپنے سامنے جمع کیا اور یہ دعا مانگی۔

"اے اللہ - اے ساتوں آسمانوں کے مالک اور جو کچھ چیزیں ان میں ہیں اور اے ساتوں زمینوں کے مالک اور جو کچھ ان میں ہے اور اے بری ارواح پر قدرت رکھنے والے اور ان کے بھی جن کو وہ بہکاتی ہیں۔ اے ہواؤں کے مالک اور جن کو وہ بکھیرتی اور اڑاتی ہیں، ہم تجھ سے التجا کرتے ہیں کہ اس شہر کو اور اس کی زمینوں کی تمام قیمتی پیداوار کو ہمارے قبضہ میں دے دے - ہم ان لوگوں کے خلاف اور ان تمام مشکلات کے دور کرنے کے

---

[1] طبقات ابن سعد - جزو ثانی - ابن سعد نے یہ روایت حضرت انسؓ سے کی ہے۔

[2] سب سے پہلے قلعہ ناعم پر قبضہ ہوا۔ اس کے بعد صعب بن معاذ کا قلعہ ہاتھ آیا - جس میں رسد اور خوراک کا ذخیرہ تھا - اور اس طرح اسلامی سپاہ کی رسد کی شدید قلت دور ہو گئی -

لئے جو ہمیں گھیرے ہوئے ہیں تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔

تمام پیدل اور سوار دستوں سے آمین آمین کی صدا بلند ہوئی۔

ایک لمحہ اللہ تعالیٰ سے لو لگانے کے بعد ہر شخص لڑائی کے کٹھن کام میں مصروف ہو گیا۔ حضرت محمدؐ نے اس وقت محسوس کیا کہ جس مہم کو سر کرنے کا بیڑا آپؐ نے اٹھایا تھا وہ آپؐ کی توقع سے کہیں زیادہ مشکل تھی اور آپؐ کی سپاہ کے لئے رسد کی قلت[2] نے صورت حال کو اور زیادہ سنگین بنا دیا تھا۔

عرب کبھی زیادہ خوراک ساتھ لے کر نہیں چلتے۔ وہ اس کے لئے زیادہ تر دوستوں کی مہمان نوازی یا دشمن سے لوٹ مار پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس عرصہ میں کہ بیرونی قلعے مسخر ہوں یہودیوں کو اپنی کھیتیاں جلانے اور مال مویشی شہر کے اندر ہانک لانے کا موقعہ مل گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ خانہ بدوش لوگ جو صحراؤں میں گھوڑے دوڑانے کے عادی تھے محاصرے کی لڑائی سے ناواقف تھے اور مدینہ میں خندق کے دفاع نے ان کو قلعوں پر حملہ کرنے کا کوئی سبق نہیں سکھایا تھا۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمدؐ کو وحی یا الہام کے ذریعہ جنگ کے ان نئے طریقوں کا علم ہو گیا تھا جن کے متعلق بادی النظر میں آپؐ بھی اتنے ہی لاعلم اور ناتجربہ کار تھے جتنے آپؐ کے لوگ۔ چنانچہ آپؐ نے محاصرہ کی کچھ کلیں وہاں موقعہ پر ہی بنوالیں۔ ان میں سب سے زیادہ موثر کھجوروں کے تنوں سے بنائی ہوئی منجنیقیں تھیں جن سے پتھر برسا کر آخر کار فصیل میں ایک چھوٹا شگاف ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس شگاف پر حضرت ابوبکرؓ نے ایک دستے کے ساتھ بڑی بہادری سے حملہ کیا لیکن انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ پھر حضرت عمرؓ نے کوشش کی۔ گو وہ شگاف تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے لیکن انہیں بھی اپنے بہت سے جوان ضائع کرا کے واپس آنا پڑا۔ آخر کار حضرت علی کرم اللہ وجہہ سیاہ علم لے کر فصیل پر حملہ آور ہوئے۔

---

[1] علامہ شبلی نے "سیرۃ النبی" میں ابن ہشام کے حوالے سے یہ مختصر دعا نقل کی ہے: "اِنَّا نَسْئَلُکَ خَیْرَ هٰذِہِ الْقَرْیَۃِ وَ خَیْرَ اَھْلِھَا وَخَیْرَ مَا فِیْھَا وَنَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّھَا وَشَرِّ اَھْلِھَا وَشَرِّ مَا فِیْھَا"

[2] رسد کی قلت کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے قلعہ ناعم یا صعب بن معاذ کے قلعہ کے فتح ہو جانے سے یہ قلت دور ہو گئی تھی۔

آپ یہ رجز پڑھتے ہوئے حملہ کے لئے بڑھے۔

"میں علی شیر ببر ہوں۔ ایسا شیر جو جنگل میں ڈکارتا ہے اور میں اپنے دشمنوں کے لئے مہیب دیو ہوں۔"

علی کرم کوئی دیو نہ تھے لیکن آپ کے قد کی کمی ایک چوڑے چکلے سینے اور بے انتہا طاقت نے پوری کر دی تھی۔ آج آپؑ ایک سرخ قبا پہنے اور سینے اور کمر پر چمکتا چار آئینہ لگائے بڑے پر عظمت نظر آرہے تھے۔ آپؑ کے سر پر ایک نوکدار چاندی سے مڑھا ہوا خود چمک رہا تھا۔ اور آپؑ اپنے دائیں ہاتھ میں حضرت محمدؐ کی ذاتی تلوار ذوالفقار لئے لہرا رہے تھے جو آپؑ کو سیاہ علم[1] کے ساتھ ہی دی گئی تھی۔

یہودیوں کے نامور جنگجو بار بار حضرت علی کرم پر یلغار کر رہے تھے اور ہر بار وہ اپنا سر یا کوئی عضو قلم کرا کے لڑکھڑاتے پیچھے ہٹتے تھے۔ آخر کار یہودیوں کا نامی گرامی پہلوان اور نبرد آزما مرحب[2]، جو قد میں تمام جنگ آزماؤں سے نکلتا ہوا تھا، خم ٹھونک کر حضرت علی کرم کے سامنے

---

[1] یہ علم 'علم نبوی' تھا اور حضرت عائشہؓ کی سیاہ چادر سے تیار کیا گیا تھا۔ (سیرۃ النبی۔ حصہ اول)

[2] مرحب قلعہ سے یہ رجز پڑھتا ہوا نکلا تھا۔

قد علمت خیبر انی مرحب	خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں
شاکی السلاح بطل مجرب	دلیر نبرد آزما اور سلاح پوش ہوں

حضرت علی کرم مرتضیٰ نے جواباً یہ رجز پڑھا۔

انّ الذی سمّتنی اُمّی حیدرہ	میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام شیر رکھا ہے
کلیث غابات کریہ المنظر	میں شیر نیستان کی طرح مہیب اور خوفناک ہوں

(سیرۃ النبی۔ حصہ اول)

طبری نے بریدہؓ کے حوالے سے رجز اس طرح لکھا ہے۔

ان الذی سمّتنی اُمّی حیدرہ   اکیلکم بالسّیف کیل السندرہ

کلیث بغابات شدیدٌ قسورہ

ترجمہ:۔ میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر (شیر رکھا ہے) میں تلوار سے تمہیں اس طرح کاٹ دوں گا جیسے آگ کا پودا۔ میں نہایت تند خو شیر نیستان ہوں۔

آیا۔ وہ دوہری زرہ بکتر پہنے ہوئے تھا۔ خود کے گرد ایک بہت بڑا عمامہ باندھا ہوا تھا جسے ایک بڑا ہیرا اپنی جگہ قائم رکھے ہوئے تھا۔ کمر کے گرد ایک طلائی پیٹی بندھی ہوئی تھی جس سے دو تلواریں لٹکی ہوئی تھیں۔ البتہ وہ انہیں استعمال نہیں کر رہا تھا اور ایک لمبے تین پھلوں والے نیزے یا ترسول سے اپنے دائیں اور بائیں لوگوں کو مار رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے لڑائی رک گئی اور سپاہی اپنے ہتھیاروں پر ٹیک لگا کر مقابلہ دیکھنے لگے۔

گولیاتھ[1] کی طرح مرحب نے بھی کبھی کسی سے شکست نہیں کھائی تھی۔ اس کا قد و قامت ہی اتنا بڑا تھا کہ مقابل اس کے قریب آنے سے پہلے ہی خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ اور اس کا ترسولی نیزہ اچھے اچھے شمشیر زنوں کے چھکے چھڑا دیتا تھا۔

مرحب نے حملہ میں پہل کی اور اپنے ترسولی نیزے سے حضرت علیؓ کرم پر وار کیا۔ ایک لمحہ کے لئے تو حضرت علیؓ کرم، جو اس ہتھیار کی لڑائی سے ناواقف تھے، کچھ کمزور پڑے لیکن پھر سنبھل گئے اور یہودی پر تلوار سے حملہ کیا۔ ایک دو داؤں میں ہی آپ نے اس کا نیزہ ہوا میں اچھال دیا اور اس سے پہلے کہ مرحب اپنی کوئی تلوار نکالے حضرت علیؓ کرم کی ذوالفقار نے خود اور عمامہ کاٹ کر اس کا سر اس طرح دو ٹکڑے کر دیا کہ آدھا سر ایک شانے پر اور آدھا دوسرے شانے پر گرا۔[2]

یہ دیکھ کر کہ ان کا نامور جنگجو مارا گیا یہودی شہر میں واپس چلے گئے۔ حضرت محمدؐ نے عام حملے کا حکم دے دیا۔ مسلمانوں نے یورش کی اور حضرت علیؓ کرم نے حملے کی قیادت کی۔ مقابلے میں آپ کی ڈھال ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی تو آپ نے اس کی بجائے فوراً (غالباً فصیل کے)

---

[1] گولیاتھ یا جالوت۔ فلسطینیوں کا نامور پہلوان جسے حضرت داؤد علیہ السلام نے مار کر شہرت حاصل کی تھی۔ مرحب کو خیبر کا جالوت قرار دیا ہے۔

[2] ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی کا بیان ہے کہ مرحب کو محمد بن مسلمہؓ نے مارا تھا۔ لیکن صحیح مسلم اور حاکم میں حضرت علی مرتضیٰ کو ہی مرحب کا قاتل اور فاتح خیبر لکھا ہے۔ اور یہی صحیح ترین روایت ہے۔ (سیرۃ النبی۔ حصہ اول)

دروازے کا ایک کواڑ مع چولوں کے اکھاڑ لیا۔ اور اسے ڈھال کے طور پہ آگے لئے بڑھے لیکن اب آپؐ کو اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ جونہی مسلمانوں نے اس شگاف میں سے ایک سیل رواں کی طرح اندر یلغار کی، شہر کے لوگ گھروں میں گھس گئے۔ جنہوں نے ہتھیار نہ ڈالے وہ مارے گئے۔ پھر شہر کو لوٹا گیا۔ جب مسلمانوں کو وہاں کوئی خزانہ نہ ملا جس کی وہاں ہونے کی توقع تھی، تو انھوں نے خیبر کے سردار[2] کو اذیتیں دے کر مار ڈالا۔ اور سردار کی جوان بیوی صفیہؓ کے علاوہ سارے یہودی شہر بدر کر دیئے گئے۔

حضرت صفیہؓ[3] بنی قریظہ کے اس یہودی حاکم کی لڑکی تھیں، جو غزوہ خندق کے بعد مدینہ میں

---

[1] طبری نے ابو رافع مولیٰ رسول اللہ سے روایت کی ہے کہ لڑائی کے دوران ایک یہودی نے حضرت علیؓ پر تلوار ماری جس سے ان کی ڈھال گر پڑی تو آپ نے قلعہ کے پاس سے ایک دروازہ اٹھالیا اور اس سے ڈھال کا کام لینے لگے وہ اسے اوپر اٹھائے برابر لڑتے رہے۔ معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ یہ کواڑ پتھر کا ہونے کے سبب بہت وزنی تھا۔ ابو رافع یہ بھی کہتے ہیں کہ بعد میں ہم آٹھ آدمیوں نے مل کر اٹھانا چاہا تو نہ اٹھا سکے۔ صاحب حیات محمدؐ نے لکھا ہے کہ یہ در اتنا مضبوط اور بڑا تھا کہ اسے بعض جگہ آپ نے پل کے طور پر استعمال کیا اور مسلمان اس پر سے گزر کر قلعہ میں داخل ہوئے۔ علامہ شبلی نے علامہ ذہبی کے حوالے سے اس روایت کو مبالغہ آمیز قرار دیا ہے۔

[2] خیبر کے یہودیوں کے اس سردار کا نام کنانہ بن ربیع تھا جو حضرت صفیہ کا شوہر بھی تھا۔ یہ روایت غلط ہے کہ چھپے خزانہ کا پتہ نہ بتانے کے سبب اسے اذیتیں دے کر قتل کر دیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے محمودؓ بن مسلمہ کو جنہوں نے قلعہ ناعم پر یلغار کی تھی، قلعہ پر سے ایک وزنی پتھر گرا کر شہید کر دیا تھا۔ ان کے بھائی محمد بن مسلمہ نے اسے قصاص کے طور پر قتل کر دیا۔ (سیرۃ النبی۔ حصہ اول)

[3] حضرت صفیہؓ حی اخطب بنی نضیر کے مشہور سردار کی بیٹی تھیں جنہیں مدینہ میں بنی قریظہ کی لڑائی میں خیبر سے آکر ان کا ساتھ دیا اور ان کے ساتھ ہی جنگ خندق کے بعد قتل کر دیا گیا تھا۔ خیبر میں آکر حضرت صفیہؓ کی وہاں کے سردار کنانہ بن ربیع سے شادی ہو گئی۔ کنانہ بھی جنگ خیبر میں قتل ہو گیا اور حضرت صفیہ مع دوسری یہودی عورتوں کے آنحضورؐ کے سامنے پیش کی گئیں۔ اس سلسلہ میں مختلف روائتیں ہیں۔ ایک یہ بھی ہے کہ پہلے آپؐ نے انہیں دحیہ کلبی کو دے دیا تھا پھر خود لے لیا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ لوگوں نے آپؐ سے کہا کہ صفیہؓ ایک بہت معزز سردار کی بیٹی اور بیوی

بنو قریظہ کے یہودیوں کے ساتھ قتل کیا گیا۔ وہ ایک بیحد خوبصورت، موقع شناس اور زیرک خاتون تھیں۔ جونہی وہ قید کر کے حضرت محمدؐ کے سامنے لائی گئیں انہوں نے اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلایا آپؐ ان کی خوبصورتی سے بھی متاثر ہوئے اور ان پر اپنی عبا ڈال دی جو اس بات کی نشانی تھی کہ اُسے آنحضرتؐ نے اپنی پناہ میں لے لیا ہے اور جب تھوڑی دیر بعد آپؐ نے انہیں لشکر سے علیحدہ کر لیا تو لوگ سمجھ گئے کہ حرم میں ایک اور بیوی کا اضافہ ہو رہا ہے۔ شادی کی خوشیاں بھی خیبر کی فتح کے جشن کی ضیافت میں شامل کر دی گئیں۔ یہودیوں نے کھانے پینے کی بہت سی اچھی اشیاء کا محاصرے کے سبب شہر میں ذخیرہ کیا تھا۔ وہ تمام کی تمام مسلمان سپاہیوں کو پیٹ بھر کر کھانے کو ملیں کیونکہ کچھ دنوں سے وہ نصف خوراک پر گذارہ کر رہے تھے۔

ضیافت ختم ہونے پر حضرت محمدؐ نے اپنا اونٹ حضرت صفیہؓ کے خیمے کے سامنے بٹھایا اور اپنا زانو جھکا کر انہیں خود سوار کرایا۔ پھر آپؐ انہیں اپنے خیمہ میں لے گئے۔

حضرت صفیہؓ کے حرم میں داخل ہونے پر ایک مرتبہ پھر ایک طوفان اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔ لیکن حضرت صفیہؓ جتنی حسین تھیں اتنی ہی زیرک اور سمجھدار بھی تھیں۔ اس لئے حالات پر بڑی ہوشیاری اور عزم سے قابو پا لیا۔ انہوں نے بہت جلد حرم کی اندرونی سیاست کا اچھی طرح جائزہ لے لیا اور حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ کے ساتھ شامل ہو گئیں گو آپ مسلمان ہو گئی تھیں لیکن اس کے باوجود حرم میں اپنی جگہ بنانا اتنا آسان نہ تھا اور آپ کو اپنی اصل نسل کے متعلق بہت سے طعنے تشنے سننے پڑے۔ بہرحال جب آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے ایک بہت ہی چبھتے ہوئے طعنے کا یہ جواب دیا "میں کس بات میں تم سے کم ہوں جبکہ حضرت ہارون علیہ السلام میرے بھائی حضرت موسیٰؑ میرے چچا اور حضرت محمدؐ میرے شوہر ہیں" تو حضرت عائشہؓ سے جواب نہ بن پڑا اور پھر کبھی کچھ نہ کہا۔ بعد میں حضرت صفیہؓ نے مدینے کی اور اسلامی سیاست

ہے وہ آپ کے سوا اور کسی کے لائق نہیں۔ پھر بھی آپؐ نے ان کو پیشکش کی کہ اگر چاہیں تو آزاد ہو کر اپنے لوگوں میں چلی جائیں لیکن حضرت صفیہؓ نے آپؐ کی خدمت میں رہنے کو ترجیح دی اور آپؐ کے نکاح میں آگئیں اور بڑی وفا شعار بیوی ثابت ہوئیں۔ آنحضورؐ کی وفات کے چالیس سال بعد تک زندہ رہیں اور اسلام کی خدمت میں عملی حصہ لیا۔ (سیرۃ النبی حصہ اول)

میں کافی اہم کردار ادا کیا۔ آپ حضرت محمدؐ کے بعد چالیس سال تک زندہ رہیں۔

بہ حال جس وقت آپؐ[2] خیبر کے باہر اپنے لشکر میں، فتح و شادی کا جشن منا رہے تھے ایک ناگہانی آفت آتے آتے ٹلی اور اسلام ختم ہوتے ہوتے رہ گیا۔

توسولی نیزہ بردار (مرحب) جسے حضرت علیؓ نے قتل کیا تھا، کی ایک بہن تھی، جس کا نام زینب[1] تھا۔ وہ مسلمانوں کو برا سمجھتی تھی اور حضرت محمدؐ سے بعید متنفر تھی۔ چنانچہ اس نے مدینہ کے فوجی افسران بالا کے لئے ایک سالم بکرا بھونا اور پیش کرنے سے پہلے اسے خوب زہر پاش کیا۔ حضرت محمدؐ مسلّم بکرا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے بڑی رغبت سے طشت میں ہاتھ ڈالا لیکن جونہی پہلا لقمہ منہ میں رکھا آپؐ نے ایک چیخ ماری اور یہ کہتے ہوئے فوراً لقمہ تھوک دیا کہ اس میں زہر ہے۔

ابھی تک صرف ایک سالار[2] نے کھانا شروع کیا تھا اور وہ گوشت کے کئی ٹکڑے حلق سے اتار چکے تھے۔ چند لمحوں میں وہ فرش پر تڑپ رہے تھے اور ایک گھنٹے بعد وہ جان بحق ہو گئے۔ حضرت محمدؐ کو بھی بہت تکلیف ہوئی اور اس تکلیف نے آپؐ کو کافی عرصہ تک پریشان رکھا لیکن آپؐ معذور یا بیکار نہ ہوئے۔

جب زینب کو آپؐ کے سامنے لایا گیا تو آپؐ نے اس سے دریافت کیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اس نے جو جواب دیا وہ اگر مبنی بر خلوص نہ تھا تب بھی اس کی حاضر دماغی پر دلالت کرتا ہے۔ اس نے کہا:

"آپ نے میری قوم پر بہت ظلم توڑے ہیں۔ آپؐ نے میرے باپ اور چچا اور میرے بھائی اور خاوند کو قتل کیا ہے۔ اس لئے میں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ اگر آپؐ واقعی نبی ہوتے تو آپؐ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس

---

[1] یہ زینب سردار یہود حارث کی بیٹی اور رئیس خیبر سلام بن مشکم کی بیوی تھی۔ (تاریخ طبری) سیرۃ النبی میں مرحب کی بہن کی بجائے اسے اس کی بھاوج بتایا ہے۔

[2] یہ سردار بشر بن براء المعرور تھے۔

میں زہر ہے اور آپؐ نہیں کھائیں گے۔ لیکن اگر آپؐ بناوٹی نبی ہوئے تو آپؐ مر جائیں گے اور یہ ساری دنیا کے لئے اچھا ہوگا۔"

بعض ہمعصروں کا کہنا ہے کہ زینب کو قتل کر دیا گیا[1] لیکن کچھ کہتے ہیں کہ آپؐ اس کے جواب سے خوش ہوئے اور اسے چھوڑ دیا۔

خیبر کے یہودیوں کے ہاتھ سے نکل جانے اور بے شمار مال غنیمت، جن میں جانور، زرہیں قالین اور اسلحہ شامل تھا، حاصل کر لینے کے بعد اب حضرت محمدؐ کے پاس وہاں پر اس کے سوا اور کوئی کام نہیں رہ گیا تھا کہ مدینہ واپس آ جائیں۔ یہودیوں کی زرخیز زمینیں[2] تقسیم کر دی گئیں۔ ان میں سے نصف کو خالصہ قرار دے دیا گیا جس کا انتظام خود حضرت محمدؐ کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ باقی نصف کو ان لشکریوں میں تقسیم کر دیا گیا جنھوں نے اس جنگ میں حصہ لیا تھا۔ سرکاری خزانہ (بیت المال) طلائی سکوں سے لبالب بھر گیا تھا۔ اور یہی حال ذاتی دولت کا تھا چنانچہ جب آپؐ آہستہ آہستہ مدینہ کی طرف واپس آ رہے تھے تو آپؐ نے اپنی کامیابیوں کا جائزہ لیا۔ ہر طرح سے آپؐ فائدے میں ہی تھے۔ اگر یہود کا دیا ہوا یہ زہر آپؐ کی عمر کم نہ کر دیتا تو غالباً آپؐ کی بیشتر دلی خواہشیں آپؐ کی زندگی میں ہی پوری ہو جاتیں۔

جب اہل فدک نے جو خیبر کے قریب ہی یہودیوں کی ایک اور بستی تھی، اہل خیبر کا یہ حشر دیکھا تو از خود اطاعت قبول کر لی اور ان ہی شرائط پر ان کی اراضی ان کے پاس رہنے دی گئی البتہ چونکہ فدک، بغیر کسی جنگ کے ملا تھا۔ اس لئے فدک کے اموال رسول اللہ کا خالصہ قرار دے دیئے گئے۔ نصف بیت المال اور دیگر ملکی اخراجات کے لئے اور نصف مجاہدین کو دے دی گئی۔ سوار کے

---

[1] صحیح واقعہ یہ ہے کہ زینب کا جواب سُن کر پہلے آپؐ نے درگذر کی لیکن جب بشر بن براء اسی زہر سے انتقال کر گئے تو اُسے قصاص میں قتل کر دیا گیا۔ (سیرۃ النبی۔ حصّہ اوّل)

[2] سیرۃ النبی کے مطابق فتح کے بعد خیبر کی زمین دو حصّوں میں تقسیم کر دی گئی۔ نصف بیت المال اور دیگر ملکی اخراجات کے لئے اور نصف مجاہدین کو دیدی گئی۔ لیکن یہود نے درخواست کی کہ اراضی اُن ہی کے قبضہ میں رہنے دی جائے وہ پیداوار کا نصف ادا کریں گے۔ چنانچہ زمین یہودیوں کے پاس ہی رہنے دی گئی اور اُن سے پیداوار کا نصف وصول کیا جاتا رہا۔ ایسی ہی شرائط پر فدک کے یہودیوں نے اطاعت قبول کر لی۔

دو حصے ہوتے تھے۔ اس میں رسول اللہ کا خمس بھی تھا۔

جب آپؐ مدینہ کے قریب پہنچے اور ہوا میں جھومنے والے کھجور کے درخت نظر آنے لگے تو آپؐ کو ایک اور غیر متوقع خوشی ہوئی۔ آپؐ کی غیر حاضری میں آپؐ کے چچازاد بھائی جعفرؓ ابن ابی طالب (مع آپ کی زوجہ ام حبیبہؓ) اور دیگر مہاجرین حبشہ سے مدینہ پہنچ گئے تھے۔ جونہی مسلمانوں کا لشکر دکھائی دیا تو وہ ملنے کے لئے تیزی سے دوڑے اور ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔

آخری مرتبہ جب حضرت محمدؐ ان لوگوں سے ملے تھے تو یہ ملاقات مکہ کی تاریک گلیوں میں ہوئی تھی کیونکہ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں ہجرت کر رہے تھے اور وہ وقت ایسا تھا کہ زور سے الوداع کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ کسی کو یہ امید نہ تھی کہ وہ کبھی پھر بھی ملیں گے۔ اب وقت کتنا بدل گیا تھا۔ ایک دوسرے کو بہت بھینچ بھینچ کر اور قہقہے لگا لگا کر خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

حضرت اُم حبیبہؓ آپ کا حرم میں انتظار کر رہی تھیں۔ وہ حضرت ماریہؓ اور صفیہؓ کی طرح نہ تو بہت جوان تھیں اور نہ ہی اتنی خوبصورت، چنانچہ ان کی طرف سے دوسری ازواج کو فی الفور کوئی خطرہ نہ تھا۔ ہر ایک کو معلوم تھا کہ ان میں حضرت محمدؐ کی دلچسپی جنسی سے زیادہ سیاسی تھی۔

بہر حال حضرت ام حبیبہؓ نے اپنے لئے دانستہ طور پر حضرت اُم سلمہؓ، حضرت زینبؓ، اور حضرت فاطمہؓ کا ساتھ دینا زیادہ مناسب جانا۔ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد جو سیاسی فتنے اٹھے۔ ان میں حضرت ام حبیبہؓ حضرت عائشہؓ کی سخت اور بعض اوقات خطرناک حریف ثابت ہوئیں۔ بہر حال اس وقت حرم میں بھی فوج کا سا ضبط اور مسجد کا سا سکون تھا۔ یہ جان کر کہ اُم حبیبہؓ اور حضرت صفیہؓ نے اپنے لئے حرم میں جگہ پیدا کر لی آپؐ کو زہر کی تکلیف کے باوجود کافی سکون محسوس ہوا۔ اب آپؐ کو صرف اس عظیم دن کا انتظار تھا کہ آپؐ اپنے لوگوں کے ساتھ اپنے وطن مکہ معظمہ واپس جائیں۔

اٹھارھواں باب

ایفائے معاہدہ (عمرہ قضا) جنگ موتہ

۶۲۹ء مطابق ۸-۷ ھجری

کامیابیوں نے حضرت محمدؐ کو مغرور نہیں کیا البتہ آپؐ کی خود اعتمادی میں ضرور اضافہ ہوگیا تھا۔ اس تمام عرصہ میں آپؐ مسلسل مکّہ واپس جانے کے متعلق سوچتے رہے۔ کبھی کبھی آپؐ خود اپنی تصویر ایک فاتح ہیرو کی سی دیکھتے، جو کامیابیوں کا سہرا سر پر باندھے مکّہ والوں پر یہ ثابت کرنے کے لئے آرہا ہو کہ وہ لوگ غلطی پر تھے اور آپؐ ہی حق پر تھے۔ آپؐ کو یقین تھا کہ ایک روز آپؐ کا یہ خواب ضرور پورا ہوگا لیکن ہجرت کے بعد ساتویں سال اور ۶۲۹ء تک ایسا نہ ہوسکا۔

۶۲۸ء کا موسم سرما حضرت ابوبکرؓ صدیق اور حضرت عمرؓ کی سرکردگی میں کئی چھوٹی مہموں میں گذرا۔ نئے سال کے شروع میں آپؐ نے اعلان کیا کہ آپؐ معاہدہ حدیبیہ میں دیئے ہوئے حق کے مطابق عمرے کی ادائیگی کے لئے مکّہ جائیں گے۔

چنانچہ فروری[1] ۶۲۹ء میں حج کا سفید لباس پہنے مسلمانوں کا ایک مرتبہ پھر مدینہ کے باہر اجتماع ہوا۔ پچھلے سال کے اجتماع میں شریک ہونے والوں میں سے وہ تمام لوگ جو خیبر کی جنگ میں زندہ بچ رہے تھے موجود تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے نئے لوگ بھی شہدا اور زخمیوں کی خالی جگہ پُر کرنے اور تعداد میں اضافہ کرنے کے لئے شامل ہوگئے تھے۔ جب حضرت علیؓ نے گنتی کی تو دو ہزار سے زائد عرب موجود تھے جن کا واحد مقصد مقدس شہر میں عبادت کرنا تھا۔ ان میں سے ہر شخص

---

[1] یہ ذی قعد ۷ھ کا واقعہ ہے۔ (طبقات ابن سعد۔ جزو ثانی)

کے پاس سواری کے لئے ایک اونٹ تھا اور اجتماع کے بازو میں قربانی کے اونٹ گردنوں میں قلادے ڈالے کھڑے تھے۔

معاہدے کے مطابق ان زائرین کے پاس نیام کی ہوئی تلوار کے سوا اور کوئی ہتھیار نہ تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ ابوسفیان نے یہ سارا کھیل دھوکا دینے کے لئے نہ کھیلا ہو احتیاطی تدابیر بھی کی گئی تھیں۔ محمد ابن مسلمہؓ کی سرکردگی میں جواب تک کی تمام اسلامی جنگوں میں لڑ چکے تھے، ایک سو سواروں کا رسالہ مرکزی دستے کے آگے آگے حالات کا جائزہ لیتا چل رہا تھا اور اسی طرح عقب میں تیروں، کمانوں اور زرہوں کا ایک بڑا ذخیرہ ساتھ ساتھ تھا۔

غالباً اس مرتبہ ابوسفیان اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جونہی اعلان ہوا کہ مسلمانوں کا لشکر دکھائی دینے لگا ہے اس نے مکہ خالی کرا دیا۔[1] قالینوں چٹائیوں اور کھانے پینے کے ساز و سامان کے ساتھ اہل مکہ پہاڑیوں کی اونچی بلندیوں پر چڑھ گئے جو مقدس شہر کو گھیرے ہوئے تھیں اور وہاں اپنے خیمے لگا لئے۔ البتہ جو لوگ حضرت محمدؐ سے شدید مخالفت رکھتے تھے وہ شہر سے کافی دور چلے گئے تاکہ مقدس مقامات کی بے حرمتی اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں لیکن شہر کے دوسرے بیشتر لوگ اونچی چٹانوں پر بیٹھ کر دیکھنے لگے کہ مسلمان کیا کرتے ہیں۔

آہستہ آہستہ مسلمانوں کے دستے شمال کی طرف کی گھاٹی سے مکہ میں داخل ہونا شروع ہوئے۔ سب سے آگے آپؐ کی اونٹنی القصواء آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ حضرت محمدؐ نے جو اس راستے سے شام کے کاروانوں کے ساتھ اکثر گزرے تھے۔ دائیں بائیں کسی طرف نظر نہ کی۔ آپؐ کے اردگرد آپؐ کے اصحاب کبار حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور زیدؓ اور ان سے ذرا پیچھے بلالؓ

---

[1] مکہ کے قریب پہنچے تو قریش کی جانب سے اسلحہ لانے پر اعتراض ہوا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اسلحہ تو حفظ ماتقدم کے طور پر لے آئے ہیں جو مکہ کے باہر ہی رہے گا اور یہ کہ آپؐ معاہدے کے مطابق صرف نیام شدہ تلواروں کے ساتھ ہی شہر میں داخل ہوں گے چنانچہ تمام اسلحہ ایک دستے کی نگرانی میں بطن یاجج مکہ سے آٹھ میل ادھر ہی چھوڑ دیا (طبری بیغ النبی) سیرۃ النبی (حصہ اول) کے مطابق صرف رؤسائے مکہ نے ایسا کیا۔ غالباً بیشتر لوگ وہاں ہی رہے لیکن کعبہ کے گرد پہاڑیوں پر چڑھ گئے اور چٹانوں پر بیٹھ کر تماشہ دیکھتے رہے۔

تھے۔ ان کے پیچھے گھاٹی میں سے باقی زائرین اپنے اونٹوں پر سوار آتے دکھائی دے رہے تھے جونہی کعبہ پر نظر پڑی ایک آواز بلند ہوئی۔

لبیک۔ اللھم لبیک[1] ہم حاضر ہیں اے اللہ۔ ہم حاضر ہیں۔"

سواروں کا یہ اجتماع بیت اللہ کے احاطے کے باہر ٹھہر گیا اور جب سب پہنچ گئے تو ایک جلوس ترتیب دیا گیا جو خراماں خراماں حرم میں داخل ہوا۔ حضرت محمدؐ سب سے پہلے سواری پر ہی کعبہ کے کونے کی طرف تشریف لے گئے اور اپنے عصا سے حجر اسود کو چھوا۔ اس کے بعد آپؐ نے اور آپؐ کے ساتھیوں نے کعبہ کے گرد سات دفعہ طواف کیا۔ یہ ایک ایسی رسم تھی جو صرف مکہ سے ہی مخصوص نہ تھی بلکہ بڑے قدیم زمانے سے مختلف مذاہب میں مروج تھی مے پول[2] مقدس آگ[3] یا جیریکو کی دیوار کے گرد چکر کاٹنے کی اصل بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس رسم کے آغاز کا

---

[1] یہ اس تلبیہ کے شروع کے الفاظ ہیں جو حاجی صاحبان یا عمرہ کرنے والے میقات سے حرم شریف کی طرف آتے ہوئے زور زور سے پڑھتے ہیں۔ پوری تلبیہ یہ ہے۔ "لبیک اللھم لبیک۔ لبیک لاشریک لک لبیک۔ ان الحمد والنعمۃ لک والملک لاشریک لک"

[2] مے پول MAYPOLE مغرب کے سرد ممالک میں مئی کے مہینے میں بہار آتی ہے۔ درختوں میں کونپلیں پھوٹتی ہیں اور پھول کھلنا شروع ہوتے ہیں۔ اناج کی بالیں سر نکالتی ہیں تو لوگ خوشی میں ایک بَلّی یا بانس کے گرد رقص کرتے ہیں۔ اسے مے پول کہتے ہیں۔ مذہبی لوگ حمد کے گیت گاتے ہیں۔ (چیمبرز انسائیکلو پیڈیا)

[3] مقدس آگ SCARED FIRE۔ اس خیال کے تحت کہ آگ اور سورج کی گرمی سے اس دنیا میں زندگی قائم ہے آگ کو ازمنہ قدیم سے ہی مقدس مانا جاتا رہا ہے۔ زرتشتی مذہب میں تو اس کی پرستش ہوتی ہے اور کبھی بجھنے نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح ہندو مذہب میں بھی اگنی (آگ) کو دیوتا مانا جاتا ہے۔ انگلستان اور سکاٹ لینڈ میں بھی اس کا تقدس مذہبی اور موسمی تیوہاروں کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ یکم مئی MAYPOLE اور ۳۱ اکتوبر ALL HALLOWS EVE کو آگ کے الاؤ جلائے جاتے ہیں۔ لوگ ان کے گرد رقص کرتے ہیں اس کے اوپر سے پھلانگتے ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ ایسا کرنے سے ان کے پچھلے گناہ جھڑتے ہیں اور آفات اور بلاؤں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس کو تزکیہ نفس کا ذریعہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ (چیمبرز انسائیکلو پیڈیا۔ جلد ۵)

اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ اسلام سے پہلے بھی رائج تھی۔ زائرین چلتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے۔

"اللہ کے[1] سوا اور کوئی معبود نہیں۔ وہ ہی ہے جس نے اپنے بندے کو سچا ثابت کیا اور ایمان لانے والوں کو عزت دی اور وہ ہی ہے جس نے دشمن کی فوجوں کو تنہا مار بھگایا"

اس سے فارغ ہو کر حضرت محمدؐ صفا اور مروہ کی پہاڑیوں پر گئے اور یہاں بھی سواری پر ہی ایک سے دوسری کی طرف سات مرتبہ سعی کی۔ حج اور عمرے کا یہ رکن حضرت ہاجرہ کے اس واقعہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ جب وہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان اپنے بچے حضرت اسمٰعیل ع کے لئے پانی کی تلاش میں اضطراب کی حالت میں دوڑی تھیں۔

اس کے بعد قربانی کے اونٹ ایک قطار میں کھڑے کئے گئے اور ان کی قربانی ہوئی اور اس سے فراغت کے بعد تمام زائرین نے اپنے سروں کے بال اتروائے۔

زائرین کا بڑا حصہ اب عمرے کے تمام مناسک ادا کر چکا تھا لیکن ابھی کچھ لوگ باقی تھے جو نگہبانی[2] کر رہے تھے مبادا اہل قریش کوئی دھوکا کر جائیں۔ چنانچہ حضرت محمدؐ نے دوسروں

سے دیوارہائے جیریکو۔ بیت المقدس کے قریب وادی اردن کا ایک قدیم شہر۔ جو تین ہزار قبل مسیح سے کئی دفعہ اجڑا اور بسا۔ موجودہ قریہ "الریحا" کہلاتا ہے۔ قدیم جیریکو کے آثار اب صرف ایک بڑے ٹیلے یا ٹیکری کی صورت میں موجود ہیں جسے ظل السلطان کہتے ہیں۔ کھدائی سے قدیم شہر اور دیواروں کے کچھ آثار بھی نکلے ہیں۔ اب ٹیلے کے ایک طرف ایک برگزیدہ ہستی الیشا کی کرامات سے نکلا ہوا ایک بہت بڑا چشمہ موجود ہے۔ جس کے پانی سے وہ بیماروں کو اچھا کرتے تھے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا مرکز بھی رہا ہے اور اب بھی لوگ عقیدتاً چشمے پر جاتے ہیں اور دیوار کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ (چیمبر انسائیکلوپیڈیا۔ جلد ۸)

[1] اصل میں یہ الفاظ آنحضورؐ کے فتح مکہ کے خطبہ کے شروع کے الفاظ ہیں جو اس طرح ہیں "لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ۔ صدق وعدہٗ ونصر عبدہٗ وحزم الاحزاب وحدہٗ"۔ (سیرۃ النبی حصہ اول)

[2] جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے نگہبانی کے لئے ایک سو مسلح سواروں کا دستہ محمدؓ بن مسلمہ کی سرکردگی میں تھا اور بشیر بن سعد دو سو سواروں کے ساتھ اسلحہ کی حفاظت پر تھے جو مکہ سے باہر کچھ فاصلے پر تھا۔

کو ان کی جگہ بھیج کر انہیں فارغ کرا دیا اور انہوں نے بھی دوسروں کی طرح عمرے کے ارکان ادا کئے۔

رات کو تمام زائرین نے مکہ میں ہی پڑاؤ کیا۔ انہوں نے زیادہ باتیں نہ کیں اور ایک دوسرے کے قریب ہی رہے لیکن طویل مدت کے بعد وطن واپس آنے پر جو توقعات تھیں وہ پوری ہوتی نظر نہ آتی تھیں۔

مشرقی شہروں کی رونق زیادہ تر وہاں پر آباد لوگوں کے دم سے ہوتی ہے۔ بازار بھی چھتوں پر بیٹھ کر ادھر ادھر کی گپ شپ۔ قہوہ خانے۔ موسیقی۔ مردوں۔ عورتوں۔ گدھوں اور اونٹوں کی آمد و رفت ایک مشرقی شہر کے لئے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ بہ نسبت اس کے کہ کوئی امریکن یا انگریز اپنی بستیوں میں روز کے معمول کا کوئی چکر لگائے۔ دونوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ ایک مغربی ملک کا باشندہ اگر کسی شہر کے بڑے اور اہم بازار سونے دیکھے، چائے خانوں میں چائے پینے والے موجود نہ ہوں اور مکانوں کی کھڑکیوں سے کسی کو جھانکتا نہ دیکھے تو اسے کوئی حیرانی نہیں ہوتی۔ لیکن ایک مشرق کے رہنے والے کی نظر میں ایسی بے رونقی اور اداسی کسی مہلک وبا یا قومی تباہی کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔

پھر اس سنسان اور ڈراؤنے ماحول اور مکمل خاموشی کے علاوہ کچھ ذاتی جذبات بھی تھے۔ ان میں سے بہت سے عرب سات سال کے بعد گھر آئے تھے۔ مذہبی اختلاف کے سبب عزیزوں اور دوستوں سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ ان سے لڑ کر چلے گئے تھے لیکن پھر بھی ان کو توقع تھی کہ یہ عمرہ ان لوگوں سے ضرور کچھ نہ کچھ مصالحت کرا دے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ ابوسفیان نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا۔ اس نے اپنے لوگوں کو مسلمانوں کا راستہ روکنے اور ان سے لڑنے کے لئے نہیں کہا بلکہ مکہ[1] خالی کر دینے کے سبب ان کو جنگ سے زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ زائرین مکہ میں اپنے گھروں میں بھی نہ جا سکے۔ ہر دروازے اور کھڑکی میں تالا یا کنڈی لگا دی گئی تھی۔ صرف چند عورتیں اور بوڑھے مرد پیچھے رہ گئے تھے لیکن وہ باہر نکلنے کی جرأت نہ کر سکے۔ چنانچہ زائرین کعبہ

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ صرف رؤسائے مکہ نے شہر خالی کیا تھا۔ بیشتر آبادی مکہ میں ہی رہی۔ لیکن مکان چھوڑ کر پہاڑیوں پر چڑھ گئے تھے۔

کے اردگرد ہی جمع رہے اور یہ امید کرتے رہے کہ ان کا قائد ہی شاید اس غم انگیز کھچاؤ کو دور کرنے کی کوئی سبیل کرے یا راہ نکالے۔

لیکن آپؐ نے اس سلسلہ میں کچھ نہ کیا۔ آپؐ نے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور خود کعبہ کے اندر چلے گئے اور وہاں مراقبے میں بیٹھے رہے۔ کعبہ میں ابھی تک بت موجود تھے لیکن غالباً آپؐ نے ان کی طرف نہ دیکھا۔ آپؐ تو کعبہ کو اپنے دین کا نشان سمجھتے تھے۔ آپؐ کی نظر میں تو یہ ایک عبادت گاہ تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے نام پر بنائی تھی۔ اپنے ساتھیوں جیسی گھر جانے کی لگن بھی آپؐ کو نہ تھی۔ حضرت خدیجہؓ سے شادی کے ابتدائی سالوں کے سوا آپؐ دوسرے مکیوں کی طرح پرسکون گھریلو زندگی سے نا آشنا رہے۔ آپؐ جب تک مکے میں رہے یا تو سفر میں رہے یا لوگوں کی معاندانہ کارروائیوں اور اذیتوں سے عہدہ برا ہونے کی کوششوں میں گزری۔ بلکہ آپؐ کی نظر میں زیادہ تر دین اسلام کے روحانی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا........

جب فجر کی نماز کا وقت ہوا تو آپؐ کعبہ سے باہر تشریف لے آئے۔ بلالؓ کو بلایا اور انہیں کعبہ کی چھت پر چڑھا دیا گیا۔ صبح کے اجالے میں کھڑے ہو کر اسلام کے پہلے مؤذن بلالؓ حبشی نے اذان دی جس سے پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ جب شہر کی خاموشی میں "اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمد الرسول اللہ کے الفاظ گونجے تو سوتے زائرین جاگ اٹھے۔ اللہ کے ایک ہونے اور اس کے پیغمبرؐ کی رسالت کا اعلان کرنے والے الفاظ زیر و بم پیدا کر رہے تھے اور اس طرح مشرق و مغرب اور شمال اور جنوب اور اونچی چٹانوں پر بیٹھے ہوئے مکیوں میں دین اسلام کی اشاعت ہو رہی تھی۔ اور یہ کام بڑے ڈرامائی انداز میں، بڑے موثر طریقے اور بالکل صحیح وقت اور موقعہ پر ہو رہا تھا۔ جھل مل روشنی میں جھکتی چٹانوں پر بیٹھے ہر مکی کو معلوم ہو گیا کہ کعبہ کے تین سو ساٹھ بت اس وقت اس حبشی غلام کے سیاہ پیروں تلے بے بسی میں ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے لیکن ان بتوں میں سے کسی نے بھی کوئی احتجاج نہ کیا اور نہ ہی ان کے اعتقاد کے مطابق کوئی گرج پیدا ہوئی اور نہ ہی کوئی زلزلہ آیا۔ کعبہ خود بھی اسی طرح ثابت و سالم رہا اور ایک حبشی، جو چند سال پہلے تک ایک لدّو جانور کی طرح پانی ڈھویا کرتا تھا، اس کی بے حرمتی

کر رہا تھا۔

زائرین کا حوصلہ بڑھا۔ دل سے خوف جاتا رہا اور مسلمانوں میں، جو رات بھر اداس اور غمگین بیٹھے رہے تھے۔ بجلی کی سی ایک رو دوڑ گئی۔ وہ خوشی خوشی آگے بڑھے اور کعبہ کے گرد جمع ہو گئے اور جب دو ہزار کے دو ہزار صفوں میں کھڑے ہو گئے تو حضرت محمدؐ نے نماز پڑھائی اور ہزاروں آوازوں نے ایک ساتھ وہ الفاظ بڑے لحن سے ادا کئے جو ان کے پیشوا نے اسلام کے ابتدائی ایام سے ہی انہیں سکھائے تھے۔ بڑے وقوف سے انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور گرائے اور رکوع اور سجود کئے۔ یہاں تک کہ نماز ختم ہو گئی۔ چند منٹ وہ خاموشی سے بیٹھے اللہ سے لو لگاتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اٹھے اور منتشر ہو گئے۔ ان کے دل مسرت سے لبریز تھے۔ گزشتہ شام کی مایوسی اور اداسی یہ جان کر غائب ہو چکی تھی کہ گھر، دوست اور رشتہ دار ایک سچے دین کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

گو کچھ کمی کے ساتھ لیکن اہل مکہ نے بھی یہ ہی تاثر لیا۔ بہت سوں نے تو کھل کر اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ ابوسفیان پریشان ہو کر رہ گیا۔ اسے اسی بات کا تو ڈر تھا چنانچہ وہ بڑی بے چینی سے وقت کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ چوتھی صبح ہوتے ہی اس نے سہیل اور حویطب کو جنہوں نے صلح نامے پر دستخط کئے تھے حضرت محمدؐ کے پاس یہ کہلا کر بھیجا کہ اب انہیں چلا جانا چاہیئے۔ حضرت محمدؐ نے جو اس وقت بڑا سکون محسوس کر رہے تھے خواہش ظاہر کی کہ اگر وہ کچھ دیر اور ٹھہر سکیں تو اس میں کوئی حرج نہ ہو گا لیکن دونوں نمائندوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ معاہدہ صرف تین روز کے قیام کا تھا۔ وہ مدت ختم ہو گئی اور انہیں اب بلا تاخیر چلا جانا چاہیئے[1]

حضرت محمدؐ اس پر خاموش ہو کر رہ گئے اور مکہ سے کوچ کا حکم دے دیا لیکن آپؐ کو ناگوار ضرور گزرا۔ آپؐ کی خفگی کا سبب یہ تھا کہ آپ کو بڑی توقع تھی کہ اہل قریش سے کسی نہ کسی طرح کا سمجھوتہ ضرور ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ایک ذاتی سبب بھی تھا۔ آپؐ کو ایک آخری شادی

---

[1] یہ بات صحیح نہیں۔ نبی کریمؐ نے کبھی کسی معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی۔ چنانچہ سیرۃ النبی کے بیان کے مطابق رؤسائے مکہ کے یہ کہنے پر کہ تین روز کی مدت ختم ہو گئی آنحضورؐ اسی وقت روانہ ہو گئے۔

اور کرنی تھی۔

آپ کی گیارھویں اور آخری بیوی حضرت میمونہؓ بنت حارث تھیں۔ وہ آپ کے عجیب و غریب شخصیت کے مالک چچا العباسؓ کی سالی تھیں[1] اور اہل قریش کے ڈی آرٹیگنن[2] یا مشہور عالم فوجی سالار حضرت خالدؓ بن ولید کی خالہ بھی تھیں۔ اس وقت وہ چھبیس سال کی تھیں اور بیوہ تھیں۔ شادی کی بات چیت حضرت عباسؓ کی وساطت سے ہوئی جو تاحال مسلمان تو نہیں ہوئے تھے لیکن اپنی موقع شناس طبیعت اور رشتہ کے سبب حضرت محمدؐ سے پہلے کی طرح ہی تعلقات قائم رکھے ہوئے تھے۔ حضرت میمونہؓ بڑی قبول صورت بھی تھیں اور مکہ کے اکابر کی قرابتیں اور تعلقات بھی ساتھ لا رہی تھیں جن کی حضرت محمدؐ کو بڑی ضرورت تھی۔

حضرت محمدؐ چاہتے تھے کہ اس رشتہ کی تحریک اہل قریش کی طرف سے ہو لیکن غالباً آپؐ نے ان کی افتادِ طبع کا صحیح اندازہ نہیں لگایا تھا۔ وہ تو صرف ایک ہی بات چاہتے تھے اور وہ یہ کہ آپؐ مکہ سے چلے جائیں۔ چنانچہ آپؐ مکے سے دس میل کے فاصلے پر سارف کے مقام پر رک گئے اور یہاں ہی یہ شادی انجام پائی۔

۱۔ حضرت میمونہؓ حضرت عباسؓ کی بیوی ام فضل کی بہن تھیں جو ان کی سرپرست بھی تھیں۔ عمرہ قضا کے موقعہ حضرت میمونہؓ مکہ میں اسلام سے متاثر ہوئیں اور مسلمان ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت عباسؓ نے آپ کی یہ خواہش رسول اللہ کی خدمت میں پہنچا دی اور ساتھ ہی یہ تجویز بھی کر دی کہ مناسب ہو گا کہ انہیں اپنی زوجیت میں لے لیں۔ آپؐ نے منظور کر لیا اور عقد ہو گیا۔ سارف کے مقام پر وہ آپؐ کے ساتھ ہو گئیں۔ حضرت میمونہؓ حضرت رسول کریمؐ کی وفات کے پچاس سال بعد تک زندہ رہیں اور اپنی وصیت کے مطابق سارف ہی میں دفن ہوئیں۔ جہاں انہیں ام المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ (حیات محمدؐ)

۲۔ ڈی آرٹیگنن ARTAGNON ایک روایتی جنگجو اور بہادر۔ ایلکزینڈر ڈوما ALEXANDFR DUMAS کے ناول تین بہادر THREE MUSKETERS کا مرکزی کردار اور کئی ناول نویسوں نے بھی اسے اپنے ناول کا کردار بنایا ہے۔

مکہ سے حضرت میمونہؓ کے ساتھ آنے والوں میں حضرت حمزہؓ کی بیوہ سلمہ اور ان کی ناکتخدا لڑکی عمارہ بھی تھیں۔ جو مکہ میں ہی رہتی تھیں عمارہ جوان اور خوبصورت تھیں اور آپ کے کئی افسران کی نگاہیں ان پر پڑیں۔ حضرت علی کرم اللہ خصوصیت سے انہیں اپنی زوجیت میں لینا چاہتے تھے لیکن آپؐ نے ان کی شادی ان کے بڑے بھائی حضرت جعفرؓ سے کر دی۔

گو حضرت میمونہؓ آپؐ کی دوسری آٹھ ازواج کی طرح حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد زندہ رہیں لیکن آپ نے نہ تو اپنے شوہر کی حیات میں کوئی خاص مقام پایا اور نہ اسلام کی ترقی اور اشاعت میں ہی کوئی خاص کردار ادا کیا۔ آپ کی شہرت بس اتنی ہے کہ آپ اپنی خواہش کے مطابق وہیں دفن ہوئیں جہاں آپ کی رسول اللہؐ سے شادی ہوئی تھی۔ آپ کا مزار مبارک آج بھی سارف کے باہر وادی فاطمہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

دو ہزار زائرین اس کے بعد مدینہ کے سفر پر روانہ ہو گئے لیکن نماز کے بعد کے روحانی اطمینان کے باوجود وہ لوگ محسوس کر رہے تھے کہ عمرے کی یہ مہم کامیاب نہیں رہی اور ان کا خیال تھا کہ حضرت محمدؐ کا رویہ اس مرتبہ بھی قریش کے ساتھ ضرورت کے مطابق سخت نہ تھا لیکن حضرت محمدؐ کا خیال اس کے بالکل برعکس تھا اور ایک مرتبہ پھر آپؐ ہی کا خیال صحیح نکلا۔۔۔۔۔

یہ موسم گرما کا درمیان تھا اور اہل مدینہ دن کی سخت دھوپ سے بچنے کے لئے علی الصبح ہی کام پر چلے جاتے تھے۔ ایک دن جنوب (مکہ) کی طرف سے دو سوار مع چند خدام کے آئے۔ اول تو وہ پوری طرح مسلح تھے۔ پھر اس بات نے کاشتکاروں کو اور زیادہ پریشان کر دیا کہ وہ قریش کے جنگی لباس اور ساز و سامان سے آراستہ تھے۔ اور پھر جب ایک کسان نے پہلے سوار کو خالد بن ولید اور دوسرے کو عمرو بن العاص بتایا تو پریشانی اور بڑھ گئی۔ مسلمانوں کے ان دشمنوں کی آمد سے حضرت محمدؐ کو خبردار کرنے کے لئے فوراً قاصد دوڑائے گئے۔ حضرت محمدؐ نے خبر سنی لیکن کسی خاص تشویش کا اظہار نہ کیا اور جب خالد اور عمرو اور ان کے عملے کے لوگ شہر میں آئے تو آپؐ مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے آپؐ کو سلام کیا اور دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی اجازت چاہی۔ ان دونوں کے بعد جلد ہی عثمان بن طلحہ مدینے پہنچے۔

حضرت محمدؐ کے چہرے پر بشاشت آ گئی۔ یہ دونوں جنرل جو ہر جنگ اور ہر جھڑپ میں آپ کے

خلاف لڑے تھے اور جن کی جنگی چالوں کے سبب ایک مرتبہ آپؐ کو شکست بھی ہوگئی تھی آج آپؐ کی فوج کے افسر تھے اور عثمان بن طلحہؓ[1] کعبہ کے ایک متولی ہونے کی حیثیت سے اہل مکہ کے مذہبی اور سیاسی گروہوں میں پہلے اہم باغی تھے۔

ان اکابر کے بعد اہل قریش کے دوسرے ان سے چھوٹے مرتبے کے لوگ جلدی جلدی آکر اسلام قبول کرتے رہے۔ حضرت محمدؐ نے ایک مرتبہ پھر محسوس کیا کہ وہ وقت بہت نزدیک آرہا ہے جب معاہدہ (صلح حدیبیہ) کالعدم ہو جائے گا۔ اور شاید ابو سفیان یا دو چار کٹر قدامت پسند لوگوں کے سوا ہر شخص آپؐ پر ایمان لے آئے گا۔

لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ آپؐ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ ابھی آپؐ کو چند غیر متوقع ناکامیوں کا سامنا کرنا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو آخری وقت تک آزماتا رہے گا۔

ان قبائل میں سے جنہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا بعض کے خلاف مہیں ناکام رہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ جہاں وہ اپنی جگہ صرف پریشان کرنے والی چھوٹی موٹی جھڑپیں تھیں وہاں حضرت محمدؐ کی عام حکمت عملی کی نظر میں بھی کوئی بڑی اہمیت نہ رکھتی تھیں لیکن جب فلسطین میں موتہ[2] کے امیر کے لڑکے نے، جو شہنشاہ ہرقل کے نام پر وہاں حکومت کرتا تھا۔ آپؐ کے ایک سفیر کو قتل کر دیا تو آپؐ نے اسے سزا دینے کی ٹھان لی۔

موتہ بیت المقدس سے تقریباً ایک سو میل جنوب میں بحیرہ مردار[3] کے کنارے واقع تھا۔

---

[1] عثمان بن طلحہ کعبہ کے بڑے متولی اور کنجی بردار تھے۔ اس لئے بہت زیادہ عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ اور قریش میں ان کا بڑا مقام تھا۔

[2] حارثؓ بن عمیر (آنحضورؐ کا ایک خط ہرقل کے نام لے کر فلسطین میں بلقا کے علاقہ میں پہنچے۔ اس علاقے کا صدر مقام بصریٰ تھا اور وہاں پر غسانی قبیلہ (عیسائی) کا شرجیل بن عمرو نامی ایک عرب رئیس حکمران تھا اور ہرقل کا باجگزار تھا۔ موتہ کے اس امیر نے اس سفیر کو قتل کر دیا۔ (سیرۃ النبی۔ حصہ اوّل) (نقشہ ۳)

[3] بحیرہ مردار یا DEAD SEA۔ بیت المقدس کے جنوب میں شمالاً جنوباً واقع ہے اور موتہ اس کے جنوبی کنارے پر تھا۔

یہ حضرت محمدؐ کی قلمرو بلکہ عربوں کی تمام حکومتوں سے کافی دور تھا یہ علاقہ رومنوں کے ماتحت تھا۔ اور رومن حکام مقامی سپاہ کے ساتھ اس علاقے کی حفاظت و امن کے ضامن تھے یہ رومن فوج ایک بڑی جنگ آزمودہ سپاہ تھی جو اس وقت کے جدید جنگی طریقوں سے واقف اور ان کی ضروریات کے مطابق ساز و سامان سے لیس تھی۔ لیکن حضرت محمدؐ کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ آپؐ کو اپنی سپاہ پر کامل اعتماد تھا۔ اور چونکہ آپؐ نے صحرائی علاقوں کی جنگوں کے سوا اور کچھ نہ دیکھا تھا اس لئے آپؐ کو اور کسی طریقہ جنگ کا خیال بھی نہ آسکتا تھا۔

چنانچہ آپؐ نے اس سے زیادہ تیاری کو ضروری نہ سمجھا جتنا کہ آپؐ نے یہودیوں سے نمٹنے کے لئے خیبر کی اور اہل قریش سے نبرد آزما ہونے کے لئے بدر کی جنگوں میں کی تھیں اور تین ہزار شتر[1] سواروں کے لشکر اور ایک مختصر رسالے کا ہی بندوبست کیا۔ زیدؓ کو سپہ سالار اور جعفرؓ کو ان کا نائب مقرر کیا۔ ان دونوں کی شہادت یا زخمی ہو جانے کی صورت میں اسلام کے ایک قدیم جان نثار عبداللہؓ بن رواحہ کو ان کی جگہ لینی تھی۔ خالدؓ بن ولید پہلی مرتبہ اسلامی لشکر میں شریک[2] ہو رہے تھے لیکن ان کا نام متبادل سالار کے طور پر تجویز نہیں کیا گیا تھا۔

حضرت محمدؐ کی موقعہ اور محل کے مطابق کام کرنے کی سمجھ بوجھ اور عملی ذہنیت کے پیش نظر یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس جنگ کے لئے معقول تیاری نہ کرنے کا سبب آپؐ کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی صحیح حالات سے لاعلمی یا سادہ دلی تھی۔ آپؐ یہ مہم اس وقت کی دنیا کی

---

[1] جنگ موتہ جمادی الاول ۸ ہجری میں ہوئی۔ (سیرۃ النبی۔ طبقات ابن سعد جزو ثانی)

[2] جب یہ لشکر روانہ ہوا تو حضرت خالد بن ولید بھی رضاکارانہ طور پر شامل ہو گئے تاکہ اسلام سے اپنی عقیدت اور اپنی مردانگی کا ثبوت پیش کر سکیں۔ پہلے سے ایسی کوئی تجویز نہ تھی۔ رسول کریمؐ اس لشکر کو باہر تک چھوڑنے آئے اور مسلمانوں کو ہدایات دیں کہ عورتوں، بچوں اور اندھوں کو قتل نہ کریں۔ عمارتوں کو نہ گرائیں، اور درختوں کو نہ کاٹیں۔ (حیات محمد)

ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ حضرت خالدؓ کو اسلام لائے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور ان کی عقیدت اور خلوص کی آزمائش درکار تھی اس لئے فوری طور پر ان کی سالاری کو پرانے جان نثار پسند نہ کرتے (مترجم)

مشہور ترین سپاہ کے خلاف بھیج رہے تھے اور اس کی قیادت علیؓ، عمرؓ یا ابوبکرؓ کی بجائے اپنے ایک سابق غلام کو دے رہے تھے جو بہادر ضرور تھے لیکن کبھی اتنی بڑی ذمہ داری نہیں سنبھالی تھی۔

رومن حکومت نے اپنے علاقوں پر اس مجوزہ حملہ کی خبر سنی تو انہوں نے طے کیا کہ مدینے کے اس دیوانے (نعوذ باللہ) پر یہ واضح کر دیا جائے کہ وہ ایسی کم عقلی کی مہمیں عرب کے صحراؤں تک ہی محدود رکھے۔ مقامی لشکر کے علاوہ ادھر ادھر سے افواج اکٹھی کر لی گئیں اور چند دنوں کے اندر اندر دو لاکھ[1] جدید ہتھیاروں سے لیس ایک بڑی سپاہ شہنشاہ کے بھائی تھیوڈورس کی زیرکمان مقابلے کے لئے تیار ہو گئی۔

اس اثنا میں حضرت زیدؓ ان کی صحرائی اونٹوں پر سوار تین ہزار سپاہ اور دو سو سواروں کا رسالہ خوشی خوشی تیزی سے شام کی طرف بڑھ رہے تھے تاکہ دشمن کو اچانک جالیں۔ اس کا صفایا کر دیں اور مال غنیمت کے ساتھ لوٹیں۔ اس لئے جب معان پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ دشمن نے ان کو ملک سے نکالنے کے لئے اپنی بہترین جنگ آزمودہ اور تربیت یافتہ ٹڈی دل افواج جمع کی ہیں، تو وہ بڑے حیران ہوئے۔ چنانچہ لشکر ٹھہر گیا اور آپس میں صلاح و مشورہ کیا کہ اب کیا قدم اٹھانا مناسب ہوگا۔

حضرت زیدؓ اور جعفرؓ نے واضح کیا کہ ان کے آنے کا مقصد مقامی حاکم سے باز پرس کرنا تھا اور رومن افواج سے لڑنا نہیں تھا لیکن حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے اس نظریہ سے اتفاق نہ کیا اور کہا کہ حضرت محمدؐ نے انہیں کافروں سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اگر واقعی اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ دشمن کی فوجیں ہم سے کتنی زیادہ ہیں۔[2] مزید براں یہ

---

[1] بعض کے نزدیک دشمن کی افواج کی تعداد مبالغہ آمیز ہے مولانا شبلی نے سیرت النبی میں ایک لاکھ لکھا ہے اگر اس سے بھی کچھ کم کر لیا جائے تو پھر بھی یہ تعداد مسلمانوں کے تین ہزار کے مقابلے میں پچیس تیس گنا ضرور تھی۔ (مترجم)

[2] حضرت عبداللہؓ بن رواحہ ایک بہادر سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نغز گو شاعر اور مقرر بھی تھے انہوں نے اپنی تقریر میں کہا،

"دوستو! جس چیز سے تم بچ رہے ہو بخدا یہ بھی تو ہے جس کی تلاش تمہیں یہاں تک کھینچ لائی ہے یعنی شہادت۔ ہم دشمنوں سے سامان جنگ یا طاقت یا کثرت تعداد کی بنا پر جنگ آزما نہیں ہوتے بلکہ ہم تو صرف اس دین کے اعتماد پر جنگ کرتے ہیں جو خدا نے ہمیں عطا کیا ہے اس لئے بہتر ہے کہ دشمن سے ڈٹ کر مقابلہ کریں کیونکہ دو فائدوں میں سے ایک فائدہ تو ضرور ہوگا۔ غلبہ یا شہادت۔" (حیات محمدؐ)

سراسر بیوقوفی ہوگی کہ سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد کچھ کئے بغیر مدینے لوٹ جائیں غالباً حضرت عبداللہ کے مشورہ کی یہ دوسری دلیل دوسرے زیادہ محتاط لوگوں کی رائے پر فوقیت حاصل کر گئی۔

چنانچہ لشکر کو آگے بڑھتے رہنے کا حکم دے دیا گیا اور عربوں کی یہ مختصر سی فوج بعلکہ پہنچ گئی جہاں دشمن کے مورچہ بند ہونے کی خبر ملی تھی بحیرہ مُردار کے اندھیرے کناروں پر موسم گرما کے آفتاب کی پہلی کرنیں پڑتے ہی رومن فوج دکھائی دی۔ عرب لشکر فوراً وہاں ہی ٹھہر گیا۔ کسی مسلمان نے تاحال اتنی بڑی سپاہ اکٹھی نہ دیکھی تھی۔ نہ ایسا ساز و سامان، نہ ایسے زرہ بکتر اور ہتھیار اور نہ ہی ایسی منظم ترتیب و آراستگی۔ جیسے جیسے خودوں پر پھائے، سینہ پر چار آئینہ لگائے رومن سپاہی نقل و حرکت کرتے تو یہ حیران ہو کر دیکھتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ساری سپاہ کا ایک ہی ذہن ہے اور سب ایک ہی بات سوچتے ہیں۔

اب کوئی نئی چال چلنے یا لڑائی سے گریز کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اب تو مسلمانوں کو لڑنا تھا۔ اور اللہ پر بھروسہ کرنا تھا کہ وہ ان کا ساتھ نہ چھوڑے۔ اب اگر کوئی بات ان کی موافقت میں جا سکتی تھی تو وہ لڑنے کے لئے جگہ کا انتخاب تھا چنانچہ اسلامی لشکر کو پیچھے ہٹا کر موضع موتہ کے قریب ایک زیادہ موزوں جگہ پر لے آیا گیا۔

اسی وقت رومن فوج کے بازوؤں کو حرکت ہوئی اور انہوں نے بڑھنا شروع کر دیا بھاری آہن پوش ہونے کے سبب وہ ٹینکوں کی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہلکے اسلحہ والے عربوں پر حملہ کرنے کے لئے بڑھے۔ اس نسبتاً دقت سے نقل و حرکت کرنے والی فوج کو دیکھ کر زیدؓ ضبط نہ کر سکے اور اپنی جگہ کی موزونیت کو بھلا کر حملہ کا حکم دے دیا۔ اگر مسلمانوں کی تعداد کچھ زیادہ ہوتی تو یقیناً جنگ کا نتیجہ کچھ مختلف ہوتا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے بڑھے اور ان کی پیدل اور سوار فوج نے رومنوں کی زیادہ تعداد والی اور گتھی ہوئی صفوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ لیکن اپنے سے بہت زیادہ بڑی فوج کے مقابلے میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔

حضرت زیدؓ شدید طور پر زخمی ہو گئے ——— حضرت جعفرؓ

جھٹ کر ان کے پہلو میں پہنچے اور علم سنبھال لیا۔ جس ہاتھ میں آپ نے علم پکڑا ہوا تھا وہ کاٹ ڈالا گیا تو آپ نے فوراً علم دوسرے ہاتھ میں سنبھال لیا لیکن جب یہ بھی کٹ گیا تو آپ نے علم دونوں کٹے ہوئے بازوؤں میں بھینچ لیا جن سے خون بہہ رہا تھا۔ تلوار کے ایک وار سے آپ گر گئے اور ایک دوسرے وار نے آپ کو شہید کر دیا۔ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے فوراً حضرت جعفرؓ کی جگہ لے لی اور لڑائی کبھی تیز اور کبھی ہلکی ان کے گرد ہوتی رہی۔ پھر وہ بھی شہید ہو گئے۔ جب مقرر کردہ تمام سالار ایک ایک کر کے کام آ گئے تو ایک نوجوان سردار نے علم سنبھال لیا۔ اور پکار کر کہا "مسلمانو ادھر آؤ، مجتمع ہو جاؤ"۔

لڑائی ایک مرتبہ پھر عَلَم کے گرد شدت اختیار کر گئی۔ جسے قدرت نے کسی نہ کسی طرح اب تک بچائے رکھا تھا۔ لیکن میدان ہارا جا چکا تھا اور صفوں میں انتشار پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا اس وقت حضرت خالدؓ بن ولید نے ایک اعلیٰ ترین سپہ سالار ہونے کا ثبوت دیا۔ انہوں نے اپنی آواز اور اپنی مثال سے حوصلہ ہارے مسلمانوں کو پھر سے منظم کیا۔ وہ نہ تو پسپائی کو روک سکتے تھے اور نہ ہی ہاری لڑائی کو جیت سکتے تھے لیکن پھر بھی بڑی چابکدستی اور ماہرانہ فوجی نقل و حرکت سے انہوں نے اپنی فوج کو تباہی سے بچا لیا اور خوف و ہراس ختم کر دیا۔ چنانچہ قدم قدم پر رک رک کر لڑتے

---

[1] جب حضرت جعفرؓ نے علم لیا تو اپنے گھوڑے سے کود پڑے اور تلوار سے اس کی کونچیں کاٹ دیں اور بے جگری سے لڑے۔ حضرت عبداللہؓ بن عمر کا بیان ہے کہ انہوں نے آپ کی لاش دیکھی تھی۔ تلواروں اور برچھیوں کے نوّے ۹۰ زخم تھے اور سب سامنے کی طرف تھے پشت پر ایک بھی نہ تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کی شہادت کے بعد حضرت خالدؓ سردار بنے اور نہایت بہادری سے لڑے۔ آٹھ تلواریں آپ کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں۔ دشمن کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ (سیرۃ النبی)

[2] مصنف کا یہ اشارہ حضرت خالدؓ ابن ولید کی طرف معلوم ہوتا ہے اور صحیح ہو سکتا ہے لیکن اس سلسلہ میں مختلف روایات ہیں طبقات ابن سعد میں ابو عامر سے مروی ہے کہ وہ جھنڈا ایک انصاری نے اٹھا لیا وہ اسے لے کر دوڑے اور اسے ایک جگہ گاڑ دیا اور آواز دی "اے لوگو۔ میرے پاس آؤ"۔ لوگ ان کے پاس جمع ہو گئے تو وہ جھنڈا انہوں نے خالدؓ بن ولید کو پیش کر دیا انہوں نے کہا کہ میں اسے نہ لوں گا اس لئے کہ تم ہی زیادہ مستحق ہو۔ انصاری نے کہا کہ واللہ یہ جھنڈا تمہارے لئے ہی لیا ہے چنانچہ حضرت خالدؓ نے جھنڈا لے لیا اور مسلمانوں کی قیادت سنبھال لی۔

زمین کے نشیبوں سے فائدہ اٹھاتے اور چھوٹے سے چھوٹے اہم مقام کا دفاع کرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ اپنی سپاہ کو میدان جنگ سے باہر نکال لائے۔ جب رات ہوئی تو ان کی کمان میں ایک بُری طرح زخم خوردہ فوج تھی لیکن اب بھی حوصلہ مندی اور تنظیم کے لحاظ سے وہ ایک فوج تھی۔

صبح تازہ دم ہونے پر حضرت خالدؓ نے ایک مرتبہ پھر دشمن کی طرف حملہ کی غرض سے بڑھنے کی جرأت کی۔ اس چال سے رومن سمجھے کہ مسلمانوں کو کمک[1] پہنچ گئی ہے۔ اور وہ عربوں کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے پیچھے ہٹ کر زیادہ مناسب مقام پر چلے گئے۔ لیکن جتنی سپاہ کو صرف خوش قسمتی یا ان کی جرأت مندانہ قیادت نے مکمل تباہی سے بچا لیا تھا حضرت خالدؓ پھر حملہ کر کے اسے ضائع کرانے کا خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہ تھے۔ شام ہونے تک آپ نے دشمن کے بازوؤں کو الجھائے رکھا اور ان کے اردگرد ہی لگے رہے اور پھر اندھیرا ہوتے ہی جتنی جلدی ہو سکتا تھا مدینہ کی طرف تیزی سے روانہ ہو گئے۔ گو وہ حضرت زیدؓ اور حضرت عبداللہ کی لاشیں تلاش نہ کر سکے لیکن حضرت جعفرؓ کی لاش انہیں مل گئی اور وہ اسے مدینہ ساتھ لے آئے۔

شکست کی خبر لشکر کے واپس پہنچنے سے پہلے ہی مدینہ پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ لوگ باہر ہی ملے۔ وہ ان کے ہار جانے پر فقرے کس رہے تھے۔ یہ اس بات کی ایک اور مثال تھی کہ یہ عرب لوگ باہر کی دنیا کے حالات سے کتنے بے خبر تھے اور حضرت محمدؐ کی بتائی ہوئی باتوں پر کتنا اعتقاد رکھتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ رومن کون لوگ ہیں اور نہ انہیں یقین آتا تھا کہ مسلم فوج کسی اور فوج سے شکست کھا سکتی ہے۔ اور یہی جذبہ ان کی بعد کی عظیم فتوحات کا بڑا سبب بنا۔ ان کے نزدیک ایک مسلمان دنیا کے ہر آدمی سے بہتر اور برتر تھا۔ وہ ایک واحد خدا کی پرستش کرتا تھا اور

---

[1] رات کے پچھلے حصہ میں حضرت خالدؓ بن ولید نے ایک چال چلی۔ اپنی ہی فوج کے ایک حصہ کو جدا کر کے لشکر سے فاصلے پر مدینے کی جانب ایک لمبی صف میں کھڑا کر دیا۔ صبح ہوتے ہی اس دستے نے لشکر کی طرف بڑھنا شروع کیا تو لشکر سے نعرے بلند ہونے شروع ہوئے۔ رومن یہ سمجھے کہ مسلمانوں کو کمک پہنچ گئی۔ وہ تعداد کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔ اس لئے زیادہ محفوظ مقام پر پیچھے ہٹ گئے اور مسلمانوں پر حملے کا خیال چھوڑ دیا۔ اس طرح باقی ماندہ اسلامی لشکر مکمل تباہی سے محفوظ رہا اور مدینہ آ گئے۔ یہ حضرت خالدؓ کی ایک بڑی کامیابی تھی۔ (حیات محمدؐ)

وہ اللہ کے خاص رسولؐ کا علمبردار تھا اور اس کا جنت میں جانا یقینی تھا۔ اس جذبے نے مسلمانوں کی نظر میں دشمن کی ہر قسم کی برتری کو بالکل غیر اہم بنا دیا تھا اور وہ میدانِ جنگ میں مرنے کو بدقسمتی کی بجائے اپنی خوش قسمتی اور منافع کا سودا تصور کرنے لگے تھے۔

لوگوں کی فقرے بازی اور آوازے سن کر حضرت محمدؐ باہر نکل آئے اور مجاہدین کو تسلی اور دلاسا دیا۔ آپؐ نے اس شور و غل کو بند کیا اور حضرت خالدؓ بن ولید کی تعریف کی۔ پھر آپؐ نے تمام سرداروں اور لشکریوں کو یقین دلایا کہ موتہ میں اسلام کے وقار کو جو تھوڑی بہت ٹھیس لگی ہے اسے دوبارہ بلند کرنے کے لئے انہیں بہت جلد دوسرے مواقع ملیں گے۔

البتہ جس بات پر حضرت محمدؐ کا دل بھر آیا وہ حضرت زیدؓ اور جعفرؓ کی شہادت تھی۔ خصوصاً حضرت زیدؓ کی وفات سے آپؐ کو بہت صدمہ ہوا کیونکہ زیدؓ تیس سال سے زیادہ مدت سے آپؐ کے دوست بھی تھے اور ساتھی بھی۔ وہ پہلے پانچ ایمان لانے والوں میں سے ایک تھے۔ وہ مکہ کے ابتلا کے دور میں بھی اور مدینے کے شروع کے ایام میں بھی ہر وقت آپؐ کے ساتھ موجود رہتے تھے۔ وہ ہر لڑائی میں آپؐ کے شانہ بشانہ لڑے تھے اور اپنے دوست اور آقا کی خاطر یہاں تک ایثار کیا تھا کہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر ان کی زوجیت[1] میں دے دیا تھا۔ اب وہ ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے تھے۔ چنانچہ حضرت محمدؐ بغیر کوئی شرم محسوس کئے خوب روئے[2]۔

حضرت جعفرؓ کی تدفین پورے فوجی اعزاز سے ہوئی۔ پوری فوج صف بستہ حاضر تھی۔

---

[1] اصل بات یہ تھی کہ حضرت زینبؓ نے رسول اللہ کے حکم کے تحت حضرت زیدؓ بن حارثہ سے شادی تو کر لی تھی لیکن وہ اپنے ذہن سے کبھی اس خیال کو نہ نکال سکیں کہ وہ قریش کی ایک عالی مرتبہ خاتون تھیں اور حضرت زیدؓ رسول اللہ کے غلام تھے خود حضرت زیدؓ بھی غالباً ایسا ہی محسوس کرتے ہوں گے۔ بہر حال دونوں میں یگانگت نہ ہو سکی اور ان میں علیحدگی ہو گئی۔ بعدازاں ان کی تالیف قلب کے لئے آنحضورؐ نے حضرت زینب سے نکاح کر لیا۔

[2] حضرت زیدؓ اور حضرت جعفرؓ سے رسول اللہؐ کو بہت محبت تھی ان کی شہادت سے آپؐ کو بیحد صدمہ ہوا اور آپؐ نے اشک فشانی کی۔ آپؐ کو روتے دیکھ کر لوگوں کو تعجب ہوا تو آپؐ نے کہا: "اس میں حیرت کی کون سی بات ہے یہ تو صرف ایک دوست کے آنسو ہیں جو ایک دوست کی جدائی میں بہائے جا رہے ہیں۔" (حیاتِ محمد)

حضرت محمدؐ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور دعائے مغفرت کی۔ آپؐ نے سب کو یقین دلایا کہ جعفرؓ جنت[1] میں ہیں۔ آپؐ نے اپنا خطبہ حضرت خالدؓ کی تعریف پر ختم کیا اور انہیں سیف اللہ کا خطاب مرحمت فرمایا۔ اس وقت سے لوگ آپ کو اس خطاب سے جاننے اور خوف کھانے لگے۔ گو حضرت خالدؓ نے بعد میں اپنے طوفانی رسالہ فوج کے ساتھ بہت سی نمایاں اور عظیم فتوحات حاصل کیں لیکن غالباً اس موقعہ (جنگ موتہ) سے زیادہ بڑی کامیابی انہیں کبھی نہیں ہوئی جو انہوں نے تھوڑے سے غیر تربیت یافتہ بدوؤں سے اس مشہور زمانہ رومن فوج کے خلاف حاصل کی تھی جس نے اس وقت کی تمام معلوم دنیا کو فتح کر لیا تھا۔

اس سے پہلے کہ کوئی اس شکست کے متعلق رائے زنی یا قیاس آرائی کرے۔ حضرت محمدؐ پھر ایک مہم کا آغاز کر چکے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے اُحد کی شکست کے بعد آپؐ نے اہل مکہ کا تعاقب کیا تھا۔ اب کی دفعہ اہل شام پر حملہ کرنے کے لئے مؤتہ کی طرف سپاہ روانہ کر دی۔

عمرو بن عاص کو ایک سو[2] سوار مہماتی فوج کا کماندار بنا کر شام کی سرحد پر بھیج دیا گیا۔ ان کی یہ مہم ان خانہ بدوش عرب قبائل کے خلاف تھی جن کے متعلق خبر ملی تھی کہ موتہ کی شکست سے فائدہ اٹھا کر وہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ عمرو بن العاص نے تیزی سے فاصلہ طے کیا اور دس روز میں شام کی سرحد پر پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ خانہ بدوش قبائل کی جارحانہ کارروائیوں کے متعلق خبریں بالکل صحیح تھیں اور ان کی ایک بڑی جمعیت عرب کے اندر داخل ہونے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ وہ ساری صورت حال کو جلدی ہی سمجھ گئے اور اپنے نائبین کے جوشیلے مشوروں کو نظر انداز کر کے انہوں نے حضرت محمدؐ کی خدمت میں ایک قاصد یہ کہلا کر بھیجا کہ

---

[1] آپؐ نے فرمایا کہ جعفرؓ جنت میں ہیں اور ان کے دونوں کٹے ہوئے بازوؤں کی جگہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دو پر عطا کر دیئے ہیں اور وہ جنت میں اڑتے پھرتے ہیں۔ اسی سبب سے اس وقت سے حضرت جعفرؓ کو طیارؓ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ([2]) اس مہم کو سریہ عمرو بن عاص یا ذات السلاسل کہتے ہیں۔ موتہ سے لشکر کی واپسی کے چند ہفتے بعد ہی یعنی جمادی الآخر شہ ھ میں تین سو مجاہدین کے ساتھ یہ مہم عمرو بن العاص کی سالاری میں روانہ کی گئی۔ یہ جگہ مدینہ سے دس روز کے فاصلے پر ہے۔

اگر ان کو کچھ کمک بھیج دی جائے تو وہ جنگ کے نتیجے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو وہ خود اور ان کے سپاہی جان توڑ کر لڑیں گے لیکن نتیجہ شاید موتہ جیسا ہی ہو۔

حضرت محمدؐ نے فوری طور پر حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کی قیادت میں ایک دستہ بھیجا اور حضرات ابو بکرؓ اور عمرؓ ان کے نائبین کی حیثیت سے ساتھ گئے۔ ان بڑے بڑے ناموں سے بعض لوگ یہ خیال کریں گے کہ شاید حضرت محمدؐ کو عمرو ابن العاص پر اعتماد نہ تھا لیکن اس سے پہلے کہ ان نئے کمانداروں میں سے کوئی اس موضوع پر اپنی رائے کا اظہار کرتا عمرو بن العاص نے ان اصحابؓ کبار سے کہلا بھیجا کہ وہ اس مُہم کے سالار مقرر ہوئے ہیں اور جب تک وہ زندہ ہیں سالار اعلیٰ وہ ہی رہیں گے۔ پھر اس وقت کے مسلمانوں کا جمہوری جذبہ بھی کچھ ایسا تھا کہ اس نو مسلم قریشی کے اس قسم کے موقف اختیار کرنے پر کسی نے بُرا نہ منایا۔

دوسری صبح عمرو بن العاص نے حملہ کر دیا۔ دشمن کو یہ علم نہ تھا کہ مسلمانوں کو کمک پہنچ گئی ہے۔ چنانچہ ان کا توازن بگڑ گیا اور وہ ہار گئے۔ آپ نے فتح کی خبر لے کر ایک قاصد حضرت محمدؐ کی خدمت میں بھیج دیا لیکن خود فوری طور پر واپس نہ آئے اور شام کی سرحدوں پر چھوٹے موٹے حملے کرتے رہے تاکہ دشمن پر یہ واضح کر سکیں کہ اگر موتہ پر مسلمانوں کو شکست ہو گئی تھی تو اس سے اسلامی افواج کا صرف ایک معمولی سا حصہ متاثر ہوا تھا۔ اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب ہر شخص اس بات کو اچھی طرح سمجھ گیا ہے تو حضرت عمرو بن العاص نے مدینے کی طرف مراجعت کی۔

اس کے بعد سارے ملک سے قبائل آ آ کر اطاعت کرنے لگے۔ خانہ بدوش قبیلوں کے

لہ رسول اللہ نے حضرت ابو عبیدہؓ کی قیادت میں دو سو انصار و مہاجرین کا امدادی دستہ بھیجا اور حضرات ابی بکرؓ اور عمرؓ کے ہوتے ہوئے انہیں اس کا سالار بنایا لیکن حضرت ابو عبیدہؓ کو تاکید کر دی کہ اگر عمرو بن عاص، جو حال ہی میں ایمان لائے تھے کوئی اختلاف کریں تو جھگڑا نہ کرنا۔ چنانچہ جب حضرت عمرو بن العاص نے اصرار کیا کہ سالار وہ خود ہی رہیں گے تو ان اصحاب کبار نے ان کی قیادت تسلیم کر لی۔ نماز بھی ان کے پیچھے پڑھی اور جنگ بھی ان کی قیادت میں لڑی۔ یہ تھی اسلامی جمہوریت کی روح اور خدمت اسلام کا جذبہ۔ (حیات محمد)

وہ سردار جنہوں نے قسمیں کھائی تھیں کہ وہ مر جائیں گے لیکن حضرت محمدؐ کی اطاعت نہ کریں گے مدینہ آئے اور حلف وفاداری اٹھایا۔ ان کا استقبال ہمیشہ گرمجوشی سے کیا جاتا تھا اور ان کی شکایات اور مشکلات بڑی توجہ اور ہمدردی سے سنی جاتی تھیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ۶۲۹ء کے آخر تک آپؐ کو یقین ہو گیا تھا کہ اب یمن اور شام کی سرحدوں کے درمیان بسنے والے بیشتر قبیلے آپ کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ آپؐ نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ابوسفیان کو اس کی گستاخیوں کی سزا دی جائے۔ آپؐ سولہ سال تک انہیں سہتے رہے اور اب سترھویں سال انہیں برداشت کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اب تو آپؐ کو صلح کا معاہدہ فسخ کرنے کے لئے کسی جائز وجہ کی ضرورت تھی اور غیر متوقع طور پر یہ سبب خود قریشیوں نے پیدا کر دیا۔

انیسواں باب

ابوسفیان کی دستبرداری اور فتح مکّہ

(رمضان المبارک ۸ھ مطابق جنوری ۶۳۰ء)

جنوری ۶۲۹ء[1] میں قبیلہ بنی بکر نے جو اہل قریش کے حلیف تھے، ایک اور قبیلے[2] پر حملہ کرکے اسے لُوٹ لیا، جس نے حضرت محمدؐ کی اطاعت کا حلف وفاداری اٹھایا ہوا تھا۔ لوٹ مار کرنے والوں میں کچھ اہل قریش بھی تھے جو بھیس بدلے ہوئے تھے۔ حملہ سے بچ جانے والے فوراً حضرت محمدؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور امداد کے ملتجی ہوئے آپ نے مسکراتے ہوئے انہیں یقین دلایا کہ

---

[1] طبقات ابن سعد اور تاریخ طبری کے مطابق بنی بکر اور قریش نے بنو خزاعہ پر حملہ شعبان ۸ھ میں کیا۔ فتح مکہ رمضان ۸ھ (جنوری ۶۳۰ء) میں ہوئی۔ اس طرح تقویم عیسوی کے مطابق یہ واقعہ آخر نومبر یا دسمبر ۶۲۹ء میں پیش آیا نہ کہ جنوری ۶۲۹ء میں جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے۔ غالباً دسمبر کی بجائے جنوری غلطی سے لکھا گیا کیونکہ آگے چل کر مصنف خود کہتا ہے کہ مکّہ کے لیے اسلامی لشکر یکم جنوری ۶۳۰ء کو حرکت میں آیا۔

[2] یہ قبیلہ بنو خزاعہ کا قبیلہ تھا۔ جو صلح حدیبیہ کے فوراً بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف بن گیا تھا اور آپؐ کی پناہ میں تھا۔ ادھر بنی بکر قریش کے حلیف تھے۔ اس حملہ میں قریش نے بنی بکر کو اسلحہ سے مدد دی اور خفیہ طور پر کچھ قریش حملے میں شریک بھی ہوئے۔ (طبری)

واقدی کے مطابق صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابوجہل اور سہیل بن عمرو بھیس بدل کر بنی بکر کے ساتھ اس شب خون میں شریک ہوئے۔

وہ ان پر بھروسہ رکھیں۔

یہ خبر مکہ بھی پہنچ گئی۔ اطلاع ملنے کے چند منٹ بعد شہر کی کونسل کا اجلاس بلایا گیا یہ تشویش اور خطرے کا اجلاس تھا۔ اس میں اشتعال دلانے کے لئے نہ تو کوئی طویل اور جوشیلی تقریریں تھیں اور نہ ہی حضرت محمدؐ کے خلاف دھمکیاں تھیں۔ اہل مکہ جان گئے تھے کہ اگر اس وقت کسی کو فوری طور پر کوئی بہت ہی معقول تدبیر نہ سوجھی تو شہر مکہ بہت جلد اپنی خود مختاری کھو بیٹھے گا۔ کوئی بھی ایسی معقول تجویز پیش نہ کر سکا۔ کسی کی سمجھ میں کوئی ایسی بات نہ آئی جو حضرت محمدؐ کو مکہ پر حملہ کرنے سے روک سکے سوائے اس کے کہ ان سے حسن سلوک اور درگذر کی درخواست کی جائے۔ ایسا کرنے کے لئے کوئی بھی تیار نہ تھا لیکن اس کے سوا کوئی اور چارہ کار بھی نہ تھا۔ عمرو بن العاص اور خالدؓ بن ولید کے اس طرف چلے جانے اور سینکڑوں قبائل کے مسلمان ہو جانے کے سبب اب سیاست اور عیاری سے ہی بچا جا سکتا تھا۔

مسئلہ کو حل کرنے کی تجویز پر متفق ہو جانے کے بعد دوسرا سوال یہ تھا کہ حضرت محمدؐ کے پاس کس کو بھیجا جائے۔ بلا تخصیص کونسل کا ہر فرد حضرت محمدؐ سے سخت نفرت کرتا تھا کیونکہ ان کے نزدیک آپؐ نے گذشتہ بیس سال سے ان کا امن وامان تباہ کیا ہوا تھا۔ آپؐ کو ختم کرنے کے لئے بھی ہر قسم کی کوششیں کر لی گئی تھیں لیکن سب ناکام رہیں۔ اب آپؐ کے پاس جا کر یہ تسلیم کرنا کہ آپؐ ہی حق پر تھے، آپؐ سے معافی مانگنا اور رحم کی درخواست کرنا ایک ایسی کڑوی گولی تھی جو زبان پر بھی نہ رکھی جا سکتی تھی چہ جائیکہ نگلی جائے لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا اور یہ کام کسی ایسے شخص کو کرنا تھا جو حضرت محمدؐ کو تجدید عہد کے لئے خلوص نیت کا یقین دلا سکے۔

ﷺ بنو خزاعہ کے فریادیوں کے چلے جانے کے بعد رسول اللہ نے ایک قاصد قریش کے پاس مندرجہ ذیل تین شرائط کے ساتھ بھیجا کہ ان میں سے کوئی سی ایک منظور کر لی جائے۔

(۱) مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔ (۲) قریش بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں (۳) معاہدہ حدیبیہ ختم سمجھا جائے قریش نے جواب دیا کہ صرف تیسری شرط منظور ہے لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش پچھتائے اور تجدید معاہدہ کے لئے ابوسفیان کو سفیر بنا کر بھیجا۔ (سیرۃ النبی۔ حصہ اوّل)

شہری کونسل کے ممبران کی نظریں ابوسفیان کی طرف اُٹھیں۔ ابوسفیان نے احتجاج کیا کہ وہ اس جھوٹے نبیؐ (نعوذ باللہ) اور اس عجیب وغریب تجارتی گماشتے کا جانی دشمن ہوتے ہوئے کس طرح ان کے پاس جاکر اپنی بے عزتی کرا سکتا تھا۔ لیکن جتنا ابوسفیان نے اس سے بچنے کے لئے حیلے بہانے کئے اہل قریش کو اتنا ہی یقین ہوتا گیا کہ وہ ہی مدینہ جانے کے لئے موزوں ترین آدمی تھا۔ مزید براں حضرت ام حبیبہؓ[1] بھی تو وہاں تھیں۔ ابوسفیان نے اپنی صاحبزادی کو کافی عرصہ سے دیکھا بھی نہیں تھا اور حضرت محمدؐ سے یہ ناموزوں اور بے جوڑ شادی کر لینے کے باوجود ان کے دل میں اپنے باپ کی کچھ نہ کچھ محبت تو ضرور ہوگی۔

آخر کار ابوسفیان اس ہتک آمیز مشن کے لئے تیار ہوگیا اور مدینہ کی طرف روانہ ہوگیا وہاں پہنچا تو مزید ذلتیں اس کی منتظر تھیں۔ حضرت محمدؐ نے یہ جانتے ہوئے کہ قریش بہت ہی مجبور ہوں گے جو انہوں نے اپنے اس قائد کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے ابوسفیان سے ملنے سے انکار کر دیا۔

ابوسفیان جو پہلے ہی کافی ضبط سے کام لے چکا تھا، مشتعل ہوگیا لیکن کسی نے اس سے رُخ دے کر بات نہ کی۔ وہ حضرات ابوبکرؓ۔ عمرؓ اور علیؓ کے پاس گیا لیکن ہر ایک نے اس کے ساتھ اسی بے توجہی کا سلوک کیا۔ پھر وہ حضرت فاطمہؓ سے ملا لیکن انہوں نے بھی اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی صاحبزادی (حضرت ام حبیبہؓ) کے پاس گیا۔ تو انہوں نے بھی اس کے ساتھ جو سلوک کیا وہ یہ تھا کہ رسول کریمؐ کی چٹائی اور بستر لپیٹ دیا مبادا ایک مشرک اس پر بیٹھ جائے۔

یہ دیکھ کر کہ کوئی بھی اس سے کسی قسم کی بات چیت کرنے کا روادار نہیں وہ مسجد کے صحن

---

[1] حضرت ام حبیبہؓ۔ ابوسفیان کی صاحبزادی۔ یہ مسلمان ہوکر اپنے شوہر عبید اللہ بن جحش کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کر گئی تھیں۔ وہاں ان کے شوہر وفات پا گئے۔
بعد ازاں وہاں پر ہی نجاشی (شاہ حبش) کی وساطت سے آپ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آگئیں۔ اور پھر مدینے تشریف لے آئیں۔

میں چلا گیا اور اعلانؒ کیا۔

"لوگو! میری بات سنو۔ میں سب لوگوں کو امن اور پناہ کی ضمانت دیتا ہوں"۔

حضرت محمدؐ نے اپنی آواز بلند کئے بغیر جواب دیا۔

"اے ابوسفیان! یہ ضمانت تم دے رہے ہو۔ ہم ایسی کوئی بات نہیں کہہ رہے ہیں"۔

جب ابوسفیان نے مکہ پہنچ کر حالات سے آگاہ کیا تو لوگوں میں مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لیکن پھر بھی وہ یہ خیال نہیں کر سکتے تھے کہ حضرت محمدؐ ان کو اتنی تھوڑی ہی مہلت دیں گے۔

اب آپؐ کے پاس اتنی جمعیت ہو گئی تھی کہ اسے حقیقی معنوں میں ایک فوج کہا جا سکتا تھا۔ اس کی قیادت ان لوگوں کے پاس تھی جو چھ سال سے جنگوں اور غزوات میں آپؐ کے ماتحت لڑتے رہے تھے۔ وہ آپؐ کے طریقوں کو جان گئے تھے۔ انہیں آپؐ پر پورا پورا بھروسا تھا اور خود پر بھی

لہ (۱) ابوسفیان حضرت علیؓ کے پاس آیا اور رسولؐ اللہ سے سفارش کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے مجبوری ظاہر کی لیکن ابوسفیان مصر ہوا اور کہا اچھا مجھے مشورہ دو میں کیا کروں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ بذلہ سنج بھی تھے اور مزاح کا مذاق بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ جب ابوسفیان نے بہت مجبور کیا تو کہا صرف ایک ہی بات ہو سکتی ہے کہ مسجد میں جا کر مجمع عام میں خود کو سب مسلمانوں کی حفاظت میں دے دو۔ چنانچہ ابوسفیان نے ایسا ہی کیا اور پھر اونٹ پر سوار ہو کر مکہ واپس چلا گیا۔ جب مکہ والوں نے پوچھا کہ آیا اس کی اس درخواست کو حضرت محمدؐ نے بھی تسلیم کیا اور اجازت دی تو اس نے کہا نہیں۔ اس پر قریش نے کہا۔ بخدا علیؓ نے تمہیں بیوقوف بنایا ہے۔

(طبری۔ جلد اول۔ حصہ سوم)

(۲) ابوسفیان نے حضرت علیؓ کے مشورہ پر مسجد میں اعلان کیا کہ میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی ہے۔ (سیرۃ النبی)

(۳) حضرت علیؓ کے مشورہ پر ابوسفیان نے یہ اعلان کیا کہ وہ اپنی طرف سے سب کو امان دیتا ہے اور خود بھی امان کا طالب ہے جب مکہ جا کر یہ بات بتائی تو لوگوں نے کہا کہ حضرت علیؓ نے تم سے مذاق کیا۔ (حیات محمدؐ)

صحیح ترین بات یہ ہی معلوم ہوتی ہے کہ ابوسفیان نے مسجد میں جا کر یک طرفہ معاہدے کی تجدید کر دی ہو گی اور سب کو امان دینے کے بعد خود بھی امان کا طالب ہوا ہو گا۔ لیکن رسول کریمؐ کی منظوری کے بغیر یہ سب کچھ ایک مذاق سے زیادہ نہ تھا۔ (مترجم)

اعتماد تھا۔ آپؐ کی فوج خانہ بدوش شتر سواروں۔ گھوڑ سواروں اور ان جفاکش صحرانوادوں پر مشتمل تھی جن کے لیے جنگ کرنا ایک قسم کا کھیل تھا۔ شراب کے مکمل امتناع اور لوٹ مار پر پابندی لگانے سے ان میں نظم و ضبط بھی پیدا ہو گیا تھا۔ ان فطری صلاحیتوں کے علاوہ اب وہ اچھے سازوسامان سے لیس اور اچھے ہتھیاروں سے مسلح بھی ہو گئے تھے۔ مکہ پر اس حملہ کے لیے حضرت محمدؐ نے دس ہزار تربیت یافتہ جوان اور اتنے ہی سواری کے جانور فراہم کر لیے تھے۔

لیکن اس کے باوجود کہ یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا لشکر تھا، جواب تک میدان میں لایا گیا تھا، حضرت محمدؐ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے اور پوری احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔ چنانچہ مکہ کی روانگی کو بڑے راز میں رکھا گیا۔ مکہ کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے۔ خانہ بدوشوں کی تمام نقل و حرکت روک دی گئی۔ دشمن کے جاسوسوں کی سرگرمیوں کو ناکام بنانے کے لیے جوابی جاسوسی کا طریقہ اختیار کیا گیا اور ہر ایک کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھی گئی۔ اس طرح دشمن کو خبریں پہنچانے کا یہ واحد ذریعہ بھی ختم کر دیا گیا۔

حضرت حاطبؓ[1] کو جو شروع میں مسلمان ہونے والوں میں سے ایک تھے مکہ میں اپنے گھر والوں کے متعلق فکر پیدا ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے ایک لونڈی کے ہاتھ ایک خط بھیجا جس میں انہیں خبردار کیا گیا تھا۔ آنحضرتؐ کو یہ خبر اپنے محکمہ جاسوسی کے ذریعے مل گئی لونڈی کو گرفتار کر کے واپس لے آیا گیا۔ اور خط پکڑا گیا۔ حضرت حاطبؓ کو اس خود غرضی کے سبب قریب قریب اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور صرف اس وقت جان بخشی ہوئی جب انہوں نے جنگ بدر میں اپنی خدمات کا واسطہ دیا۔

یکم جنوری[2] سن ۶۳۰ء کو یہ لشکر حرکت میں آیا اور مکہ کی جانب روانہ ہوا۔ حضرت زبیرؓ بن عوام دو سو سواروں کے ساتھ مقدمۃ الجیش[3] کے سالار تھے۔ خود حضرت محمدؐ قلب کی کمان

---

[1] حاطب بن ابی بلتعہ ایک معزز صحابی اور اہل بدر میں سے تھے۔ (سیرۃ النبی)

[2] مطابق ۱۰ رمضان المبارک ۸ھ (سیرۃ النبی)

[3] لشکر سے آگے چلنے والا ہراول دستہ۔

کر رہے تھے۔ عقب میں چند عورتیں ہم رکاب تھیں جن میں امہات المومنین حضرت زینبؓ اور حضرت ام سلمہؓ بھی تھیں۔

حضرت عمرؓ مرکزی لشکر کی نقل وحرکت اور مقدمۃ الجیش کے درمیان رابطہ قائم رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ بڑی مہارت سے آپ فوج کو چٹانی پہاڑیوں کے غیر مستعمل دروں میں سے نکال کر لے گئے۔ راستے میں نہ کوئی بگل بجا سکتا تھا اور نہ ہی تالی بجانے یا زور سے پکارنے کی اجازت تھی۔ جب مکہ اور مدینے کے درمیان پہنچے تو مخبروں نے خبر دی کہ چند مردوں اور عورتوں کی ایک جماعت مکہ مکرمہ کی جانب سے صحرا میں چلی آرہی ہے۔ کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ اس جماعت کے سربراہ کسی سے نہ دبنے والے آپؐ کے چچا العباسؓ[1] تھے۔ حضرت عباسؓ نے یہ نہیں بتایا کہ ان کو ان سب باتوں کا کیسے پتہ چلا کہ کیا ہونے والا ہے۔ بس وہ آئے اور حضرت محمدؐ کو اس طرح سلام کیا گویا آپؐ کا دس ہزار فوج کے ساتھ صحرا میں سفر کرنا ایک معمول کی سی بات تھی۔ ان کے ساتھ ان کے تمام اہل خانہ بھی تھے۔ دن کا وقت گزر جانے پر انہوں نے اپنے بھتیجے کو بتایا کہ ان سب نے مسلمان ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور اس طرح کوئی شرم محسوس کئے بغیر انہوں نے اور ان کے اہل خانہ نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ آپؐ کے چچا ہمیشہ کے ابن الوقت تھے آپؐ ہمیشہ ان سے ملاطفت اور خوش دلی سے پیش آئے۔ آپؐ نے فرمایا:۔

"چچا جان جس طرح میں آخری نبیؐ ہوں اسی طرح آپ بھی آخری مہاجر ہیں"

جواب نہ بن پڑنے پر حضرت عباسؓ اپنے کندھے اچکا کر رہ گئے۔ اپنے اہل خانہ کو مدینہ کی طرف روانہ کر کے آپ مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہو گئے۔

---

[1] حضرت عباسؓ کو کسی نہ کسی ذریعہ سے لشکر اسلام کی آمد کا علم ہو گیا تھا چنانچہ وہ قریش کو چھوڑ کر جحفہ کے مقام پر رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ کے ساتھ اہل خانہ کے علاوہ ابو سفیان بن حارث بن عبد المطلب (آپؐ کے ابن عم) اور عبد اللہ بن امیہ بن مغیرہ (آپؐ کے پھوپی زاد) بھی تھے۔ رسول اکرمؐ نے ان دونوں صاحبان سے ملنے سے انکار کیا لیکن پھر حضرت عباسؓ اور حضرت ام سلمہؓ کی سفارش پر انہیں اندر بلا لیا اور یہ مسلمان ہو گئے اور لشکر اسلام میں شامل ہو گئے۔ (حیات محمدؐ)

روز بروز لشکر قریب آتا گیا۔ یہاں تک کہ مرالظہران[1] کے مقام پر پہنچ کر مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا جہاں سے مکہ نظر آتا تھا۔ صرف یہاں پہنچ کر حضرت عمرؓ نے پڑاؤ میں آگ جلانے کی اجازت دی چنانچہ اہل قریش، جنہیں خیال بھی نہ تھا کہ حضرت محمدؐ کیا کرنے والے ہیں، اچانک شمال کی طرف پہاڑیوں پر آگ کے ہزاروں[2] سرخ شعلوں کی لپک دیکھ کر حیران رہ گئے۔ البتہ ان کو یقین نہ آتا تھا کہ اتنی بڑی تعداد سب لشکریوں کی تھی۔ ان کے خیال میں غالباً یہ صرف دھوکا یا دکھاوا تھا تاکہ لشکر اصل تعداد سے زیادہ بڑا نظر آئے۔ چنانچہ اس بات کی تحقیق کرنے اور حالات کا جائزہ لینے کے لئے ابوسفیان خود، حضرت خدیجہؓ کے ایک بھتیجے حکیم بن حزام اور مقامی قبیلے کا سردار بدیل بن ورقہ جو اب تک قریش کا حلیف تھا مکہ سے باہر نکلے۔

اس سے پہلے کہ وہ پڑاؤ تک پہنچیں انہوں نے ایک سفید بڑی ڈیل ڈول والی مخلوق کو اندھیرے میں منڈلاتے دیکھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ کوئی دفاعی قدم اٹھائیں، وہ مخلوق ان کے برابر آکر ٹھہر گئی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ العباسؓ تھے۔ اس خیال سے کہ اہل قریش کوئی قدم غلط اٹھا کر اپنے مظالم کے سبب اپنا قتل عام نہ کرا لیں، آپ نے حضرت محمدؐ کا سفید خچر مانگ لیا اور اس پر سوار ہو کر پڑاؤ سے باہر نکل آئے تھے تاکہ جو کوئی بھی مل جائے اسے مسلمانوں کے لشکر کی تعداد سے خبردار کر دیں۔ ابوسفیان سے مڈبھیڑ ہو جانے پر آپ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ آپ کے ساتھ چلے اور دن نکلنے سے پہلے پہلے خود کو حضرت محمدؐ کے حوالے کر دے کیونکہ علی الصبح ہی حملہ شروع ہو جانا تھا۔

ابوسفیان 'جس کا غرور و تکبر اب خاک میں مل چکا تھا' رضامند ہو گیا اور حضرت عباسؓ کے پیچھے ان کے خچر پر سوار ہو گیا۔ باقی دو ساتھی واپس چلے گئے تاکہ شہر والوں کو بھی یہ حال بتا دیں۔

جونہی رسولؐ اللہ کا خچر پڑاؤ میں داخل ہوا ہر طرف کے سپاہیوں نے ہوشیار ہو کر سلامی

---

[1] مرالظہران۔ مکہ سے باہر چند میل کے فاصلے پر ہے۔

[2] مسلمانوں نے پھیل کر اپنے لشکر میں دس ہزار جگہ آگ روشن کی۔ (تاکہ اہل مکہ مرعوب ہو جائیں۔)
(طبقات ابن سعد)

دی۔ رات کا وقت ہونے کے سبب یہ کسی نے نہ دیکھا کہ خچر پر کون تھا اور ان دونوں سواروں کو کسی نے نہ روکا۔ یہاں تک کہ وہ حضرت عمرؓ سے ملاقی ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے جوش و مسرت سے بھری ہوئی کہی اور فوراً ابوسفیان کا سر قلم کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ دیکھ کر حضرت عباسؓ نے فوراً مداخلت کی اور اپنے ساتھی سوار کو اپنی پناہ میں لینے کا اعلان کر دیا۔ عمرؓ بادل ناخواستہ پیچھے ہٹ گئے اور خچر رسول اللہؐ کے خیمے تک پہنچ گیا۔

جب آپؐ کے چچا نے حاضر خدمت ہو کر سلام کیا اور بتایا کہ باہر آپؐ سے ملاقات کا منتظر کون تھا۔ تو حضرت محمدؐ صلعم نے کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہ کیا اس خبر پر جو دلی مسرت آپؐ کو ہوئی ہوگی۔ اس کا اظہار آپؐ کیسے کر سکتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ آپؐ ان تمام بے عزتیوں کا منافع کے ساتھ بدلہ لے رہے تھے جو ابوسفیان نے آپ پر روا رکھی تھیں بلکہ آپؐ کو خونریزی کے بغیر ہی شہر مکہؐ واپس لینے کا ذریعہ مل رہا تھا۔ حالانکہ آپؐ نے اتنا بڑا لشکر فراہم کر لیا تھا لیکن حضرت محمدؐ ہر گز یہ نہیں چاہتے تھے کہ آپؐ واقعی طور پر انتقام لیں اور نہ ہی آپؐ ان کو سزا دینا چاہتے تھے جنہوں نے آپؐ کو ستایا تھا۔ آپؐ نہیں چاہتے تھے کہ بھائی بھائی مزید ایک دوسرے کے خونؐ سے ہاتھ رنگیں۔ البتہ جو کچھ آپؐ نے حضرت عباسؓ کو جواب دیا۔ وہ یہ تھا۔

"اسے اپنے خیمہ میں لے جائیں اور صبح کو میرے پاس لائیں۔"

حضرت عباسؓ نے ان احکام کی تعمیل کی اور رات کا بیشتر حصہ ابوسفیان کو یہ سمجھانے میں گذارا کہ اب مکہ کی آزادی اور خودمختاری کے دن ختم ہو چکے اور اسے اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ صبح کی نماز کے بعد آپ اپنے قیدی کو لے کر حضرت محمدؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ چند لمحے تک حضرت محمدؐ نے اپنے سامنے کھڑے ابوسفیان کو دیکھا جس کے چہرے سے کچھ عاجزی، کچھ غصہ لیکن زیادہ تر نفرت اور نخوت کا اظہار ہو رہا تھا۔ پھر آپؐ نے کہا۔

"ابوسفیان کیا اب بھی تمہیں یقین نہیں آیا کہ اللہ ایک ہے۔ (اور وہ

لے جنگ بدر۔ جنگ احد اور جنگ خندق میں ایسا ہی ہوا تھا۔ اور باپ بیٹے کے اور بھائی بھائی کے خلاف لڑا تھا۔ ایسی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

لاشریک ہے)

ابوسفیان نے اثبات میں سر ہلایا اور بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "اگر ایسا نہ ہوتا (یعنی کوئی دوسرا خدا بھی ہوتا) تو میں اس حال میں نہ ہوتا جواب ہے"۔

"اور کیا میں اللہ کا رسول نہیں ہوں"؟ حضرت محمدؐ نے مزید دریافت کیا۔

ابوسفیان نے کچھ تامل کیا اور تذبذب میں اپنے چاروں طرف دیکھا۔ یہ بات تسلیم کر لینا اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ حضرت عباسؓ نے فوراً مداخلت کی۔

"ابوسفیان یہ تذبذب کا وقت نہیں ہے۔ ایمان لاؤ اور کلمہ شہادت پڑھو ورنہ پھر ..."

"ورنہ پھر" یہ کہتے ہوئے حضرت عمرؓ نے، جو خیمہ کے دروازے پر کھڑے ابوسفیان کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، فقرے کو پورا کر دیا۔ "ورنہ پھر تمہارا سر تمہارے جسم سے علیحدہ کر دیا جائے گا"۔

ابوسفیان نے اب مزید تامل نہ کیا اور اسلام قبول کر لیا۔[1]

حضرت محمدؐ چند منٹ تک خاموش رہے۔ آپؐ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ مسلمانوں کے اس سب سے بڑے اذیت دہندہ نے آپؐ کو اللہ کا نبیؐ تسلیم کر لیا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اس نے (فی الوقت) خوف کے سبب ایسا کیا تھا لیکن اس بوڑھے بشری کے دل میں جس نے کئی بار آپؐ کو جان سے مار دینے کی کوششیں کی تھیں صحیح معنوں میں خوف پیدا کرنا قریب قریب ناقابلِ یقین معلوم ہوتا تھا چنانچہ کچھ توقف کے بعد آپؐ نے فرمایا:۔

"ابوسفیان[2]! اب جلدی سے مکہ جاؤ اور لوگوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے گھروں

---

[1] تاریخ طبری۔ حیات محمدؐ (محمد حسین ہیکل) اور کئی دوسری کتب میں ابوسفیان کا اسلام لانا اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔ سیرۃ النبی میں بھی طبری وغیرہ کے حوالے سے ایسا ہی لکھا ہے۔

[2] ابوسفیان کے ایمان لے آنے کے بعد حضرت عباسؓ نے آنحضرت صلعم سے مخاطب ہو کر عرض کی کہ سرداری اور جاہ پرستی ابوسفیان کی کمزوری ہے ذرا اس کا خیال رکھیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا "جو شخص ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا اسے امان دی جائے گی۔ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا اسے بھی امان ہو گی اور جو شخص کعبہ میں داخل ہو جائے گا وہ بھی مامون ہو گا"۔ "حیاۃ محمدؐ"

کے اندر رہیں ۔ جو بھی ایسا کرے گا، وہ محفوظ رہے گا۔"

ابوسفیان خیمے سے باہر نکل آیا۔ باہر آ کر اس نے سارے کیمپ میں سرگرمی اور تیاری دیکھی۔ کمپنیاں اور دستے، پلٹنیں اور رسالے صف بستہ ہو رہے تھے۔ سورج کی کرنیں خود اور چار آئینوں پر پڑ کر چمک اور چکا چوند پیدا کر رہی تھیں۔ قبیلوں کے پرچم جو تعداد میں سینکڑوں تک پہنچتے تھے۔ ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اونٹ بلبلا رہے تھے اور گھوڑے ہنہنا ہنہنا کر زمین پر ٹاپیں مار رہے تھے۔ ابوسفیان نے مسلمانوں کی اتنی فوج۔ اتنی سواریاں اور اتنے اچھے ہتھیار کبھی نہ دیکھے تھے۔ ایک گھوڑ سوار دستے کو دیکھا۔ جو سیاہ رنگ کی زرہ بکتر پہنے، ہاتھوں میں لمبے نیزے لئے اپنے گھوڑوں پر اس طرح جمے بیٹھے تھے جیسے مجسمے ہوں اور پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔

حضرت عباسؓ نے جواب دیا: "یہ حضرت محمدؐ کا ذاتی حفاظتی دستہ ہے جو مکے اور مدینے کے مشہور جنگجوؤں اور مجاہدین میں سے چنا گیا ہے۔"

ابوسفیان مزید کچھ سننے کے لئے نہ ٹھہرا۔ پتھریلی گھاٹی کی ڈھلوان سے وہ واپس مکہ کی طرف تیزی سے روانہ ہو گیا۔ شہری کونسل طلب کی اور جو کچھ دیکھا تھا انہیں بتایا۔ اس نے ہر ایک کو آگاہ کر دیا کہ کسی قسم کا مقابلہ بے سود ہو گا۔ کسی نے اس پر احتجاج نہ کیا۔ مکہ کے بیشتر لوگ مقابلہ کرنا بھی نہ چاہتے تھے۔ وہ پچھلے سال عمرہ قضا کے موقعہ پر مسلمانوں کے رویہ سے بہت متاثر ہو چکے تھے اور لڑائیوں سے اکتائے ہوئے بھی تھے۔ بہت سوں نے تو یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ شروع

۱-۲ طبری نے حضرت عباسؓ سے روایت کی ہے کہ میں نے ابوسفیان کو دانستہ پہاڑی ایک گھاٹی کے کنارے چوٹی پر ٹھیرا لیا۔ افواج کے تمام دستے اس کے سامنے سے گزرتے رہے۔ وہ ہر ایک کے متعلق پوچھتا تھا کہ یہ کون ہیں۔ وہ بڑا متاثر ہوا آخر میں مہاجر و انصار پر مشتمل آنحضرت صلعم کا خاص دستہ گزرا جو فولاد میں غرق تھا اور صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ جب ابوسفیان کو اس دستے کے متعلق بتایا گیا تو کہنے لگا کہ اب تو تمہارے بھتیجے کی طاقت اور شوکت و عظمت بہت بڑھ گئی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ دنیاوی حکومت نہیں بلکہ نبوت کا اثر ہے۔ چنانچہ مکہ پہنچ کر ابوسفیان نے اسلامی لشکر کی طاقت اور تعداد سے لوگوں کو آگاہ کیا اور کہا ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پھر حفاظت و امن کے متعلق رسولؐ اللہ کے احکام سنائے۔ (تاریخ طبری)

ہی سے حضرت محمدؐ کے متعلق ان کا رویہ غلط تھا۔ چنانچہ مرد، عورتیں اور بچے گھروں کے اندر چلے گئے اور دروازے بند کر کے مسلمانوں کے فاتحانہ داخلے کا انتظار کرنے لگے۔

اس اثنا میں حضرت محمدؐ بھی اور جنگی مواقع کی طرح جنگی لباس پہن کر اور ہتھیار لگا کر تیار ہو گئے۔ آپؐ نے سرخ قبا زیب تن کی جس پر آپؐ کا چار آئینہ چمک رہا تھا۔ سر پر ایک نوکدار خود تھا۔ جس کے گرد آپؐ نے سیاہ عمامہ باندھا ہوا تھا۔ تلوار کے علاوہ آپؐ کے پاس کوئی اور ہتھیار نہ تھا۔ خیمے کے سامنے بیٹھی ہوئی القصوا پر سوار ہو کر آپؐ نے صفوں میں گشت کیا۔ اس سے پہلے کہ لشکر روانہ ہو آپؐ نے حضرت علیؓ کو وہی مشہور علم عطا کیا جسے وہ خیبر کی جنگ میں لے جا کر بے مثل بہادری کے جوہر دکھا چکے تھے۔

اسلام قبول کر لینے کے باوجود حضرت محمدؐ کو ابوسفیان پر اس سے زیادہ بھروسا نہ تھا جتنا کہ اُحد کے موقعہ[1] پر تھا۔ چنانچہ آپؐ نے فوج کو اس طرح ترتیب دیا کہ وہ اہل مکہ کے کسی اچانک حملے کا نشانہ بن کر نقصان نہ اٹھائے۔ آپؐ کی فوجوں نے مکہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور وہ چار مختلف مقامات سے شہر میں داخل ہوئیں۔

جنوب کی سمت سے حضرت خالدؓ بدویوں کے رسالوں کے ساتھ (زیریں حصہ سے) داخل ہوئے۔ شمال کی جانب (بالائی حصہ) سے بدوی شتر سواروں کی ایک اور جماعت الزبیرؓ (زبیر بن عوام) کی سالاری میں، مغرب کی طرف سے مدنی دستے سعد بن عبادہؓ[2] کی سرکردگی میں اور مشرق

---

[1] احد کی جنگ کے بعد شام کو ابوسفیان اپنا لشکر لے کر مکہ کی جانب روانہ ہو گیا لیکن آپؐ کو اعتبار نہ تھا چنانچہ آپؐ نے اس کا تعاقب کیا۔ آپؐ کا اندازہ صحیح نکلا وہ مدینہ سے تھوڑے فاصلے پر جا کر ٹھہر گیا تھا اور مدینہ پر دوبارہ حملے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ آپؐ کے تعاقب نے اس کا یہ منصوبہ پورا نہ ہونے دیا۔

[2] رسول اللہ نے مکہ میں داخلے کے وقت سالاروں کو حکم دیا تھا کہ وہ کسی کو قتل نہ کریں گے۔ مسجد حرام میں پناہ لینے والے بھی مامون تھے لیکن جب سعد بن عبادہؓ شہر میں داخل ہوئے وقت یہ رجز پڑھتے گزرے کہ آج جنگ کا دن ہے اور حرم میں خونریزی حلال ہو گی۔ آنحضرت کو خبر ہوئی تو آپؐ کے حکم سے فوراً پرچم سعدؓ سے لے کر ان کے صاحبزادے قیس کو دے دیا گیا۔ آپؐ ہرگز نہ چاہتے تھے کہ مکہ یا حرم میں خونریزی ہو۔ (تاریخ طبری - حیات محمدؐ)

سے ابوعبیدہؓ بن الجراح مہاجر اکابرین کے ساتھ داخل ہوئے۔ اس دستے کے پیچھے خود حضرت محمد صلعم اپنے عملہ کے ساتھ چلے آرہے تھے۔ آپؐ کے ساتھ حضرت علیؓ کی قیادت میں سیاہ بکتر پہنے وہ رسالہ تھا جس کو دیکھ کر ابوسفیان متاثر ہوا تھا۔

تربیت یافتہ فوج بڑے قاعدے اور قرینے کے مطابق پلٹنوں اور رسالوں کی شکل میں پڑاؤ سے روانہ ہوئی۔ فوجی دستے آہستہ آہستہ ان قدیم راستوں سے روانہ ہوئے جو شہر میں آتے تھے۔ کہیں بھی کوئی مخالفت نہیں ہوئی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت محمدؐ کی خواہش کے مطابق شہر کسی خونریزی کے بغیر ہی فتح ہو جائے گا۔ کہ اچانک حضرت خالدؓ کے دستوں پر حملہ کیا گیا۔

صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو اور عکرمہ بن ابی جہل یہ برداشت نہ کر سکے کہ وہ گھروں میں بیٹھے رہیں اور (نعوذ باللہ) یہ صلح شکن دشمن (حضرت محمد صلعم) شہر پر قبضہ کرلے اور ان کی آزادی سلب ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے اسلامی لشکر کی بڑی تعداد کی بھی پروانہ کی۔ وہ ہمیشہ کے جنگجو تھے اور لڑائی لڑنا ان کی فطرت تھی۔

البتہ یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ انہوں نے خالدؓ کے دستوں کو حملے کے لئے چنا۔ ان کی بجائے کوئی اور سالار ہوتا تو شاید انہیں کوئی عارضی کامیابی ہوتی لیکن اس شعلہ جوالہ کے سامنے وہ کہاں ٹھہر سکتے تھے۔ ابھی مشکل سے اہلِ مکہ کے تیروں کی پہلی بوچھاڑ حضرت خالدؓ اور ان کے ایک ہزار سواروں کے قریب پڑی ہی تھی کہ ان کے رسالے نے حملہ کر دیا اور اس سے پیشتر کہ حضرت محمدؐ اس لڑائی کو روکنے کا پیغام[1] بھیجیں، جس سے بچنے کے لئے آپؐ نے اتنا اہتمام کیا تھا دو مسلمان اور اٹھائیس اہل مکہ کھیت رہے تھے۔

---

[1] حضرت خالدؓ مکہ میں جنوب یا شہر کے زیریں حصہ سے داخل ہوئے اور وہاں پر کچھ قریش ان سے نبرد آزما ہوئے۔ تھوڑی دیر تلوار بھی چلی۔ رسول کریمؐ اونچی جگہ پر تھے اور بالائی حصہ سے آپؐ نے نیچے کی طرف حضرت خالدؓ کو لڑتے دیکھا تو آپؐ نے فوراً تلوار روک لینے کا حکم بھیجا لیکن اتنی دیر میں قریش کے کچھ آدمی مارے جا چکے تھے اور عکرمہ وغیرہ راہ فرار اختیار کر چکے تھے۔ جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ لڑائی قریش نے شروع کی اور خالدؓ نے صرف جوابی کارروائی کی ہے تو آپؐ نے فرمایا "جو کچھ خدا کو منظور ہے اسی میں بہتری ہے۔" (حیاۃ محمدؐ)

اس غلط قسم کے واقعہ کے وقت حضرت محمدؐ اس قبرستان[1] کے ذرا نیچے، جہاں حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ مدفون ہیں، ایک چبوترے کی سی بلندی سے شہر مکہ پر قبضہ کی کارروائی کی نگہبانی کر رہے تھے۔ یہاں پر آپؐ نے اپنا خیمہ نصب کر لیا تھا اور مکہ پر مکمل قبضہ ہو جانے تک آپؐ یہاں ہی مقیم رہے۔

اب بھی آپؐ کو ہر بات ناقابل یقین معلوم ہو رہی تھی۔ جہاں اس وقت آپؐ تشریف رکھتے تھے وہاں سے آپؐ کو اپنے دادا حضرت عبدالمطلب کا مکان نظر آ رہا تھا جہاں آپؐ بچپن میں کھیلتے رہے تھے۔ آپؐ حضرت ابوطالب کا مکان بھی دیکھ سکتے تھے جہاں آپؐ نے پرورش پائی اور حضرت خدیجہؓ کا بھی جہاں آپؐ نے خوشی و مسرت کے دن گزارے تھے۔ وہ گلیاں بھی آپؐ کو نظر آ رہی تھیں جن سے آپؐ جوانی کے ایام میں گزرا کرتے تھے اور وہ جگہ بھی جہاں آپؐ پہلے کارواں میں شامل ہوئے تھے۔ آپؐ کو اب صحیح طور پر یاد بھی نہ رہا تھا، کہ آپؐ دور دراز کے سفر سے واپسی پر کتنی بار اس سڑک سے گزرے تھے اور ریاضت اور خاموش عبادت کے لئے کتنی دفعہ اس جگہ سے ہو کر غار حرا گئے تھے اور اب یہ سب کچھ آپؐ کا تھا بوڑھے ہاشم کا ایک خلف، جس کا خاندان اتنا زوال پذیر ہو گیا تھا کہ اب اس میں کوئی قابل ذکر فرد باقی نہ رہا تھا، اس کے نام کی عظمت کو دوبارہ زندہ کر رہا تھا۔ آج آپ **محمدؐ الرسول اللہ** ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب ابن ہاشم مکہ کے آقا و مالک تھے۔ سب کچھ آپؐ کے قبضہ و تصرف میں تھا۔

---

[1] یہ مشہور قبرستان قدیم مکہ کے باہر پہاڑی ڈھلوان پر ہے۔ شالامار باغ کی طرح اس کے تین طبقے ہیں۔ حضرات عبدالمناف عبدالمطلب اور ابوطالب کی قبریں پہاڑی پر ہیں۔ حضرت خدیجہؓ اور آپ کے صاحبزادے حضرت قاسم کی درمیانی طبقہ میں اور حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت اسماء وغیرہ کی قبریں سب سے نچلے میدانی طبقہ میں ہیں۔ اس قبرستان کو جنت المعلاۃ کہتے ہیں (مترجم) [2] آنحضورؐ ایک بلند جگہ پر تشریف رکھتے تھے۔ وہاں سے کعبہ نظر آتا تھا۔ اور اس کے بازو میں پہاڑی پر شعب بنی ہاشم اور آپ کے آبائی مکانات تھے۔ اسی طرح حضرت خدیجہؓ کا مکان بھی اور زیادہ قریب بلندی پر تھا۔ جہاں آپؐ تشریف رکھتے تھے، وہاں سے اس وقت یہ مکانات وغیرہ نظر آ سکتے ہونگے۔ جبل حرا اور دوسری پہاڑیاں بھی آپؐ کے سامنے تھیں۔

جونہی آپؐ کو یہ تصدیق ہوگئی کہ مسلمان فوج کا شہر پر مکمل قبضہ[1] ہوگیا ہے آپؐ نے اپنا فوجی لباس اتارا اور احرام[2] باندھ لیا۔ القصوہ پر سوار ہوکر آپؐ کعبہ تشریف لے گئے۔ یہاں آپؐ نے پچھلے سال کی طرح تمام مناسک ادا کیئے۔ یعنی حجر اسود کو بوسہ دیا اور کعبہ کے گرد سات دفعہ طواف کیا۔ کچھ توقف کے بعد آپؐ نے ان چند تا حال موجود لوگوں کو بلایا جو ہجرت سے پہلے اسلام لے آئے تھے۔ وہ لوگ جنہوں نے اسی جگہ آپؐ کا ساتھ دینے کا عہد کیا تھا اور اسلام کے نصب العین کی خاطر اپنی جانیں خطرے میں ڈالی تھیں۔ اب آپؐ اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے والے تھے جو اسلام کے آغاز سے ہی آپؐ کے ذہن میں تھا۔ یعنی آپؐ کعبہ کے بتوں کو توڑنے لگے تھے۔

پتھر کے تراشیدہ تین[3] سو ساٹھ بت، بشمول بڑے بت ہبل اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت

---

۱ فتح مکہ کی تاریخ کے متعلق مختلف روائتیں ہیں اکثر مورخین نے کوئی حتمی تاریخ نہیں لکھی لیکن طبقات ابن سعد میں واضح طور پر لکھا ہے کہ رسول اللہ ۱۰ رمضان المبارک کو بدھ کے روز بعد عصر مدینے سے روانہ ہوئے اور ۲۰ رمضان یوم جمعہ ۸ھ کو مکہ معظمہ فتح کیا۔ پندرہ رات مکہ میں گزاریں پھر حنین کی طرف روانہ ہوئے۔ ابن سعد نے اس سلسلہ میں دوسروں کی بیان کردہ اور تاریخیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن یہ تاریخ ہی حتمی اور صحیح معلوم ہوتی ہے۔ مدینہ سے روانگی کی تاریخ علامہ شبلی نے بھی ۱۰ رمضان ۸ھ ہی لکھی ہے۔ (مترجم)

۲ اس بات کی کہیں تصدیق نہیں ملتی کہ فتح مکہ میں آپؐ احرام میں کعبہ تشریف لے گئے بلکہ اس کے خلاف طبقات ابن سعد میں ایسی کئی روایات ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ احرام میں نہیں تھے بلکہ خود پہن رکھا تھا اور عمامہ باندھا ہوا تھا اور اسی لباس میں آپؐ نے حجر اسود کو اپنے عصا سے بوسہ دیا اور طواف کیئے۔

۳ کعبہ کے اندر اور اس کے گرد صحن میں ۳۶۰ یا اس سے بھی زیادہ بت اور شبیہیں تھیں۔ ہبل کا بت بت پرستوں کا خدائے اعظم تھا اور یاقوت احمر سے بنا ہوا تھا اور انسان کی شکل کا تھا۔ اس کے سامنے فال کے سات تیر رکھے تھے۔ جن پر نعم (ہاں) یا لا (نہیں) لکھا ہوا تھا۔ لوگ اس سے فال نکالتے تھے۔ یہ بت کعبہ کے اندر تھا بعض روایات کے مطابق کعبہ کے سامنے تھا۔ اسی طرح حضرات ابراہیم۔ اسماعیل علیہم السلام کی مورتیاں تھیں اس کے علاوہ فرشتوں کی تصاویر تھیں۔ یہ کعبہ کے اندر تھیں۔ کعبہ کے اندر کے بتوں اور شبیہوں کو آپ نے خود بھی توڑا اور دوسروں کو توڑنے کا حکم دیا۔ کعبہ کی دیواروں پر سے تصاویر کھرچ کر مٹادی گئیں۔ اس طرح حرم کعبہ سے بت پرستی کا خاتمہ ہوا۔ یہ سب کچھ آپؐ کے مکہ میں داخلے کے دن ہی ہوگیا۔ جب لوگوں نے دیکھ لیا کہ بڑے بڑے

اسماعیل علیہم السلام کے مجسموں کے، ایک ایک کر کے کعبہ سے باہر لاکر پاش پاش کر دیئے گئے۔ ہر بت کے ٹوٹنے پر آپ، سترھویں سورۃ کی یہ آیت بلند آواز سے پڑھتے۔

"وقل جاءَ الحق و زھق الباطل ۔ اِنّ الباطِلَ کان زَھُوقا o"

(کہہ دو حق آیا اور باطل مٹ گیا۔ بیشک باطل مٹنے والا ہی تھا۔ (سورہ بنی اسرائیل۔ رکوع ۹)

کچھ اہل مکہ جو اپنے گھروں سے یہ دیکھنے نکل آئے تھے کہ کیا ہو رہا ہے بتوں کی یہ بے حرمتی دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ لیکن جب قدیم ترین زمانے کی بت پرستی کا آخری نشان بھی توڑ کر پاؤں تلے روند ڈالا گیا اور کوئی بلا یا آفت نہ آئی تو انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ وہ جلدی سے اپنے گھروں کو گئے اور اپنے ان پڑوسیوں کو، جو تا حال اپنے گھروں میں ہی تھے، یہ حیران کن خبر سنائی اور جب تک وہ اس بات کا یقین نہ کرنے والوں کو کعبہ کے صحن میں لائے تاکہ وہ خود دیکھ لیں کہ وہاں کیا ہو رہا تھا حضرت محمدؐ نے کعبہ کی دیواروں سے تصاویر مٹا کر مزید بے حرمتی کر ڈالی تھی۔

اس سے فارغ[ا] ہو کر ایک منادی کرنے والا شہر میں بھیجا گیا تاکہ وہ سب کو بتا دے کہ جو لوگ اسلام کی مراعات حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے گھروں کے ذاتی بت توڑ ڈالیں۔ کعبہ کے باہر پتھر کے بتوں کی درگت بننے اور کوئی آفت نہ آنے کے بعد اہل مکہ نے بلا پس و پیش اپنے

بت ان کی آنکھوں کے سامنے توڑ ڈالے گئے اور کوئی آفت نہ آئی اور واقعی یہ پتھر کے بت کچھ نہیں کر سکتے تو رسول اللہؐ کے حکم کے تحت مکہ والوں نے اپنے اپنے گھروں میں رکھے ہوئے خانگی بت بھی توڑ ڈالے۔ ہبل اہل مکہ کا بت تھا۔ قریش کا ہی ایک اور بڑا بت عزیٰ تھا جو مکہ سے کچھ فاصلے پر نخلہ میں تھا۔ عزیٰ اور ہبل کے علاوہ طائف میں "لات" نامی وہاں کے لوگوں کا بت تھا۔ مناۃ مدینے کے اوس و خزاج کا بت مشلل میں تھا۔ جو مدینے سے سات میل دور تھا۔ 'سواع' قبیلہ ہذیل کا بت جو ینبع کے نواح میں تھا۔ (سیرۃ النبی۔ حیاتِ محمدؐ)

[ا] آپؐ نے اہل مکہ کی طرف دیکھا جنہوں نے آپ کو اور مسلمانوں کو اذیتیں دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی اور پوچھا: "اے اہل قریش تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں" لیکن یہ لوگ مزاج شناس تھے بولے "اَخٌ" کریم و ابن اَخٍ کریم یعنی آپ شریف بھائی اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں اور آپؐ سے اچھے سلوک کی امید ہے" آپؐ نے عفو عام کا حکم دے دیا اور فرمایا "جاؤ۔ تم آزاد ہو" (حیات محمد۔ طبری۔ سیرۃ النبی)

بتوں کو اٹھا کر کھڑکیوں سے باہر پھینک دیا۔

اس کے بعد حضرت محمدؐ نے عثمان بن طلحہ کو بلایا اور کعبہ کی کنجیاں[1] انہیں واپس کر دیں اور انہیں ان کے موروثی متولیٔ کعبہ کے عہدے پر بحال کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ آپؐ نے اپنے چچا العباسؓ کو چاہ زمزم کی تولیت (سقایہ) واپس دے دی۔

حضرت عباسؓ نے اس عہدے کو کچھ کہے سنے بغیر قبول کر لیا اور ایسا رویہ اختیار کیا گویا اسلام کے آغاز سے ہی وہ اور اسلام لازم و ملزوم تھے۔ آپؐ کے ان متذبذب اور مصلحت اندیش چچا نے زندگی بھر کوئی کارنمایاں نہ کیا سوائے اس کے کہ انہوں نے دونوں فریقوں (قریش اور مسلمانوں) سے ایک طویل مدت تک بنا کر رکھی لیکن ان کا نام تاریخ اسلام میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ عباسی خلفاء کے مورث اعلیٰ تھے جن کی حکومت کے دور میں عرب تہذیب اور ثقافت اپنی ترقی کی آخری بلندی تک جا پہنچی تھی۔ انہی عباسیوں نے، جن کا دور حکومت حضرت محمدؐ کی وفات کے ایک سو سال بعد شروع ہو کر تیرھویں صدی عیسوی تک رہا، بغداد کو اس کا سنہرا زمانہ عطا کیا۔ خلیفہ ہارون الرشید حضرت عباسؓ کے بہت سے مشہور اخلاف میں سے ایک تھا۔

ان دو معزز عہدوں کی تقسیم اور توثیق کے بعد حضرت بلالؓ کعبہ کی چھت پر دوسری مرتبہ چڑھے اور نماز کے لئے اذان دی۔ اور ایک مرتبہ پھر ان کی آواز شمال اور جنوب اور مشرق اور مغرب میں مکہ کے مکانات پر واضح طور پر گونجی۔ حضرت محمدؐ نے اپنا رخ بتوں کی آلودگی سے پاک بیت اللہ کی طرف کیا اور نماز شروع کی۔ جو مجاہدین قریب کھڑے تھے انہوں نے بھی اپنا رخ اسی طرف کر لیا اور اسی طرح گلیوں اور بازاروں اور پہاڑیوں پر کھڑے سپاہیوں نے بھی جو تعداد میں دس ہزار تھے اپنا رخ پھیر لیا اور ایک اللہ اور اس کے رسول پر اپنے ایمان کی شہادت دی۔

---

[1] کعبہ کی تولیت کے لئے تین چار معزز عہدے تھے جو خاندانی تھے۔ (۱) اسلام سے پہلے بھی عثمان بن طلحہ کعبہ کے کنجی بردار ہوتے تھے۔ (۲) سقایہ، چاہ زمزم اور دوسری جگہ سے لا کر حاجیوں کو پانی مہیا کرنے کا عہدہ حضرت عباسؓ کے پاس تھا۔ (۳) رفادہ۔ منیٰ و عرفات میں غریب حاجیوں کو کھانا مہیا کرنے کا ٹیکس اور اس کا انتظام حضرت ابوطالب سے متعلق تھا۔ (۴) لواء۔ یعنی پرچم برداری۔ یہ بنو عبد شمس یا ابوسفیان کے خاندان سے منسلک تھی۔ وہ قریش کے لشکر کے پرچم بردار یا قائد ہوتے تھے۔ اسی لئے ابوسفیان لشکر قریش کا سالار تھا۔

کچھ دیر ہی گزری تھی کہ حضرت محمدؐ سوار ہو کر ایک چھوٹی سی پہاڑی[1] کی طرف آئے۔ جو کعبہ سے زیادہ دور نہ تھی اور مکّہ کے مرد اور عورتوں کو اسلام قبول کرنے کا شرف بخشا۔

سب سے پہلے مسلمان ہونے والے حضرت ابو بکرؓ کے والد ابو قحافہ تھے جو اپنے بیٹے کے بازو کا سہارا لیے حضرت محمدؐ تک پہنچے۔ آپؐ نے اپنے صحابی (حضرت ابی بکرؓ) سے کہا کہ ان بزرگ کو تکلیف دینے کی ضرورت نہ تھی بلکہ مناسب یہ تھا کہ آپؐ کو ان کے پاس لے جایا جاتا۔ اس ساری رسم کے دوران حضرت محمدؐ اس امر کی بار بار وضاحت کر رہے تھے کہ آپؐ ان لوگوں کی طرح ہی کے ایک انسان تھے جو اس وقت ان کے سامنے کھڑے تھے اور ایک قریش والدین کے بیٹے تھے۔

حضرت محمدؐ کو اذیتیں دینے والوں میں سے معدودے چند ہی کو سزا دی گئی اور صرف چار آدمیوں[2] کی، جو قتل کے مرتکب ہوئے تھے، گردنیں ماری گئیں۔ واجب القتل قرار دیئے جانے والوں میں ایک وحشی بھی تھا جس نے جنگ اُحد میں حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا لیکن وہ بھاگ گیا اور جب دوسری مرتبہ آپؐ کے سامنے پیش ہوا تو مسلمان ہو چکا تھا اور اس طرح اس کی جان بچ گئی۔

سب سے زیادہ حیران کن واقعہ ابو سفیان کی بیوی ہندہ کا مسلمان ہونا تھا۔ مکّہ سے بھاگ کر نہ جا سکی تھی اور بڑی دلیری سے حضرت محمدؐ کے سامنے حاضر ہو گئی۔ جب حضرت محمدؐ نے اسے خوبصورت آنکھوں سے اپنی طرف دیکھتے دیکھا تو آپؐ اس پر نفرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔

---

[1] کوہ صفا کا ایک مقام (سیرۃ النبی)

[2] عام روایات کی رو سے دس آدمی واجب القتل قرار دیئے گئے تھے لیکن صرف وہ چار قتل کئے گئے۔ جو قتل کے مرتکب ہوئے تھے۔ ان میں تین مرد اور ایک عورت قریبہ ابن حنظل کی لونڈی اور مغنیہ تھی۔ جو آنحضورؐ کی ہجو کے گیت گاتی تھی۔ مردوں کے قتل کا سبب قصاص تھا۔ اور جو مسلمان ہو گئے اور جن کو معاف کر دیا گیا ان میں عکرمہ بن ابو جہل عبداللہ بن ابی سرح (حضرت عثمانؓ کے رضاعی بھائی) صفوان بن امیہ۔ عبداللہ بن زبعری (مشہور شاعر آپؐ کی ہجو کہتے تھے اور قرآن پر نکتہ چینیاں کرتے تھے) اور وحشی (قاتل امیر حمزہؓ) عورتوں میں ہندہ (زوجہ ابو سفیان) اور ام سارہ (ایک کنیز جو حاطبؓ کا خفیہ خط لے کر مکّہ والوں کو خبردار کرنے چلی تھی۔) (سیرۃ النبی۔ طبقات ابن سعد۔ تاریخ طبری)

اب ہند کا غرور خاک میں مل چکا تھا۔ وہ حضرت محمدؐ کے پاؤں پر گر گئی اور معافی چاہی۔ ایک ایسی عورت[1] جس نے حضرت محمدؐ کو بدنام کرنے میں سب سے زیادہ کام کیا تھا کے اس طرح برسر علم عاجزی کرنے سے حضرت محمدؐ مطمئن ہو گئے۔ آپؐ نے حمزہؓ کی قاتلہ کو معاف کر دیا اور اس کی بیعت قبول کر لی۔ لیکن درحقیقت ہند کبھی دل سے اسلام نہیں لائی اور مرتے دم تک آپؐ کی مخالفت اور آپؐ سے نفرت ہی کرتی رہی۔

عکرمہ بن[2] ابوجہل بھی مکہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن جب انہوں نے سنا کہ حضرت محمدؐ اسلام لے آنے والوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کر رہے تھے تو وہ واپس آ گئے اور اپنے جانی دشمن سے فراخدلانہ سلوک پایا۔

ایسا کرنے کی وجوہات[3] بھی تھیں۔ ابوجہل کے لڑکے کا آپؐ کو پیغمبر تسلیم کر لینا بذاتِ خود ایک ایسی کامیابی تھی جس کے سبب یہ فراخدلی اور نرمی روا تھی۔ اس کے علاوہ اسلامی سپاہ کے لئے اعلیٰ اہلیت رکھنے والے افسران اور قائدین کی بھی ضرورت تھی۔ عکرمہؓ عرب کے بہترین سالاروں میں سے ایک تھے۔ چنانچہ مسلمان ہو جانے کے بعد جلدی ہی انہیں اسلامی فوج کی ایک کمان دے دی گئی۔ انہوں نے بھی اپنی اہلیت سے حضرت محمدؐ کے فیصلے کو صحیح کر دکھایا اور ایک پرجوش اور دلیر سالار ثابت ہوئے اور آخرکار اسلام کی خاطر لڑتے

۱ے ہند جب بیعت کے لئے حاضر ہوئی تو چہرے پر نقاب ڈال رکھا تھا۔ اس نے اس حال میں بھی آنحضورؐ سے بڑی حاضر جوابی اور گستاخانہ دلیری سے بات کی۔ (سیرۃ النبی۔ جلد اوّل)

۲ے خالدؓ سے شکست کھانے کے بعد قتل کے خوف سے عکرمہ یمن چلے گئے لیکن ان کی بیوی ام حکیم ایمان لے آئیں اور بعد میں اپنے شوہر کو یمن سے واپس لے آئیں۔ عکرمہ مسلمان ہو گئے اور بعد میں اسلام کے ایک سچے جان نثار سپاہی اور سپہ سالار ثابت ہوئے اور اسلام کی خاطر لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

(سیرۃ النبی۔ جلد اوّل)

۳ے یہ ثانوی وجوہات یا نتائج ہو سکتے ہیں۔ ورنہ درحقیقت یہ آپؐ کا حسنِ سلوک اور عفو و درگذر ہی تھا۔ جو ابوسفیان اور عکرمہ جیسے لوگوں کو دائرہ اسلام میں لے آیا۔

ہوئے ہی میدانِ جنگ میں شہید ہوئے۔

درحقیقت یہ تمام نومسلم مجاہدین اپنے ان بھائیوں سے زیادہ پرجوش اور سرگرم مسلمان ثابت ہوئے جو مصائب کے اس دور میں مسلمان ہو گئے تھے جب اپنے بچاؤ کے سوا باہر جا کر کوئی لڑائیاں نہیں لڑنا پڑتی تھیں۔

شہر مکّہ فتح ہو جانے اور وہاں کے لوگوں کے اسلام قبول کر لینے کی رسم کے فوراً بعد خالدؓ بن ولید اور عمرو بن العاص کو قریبی مواضعات اور نخلستانوں میں شبیہوں اور بتوں کو ختم کرنے اور توڑنے[1] کے لئے بھیجا گیا۔ انہوں نے اس کی تعمیل کی لیکن جہاں کہیں ان کو ایسا آدمی ملا جس نے اسلام قبول کرنے میں کچھ پس و پیش کیا تو وہ اور خصوصاً خالدؓ اس کو فوراً قتل کر دیتے تھے۔

یہ حضرت محمدؐ کے تمام اصولوں کے خلاف تھا۔ آپؐ نے مکّہ میں بڑے تحمل اور فراخدلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ آپؐ نے ان کی تمام لغزشوں اور زیادتیوں کو معاف کر دیا تھا اور ان اذیتوں کو دل سے بھلا دیا تھا جو ان لوگوں نے مصائب کے دور میں آپؐ پر روا رکھی تھیں۔ آپؐ نے ان سے ایسا ہی سلوک کیا جیسا حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے مصر میں کیا تھا جب آپؐ نے سنا کہ حضرت خالدؓ کس طرح اسلام کی اشاعت کر رہے ہیں تو آپؐ نے آسمان کی طرف دیکھا اور بلند آواز سے کہا:۔

"یا اللہ[2]۔ جو کچھ خالدؓ نے کیا میں اس سے بری الذمہ ہوں"۔

---

[1] حضرت خالدؓ نے مکّہ کے قریب نخلہ میں قریش کا دوسرا بڑا بت عزّیٰ توڑا۔ اور عمرو بن العاص نے ہذیل کا بت "سواع" منہدم کیا جو ینبوع کے قریب رہاط میں تھا۔ اسی طرح "منات" کو توڑا گیا جس کا استھان مشلّل (مدینہ کے قریب) تھا اور بنو اوس و خزرج اس کی پرستش کرتے تھے۔ بعد میں طائف کی فتح پر وہاں کے لوگوں کی دیوی "لات" کو بھی توڑ دیا گیا۔

[2] طبری نے ایک روایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ الفاظ آپؐ نے اس وقت کہے جب حضرت علی کرم ان سب لوگوں کا خون بہا ادا کر آئے جنہیں خالدؓ بن ولید نے قتل کر دیا تھا۔ حالانکہ آپؐ نے حضرت خالدؓ کو صرف بت توڑنے اور داعی کی حیثیت سے بھیجا تھا۔

آپؐ نے اپنی بے گناہی کی تصدیق خالدؓ کو سرزنش کر کے کر دی اور مقتولین کے ورثا کو خون بہا کے طور پر روپیہ بھیجا۔

جب تمام رسومات ختم ہو گئیں تو حضرت محمدؐ نے شہر پہ ایک نظر ڈالی جو اس وقت شام کی سنہری دھوپ میں نہایا ہوا تھا۔ آپؐ کے گرد آپؐ کے چند جاں نثار کھڑے تھے جو شروع سے ہی آپؐ کے ساتھ تھے۔ ان میں بھی کچھ تبدیلی نظر آرہی تھی۔ وہ بے فکر سے نظر آرہے تھے اور ان لوگوں کی سی خبرداری سے بے نیاز ہو کر آپس میں باتیں کر رہے تھے، جو چوکنے رہ کر ہر وقت اس بات کا بڑا خیال رکھتے ہیں کہ موقعہ پڑنے پر ان کی تلواریں نیام میں اٹک کر نہ رہ جائیں۔ شام کی دھوپ میں شہر کی چمکتی چھتوں کی طرف بازوؤں کو پھیلا کر حضرت محمدؐ نے کہا:۔

(" اے شہر مکہ، تو اللہ کی زمین پر میرے لئے سب سے پسندیدہ جگہ ہے۔

اور اگر تیرے لوگ مجھے یہاں سے نہ نکال دیتے تو میں چھوڑ کر نہ جاتا۔"

اہلِ مکہ نے اس پر بڑے تشکر کا اظہار کیا۔ زبان سے بھی اور آنسوؤں سے بھی۔ مدینہ والوں نے البتہ مایوسی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہوں نے کہا۔" وائے افسوس! حضرت محمدؐ اب اپنے آبائی شہر کے فاتح اور مالک ہیں۔ وہ بلاشبہ اب یہاں ہی مستقل رہائش اختیار کر لیں گے۔ اور مدینہ چھوڑ دیں گے۔"

یہ باتیں حضرت محمدؐ کے کانوں تک بھی پہنچیں۔ چنانچہ آپؐ نے اسی وقت ان لوگوں کو یقین دلایا۔ جنہوں نے آپؐ کا ایسے وقت میں ساتھ دیا تھا جب آپؐ بے یار و مددگار تھے۔

آپؐ نے فرمایا۔" ہرگز نہیں۔ جب آپ لوگوں نے مجھے قول دیا اور میری بیعت کر لی تھی تو میں نے بھی آپ لوگوں کے ساتھ جینے اور مرنے کی قسم کھائی تھی اور اب اگر میں آپ کو چھوڑ دوں تو میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول نہ ہوں گا۔ میرا جینا اور مرنا اب آپ لوگوں کے ساتھ ہی ہوگا۔"

آپؐ نے اپنا یہ قول پورا کر دکھایا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد اپنی وفات تک حضرت محمدؐ صرف دو مرتبہ مکہ آئے۔

لہ آپ نے یہ الفاظ کعبہ کو خطاب کر کے کہے تھے۔ (طبقات ابن سعد (جز و ثانی)

اب آپؐ تھک چکے تھے اور آرام کی ضرورت تھی ۔ ان چند روز میں آپؐ عرب کے طاقت ور ترین حکمران بن گئے تھے ۔ آپؐ دینی پیشوا بھی تھے اور دنیوی حکمران بھی اور یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ سال ختم ہونے سے پہلے پہلے آپؐ اکیلے ہی سارے عرب کے حکمران ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ ایک قوم، ایک سلطنت اور ایک دین کے بانی بھی لیکن آپؐ کے نزدیک یہ سب کچھ اتنی قابل فخر بات نہ تھی جتنی یہ کہ یہ اب کعبہ، جو زمین کا مرکز تھا ۔ رسوائے زمانہ بتوں سے پاک ہو چکا تھا ۔ اگر آپؐ اس رات ہی فوت ہو جاتے تب بھی آپؐ کو یہ اطمینان رہتا کہ آپؐ اپنے مشن کا اہم ترین حصہ کامیابی سے پورا کر چکے تھے ۔

لیکن حضرت محمدؐ نے اس رات انتقال نہ کیا ۔ ابھی آپؐ کو کچھ عرصہ اور اس دنیا میں رہنا تھا ۔ لیکن آپؐ کی زندگی کا نقطہ عروج وہ سنہری شام ہی تھی جب آپؐ کو وہ شے مل گئی جس کے لئے آپؐ ساری زندگی کوشاں رہے یعنی مکہ کو دوبارہ حاصل کرنا اور کعبہ کو بتوں سے پاک کرنا ۔

ایسے لوگ شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں جن کی تمام خواہشات ان کی زندگی میں ہی پوری ہو جائیں اور ان گنے چنے افراد کا ملنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے جو خواہشات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ انسانی اقدار کو بھی ہاتھ سے نہیں کھوتے ۔ جنوری ۶۳۰ء اور ہجرت کے آٹھویں سال کی اس شام کو حضرت محمدؐ اپنی چٹائی پر اسی اطمینان سے سوئے جس طرح آپؐ اس وقت سوتے تھے جب آپؐ حضرت خدیجہؓ کے تجارتی گماشتے کی حیثیت سے سفر پر جایا کرتے تھے ۔

بیسواں باب

فوج کی تشکیل ۔ غزوات حنین، طائف اور تبوک

۶۳۰ تا ۶۳۱ء

قیاس کیا جاسکتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد اس سے بڑی اور کوئی مہم آپ کو درپیش نہیں آئی ہوگی لیکن ایسا نہ ہوا۔ بلکہ اس کے خلاف حضرت محمدؐ کی پہلے ہی ضرورت سے زیادہ ہنگاموں بھری زندگی میں ایک سخت آزمائش کے بعد اس سے بڑی مہم بڑے تسلسل سے آتی چلی گئی۔

حالانکہ مکہ کے بیشتر لوگ اسلام لے آئے تھے لیکن چند قدیم خاندانوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ انہوں نے حضرت محمدؐ کو اپنا حاکم تو تسلیم کر لیا تھا لیکن آپؐ کا دین اختیار کرنا ضروری نہ سمجھا۔ یہ بات مقدس شہر اور عرب کے دوسرے قبائل کے متعلق آنحضرتؐ کی حکمت عملی اور منشاء کے خلاف تھی۔ اب آپؐ کو اپنی نبوت اور رسالت کو مزید سچا ثابت کرنے کی تو چنداں ضرورت نہ تھی لیکن جب تک آپؐ کے تابع فرماں لوگ اللہ کا دین (اسلام) اختیار نہ کر لیتے آپؐ خود کو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کے احکام کی تکمیل میں پوری طرح کامیاب نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپؐ باہر جاکر دوبارہ تبلیغ کرنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ایک غیر متوقع خبر نے آپؐ کو ایسا کرنے سے روک دیا۔

مکہ فتح ہو جانے سے آپؐ کے جنرل یہ سمجھنے لگے تھے کہ اس کے بعد عرب کا باقی ملک بھی غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دے گا۔ لیکن ہوا اس کے خلاف۔

ہوازن کے مشہور قبیلے نے جس کی چراگاہیں طائف کے اردگرد تھیں اور جہاں آپؐ نے ہجرت سے دو سال قبل اذیتوں سے بچنے کے لئے پناہ لینے کی کوشش کی تھی، آپؐ کو ہمیشہ

نبوت کا جھوٹا دعویدار سمجھتے ہوئے نظر انداز کیا۔ اس قبیلے کے لوگ بڑے خودسر اور مغرور تھے اور اپنی محفوظ پہاڑی پناہ گاہ کے سبب ہمیشہ سے اپنی خودمختاری کو قائم رکھے ہوئے تھے۔ مکہ میں آپؐ کی کامیابی پر ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ آپؐ سارے عرب پر غلبہ حاصل کر لیں اور ان کی اپنی آزادی بھی ختم ہو کر رہ جائے۔ آپؐ پر پوری قوت سے حملہ کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تمام حلیف قبائل کو، جو انہی پہاڑوں میں رہتے تھے، اپنے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کی دعوت دی اور انہیں جمع کر لیا۔ ان میں بنو سعد بھی تھے۔ جن کے درمیان آپؐ نے اپنا بچپن گذارا تھا۔

جونہی حضرت محمدؐ نے اس معاندانہ اقدام کے متعلق سنا۔ آپؐ نے فوراً یہ فیصلہ کر کیا کہ دشمن کے آگے بڑھنے سے پہلے ہی اس پر اپنی پوری قوت سے حملہ کر دیا جائے۔ آپؐ کے پاس ایسا کرنے کے لئے ہر قسم کے ذرائع بھی موجود تھے اور مکہ لے لینے کے بعد آپؐ کی فوج میں ابوسفیان کے لشکر کا اضافہ ہو گیا تھا اور اب اس کی تعداد دس ہزار سے بڑھ کر بارہ ہزار ہو گئی تھی۔ اس کو ساتھ لے کر آپؐ قبیلوں کی متحدہ جمعیت سے مقابلے کے لئے طائف کی جانب روانہ ہو گئے۔[2]

ان قبائل نے اپنے آپ کو بہت تیزی سے جنگ کے لئے تیار کر لیا اور بڑی جمعیت اکٹھی کر لی۔ مسلمانوں کے رسالے اور ان کی بہتر کارکردگی کا مقابلہ کرنے کے لئے انہوں نے اپنے سخت ناہموار پہاڑی علاقے سے فائدہ اٹھایا۔

اوطاس کے پہاڑوں کے اس پار زرخیز وادی میں پہنچنے کے لیے جہاں یہ قبیلے اپنے اونٹ اور بھیڑ بکریاں چراتے تھے ایک تنگ گھاٹی کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ یہ گھاٹی یا درہ حنین کے نام سے موسوم تھا۔ یہ ایک تنگ اور سنسان گھاٹی تھی۔ جس کے دونوں طرف عمودی

---

[1] طائف میں آنحضورؐ پناہ لینے کے لئے نہیں بلکہ اللہ کا پیغام پہنچانے اور اسلام کی تبلیغ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

[2] شوال ۸ھ مطابق جنوری۔ فروری ۶۳۰ء میں بارہ ہزار اسلامی فوج مکہ سے طائف کی جانب روانہ ہوئی (سیرۃ النبی۔ حصہ اول) آنحضورؐ ۶ شوال کو مکہ سے روانہ ہو کر ۱۰ شوال کو منگل کی شام کو حنین پہنچے۔ (طبقات ابن سعد۔ جزو ثانی)

چٹانیں تھیں اور اس کے سوا کہ اسے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں طے کریں ایک بڑی فوج کا اس میں سے گزرنا مشکل تھا۔ اگر ایک دفعہ اس تنگ درے میں روک کر لڑائی شروع کر دی جائے تو رسالے کے سواروں کے لئے اس میں نقل و حرکت کرنے اور گھوڑوں کو موڑنے اور پلٹنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اونٹوں کے لئے بھی ایسا کرنا مشکل تھا۔ مسلمانوں کا ہراول دستہ جس میں زیادہ تر ناحال ناآزمودہ بدو سوار تھے[1] خالدؓ بن ولیدؓ کی سرکردگی میں تھا۔ اس کے پیچھے گھوڑ سواروں اور شتر سواروں کے رسالوں اور پیادہ دستوں کی اصل فوج تھی حضرت محمدؐ اپنے سفید خچر پر سوار اپنے مشہور جنگ آزمودہ لوگوں کے ہمراہ سب سے پیچھے آرہے تھے۔

حضرت محمدؐ عقب میں اس لئے نہیں چل رہے تھے کہ آپؐ کو اپنی حفاظت کا کچھ زیادہ خیال تھا بلکہ اس لئے کہ آپؐ کو کسی ایسے ناگہانی حادثے کا گمان نہ تھا۔ اس کے برعکس آپؐ آج اسی قدر پراعتماد تھے جتنے چند ہفتے پہلے محتاط تھے۔ آج آپؐ کو اس بات کا پورا یقین[2] تھا کہ آپؐ کی فوج ہر دشمن کو شکست دے سکتی تھی۔ آپؐ اس ساری مہم کو ایک بڑی چھاپہ مار مہم سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہے تھے جو آپؐ کے نئے رنگروٹوں کو تجربہ اور کارآزمودہ لوگوں کو غنیمت مہیا کرتی تھی۔ آپؐ کے افسران اور مشیروں کا بھی یہی خیال تھا چنانچہ جب ہوازن کے لوگوں نے اس گھاٹی میں چٹانوں کی آڑ لے کر دونوں طرف سے مسلمانوں پر چٹانیں لڑھکائیں۔ پھر تیروں کی بوچھاڑ کی اور پھر نعرے لگاتے شمشیر زنوں نے حملہ کر دیا تو اس تنگ و تاریک گھاٹی میں

---

[1] خالد کی سالاری میں فتح مکہؐ کے جدید الاسلام نوجوان تھے۔ غیر تربیت یافتہ تھے اور تاحال کسی نظم و ضبط کے پابند نہ تھے۔ اسلام بھی تاحال دلوں میں راسخ نہ تھا۔ اس لئے سختی کے وقت جان بچا کر بھاگ کھڑا ہونا تاحال ان کا شعار تھا۔ (سیرت النبی۔ طبقات ابن سعد)

[2] حقیقت یہ ہے کہ یہ سروسامان دیکھ کر بعض صحابہ کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے کہ "آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے"۔ لیکن بارگاہ ایزدی میں یہ نازش پسند نہ آئی اور بعد میں یہ ناپسندیدگی ایک آیت کی شکل میں نازل ہوئی۔ "وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ ..... ثُمَّ وَلَّيْتُمْ" (سورۃ توبہ) (سیرۃ النبی حصہ اول)

ایک افراتفری مچ گئی۔[1]

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ ایک نہیں بہت سے مواقع پر ایسے جنگی طریقوں نے بہترین سے بہترین فوج کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے اور یہ اس سے بھی زیادہ عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ ترین افواج کو بہت دفعہ ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ رولینڈ[2] ROLAND کو اسی طرح رونکیس ولا RONCES VLIES کے مقام پر شکست ہوئی تھی اور یہ ہی صورتِ حال وارس[3] VARUS) کو ٹیوٹو برجر کے جنگل میں پیش آئی تھی۔ لارنس آف عربیبا[4] LAWRENCE OF ARABIA نے بھی یہی جنگی چال پہلی جنگ عظیم

---

[1] ابھی صبح ہونے میں کچھ دیر تھی۔ اس لئے اندھیرا تھا دوسرے گھاٹی تنگ اور دعودی تھی۔ اور اس کے دونوں طرف اونچی اونچی چٹانیں ہونے کے سبب اس میں اور زیادہ اندھیرا تھا۔ ایسی حالت میں کہ جہاں تنگی کے باعث گھوڑا پھیرنے کو جگہ نہ ہو وہاں اوپر سے بڑی بڑی چٹانیں سروں پر گرنے، کمینگاہوں سے تیروں کی بارش اور دونوں سمت سے چھپے ہوئے قبائلیوں کا نکل کر تلواروں سے حملہ کرنے سے مسلمانوں کا مقدمۃ الجیش بوکھلا گیا اور پیچھے کی طرف ایسے بھاگے کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ جب وہ مرکزی فوج میں سے گزرے اور انہوں نے بھی دشمن کی بھاری جمعیت کمین گاہوں سے نکل کر چاروں طرف سے حملہ کرتی دیکھی تو ساری مسلم سپاہ کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھگدڑ مچ گئی۔ اتنا شوروغل تھا کہ لوگوں نے رسول اللہؐ کی آوازیں بھی نہ سنیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جاں نثاروں کی بہت تھوڑی جمعیت آنحضورؐ کے پاس رہ گئی لیکن رسول اللہؐ کی ثابت قدمی نے بھاگتی فوج کو لوٹایا اور ہاری لڑائی جیت لی گئی۔

[2] رولینڈ شاہ فرانس (شارلیمان) کے بارہ بہادر امراء میں سے ایک تھا۔ اس کی روائتی بہادری کی داستانیں مشہور ہیں۔ ۷۷۸ء میں ہسپانیہ کی مسلم افواج کے خلاف جو فرانس میں داخل ہو کر بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ رونکیس ولا کے درے میں پھنس کر لڑتے ہوئے مارا گیا اور اس کی ساری فوج تباہ ہو گئی۔ (سنچری انسائیکلوپیڈیا آف نیمز)

[3] ایک رومن جرنل جس کا پورا نام VARUS PUBLIUS QUINTILLUS ۶ء تا ۴ ق۔ م میں شام کا گورنر اور بعد میں جرمنی کے علاقے میں رومن فوجوں کا کمانڈر تھا۔ اس کی سخت گیری اور مظالم کے خلاف جرمن اور دوسری اقوام نے متحد ہو کر اس کا مقابلہ کیا اور آرمینئس ——— ARMENIUS نے ۹ء میں اس کو ٹیوٹو برجر کے جنگل میں شکست فاش دی۔ شکست کھانے پر اپنی ہی تلوار سے خودکشی کر لی CENTURY ENCYCLOPEDIA OF NAMES

[4] لارنس آف عربیبا۔ برطانوی ایجنٹ اور فوجی کرنل جو جنگ عظیم اول (۱۹۱۴-۱۸ء) میں عربوں کا دوست بنا رہا اور آزادی دلانے کے بہانے ان کو ترکوں سے باغی کر کے انہیں ترک جرمن افواج سے لڑاتا رہا۔ اس نے بھی ترک فوجوں کو اسی طرح ایک درّے میں روک کر شکست دی تھی۔

میں جرمن ترک افواج کے خلاف اس لڑائی میں کامیابی سے چلی جو اس مقام سے زیادہ دور نہیں لڑی گئی جہاں اب حضرت محمدؐ کے مشہور مقدمۃ الجیش کے سپاہی خوفزدہ جانوروں کی طرح افراتفری میں دوڑے۔ آپؐ کی طرف چلے آرہے تھے۔ چند ہی منٹ کے اندر اندر یہ قابلِ فخر فوج، جو تھوڑی دیر پہلے گھاٹی میں بڑے تزک و احتشام سے چڑھ رہی تھی ایک بے ترتیب انبوہ کی شکل میں بدل گئی جن کو پیچھے سے چیختے چلاتے قبائلی مارتے کاٹتے چلے آرہے تھے۔ اور جن کی تعداد چٹانوں کے پیچھے سے نکل نکل کر ہر دم بڑھتی چلی جارہی تھی۔ حضرت محمدؐ کا اس وقت ان کو کوئی حکم دینا یا آپؐ کے ارد گرد جمع ہو جانے کی اپیل کرنا بے سود رہا۔ خوف وہراس، جس نے اکثر اوقات بہترین فوجوں کو تباہ کرکے رکھ دیا ہے، ان پر پوری طرح مسلط ہو گیا تھا اور ان بھاگتے ہوئے لوگوں کو اس وقت روکنا ایسا ہی تھا جیسے سمندری طوفان کے آگے بند باندھنا۔

حضرت محمدؐ یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ آپؐ نے اپنے تھوڑے سے جاں نثار رفقا[1] کو جو ابھی تک قدم جمائے کھڑے تھے اپنے پیچھے آنے اور آخری دم تک لڑنے کا حکم دیا۔ آپؐ نے تلوار کھینچ لی۔ خچر کو مہمیز کیا اور دشمن کی بڑھتی ہوئی صفوں کی جانب یلغار کی جو اس وقت

---

[1] عبداللہ بن مسعودؓ۔ بیہقی اور ابونعیم کی روایات کے مطابق آنحضورصلعم کے پاس صرف اسّی یا ایک سو جاں نثار باقی رہ گئے تھے جن میں ابوبکرؓ۔ عمرؓ۔ علیؓ کرم۔ عباسؓ۔ ابوسفیانؓ بن حارث۔ ان کے لڑکے جعفرؓ۔ فضل بن عباسؓ۔ ربیعہؓ بن حارث۔ اسامہؓ بن زید اور چند گھر والے شامل تھے۔

جب آپؐ نے دیکھا کہ آپؐ کے آواز دینے کے باوجود لوگ بھاگے چلے جارہے ہیں اور دشمن بڑھتا آرہا ہے تو آپؐ کو جلال آگیا۔ تلوار کھینچ لی اور مرنے مارنے کا فیصلہ کرکے دشمن کی طرف بڑھے۔ آپؐ یہ رجز پڑھ رہے تھے۔

انا النبیّ لا کذب ــــ انا ابن عبد المطلبّ

لیکن حضرت عباسؓ (بعض کے نزدیک سفیان بن حارثؓ) نے آپؐ کی باگ تھام لی۔ آپؐ کے اس نعرے سے اور حضرت عباسؓ کی للکار سے بھاگتی فوج پلٹی۔ لوگ پروانوں کی طرح آپؐ کے گرد جمع ہوگئے اور تھوڑی ہی دیر میں دشمن بھاگ نکلا۔ (سیرۃ النبی)

ابوسفیان اس موقعہ پر یہ طعنہ دیئے بغیر نہ رہ سکا کہ اب یہ مسلمان سمندر سے ادھر نہ رکیں گے اسی طرح ان الجنبل ایک مشرک زور سے چلایا اور کہا "کیا آج رسول اللہ کا جادو ختم نہیں ہوگیا۔ شیبہ بن عثمان بن طلحہ نے کہا کہ "آج (نعوذ باللہ) حضرت محمدؐ کو قتل کرکے باپ کا بدلہ لوں گا۔" (طبری۔ ج ا حصہ سوم)

خود بھی تنگ گھاٹی میں پھنسے ہونے کے سبب کھل کر مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ العباسؓ بھی اپنے بھتیجے کے پیچھے لپکے۔ خچر کی باگ تھام لی اور اپنی پوری قوت سے مسلمانوں کو للکارا کہ وہ ذرا یہ تو سوچیں کہ وہ کون ہیں اور اس دنیا میں کیا نصب العین لے کر آئے ہیں۔ حضرت عباسؓ کی آواز اس قدر بلند تھی جیسے بگل بجا دیئے گئے ہوں۔ اونچی چٹانوں سے گھری وادی میں یہ آواز بڑے زور سے گونجی اور بازگشت کے سبب گونجتی ہی چلی گئی۔ بھاگتے مسلمان یہ سن کر رُکے۔ حضرت عباسؓ اور زور سے للکارے۔ مسلمان پلٹے اور دوبارہ گھاٹی کی طرف رُخ کیا۔ جن لوگوں نے خیبر اور موتہ کی جنگیں لڑی تھیں وہ بڑے شرمندہ ہوئے۔ اور جس طرح وہ اپنی جانیں بچانے کے لئے بھاگے تھے۔ اسی جوش اور جذبے کے ساتھ اب وہ دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ وہ لبیک۔ لبیک (ہم حاضر ہیں) کے نعرے لگاتے ہوئے پلٹے اور اب گھاٹی پر چڑھے چلے جا رہے تھے۔

حملہ آور مسلمانوں کا خصوصاً جب وہ اسلام کی خاطر کٹ مرنے کے لئے یلغار کرتے ہیں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ فروری ۶۳۰ء کی اس صبح کو بھی ان کا جوش و جذبہ کسی طرح کم نہ تھا۔ جو مقابلہ بے ترتیبی اور خوف و ہراس میں شروع ہوا تھا جلد ہی ایک خونریز معرکے میں بدل گیا۔ پہاڑی قبائلیوں نے مقابلہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لیکن ان جوشیلے مجاہدین کے سامنے نہ ٹھہر سکے جو ان سے زیادہ بہتر طور پر مسلح تھے اور اب ان میں نظم و ضبط بھی پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جلدی ہی ہوازن میدان ہار گئے۔ اور اسی تیزی سے جانیں بچا کر بھاگنے لگے جس طرح تھوڑی دیر پہلے مسلمان بھاگے تھے۔

ان کی یہ شکست مکمل تھی۔ اپنی فوج کا پورا دباؤ ڈال کر حضرت محمدؐ نے ان کو گھاٹی سے نکال کر دوسری طرف کھلی وادی میں دھکیل دیا۔ یہاں انہوں نے پاؤں جمانے کی کوشش کی لیکن اب

ؔ رسول کریمؐ کے حکم سے حضرت عباسؓ نے مہاجرین و انصار کو یہ کہہ کر للکارا: یا مشعر الانصار" (آج کون انصار کا حق ادا کرے گا) یا اصحاب الشجرہ (آج بیعت رضوان کرنے والوں کا کون حق ادا کرے گا۔) (سیرت النبی) ابن سعد اور طبری نے آپ کے نعروں میں "یا اصحاب السمرہ" اور "یا اصحاب سورۃ البقراء" بھی لکھا ہے۔

وہ (حضرت خالد کے) رسالے کے رحم وکرم پر تھے۔ شکست نے اب ایک قتل عام کی شکل اختیار کرلی تھی۔ چنانچہ جلدی ہی بچے کھچے لوگ جان بچا کر بھاگ رہے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں وہ اتنے پیچھے ہٹ گئے کہ ان کے خیمہ و خرگاہ پر مسلمانوں نے قبضہ کرلیا۔ قتل ہو جانے والوں کے علاوہ جو کچھ حضرت محمدؐ کی سپاہ کے ہاتھ لگا وہ چھ ہزار بوڑھے مرد، عورتیں اور بچے قیدی، چار ہزار چاندی کے سکے، چالیس ہزار بھیڑ بکریاں اور چوبیس ہزار اونٹ تھے، یہ عظیم ترین فتح تھی۔ جو حضرت محمدؐ کو تا حال حاصل ہوئی تھی۔

آپؐ نے ابھی فتح کی مبارک باد قبول نہ کی کیونکہ آپؐ کے احساسات اس وقت ایسے ہی تھے جیسے غزوہ احد کے بعد۔ آپؐ جانتے تھے کہ اگر آپؐ کے چچا العباسؓ اپنی گرجدار آواز کے ساتھ آپؐ کی امداد نہ کرتے تو آپؐ خود اور آپؐ کے بہادر ساتھی اس گھاٹی کی بھینٹ چڑھ چکے ہوتے۔ آپؐ نے اپنی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کی ناقابل معافی کمزوری کو تسلیم کیا۔ قرآن کی انیسویں[1] سورۃ میں اس کا ذکر اس طرح ہے:-

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ ۙ وَّ یَوْمَ حُنَیْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْـًٔا وَّ ضَاقَتْ عَلَیْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ . . . .
وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ۝

اب تک اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت سی لڑائیوں میں فتح عطا کی لیکن حنین کی جنگ میں اپنی بڑی تعداد پر تمہارا غرور کچھ کام نہ آیا زمین اپنی وسعت کے ساتھ تم پر تنگ ہو گئی اور پھر تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے . . . . . .

(سورۃ توبہ - رکوع ۴)

قیدیوں میں ایک کمزور بڑھیا عورت ایسی بھی تھی۔ جس نے حضرت محمدؐ کے سامنے پیش ہونے کی اجازت چاہی۔ جب اس نے حضرت محمدؐ کو دیکھا تو بڑے جانے پہچانے انداز میں آپؐ کو محمدؐ کہہ کر مخاطب کیا۔ حضرت محمدؐ نہ پہچان سکے۔ یہاں تک کہ بڑھیا نے شیما کے نام سے

---

[1] یہ آیات نویں سورۃ (سورۃ توبہ) کی ہیں - انیسویں کی نہیں۔ (مترجم)

THE GREAT ARAB CONQUESTS
BY J. B. GLUBB



اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ وہ آپؐ کی اس وقت کی رضاعی بہن تھی جب آپؐ نے بنو سعد کے خانہ بدوشوں میں اپنا بچپن گذارا تھا۔ حضرت محمدؐ نے بلا تامل شیما کو بلا کر اپنے پاس اسی طرح چٹائی پر بٹھایا[1] جیسے وہ دونوں بچپن میں صحرا نشینوں کے خیموں میں بیٹھا کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد حضرت حلیمہ سعدیہ[2] بھی تلاش کرتی ہوئی سپہ سالار کے خیمے میں آگئیں۔ بڑھاپے کے سبب ان کا چہرہ جھریوں سے مرجھا گیا تھا اور کمر جھک گئی تھی لیکن انہوں نے اپنے اس نامور بیٹے کو اسی طرح مخاطب کیا جیسے وہ پچاس سال پہلے کرتی تھیں۔ حضرت محمدؐ نے ان کی بھی اسی طرح عزت و توقیر کی جس طرح شیما کی تھی اور تینوں ایک چٹائی پر بیٹھے بچپن کے واقعات پر، جو دائی حلیمہ کو یاد تھے، دیر تک ہنستے رہے۔

بہرحال ماضی کی یادوں کی یہ کڑیاں حضرت محمدؐ کو ان قبائل کو سخت سزا دینے میں حائل نہ ہو سکیں جنہوں نے آپؐ کے خلاف سرکشی کی تھی۔ آپؐ طائف والوں کو تو خاص طور پر ایک سبق[3] دینا چاہتے تھے کیونکہ انہوں نے دس سال پہلے آپؐ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ آپؐ کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ اگر کسی صورت سے رسوائے زمانہ بت 'الات' کو توڑ ڈالا جائے تو سارا عرب آخر کار اس بات کا قائل ہو جائے گا کہ بت پرستی بالکل بے سود شے ہے۔

---

[1] جب آپ نے شیما سے بہن ہونے کی نشانی دریافت کی تو اس نے اپنی پیٹھ کھول کر ایک نشان دکھایا اور کہا کہ بچپن میں ایک مرتبہ وہ آپؐ کو کمر پر چڑھائے ہوئے تھیں تو آپؐ نے زور سے کاٹ لیا تھا۔ یہ اس کا نشان ہے۔ آپؐ نے فوراً پہچان لیا اور ان کو اپنی چادر بچھا کر عزت سے بٹھایا۔ (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم)

[2] حضرت حلیمہ سعدیہؓ آپ کی دایہ اور حضرت شیما کی والدہ تھیں۔ بنو سعد سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپؐ نے بچپن میں صحرا میں لے جا کر آپؐ کو دودھ پلایا اور کئی سال تک پرورش کیا۔ اس کے بعد یہ آپؐ سے جدا نہ ہوئیں اور مدینے میں انتقال کیا۔ آپ کی قبر جنت البقیع (مدینہ) میں تا حال موجود ہے اور ہر زائر فاتحہ پڑھ کر جاتا ہے (مترجم)

[3] یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ طائف کے محاصرے میں جب بھی آپؐ سے کہا گیا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے بد دعا کریں تو آپؐ نے ہمیشہ ان کے لئے راہ ہدایت کی دعا کی۔

(سیرت النبی)

لیکن طائفؑ کے لوگ بڑے جی دار جنگجو تھے۔ انہوں نے رسد کے ایک بڑے ذخیرے کے ساتھ اچھی طرح مسلح ہو کر اپنے آپ کو شہر بند کر لیا۔ حضرت محمدؐ نے جو اسی طرح اچھے ہتھیاروں سے لیس تھے ہر طرح کے حملے کر دیکھے۔ آپؐ نے محاصرے کے جدید ہتھیار (منجنیق وغیرہ) بھی استعمال کئے اور اجتماعی حملے بھی کئے لیکن ہر کوشش ناکام رہی۔ آپؐ کا نقصان تشویش ناک حد تک بڑھتا گیا اور آپؐ کے چند بہت اچھے سالار شہید ہو گئے۔ ابو سفیان کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی۔ آخر کار کھجوروں اور انگوروں کے باغات تباہ کرنے کے بعد آپؐ نے یہ ہی مناسب سمجھا کہ (فی الحال) محاصرہ اٹھا لیں چنانچہ آپؐ نے اپنی سپاہ طائف سے ہٹا لی اور الجعرانہ چلے آئے جہاں پہنچ کر آپؐ نے اس مہم کا مالِ غنیمت تقسیم کیا۔ اس تقسیم میں آپؐ نے لشکر میں نئے شامل ہونے والوں کو بھی پرانے مسلمانوں کے برابر حصہ دیا[۲]۔ خصوصاً ابو سفیان اور عکرمہ بن ابی جہل کے ساتھ زیادہ فراخدلی کا برتاؤ کیا۔

---

[۱] مالک بن عوف حنین۔ اوطاس کی لڑائیوں میں ہوازن کا سردار تھا۔ وہاں سے شکست کھا کر طائف چلا گیا اور بنی ثقیف کے ساتھ قلعہ بند ہو گیا۔ طائف کا محاصرہ پندرہ روز جاری رہا لیکن شہر والوں نے ہتھیار نہ ڈالے کیونکہ ان کا قلعہ مضبوط اور ان کے پاس تقریباً ایک سال لڑائی جاری رکھنے کا پورا انتظام تھا دوسرے آپؐ کو عمرہ کر کے جلد مدینے واپس پہنچنا تھا اس لئے محاصرہ اٹھا لیا اور اس مہم کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھا۔ بعد میں مالک نے آنحضورؐ کی پیشکش قبول کر لی۔ وہ مسلمان ہو گیا اور اس کی جائیداد اسے واگذار کر دی گئی۔ (تاریخ طبری)

[۲] مکہ میں اسلام لانے والوں کے ساتھ آنحضورؐ نے ان کی تالیف قلوب کے لئے ترجیحی سلوک کیا۔ چند لوگوں کے حصے یہ تھے۔ ابو سفیان مع اولاد۔ تین سو اونٹ ایک سو بیس اوقیے چاندی۔ حکیم بن حزام کو دو سو اونٹ۔ صفوان بن امیہ ایک سو اونٹ۔ قیس بن عدی ایک سو اونٹ۔ سہیل بن عمرو ایک سو اونٹ۔ غنیمت اتنی تھی کہ اس فیاضانہ داد و دہش کے باوجود اتنا بچا کہ لشکر میں سے ہر ایک کے حصے میں فی کس چار اونٹ اور چالیس بکریاں آئیں۔ سواروں کو تگنا حصہ ملتا تھا ایک خود کا اور دو سواری کے۔ اس طرح ہر سوار کو بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بکریاں ملیں۔ (سیرۃ النبی۔ حصہ اوّل)

اہل مکہ کو جو فاضل غنیمت آنحضورؐ نے دی وہ خمس میں سے ہی دی تھی۔ یہ ہی ہمارے نزدیک سب سے زیادہ ثابت ہے۔ اس لئے بحیثیت مجموعی لشکر کے حصہ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ (طبقات ابن سعد۔ جزو ثانی)

آپؐ نے ایک پیغام طائف کے قبائل کے سپہ سالار مالک بن عوف کو بھی بھیجا کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دے اور مسلمان ہو جائے تو آپؐ اس کو اس کی ذاتی جائیداد واگذار کر دیں گے۔ مالک نے یہ پیشکش قبول[1] کر لی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ زود یا بدیر اسے ہتھیار ڈالنے ہی پڑیں گے۔ گو وہ اپنے لوگوں کو اپنے اس اقدام کی دانشمندی کے متعلق مطمئن نہ کر سکا لیکن انہیں چھوڑ کر اس کا اکیلا چلا آنا ہی سردست آپؐ کے لئے بڑے اطمینان کی بات تھی۔

لیکن قدیم جاں نثاروں کو ان میں سے کوئی بات بھی نہیں بھائی۔ انہوں نے کہا "دیکھو[2] آپؐ کس طرح نئے لوگوں پر داد و دہش کی بارش کر رہے ہیں اور ہمیں مشکل سے ہمارا حصہ ملتا ہے۔"

حضرت محمدؐ نے جب اس کے متعلق سنا تو معمول کے مطابق آپؐ نے پہل کر کے اس فتنے کو سر اٹھانے سے پہلے ہی ختم کر دیا۔ آپؐ نے تمام انصار و مہاجرین کو جمع کیا اور انہیں اس طرح خطاب کیا۔

آپ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ "میں جب آپ لوگوں کے درمیان آیا تھا تو مجھے جھوٹا کہا جاتا تھا لیکن آپ نے میرا یقین کیا۔ مجھے اذیتیں دی گئیں لیکن آپ نے بچایا۔ میں بے یار و مددگار تھا۔ آپ نے میری امداد کی۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ مجھے اس کا احساس نہیں؟ کیا میں اتنا ناشکرا ہو سکتا ہوں؟ آپ کو شکایت ہے کہ میں ان لوگوں کو تو عطیات سے نواز رہا ہوں اور آپ کو کچھ نہیں دے رہا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے ان کو دنیاوی دولت دی ہے لیکن ایسا میں نے ان کے دنیادار دلوں کو جیتنے کے لئے کیا ہے۔ تاکہ وہ مسلمان ہو جائیں لیکن آپ لوگوں کے لئے

---

[1] تاریخ طبری۔

[2] حقیقت یہ ہے کہ یہ شکایت انصار مدینہ کو ہوئی۔ سعد بن عبادہ (سردار انصار) آنحضورؐ کے پاس آئے اور اہل مکہ پر نوازشات کرنے کا گلہ کیا تو آپؐ نے ان کو جمع کر کے یہ خطبہ دیا۔ یہ پر خلوص باتیں سن کر لوگ اس قدر روئے کہ ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں۔ (طبری)

جو ہمیشہ کے وفا شعار ہیں میں خود کو پیش کرتا ہوں۔ اہل مکہ اپنے گھروں کو واپس جائیں گے تو بھیڑوں اور اونٹوں کو ساتھ لے جائیں گے۔ لیکن آپ کے ساتھ اللہ کا نبی ہوگا۔ کیونکہ خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے اگر ساری دنیا ایک طرف چلی جائے اور آپ دوسری طرف تو میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔

اب آپ ہی فیصلہ کرلیں کہ میں نے کس پر زیادہ نوازشات کی ہیں۔"

آپ کے یہ خلوص بھرے الفاظ قدیم جاں نثاروں کے دلوں میں اتر گئے۔ بلا تامل انہوں نے (یک زبان ہوکر) جواب دیا "یا رسول اللہ ہم بالکل مطمئن ہیں"۔

حضرت محمدؐ واقعی سچ کہہ رہے تھے۔ یہ نو مسلم قبائل کیا جانیں کہ اسلام کیا تھا۔ وہ تو صرف طاقت اور نتیجتاً مال غنیمت سے متاثر ہونے والے تھے۔ جب انہیں یقین ہوگیا کہ اس دین میں دونوں عناصر موجود ہیں تو وہ حضرت محمدؐ کے طرفدار بن گئے۔ ان میں دین کی سمجھ تو بعد میں پیدا ہوئی۔

جب یہ سارے معاملات طے ہو گئے تو حضرت محمدؐ مکہ واپس آئے[1] تاکہ عمرہ کے مناسک پورے کرسکیں جو اس مہم کے سبب ادھورے چھوڑ گئے تھے۔ اس سے فارغ ہوکر آپؐ اپنی سپاہ کے ساتھ مدینہ[2] روانہ ہو گئے۔

جو راستہ آپؐ نے اختیار کیا وہ ابوا[3] سے ہوکر گزرتا تھا جہاں آپؐ کی والدہ مدفون تھیں

---

[1] آپ طائف سے محاصرہ اٹھا کر جعرانہ آئے۔ وہاں تیرہ روز قیام کیا۔ مال غنیمت بھی یہاں ہی تقسیم کیا یہاں ہی بنو ہوازن کا وفد اپنے قیدی چھڑانے آیا اور آپؐ نے چھ ہزار جنگی قیدی بغیر کسی فدیے کے رہا کرکے ایک اعلیٰ مثال قائم کر دی۔ اس کے بعد آپؐ شب چہار شنبہ (بدھ) ۱۸ ذیقعد ۸ھ کو عمرے کی نیت سے مکہ روانہ ہو گئے اور وہاں ہی سے احرام باندھ کر مکے میں داخل ہوئے۔ عمرہ کرتے ہی آپؐ مدینہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ مکہ میں عتاب بن اُسید کو اپنا نائب مقرر کیا۔ (طبقات ابن سعد۔ جزو ثانی)

[2] ذی قعد کے آخر یا ذوالحجہ ۸ھ کے شروع میں آپ مدینہ منورہ واپس پہنچ گئے۔ (تاریخ طبری)

[3] ملاحظہ ہو نقشہ ۳

آپؐ نے سپاہ کو روک لیا اور کچھ دیر تک حضرت آمنہ کے مزار پر بیٹھے رہے۔ چون۵۴ سال پہلے اسی جگہ آپؐ اپنی حبشن دایہ برکہ (ام ایمن) کا ہاتھ پکڑے کھڑے تھے اور گاؤں کے لوگ آپؐ کی والدہ کی کفن میں لپٹی میت پر بیلچوں سے ریت اور پتھر ڈال رہے تھے۔ وہ واقعہ آپؐ کو اچھی طرح یاد تھا۔ آپؐ کی کنیز دایہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن اس وقت یقین کے ساتھ آپؐ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ کیوں رو رہی تھیں۔ موت اس وقت آپؐ کے لئے اتنی ہی انجانی تھی جیسی اب جانی پہچانی۔ آج آپؐ کی خواہش تھی کہ کاش وہ زندہ ہوتیں اور نیا دین اختیار کر کے نجات آخروی حاصل کرتیں۔

مدینہ میں آپؐ کی واپسی فاتحانہ تھی۔ صرف یہ ہی نہیں کہ مکہ شہر نے مسلم سپاہ کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ بلکہ حنین کی جنگ بھی لڑی اور جیتی جا چکی تھی۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو اپنے شوہر کے بحفاظت گھر واپس آجانے پر گونہ اطمینان ہوا۔ وہ دونوں حضرت زینبؓ اور ام سلمہؓ کو رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں جو اس مہم میں آنحضرتؐ کے ساتھ تھیں۔ لیکن ان کے اشتیاق نے مجبور کر دیا کہ ان دونوں ہم رکاب ازواج کی زبانی وہاں کی پر عظمت داستانیں سنیں۔ حضرت محمدؐ بھی حضرت عائشہؓ کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ اپنی آمد کے چند گھنٹے کے اندر اندر ہی آپؐ نے پہلے کی طرح اپنا معمول شروع کر دیا۔ پچھلے چند مہینوں میں پیش آنے والے واقعات نے آپؐ کے رہن سہن کے طریقوں اور معیار زندگی میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ اب آپؐ کے پاس دولت کی افراط تھی اور شاہانہ طریقوں سے جشن منائے جا سکتے تھے لیکن اس سے آپؐ کے معمول میں کوئی فرق نہ پڑا۔ دولت غریبوں میں تقسیم کر دی گئی اور فتح کا جشن مسجد کے قریب انہی آرائش سے عاری جھونپڑیوں میں وہی سادے کھانے کھا کر منایا گیا۔ اس بے تاج بادشاہ اور اس کی رعایا و سپاہ کے درمیان جمہوری رشتہ اب بھی وہی تھا جو شروع کے مصائب اور تکالیف کے ایام میں ہوتا تھا۔ (یعنی ہر مسلمان اب بھی آپؐ سے آزادی سے بات کر سکتا تھا)

۶۳۰ء کے موسم بہار کے باقی ماندہ ایام اور شروع گرمیاں آپؐ نے قوانین و ضوابط کے اجراء، ان پر عملدرآمد کرانے، قبیلوں کے وفود کی آمد اور ان سے بیعت لینے میں گذارا۔ پھر

اپنی ساٹھویں سالگرہ کے موقعہ پر گرمیوں کے وسط میں حضرت محمدؐ نے ایک ایسی مہم[1] کا منصوبہ بنایا جو غالباً آپؐ کی زندگی کی سخت ترین مہم تھی۔ آپؐ نے سپاہیوں، گھوڑوں اور اونٹوں پر مشتمل ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا اور عرب کے تپتے ہوئے صحرا کو طے کرنے کے لئے کوچ کر دیا تاکہ رومن شہنشاہ کو یہ باور کرایا جا سکے کہ "رومن[2] خاموش بیٹھے بھی فتوحات حاصل کرتا ہے" والا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔

اور یہ اس طرح ہوا :۔

حضرت محمدؐ کی پے در پے فتوحات اور اب سارے عرب پر آپؐ کی حکومت قائم ہو جانے کے سبب شہنشاہ ہرقل کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ موتہ کے معرکہ کے فوراً بعد ہی اسے مسلمانوں پر حملہ کر دینا چاہیئے تھا اور یہ کہ اب بھی ایسا کرنے کا وقت تھا۔ چنانچہ اس نے شام کے قبائل کو رومنوں کے عقابی پرچم تلے جمع ہونے اور عرب کے اس آمر کو ختم کرنے میں امداد دینے کی دعوت دی۔ اس خطرے سے نمٹنے کے لئے آپؐ کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ دشمنوں کو اپنے صحرائی علاقوں میں آنے دیں اور مناسب جگہ پر اس کا مقابلہ کریں۔ دوسرا یہ کہ خود ان پر چڑھائی کریں۔ پہلا طریقہ زیادہ آسان تھا لیکن خدشہ یہ تھا کہ نئے حلیف قبائل میں سے کچھ ان کے ساتھ نہ جا ملیں۔ اس لئے آپؐ نے دوسرا راستہ اختیار کیا گو اس تجویز کی عام مخالفت ہوئی۔

ان بے آب و گیاہ علاقوں میں ساری زندگی گزارنے کے باوجود گرمی عرب لوگوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ جو عرب اپنے ریوڑوں کو موسم گرما میں پہاڑی علاقوں میں لے جا سکتے ہیں وہ تو ٹھیک رہتے ہیں لیکن جو ایسا نہیں کرتے وہ دن کے وقت کسی نہ کسی سایہ میں جو وہاں موجود ہو پناہ لے لیتے ہیں اور جہاں تک ہو سکتا ہے۔ جانوروں کو دھوپ چڑھنے سے پہلے اور سورج غروب ہونے کے بعد ہی چراتے ہیں۔ چنانچہ ان بے آب جھلستے ہوئے ویرانوں میں زرہ بکتر پہن کر

---

[1] یہ مہم تبوک کی مہم تھی جو عرب کے صحراؤں کے پار اردن کی سرحد کے قریب ایک جگہ تھی۔

[2] انگریزوں کے ماضی قریب کے دعوے کی طرح "کہ سلطنت برطانیہ پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا" کبھی رومنوں کا یہ مقولہ بھی صحیح تھا "کہ رومن لوگ خاموش بیٹھے بھی فتوحات کرتے ہیں"۔ تبوک رومن سلطنت کی جنوبی سرحد پر واقع تھا۔ آج کل یہ مقام مملکت سعودیہ کا حصہ ہے۔

ایک بڑے طاقتور دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے شام کی حدود تک سفر کرنے کی تجویز میں کسی کے لئے کوئی ترغیب نہ تھی اور مسلمان سپاہ کے عام افسر اور لشکری کی نظروں میں اس میں کوئی معقولیت نہ تھی۔ اسی لئے فوج کے بہت سے[1] لوگوں نے اس سودائی مہم میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ عبداللہ بن اُبی نے جو حضرت محمدؐ کی پے در پے فتوحات سے اندر ہی اندر جلا جا رہا تھا ایک مرتبہ پھر اہمیت اختیار کر لی۔ غیر مطمئن لوگوں کے دلوں میں اس نے مزید بے اطمینانی کے تیر پھینکے اور شرارت کی۔ اس نے گرمیوں میں صحرا کی ایک بے حد مبالغہ آمیز تصویر پیش کی اور کہا کہ اس پر مشقت اور ادھ موا کر دینے والے سفر کے اختتام پر شکست یقینی تھی۔ اس کے خیال میں ایک بڑی شخصیت بن جانے کے خبط میں (نعوذ باللہ) حضرت محمدؐ اپنی عقل کھو بیٹھے تھے۔ کوئی صحیح الدماغ عرب ایسی کوئی تجویز پیش نہیں کر سکتا تھا۔

حضرت محمدؐ نے بھی اصرار نہ کیا۔ جہاد کے شروع ایام سے ہی آپؐ نے کسی ایسے شخص کو کبھی اپنا ساتھ دینے کی ترغیب نہ دی جو خود اسی کام کے لئے جوش و جذبہ نہ رکھتا ہو۔ جن لوگوں نے حیلے بہانے تراشے ان پر آپؐ نے طنزیہ انداز میں تبصرے کئے۔ چنانچہ جب کسی نے یہ کہا کہ یہ فصل اٹھانے کا وقت ہے تو آپؐ نے اُسے جواب دیا۔

"تمہاری یہ فصل تو ایک دن کی ہے۔ آخرت کی کھیتی کا کیا کرو گے جو ہمیشہ چلے گی۔"

---

[1] یہ لوگ بیشتر منافقین تھے جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے لیکن جو خود بھی گرمی سے جی چراتے تھے اور دوسروں کو بھی شدید گرمی میں نہ نکلنے کی تلقین کرتے تھے۔ خصوصاً جب کہ کھجوروں کی فصل پکی کھڑی تھی۔ سوءِ اتفاق سے قحط بھی تھا۔ شام کے قبطی سوداگر مدینہ آئے تو خبر دی کہ رومیوں نے بہت بڑی فوج اکٹھی کر لی ہے اور ان کا ہراول بلقاء (اردن کی سرحد) تک پہنچ گیا ہے۔ ادھر عرب عیسائیوں نے ہرقل کو یہ غلط اطلاع پہنچائی کہ نعوذ باللہ رسول اللہؐ کا انتقال ہو چکا ہے اور عرب قحط کے سبب بھوکوں مر رہے ہیں۔ بہت سے مسلمان اس وجہ سے اس مہم میں شرکت نہ کر سکے کہ ان کے پاس سواری اور زادِ راہ نہ تھی۔ البتہ صرف چند صحابہ نے جن میں کعب بن مالک بھی شامل تھے مصلحت اندیشی سے کام لیا اور ساتھ نہ گئے لیکن آپؐ کی واپسی پر اپنے قصور کا کھلے دل سے اعتراف کر لیا اور معافی چاہی لیکن آپؐ نے خود معاف نہ کیا یہاں تک کہ کچھ دنوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے قرآنی آیت نازل کر کے ان کی توبہ قبول کی۔ (سیرت النبی)

عرب کے صحرا کی گرمی کی عام شکایت پر آپ[3] نے یہ دندان شکن جواب دیا "دوزخ[1] اس سے بھی زیادہ گرم ہو گی"۔

بہرحال قدیم جاں نثاروں نے ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اسی وفاداری اور بھروسے کا ثبوت دیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنی تمام بچت کی پونجی حضرت محمدؐ کے سامنے لا رکھی۔ حضرت عثمانؓ ایک ہزار دینار لائے اور حضرت ابی بکرؓ نے چار ہزار درہم پیش کر دیئے۔ حضرت محمدؐ جانتے تھے کہ ان کے دوست کا کل اثاثہ یہی تھا لیکن آپؐ نے وہ سب کا سب قبول کر لیا۔ یہاں تک کہ حضرت عباسؓ نے بھی دل کھول کر مالی امداد کی۔

آخر کار تیاری مکمل ہو گئی اور جونہی دوپہر ڈھل گئی اور کھجوروں کے سائے لمبے ہونے شروع ہوئے۔ حضرت محمدؐ نے اپنی سپاہ کو صف بستہ ہونے کا حکم دیا۔ حالانکہ بہت سے قبائل اس میں شامل نہیں ہوئے پھر بھی اتنی کافی فوج[2] جمع ہو گئی کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ مدینہ کے باہر لمبی لمبی صفیں ختم ہوتی نظر نہ آتی تھیں۔ تیس ہزار شتر سوار۔ دس ہزار رسالہ اور ایک بہت لمبی قطار باربرداری کے جانوروں کی تھی۔ یہ سب مل کر چالیس ہزار سے کچھ اوپر ہی تھے۔ اتنے اجتماع پر یقین نہیں آرہا تھا۔

بدر کے موقع پر صرف تین سو مجاہد تھے۔ جن کے پاس پورے ہتھیار بھی نہیں تھے۔ اُحد میں سات سو اور صرف دو سال پہلے خیبر میں سولہ سو مجاہدین نے آپؐ کے پرچم تلے کوچ کیا تھا۔

---

[1] یہ سورہ توبہ کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے "وقالوا لا تنفروا فی الحر ؕ قل نار جہنم اشد حرا ؕ لو کانوا یفقہون" "وہ بولے نہ کوچ کرو اس گرمی میں۔ آپ کہہ دیں کہ دوزخ کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے اگر سمجھ رکھتے ہو" (رکوع - ۱۱)

[2] آنحضورؐ رجب ۹ھ کو تبوک کے لئے روانہ ہوئے اور رمضان کے مہینہ میں اس غزوہ سے واپس آئے۔ (طبری) مسلمانوں کے لشکر کی تعداد تیس ہزار تھی جس میں دس ہزار گھوڑے تھے۔ تیس ہزار جوان اور دس ہزار گھوڑوں کے ہمراہ آپ تبوک آئے اور وہاں بیس[3] شب قیام کیا۔ (طبقات ابن سعد۔ سیرت النبی۔ نقشہ ۱۴)

سیرت النبی میں اس غزوہ کے لیے روانگی کی تاریخ رجب ۹ھ مطابق نومبر ۶۳۰ء لکھی ہے لیکن جنرل گلب

اپنے اسی معاندانہ رویہ کے ساتھ عبداللہ بن ابی بھی پریڈ پر موجود تھا۔ اور معمول کے مطابق خود اس نے اور اس کے دستے نے فوج کے ساتھ کوچ کیا اور معمول کے مطابق ہی جونہی فوج مدینہ کی حدود سے باہر آئی وہ ساتھ[1] چھوڑ کر چلا گیا۔ اس مرتبہ اس نے دغابازی کے ساتھ شرارت بھی کی۔

حضرت محمدؐ نے اپنی غیر حاضری کے دوران حضرت علیؑ[2] کو مدینہ میں متعین فوج کا کمانڈر مقرر کیا۔ مدینہ واپس پہنچنے پر عبداللہ نے یہ افواہ پھیلا دی کہ اس دفعہ آپؐ حضرت علیؑ کو اس لئے ساتھ نہیں لے گئے کہ حضرت محمدؐ کو آپ سے شکایت تھی۔ جب حضرت علیؑ نے سنا تو آپ فوراً اپنی تیز رفتار سانڈنی پر سوار ہو کر لشکر کے تعاقب میں لپکے۔ حضرت محمدؐ کو اپنے نائب کو مطمئن کرنے اور یہ یقین دلانے میں بڑے تدبر سے کام لینا پڑا کہ آپؐ نے ان کو یہ غیر جنگی خدمت اس لئے سونپی تھی کہ ایک تجربہ کار اور بھروسے کا افسر مدینے میں موجود رہے اور آپؐ کی غیر حاضری میں اگر کوئی قبائلی

نے اپنی کتاب THE GREAT ARAB CONQUESTS میں یہ تاریخ ستمبر سنہ ۶۳۰ء بتائی ہے۔ یہ تاریخ مصنف کے بیان سے مطابقت کرتی ہے کیونکہ ستمبر بھی صحرا میں سخت گرمی کا مہینہ ہوتا ہے۔ ماہ رمضان میں آپ کی واپسی ہوئی اس پر سب متفق ہیں۔ مصنف نے واپسی دسمبر سنہ ۶۳۰ء میں بتائی ہے۔

[1] عبداللہ بن ابی نے اپنے لوگوں کے ساتھ اپنا کیمپ ثنیۃ الوداع (مدینہ کے باہر) قائم کیا لیکن جب اسلامی لشکر روانہ ہوا تو وہ اور اس کے ہمراہی پیچھے رہ گئے۔ چند صحابی بھی جن میں کعبؓ بن مالک اور ابوذر غفاریؓ بھی شامل تھے لشکر کے ساتھ نہ گئے۔ (طبقات ابن سعد) عبداللہ بن ابی اپنے قبیلہ کے کچھ آدمیوں کو لے کر فوج میں شامل ہونے آیا لیکن آپ نے اسے اور اس کے آدمیوں کو شریک نہ کیا کیونکہ اس پر اعتماد نہ تھا۔ (حیات محمدؐ)

[2] غزوہ تبوک کے موقعہ پر آنحضورؐ نے اپنی غیر حاضری میں محمد بن مسلمہؓ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا اور حضرت علیؑ کو ازواج مطہرات اور گھریلو معاملات کی دیکھ بھال کے لئے چھوڑا۔

(تاریخ طبری۔ حیات محمدؐ۔ سیرت النبی۔ طبقات ابن سعد)

[3] مصنف کی دی ہوئی وجہ معقول نظر آتی ہے۔ اس کے بعد آنحضورؐ نے جناب امیرؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا "کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ سے تھی"

(سیرۃ النبی ج اوّل)

بغاوت ہو تو اسے سنبھال سکے۔ حضرت علیؓ مدینہ واپس آئے اور عبداللہ کو گھر سے باہر نکال لائے۔ اس کو صاف صاف بتادیا کہ اگرچہ حضرت محمدؐ اس کی تمام شرارتوں اور سازشوں سے درگزر کرتے رہے ہیں لیکن آپ ایسا نہیں کریں گے اور جب تک آپ یہاں کے حاکم ہیں اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو وہ جان لے گا کہ اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔

مسلمانوں کے لئے صحرا کو عبور کرنا ایک نہایت کٹھن اور جانگسل آزمائش تھی۔ سورج غروب ہونے کے بعد ہی وہ سفر کرتے تھے لیکن اس میں بھی کوئی آرام کی صورت نہ تھی۔ شام ہونے پر سورج کی کرنیں خود دل اور زرہوں پر سیدھی تو نہ پڑتی تھیں لیکن رات اتنی مختصر ہوتی تھی کہ زمین پوری طرح ٹھنڈی بھی نہ ہو پاتی تھی۔ دن میں اگر کوئی سایہ میسر آسکتا تھا تو وہ صرف چٹانوں کا ہوتا تھا جو اتنی گرم ہوتی تھیں کہ ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ اسی طرح زمین کی تپش جلتے انگاروں کی طرح پاؤں میں آبلے ڈال دیتی تھی۔ پانی کی قلت نے اس مصیبت میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ لُو اور سخت گرم ہوا سے زندگی اجیرن ہوئی جاتی تھی۔ کسی شخص نے بھی یہاں تک کہ بوڑھے سے بوڑھے صحرا نشین نے بھی اس سے پہلے کبھی اتنی سخت گرمی اور تکالیف میں سفر نہیں کیا تھا۔

حضرت محمدؐ نے اس موقعہ پر بڑی بلند ہمتی کا مظاہرہ کیا۔ آپؐ کا طرزِ عمل مثالی تھا۔ حالانکہ آپؐ نہ تو خانہ بدوش تھے اور نہ ہی جوان یا ادھیڑ۔ جسمانی محنت اور جفاکشی کے علاوہ آپؐ کو اور ہزاروں ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا پڑتا تھا لیکن اس کے باوجود آپؐ نے کہیں بھی کمزوری نہیں دکھائی۔ ایک ہفتہ سے کچھ ہی اوپر ہوا ہو گا کہ آپؐ اپنے سارے لاؤ لشکر کے ساتھ تبوک پہنچ گئے جو رومن سلطنت کی سرحد پر تھا۔ اگر آپؐ صرف گلہ بان یا شتربان ہوتے جو اپنے ریوڑ کے ساتھ یہ صحرا عبور کر لیتا تب بھی یہ ایک بڑا کارنامہ ہوتا۔ لیکن چالیس ہزار فوج اور جانوروں کو لے کر صحرا کو عبور کرنا سائرس[1] کے ہم پلہ کہا جاسکتا ہے۔ جس نے ۴۰۱ ق م میں دس ہزار

---

[1] سائرس۔ یہ تاریخ میں CYRUS THE YOUNGER کے نام سے مشہور ہے۔ فارس کے بادشاہ دارائے ثانی کا دوسرا لڑکا تھا۔ ۴۰۴ ق م میں تخت بڑے بھائی کو مل گیا اور اس کو ایشیائے کوچک (ترکی) کا

یونانی فوج کو لے کر بابل سے بحیرہ اسود تک کا سفر کیا تھا۔

تبوک ایک زرخیز اور سرسبز نخلستان تھا۔ وہاں کے باغات، کھجور اور پانی کی بہتات دیکھ کر مسلمانوں کو جنت کا گمان ہونے لگا۔ اس وقت وہاں کوئی رومن[1] فوج نہ تھی جو گڑبڑ پیدا کرتی۔ وہاں کے باشندوں کا رویہ دوستانہ تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی فوج نے وہاں پر نہانے دھونے اور زخمی پیروں کو مندمل کرنے میں پر مسرت وقت گذارا۔ چونکہ وہاں پر لڑنے والا کوئی نہ تھا حضرت محمدؐ نے فوج کے طوفانی دستے قریب کے اضلاع میں بھیجے تاکہ وہاں کے مقامی قبیلوں سے اطاعت تسلیم کرائیں۔ چنانچہ یہودی، نصرانی اور بت پرست لوگ بلا پس و پیش مسلمانوں کے کیمپ[2] میں حاضر ہونے لگے۔ صرف ایک دستہ ایسا واپس آیا۔ جس کے نیزوں کی انیاں خون آلود تھیں اور جیسا کہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ وہ خالدؓ کا دستہ تھا۔

حضرت خالدؓ کی کمان میں مسلمانوں کے رسالے کے نئے دستے تھے۔ جن کی تعداد

گورنر بنا دیا گیا۔ لیکن اس نے یونانیوں کی فوج بھرتی کر کے ایک بڑا لشکر اکٹھا کیا اور بڑے بھائی سے مقابلہ کرنے کے لئے ایشائے کوچک سے چل کر عراق آیا اور بابل پر ۴۰۱ ق۔م میں حملہ کیا۔ شکست کھائی اور مارا گیا۔ بچی کھچی فوج جس طرح آرمینیا کے برفانی پہاڑوں سے ہو کر بحر اسود تک پہنچی وہ ایک شاندار کارنامہ شمار ہوتا ہے۔ یہ سفر انہوں نے اپنے سپہ سالار زینوفون XENOPHONE کی سرکردگی میں کیا۔ جس نے اپنی کتاب میں یہ حالات قلم بند کئے ہیں۔

(چیمبرز انسائیکلوپیڈیا۔ جلد چہارم)

[1] تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ رومی فوج کے بڑے اجتماع اور مدینہ پر حملے کی خبریں بے بنیاد تھیں (سیرۃ النبی)

[2] یوحنا ایلہ (خلیج عقبہ) کا ایک عیسائی سردار تھا۔ اس نے جزیہ کی ادائیگی پر اطاعت قبول کر لی۔ اسی طرح آپؐ نے فلسطین کے شہروں جربا اور اذرح (جو عمان کے مضافات میں تھے) کے سرداروں سے بھی جزیہ کی شرط پر صلح کر لی۔ آپؐ نے ان سرداروں کو صلح نامے اور امان نامے لکھ کر دیئے۔ ان معاہدوں کے بڑے دور رس نتائج نکلے اور آپؐ کی شمال مغربی سرحدیں محفوظ ہو گئیں اور ادھر سے حملوں کا خطرہ نہ رہا۔
نقشہ ۱۴

پانچ ہزار تھی۔ حضرتِ خالدؓ نے اتنی تیزی سے سفر کیا کہ انہوں نے ایک عیسائی سردار مسمی اکیدر کو شہر کے باہر شکار کھیلتے جالیا۔ انہوں نے اپنے اصول کے مطابق اکیدر کے سوا عیسائی سردار کے سارے دستہ کو تہ تیغ کر دیا۔ اکیدر کی جان بخشی صرف اس شرط پر کی کہ وہ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور وہ اس کو دو ہزار اونٹ اور آٹھ سو بھیڑ بکریاں اور اسلحہ کے ایک بڑے ذخیرے کے ساتھ حضرت محمدؐ کی خدمت میں لے آئے۔ حضرت محمدؐ نے اکیدر کا استقبال ایسی گرمجوشی اور حضرت خالدؓ کے رویہ سے پیدا شدہ توقعات کے اتنا برعکس کیا کہ وہ از خود عیسائیت ترک کر کے مسلمان ہو گیا۔

حضرت محمدؐ نے تبوک میں چند ماہ[2] قیام کیا جس کے دوران تمام ملک سے قبائل آکر آپؐ کی اطاعت

---

[1] یہ مہم دومۃ الجندل کی مہم کہلاتی ہے اور حضرت خالدؓ کی سرداری میں رجب ۹ ہجری میں ہوئی۔ یہ قصبہ دمشق سے سات منزل ادھر واقع تھا اور شام کے علاقہ میں تھا۔

"حیاتِ محمدؐ" میں خالدؓ کے دستے کی تعداد پانچ سو لکھی ہے۔ یہ مہم اس شہر کی جانب اس لئے بھیجی گئی تھی کہ وہاں پر رومیوں کی فوج کے اجتماع کی خبر ملی تھی۔ حضرت خالدؓ عیسائی سردار اکیدر کو گرفتار کر کے اس کے شہر لے آئے اور اس کے کہنے پر شہر نے دروازے کھول دیئے اور مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ غزوہ تبوک کے سلسلہ میں یہ ایک بڑی سیاسی کامیابی تھی۔ ("حیاتِ محمدؐ"۔ طبقات ابن سعد) سیرت النبیؐ میں مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ اکیدر کی جان بخشی اس شرط پر کی تھی کہ وہ مدینہ میں آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اطاعت قبول کرے۔ وہ مدینہ آکر اتنا متاثر ہوا کہ مسلمان ہو گیا۔
نقشہ ۱۴

[2] آنحضورؐ نے تبوک میں بہت زیادہ قیام نہیں کیا۔ ابن سعد نے یحییٰ بن کثیر سے روایت کی ہے کہ آپ بیس[20] شب وہاں مقیم رہے۔ سیرۃ النبی میں بھی یہی مدت لکھی ہے اور طبری نے بارہ تیرہ دن لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ رجب ۹ھ میں تبوک کے سفر پر روانہ ہوئے اور رمضان (مطابق ۶۳۰ء) میں واپس تشریف لے آئے۔ گویا سفر کی مدت ملا کر آپ کو تقریباً ڈیڑھ دو ماہ کا عرصہ لگا۔ (مترجم)

قبول کرتے رہے۔ لیکن جب رومن نہ آئے تو آخر تنگ آکر آپؐ نے اپنے جرنیلوں کے سامنے یہ خیال ظاہر کیا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ وہ خود آگے بڑھ کر ان کی تلاش کریں لیکن حضرت عمرؓ نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ انہوں نے کہا کہ اس مہم کا اصل مقصد رومنوں کے حملے کا سدّباب کرنا تھا وہ پورا ہوگیا۔ علاوہ ازیں بحیرہ قلزم سے لے کر فرات کی وادی تک کے تمام قبائل بھی آپؐ کی اطاعت میں آگئے ہیں۔ اس لئے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ اس اچھی صورت حال کو اسی طرح قائم رہنے دیا جائے۔ حضرت محمدؐ نے اس تجویز کو مان لیا۔ چنانچہ مدینہ کو واپسی کا سفر دسمبر کے نسبتاً سرد مہینہ میں کیا گیا۔

مدینہ والوں نے واپسی پر فوج کا استقبال بڑے جوش و خروش سے کیا۔ جونہی آنے والے لشکر کی طویل صفوں سے اٹھنے والی گرد دکھائی دی شہر کے لوگ مدینہ سے باہر نکل آئے وہ تالیاں بجا بجا کر، گانے گا کر اور تحسین و آفریں کر کے خوشی کا اظہار کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود حضرت محمدؐ نے ایک فاتح ہیرو جیسا رویہ اختیار نہ کیا۔ جیسے ہی لوگ آپؐ کے خچر کے گرد جمع ہوئے آپؐ نے لوگوں سے ان کے نام لے لے کر خیریت پوچھی۔ بچے آپؐ کی رکابوں میں کھڑے ہوگئے اور آپؐ کے آگے اور پیچھے بیٹھ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپؐ ایک بڑے خاندان کے سربراہ ہیں جو کسی شکاری مہم سے واپس آئے ہوں۔

صرف وہی لوگ ان خوشیوں میں شریک نہ ہوئے جنہوں نے اتنی سخت گرمی میں سفر کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ شرمندہ تھے بلکہ وہ سخت مایوس بھی ہوئے۔ فوج میں اموات اور زخمیوں کی تعداد بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ مال غنیمت بھی بہت لائے تھے۔

حضرت محمدؐ نے ان لوگوں کے خلاف سخت رویہ اختیار کر لیا جو کسی معقول وجہ کی بجائے صرف تن آسانی کے سبب گھروں سے نہ نکلے تھے۔ آپؐ نے ان پر قدغن لگا دیا اور قدیم جاں نثاروں کو ان سے کسی قسم کا تعلق رکھنے سے منع کر دیا۔ یہ ایک قسم کا برادری سے خارج کر دینا تھا جس کے سبب نہ وہ مسجد میں آسکتے تھے اور نہ ہی لوگوں سے میل ملاپ رکھ سکتے تھے۔ نہ صرف انہیں بزدل کہا گیا بلکہ ان کو تمام مذہبی مراعات سے محروم کر دیا گیا۔ ان جی

چرانے والوں کے خلاف یکے بعد دیگرے کئی آیات رسول اللہ پر نازل ہوئیں جن کو باقاعدہ طور پر قرآن میں محفوظ کر لیا گیا۔ ایک جگہ ارشاد باری ہوتا ہے :۔

لوکان عرضاً قریباً وسفراً قاصداً ....

انھم لکذبون ع (رکوع ۷۔ سورۃ توبہ)

"اگر مال غنیمت کہیں نزدیک ہوتا اور سفر بھی آسان ہوتا تو وہ ضرور تیرے ساتھ جاتے لیکن انہیں راہ بہت طویل نظر آئی۔ وہ تیرے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر وہ سفر کے قابل ہوتے تو یقینی طور پر تیرے ساتھ جاتے ......

انہوں نے اپنا ہی نقصان کیا ہے کیونکہ اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں "

اسی طرح کی اور بہت سی آیات ہیں۔

ایک ماہ تک حضرت محمدؐ ان لوگوں سے ناراض رہے۔ پھر پابندیاں نرم کر دیں اور خطاکاروں کو معافی مل گئی۔ آپؐ جانتے تھے کہ اس واقعہ کے بعد آپؐ کو اس کا نزد نہیں رہے گا کہ آئندہ کوئی شخص جنگ سے غیر حاضر ہوگا۔ اس کے بعد آپؐ کی مزید تسکین اور اطمینان کا ایک اور واقعہ ہوا۔

معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بس اب عبداللہ بن ابی حضرت محمدؐ کو کافی ستا چکا ہے کیونکہ یہ منفی شخص آپؐ کے غزوہ تبوک سے واپس آنے کے بعد جلد ہی بیمار پڑ گیا اور مر گیا۔ حضرت محمدؐ کئی دفعہ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور اس کے دفن ہونے سے پہلے اس کے لئے دعا کی۔ جب حضرت عمرؓ نے اس پر احتجاج کیا تو حضرت محمدؐ نے فرمایا۔

ل اللہ تعالیٰ نے حضرت کعبؓ بن مالک اور دوسرے ان صحابیوں کی توبہ قبول کر لی جو غزوہ تبوک میں شریک نہ ہوئے تھے لیکن اپنے کئے پر پشیمان تھے اور دن رات روتے تھے۔ اس سلسلہ میں سورہ توبہ کی یہ آیات نازل ہوئیں "لقد تاب اللہ علی النبی والمھاجرین والانصار الذین ..... ھو التواب الرحیم" اور ان سب کی توبہ قبول کر لی۔ آنحضورؐ نے اور تمام مسلمانوں نے ان سے پھر برادرانہ سلوک شروع کر دیا۔

"ایک ریاکار شخص کے لئے دعا کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر تم دن رات کسی کے لئے دعا کرو اور وہ ریاکار ہو تو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے اور وہ اس کی بخشش نہیں کرے گا۔"

حضرت محمدؐ عبداللہ کے ساتھ فراخدلی کا سلوک کر سکتے تھے کیونکہ اس کے راستے سے ہٹ جانے کے بعد آپؐ کا کوئی حریف[1] نہ رہا۔ اور یہ بات صحیح بھی تھی کیونکہ عبداللہ کے مرنے کے چند روز کے اندر اندر ہی مدینہ کے مخالف لوگوں نے آپؐ کو اپنا سردار مطلق تسلیم کر لیا۔

اس کے بعد آپؐ کو مزید اطمینان اور سکون نصیب ہوا۔ گو طائف کا محاصرہ اٹھا لیا گیا تھا۔ ان کا سردار (مالک بن عوف) مسلمان ہو گیا تھا اور مسلمانوں کے مسلح دستے قریبی علاقوں میں چھاپے مارتے رہتے تھے لیکن شہر والوں نے تاحال ہتھیار نہیں ڈالے تھے، باوجود اس کے کہ ان کے باغات اور کھجوروں کے ذخیرے تباہ کر دیئے گئے تھے اور جب بھی وہ فصیل سے ذرا زیادہ دور چلے جاتے تو ان کے ریوڑ چھین لئے جاتے تھے لیکن وہاں کے باشندے تاحال مقابلہ پر ڈٹے ہوئے تھے آخر کار ان کا ایک وفد مدینہ[2] پہنچا جس نے اس شرط پر شہر حوالے کرنے کی پیش کش کی کہ اپنے بت "اللات" کو اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دی جائے۔ حضرت محمدؐ نے انکار کر دیا۔ ایلچیوں نے پھر دریافت کیا کہ کیا وہ اسے تین سال، دو سال یا کم از کم ایک سال کے واسطے بھی نہ رہنے دیں گے؟

حضرت محمدؐ نے دوٹوک انداز میں جواب دیا "ایک ہفتہ کے لئے بھی نہیں"۔

---

[1] یہ مصنف کا ذاتی خیال ہے۔ اصل وجہ غالباً یہ تھی کہ عبداللہ بن ابی کے صاحبزادے عبداللہ اتنے ہی مخلص مسلمان اور جاں نثار تھے جتنا ان کا باپ آنحضورؐ کا دشمن اور منافق تھا۔ غالباً اسی لئے نہ آپ نے عبداللہ بن ابی کو قتل کرایا اور نہ کوئی سزا دی۔ حالانکہ حضرت عبداللہ نے کئی دفعہ آنحضورؐ سے کہا کہ اگر آپؐ چاہیں تو وہ اپنے باپ کو قتل کر کے اس کا سر خدمت اقدس میں پیش کر دیں۔ لیکن رسول اللہؐ نے ایسا کرنے سے منع کیا۔

[2] اہل طائف کا یہ وفد آنحضورؐ کی غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد ماہ رمضان ۹ھ میں مدینہ پہنچا۔ گویا ان لوگوں نے پورے ایک سال کے بعد غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالے۔ واضح رہے کہ آپ نے شوال ۸ھ میں طائف کا محاصرہ کیا تھا۔

طائف کے لوگ کچھ ہی کیوں نہ کہتے حضرت محمدؐ کا یہ فیصلہ اٹل تھا۔ چنانچہ جلدی ہی انہوں نے عاجز آ کر بحث مباحثہ بند کر دیا۔ مدینہ سے روانہ ہونے سے پہلے وہ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے پر رضامند ہو گئے۔ جہاں تک "اَلّات" کو توڑنے کا معاملہ تھا حضرت محمدؐ نے ان کا اعتبار نہ کیا۔ چنانچہ آپؐ نے ابوسفیان اور مغیرہ بن شعبہ کو (جو سابقون الاولون میں سے تھے) ساتھ بھیجا[1] تاکہ معاہدے کے اس حصہ کی تعمیل میں کوئی فروگذاشت نہ ہو۔

بت شکنی کی اس مہم پر اس قریشی سردار (ابوسفیان) کو بھیجنا بڑی زیرکی اور دانائی پر مبنی تھا۔ اس اقدام سے بغیر کسی اعلان کے یہ بات واضح ہو گئی کہ کوئی شخص کسی وقت میں اسلام کا کتنا ہی بڑا مخالف کیوں نہ رہا ہو اللہ تعالیٰ جب چاہے اس سے اپنی مرضی کا کام لے سکتا ہے۔ بہ ایں ہمہ جس وقت ابوسفیان نے کدال اٹھا کر پتھر کے اس عظیم بت (الآت) پر ضرب لگانا چاہی تو وہ خود لڑکھڑا گیا۔ اس کا سبب خواہ یہ خوف ہو کہ نہ معلوم اَلّات کی دیوی اس کا کیا حشر کرے یا پھر طائف کے بت پرست تماشائیوں کے تحقیر آمیز قہقہوں کے درمیان منہ کے بل گر پڑا۔[2] یہ ایک بڑا نازک لمحہ تھا اور بنو ہوازن کے خیالات کو یکسر تبدیل کر سکتا تھا لیکن مغیرہؓ ایک جہاندیدہ مسلمان تھے انہوں نے فوراً کدال پکڑ لی اور "لات" کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کیا، اونٹوں پر سوار ہوئے اور طائف کی عورتوں کو اپنی محافظ و نگہبان دیوی کی میّت پر روتے دھوتے چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔

سال کے اختتام پر پھر حج کا وقت آ گیا۔ اس مرتبہ حضرت محمدؐ خود نہیں گئے بلکہ اپنی جگہ

---

[1] بنی ثقیف (اہل طائف) نے آخر میں یہ درخواست کی کہ انہیں اپنے اصنام خود توڑنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اور نماز سے بھی معاف کر دیا جائے۔ آپؐ نے پہلی شرط مان لی اور ابوسفیان اور مغیرہؓ کو الآت کو توڑنے کے لئے بھیج دیا لیکن نماز کی معافی سے صاف انکار کر دیا۔ (تاریخ طبری)

[2] ابوسفیان کے "الآت" کے خوف سے لڑکھڑا کر گرنے کا واقعہ تواریخ میں نہیں ملتا۔ مصنّف نے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔

حضرات[1] ابوبکرؓ و علیؓ کو بھیجا۔ آپؐ نے دانستہ طور پر ایسا کیا۔ اگرچہ مکہ کے بیشتر لوگ اور عرب کے قبائل مسلمان ہو چکے تھے لیکن پھر بھی کچھ ایسے بت پرست لوگ باقی تھے جو عادتاً مکہ جا کر حج کرتے تھے۔ گو اب کعبہ میں بت نہ تھے لیکن وہ تا حال وہاں جا کر اپنی قدیم ملحدانہ رسومات ادا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ خیال رہے کہ گو عربوں کا مذہب تبدیل ہو گیا تھا لیکن اکثر قدیم رسوم یا تو ویسی ہی رہنے دی گئی تھیں یا کچھ تبدیلیاں کر کے نئے نظریات کے مطابق ڈھال لی گئی تھیں۔ حضرت محمدؐ نے کبھی کعبہ کی ان قدیم رسومات کو برا نہیں کہا تھا جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے اللہ تعالیٰ کے نام پر ادا کی جاتی رہی تھیں۔ لیکن بہ ایں ہمہ آپؐ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ لوگ اس کو غلط معنی پہنائیں۔ چنانچہ آپؐ نے فیصلہ کر لیا کہ یا تو تمام کافر اور مشرک آپؐ کی تعلیمات کی پیروی کر کے مسلمان ہو جائیں یا پھر ان کو مکہ سے دور رکھا جائے۔ لیکن ان احکام کو لوگوں تک خود پہنچانا اب آپؐ کے مقام کے پیشِ نظر اتنا زیادہ اہم نہ تھا کہ آپؐ اس کے لئے خود جاتے[2]۔ چنانچہ آپؐ خود نہ گئے اور ان احکام کے اعلان اور ان امور کی تعمیل اپنے نائبین پر چھوڑ دی۔

جب حج کی رسومات ختم پر آئیں تو حضرت علیؓ نے سب کو اکٹھا کیا اور حضرت محمدؐ کا تازہ فرمان سب کو سنا دیا جو ایک طرح سے عرب سے کفر و الحاد کے خاتمے کا اعلان تھا۔

مسلمان ہونے سے انکار کرنے والے کافر قتل کے مستوجب قرار دے دیئے گئے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو قتل نہیں کرنا تھا البتہ ان سے جنگ کرنا تھی اور مسلمانوں کے سامنے ہتھیار ڈال

---

[1] ذی قعد ۹ھ میں رسولِ اکرمؐ نے تین سو مسلمانوں کا ایک قافلہ اور قربانیاں حج کے لئے مدینہ سے روانہ کیں حضرت ابی بکرؓ امیرِ حج بنائے گئے۔ کچھ دیر بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو نقیب اسلام اور حضرت سعدؓ بن وقاص اور ابوہریرہؓ کو معلم حج کی حیثیت سے بھیجا۔ یوم النحر میں حضرت ابی بکرؓ نے خطبہ دیا جس میں حج کے مسائل بیان کئے۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ نے سورہ برأت کی چالیس آیات سنائیں اور اعلان کیا کہ آئندہ سال سے کوئی مشرک یا غیر مسلم خانہ کعبہ میں داخل نہ ہو سکے گا اور نہ ہی حج کر سکے گا۔ نہ کوئی برہنہ حج کر پائے گا اور مشرکین کے تمام معاہدے نقض عہد کے سبب آج سے چار ماہ بعد ٹوٹ جائیں گے (سیرت النبی)

[2] حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں باہر سے اتنے وفود اطاعت اور بیعت کے لئے آ رہے تھے کہ آپؐ مدینہ سے باہر نہیں جا سکتے تھے چنانچہ آپؐ نے حضرت ابی بکرؓ کو امیر حج بنا کر بھیجا۔ (حیاتِ محمدؐ)

دینے اور اطاعت کر لینے پر وہ جزیہ دے کر اپنے مذہب پر قائم رہ سکتے تھے۔ فرمان[1] ان الفاظ پر ختم ہونا تھا۔

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تم کو بتا دوں کہ کوئی کافر جنت میں نہیں جائے گا اور کوئی غیر مسلم اس سال کے بعد حج نہیں کرے گا۔ البتہ جس کسی (قبیلے) کا رسول اللہ سے معاہدہ ہے۔ اس مدت کے ختم ہونے تک صلح کا احترام کیا جائے گا۔ قبیلوں کو چار ماہ کی مدت دی جاتی ہے تاکہ وہ بحفاظت اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ اس کے بعد اللہ کے رسولؐ کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔"

حضرت علیؑ نے تقریر ختم کی تو حاجیوں کا اجتماع منتشر ہو گیا۔ گروہ گروہ یا تن تنہا اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ وہ چلتے جاتے تھے اور اس خبر کا اعلان کرتے جاتے تھے کہ آئندہ سے تمام عرب کا مذہب صرف اسلام ہوگا۔ ہجرت کے اس نویں سال کے اختتام اور چھ سو اکتیس (۶۳۱) سن عیسوی کے بعد کسی غیر مسلم کو مکہ کی مقدس حدود (حرم) میں قدم رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

اس فرمان کو جاری ہوئے تیرہ سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن اس پر آج بھی اسی طرح عمل جاری ہے۔

---

[1] سورہ توبہ کے شروع کے پانچ رکوع سورۃ برات کہلاتے ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ ہے "براۃ من اللہ و رسولِہٖ الی الذین عٰہدتم من المشرکین .... واللہ لا یہدی القوم الکٰفرین ع یہ چالیس آیات حضرت علیؑ نے حجاج کے سامنے پڑھ کر سنائیں اور ان پر عمل کا حکم دیا۔ ان ہی آیات میں مشرکین کے مستقبل کے متعلق بھی احکام ہیں۔ (حیات محمدؐ)

اکیسواں باب

حجۃ الوداع

(۶۳۲ عیسوی)

جہاں تک عیسائیوں سے مسلمانوں کے سلوک کا تعلق ہے حضرت محمدؐ کے اس فرمان پر چند استثناء کے ساتھ تاحال عمل ہوتا ہے لیکن ان احکام کی حقیقت اُس سے بہت مختلف ہے جیساکہ مغرب کے لوگ عام طور پر خیال کرتے ہیں۔

ایک عام امریکی یا یورپین فرد کے نزدیک جو عیسائی مذہب میں اعتقاد رکھتا ہے عیسائیت کے علاوہ تمام مذاہب غلط ہیں۔ یہاں تک کہ خود عیسائیت میں مختلف اعتقادات[ل] کے لوگ ایک دوسرے کو گمراہ سمجھتے ہیں۔ مختلف عقیدوں کے لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے رواداری نہ ہونے کے برابر ہے اور عیسائیت اور اسلام میں تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اسلام میں ایسا نہیں ہے۔

جہاں اسلام بت پرستی کے سخت خلاف ہے وہاں واضح طور پر عیسائیت کو تسلیم کرتا ہے۔ قرآن کی دوسری سورۃ (البقرہ) اور پھر پانچویں سورۃ (المائدہ) میں لکھا ہے۔

اِنَّ الَّذِینَ اٰمَنُوْا وَالَّذِینَ ھَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَا

[ل] مصنف نے چرچ، چیپل اور کیتھڈرل کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جو عیسائیت میں مختلف عقیدوں کے فرقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون ۝ (سورہ بقر۔ رکوع ۸)

"بیشک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین جو کوئی یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور نیک عمل کیے تو ان کو اجر ملے گا ان کے رب کی طرف سے۔ اور نہ ان کو ڈر ہوگا اور نہ کوئی غم۔"

ولتجدنّ اقربھم مودّۃ للّذین آمنوا الّذین قالوا انّا نصاریٰ ۝

(سورہ مائدہ۔ رکوع ۱۱)

"اور (اے محمدؐ) تجھے معلوم ہو جائے گا کہ جو لوگ مودّت اور محبت میں مسلمانوں سے سب سے زیادہ قریب ہیں وہ وہی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں"

ان شرائط کا ذکر کرتے ہوئے جن کے تحت یہودی اور عیسائی مسلمانوں کی سرزمین پر رہ سکتے ہیں اور قوم کا ایک حصہ بن سکتے ہیں حضرت محمدؐ نے فرمایا:۔

"جو شخص بھی یہودیوں یا عیسائیوں کو تکلیف پہنچائے گا، اس کا مدعی میں ہونگا"

بار بار آپؐ نے اس مذہب والوں سے رواداری کے سلوک پر زور دیا جو آپؐ کے اپنے دین سے بہت ملتا جلتا تھا۔ عیسائیوں سے کئے گئے تمام معاہدوں میں آپؐ نے ان کو ہمیشہ اپنے طریقہ پر عبادت کرنے کی آزادی کی ضمانت دی۔

جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے اور بیت المقدس فتح ہوا تو آپ نے سختی سے حکم دیا کہ نہ تو عیسائیوں کو خود اور نہ ہی ان کے گرجاؤں کو کوئی نقصان پہنچایا جائے۔

جب مسلمانوں نے آٹھویں صدی میں اسپین پر حملہ کیا تو عیسائیت سے متعلق ہر چیز کا احترام کیا گیا اور پندرھویں صدی میں یورپ میں عربوں کی حکومت کے زوال اور انتشار تک اس پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن عیسائیوں کے دوبارہ غالب آنے پر رواداری کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ مسلمانوں کے نرم رویے اور فراخدلی کی جگہ بجبر عیسائی بنانے کی رسم نے لے لی۔

اب وہ کھلا تعصب تو ختم ہوگیا ہے لیکن اس کی جڑیں اب بھی باقی ہیں۔ اس کے باقی رہنے کی بھی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ کیونکہ عیسائیت اور اسلام کی جنگ اصل میں ایک ہی کنبے کے دو قریبی بھائیوں کا جھگڑا ہے اور اسی طرح کے اور بہت سے جھگڑوں کی

طرح اس کی بنیاد بھی زیادہ تر غلط فہمی ہی ہے۔ حضرت محمدؐ کو بدنام کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا اور نہ ہی قرآن کو (نعوذ باللہ) خرافات کا پلندہ کہہ کر نظر انداز کرنے سے کوئی فائدہ ہوگا۔ البتہ اسلام کا غیر جانبداری سے مطالعہ کرنے سے بہت کچھ ملے گا۔ جیساکہ شاہ جارج پنجم (انگلستان) کی پریوی کونسل کے ایک بیدار مغز رکن سید امیر علیؒ[1] نے چند سال پہلے لکھا تھا۔

"ایک سچا مسلمان اصل میں ایک سچا عیسائی ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی حضرت عیسیٰؑ کی رسالت کا قائل ہے اور ان کی تعلیمات سے بہرہ مند ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

چنانچہ کوئی وجہ نہیں کہ ایک سچا عیسائی بھی اس رسولؐ کا احترام کیوں نہ کرے جس نے پہلے برگزیدہ نبیوں کے لائے ہوئے دین کی تکمیل کرکے اسے آخری شکل دی۔"

ایسا کیوں نہ ہو؟ آخر مغربی ممالک کے لوگ اپنے اعتقادات کو دوسرے مذاہب والوں سے کیوں زیادہ موثق سمجھتے ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ اس وقت دنیا میں تیس کروڑ مسلمانوں[2] کے مقابلے میں اٹھاون کروڑ پچاس لاکھ عیسائی ہیں۔ لیکن ان اٹھاون کروڑ پچاس لاکھ میں سے زیادہ سے زیادہ ستر فیصد عیسائی ایسے ہیں جو اپنے مذہب کے کسی نہ کسی حد تک پابند کہے جا سکتے ہیں لیکن مسلمانوں میں تقریباً پچانوے فی صد لوگ ایسے ہیں جو اب بھی دین اسلام کی پیروی اسی طریقے پر کرتے ہیں جیساکہ حضرت محمدؐ نے تیرہ سو سال سے زیادہ عرصہ پہلے بتایا تھا جب آپؐ آخری حج پر مکہ جانے والے تھے۔

حج کے لئے روانہ ہونے سے پہلے آپؐ کو ان حکمرانوں کے وفود سے بھی ملنا تھا جو اگرچہ سب مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن آپؐ کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ ان میں سے ایک شہنشاہ ہرقل کے شام کے گورنروں میں سے تھا اور ایک اومان (خلیج فارس کی ایک ریاست) کا بادشاہ تھا۔ بہت

---

[1] جسٹس سید امیر علی (۱۸۴۹ تا ۱۹۲۸ء) ایک ماہر قانون دان۔ کلکتہ ہائی کورٹ کے جج اور پریوی کونسل کے پہلے ہندوستانی ممبر۔ مسلمانان پاک و ہند کے ایک بیدار مغز لیڈر تحریک خلافت کے علمبردار اور کئی قابل قدر کتابوں کے مصنف SPIRIT OF ISLAM اور HISTORY OF SARACENS ان کی مایہ ناز کتابیں ہیں۔

[2] یہ اعداد و شمار سنہ ۱۹۳۶ء سے بھی پہلے کے ہیں جب یہ کتاب پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔

سے دوسرے لوگوں کی طرح انہوں نے بھی نوشتہ دیوار پڑھ لیا تھا اور اس کا صحیح مطلب بھی سمجھ لیا تھا کہ اب عرب میں محفوظ و مامون رہنے کے لئے حضرت محمدؐ کی خوشنودی حاصل کرنا لازمی امر تھا۔

عرب کے جنوبی کنارے پر واقع یمن کے علاقہ میں حضرت علی کرم کو بھیجا گیا تاکہ وہاں کے لوگوں کو اچھی طرح سمجھا دیں کہ وہ حضرت محمدؐ کو اور اُن کے لوگوں کو محض تاجر سمجھنا چھوڑ دیں۔ حضرت علی کرم کو اس سے پہلے کبھی اس قسم کے فرائض نہیں سونپے گئے تھے۔ آپ کو یہ کام بالکل پسند نہ آیا۔ آپ ایک قریش سے لے کر رومن تک ہر ایک سے لڑ سکتے تھے لیکن تبلیغ کرنے سے آپ کو خوف آتا تھا۔ حضرت محمدؐ نے آپنے عم زاد کو یقین دلایا کہ قدرت ان کا سینہ کھول دے گی اور آپؐ نے ایک ہاتھ ان کے منہ پر اور دوسرا سینے پر رکھ کر دعا کی۔

"یا اللہ ان کی زبان کو روانی عطا کر اور ان کی رہبری کر۔"

حضرت علی کرم کو مزید تقویت دلانے کے لئے آپؐ نے تین سو مسلح سواروں کا ایک رسالہ بھی ساتھ کر دیا تھا۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ حضرت علی کرم جتنے اچھے سپاہی تھے۔ اتنے ہی ناکام مبلغ ثابت ہوئے۔ یمن کے لوگوں نے آپ کی ہر بات کا مذاق اڑایا اور بعض نے تو آپ پر پتھر بھی پھینکے۔ لیکن جب اُنہوں نے تیر برسانے شروع کر دیئے تو آپ کو فیصلہ کرنا پڑا کہ گو وعظ و نصیحت میں تلوار سے زیادہ طاقت ہے لیکن ان طریقوں سے لوگوں کو مسلمان بنانا آپ کی افتادِ طبع کے خلاف تھا۔

لہ یہ مہم سریہ علی کرم ابن ابی طالب کہلاتی ہے۔ یمن کا ایک قبیلہ نخع تاحال اسلام سے برگشتہ تھا۔ انہیں تکبر تھا کہ ابھی تک تو یمن والے ہی حجاز پر چڑھائی کرتے رہے ہیں۔ وہ حجاز کی اطاعت کیوں کریں۔ چنانچہ حضرت علی کرم کو رمضان ۱۰ھ میں تین سو سواروں کے ساتھ یمن کے اس علاقہ میں بھیجا گیا لیکن واضح ہدایات کر دی گئیں کہ جب تک وہ خود حملہ نہ کریں ان سے لڑائی نہ کی جائے۔ ان لوگوں نے آپ کی دعوت کا مذاق اڑایا، پتھر پھینکے، تیر چلائے اور دو مرتبہ حملہ کیا۔ لیکن حضرت علی کرم کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور اطاعت کر کے اسلام لے آئے۔ یمن کے باقی قبائل ازخود اسلام لے آئے اور صدقات پیش کئے۔ بعد ازاں قبیلہ نخع کا ایک وفد رسول اکرم کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوا۔ یہ آخری وفد تھا جو آنحضورؐ کی خدمت میں مدینہ باریاب ہوا۔ حضرت علی کرم یمن سے واپسی پر سیدھے مکہ تشریف لے گئے اور آنحضورؐ کے ساتھ حجۃ الوداع میں شرکت کی۔ (حیات محمد) سیرۃ النبی میں اس قبیلہ کا نام مذحج لکھا ہے۔

چنانچہ چند ہی لمحوں میں سواروں کے نیزوں اور بھالوں نے وعظ و نصیحت کی جگہ لے لی۔ شام سے پہلے پہلے ان لوگوں کو متاسف ہونا پڑا کہ انہوں نے حضرت علیؓ کو کیوں نہ وعظ و نصیحت کرتے رہنے دیا۔ چنانچہ جب آپ واپس لوٹے تو آپ کے آگے آگے قیدی اونٹ اور بھیڑ بکریاں تھیں اور ساتھ ہی آپ نے حضرت محمدؐ کو یہ یقین بھی دلا دیا کہ یمن اب اسلامی سلطنت کا حصہ بن چکا تھا۔

ایک اور جنوبی ریاست حضر موت سے امراء اور سرداروں کی ایک سفارت[لہ] دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے آئی۔ اس سفارت کے آنے سے آپؐ کو اومان سے معاہدہ ہونے سے بھی زیادہ خوشی ہوئی۔ حضر موت کے لوگ ایک خوشحال اور مہذب قوم سے تعلق رکھتے تھے جو خلیج عدن کے پر عظمت ساحلی شہروں میں رہتی تھی۔ ان کے کئی کئی منزلہ اونچے مکانات غالباً موجودہ دور کی آسمان سے باتیں کرنے والی عمارتوں کے اب وجد یا پیشرو تھے اُس وقت کی طرح آج بھی اور اس سے صدیوں پہلے بھی ان شہروں کے مکانات کا طرز تعمیر عربی ہونے کی بجائے مستقبل کے نیویارک کی طرح کا تھا۔

حضر موت کے لوگ سیاحت و تجارت کے لئے مشہور تھے۔ حضرت محمدؐ کی توقع کے مطابق ان کے مسلمان ہو جانے کے سبب اسلام کو باہر کے ممالک میں پھیلنے کا موقع ملا۔ اور یہ ان بلند و بالا مکانات کے رہنے والے ہی تھے جو اسلام کو اپنے ساتھ ملایا جاوا۔ اور فلپائن کے جزائر میں لے گئے اور غالباً یہ بھی نادانستہ طور پر ان ہی کے سبب تھا کہ منڈاناؤ کے باشندے "مورو" کہلائے۔

لہ حضر موت کے علاقے کا ایک سردار وائل بن حجر کندی بھی اس وفد میں تھا۔ اسلام لے آیا اور آنحضورؐ نے اسے بدستور اس کی امارت پر سرفراز رکھا لیکن نخوت کا یہ عالم تھا کہ کسی کم درجہ آدمی سے بات کرنا گوارا نہ تھا۔ آنحضورؐ نے عزت افزائی کے لئے معاویہ بن ابو سفیان کو جو اس وقت کاتب وحی تھے۔ مشائعت کے لئے ساتھ کر دیا۔ معاویہ اس وقت برہنہ پا تھے۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ کندی نے نہ تو ان کو اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھایا اور نہ ہی انہیں جلتے ریت کی تپش سے بچنے کے لئے اپنی جوتیاں دینے کو تیار ہوا۔ زیادہ سے زیادہ یہ رعایت کی کہ وہ اس کے اونٹ کے سایے میں چل سکتے تھے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی مشائعت میں پیادہ پا چلنے والا شخص کچھ عرصے بعد سارے عرب کا حکمران ہوگا۔

(حیات محمدؐ)

ہسپانوی لوگ جنھوں نے جزائر فلپائن کو سب سے پہلے دنیا کے نقشہ پر متعارف کیا، ہر مسلمان کو "مور" یا مورو کہتے تھے۔ مورو لاطینی لفظ مورس MAURUS سے مشتق ہے۔ یعنی شمالی افریقہ کی مملکت موریطانیہ کا باشندہ۔ چنانچہ جب ہسپانیہ والوں نے دیکھا کہ یہاں کے لوگوں کا مذہب بھی بحیرہ روم کے ممالک کے مسلمانوں جیسا ہے تو یہ خیال کر کے یہ لوگ بھی ضرور اسی نسل سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ انہیں "مورو" کہنا شروع کر دیا۔

اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ شمال جنوب اور مشرق و مغرب سے قبیلے حکومتیں اور چھوٹی امارتیں اپنے نمائندے بھیجتی رہیں تاکہ صحرا کے اس گمنام شخص کے سامنے وفاداری کا حلف اٹھائیں۔ کسی کو اس امر میں کوئی تعجب نہ تھا کہ یہ شخص جو تجارت میں ایک سفری گماشتے کی حیثیت سے آگے نہ بڑھا، جو ذہنی طور پر بھی کسی غیر معمولی صلاحیت کا مالک نہ تھا اور جو آغاز میں کسی نمایاں کارکردگی کے سبب کسی اختیار و اقتدار کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا تھا، اتنا بلند مرتبہ حاصل کر لے گا۔ اس وقت بھی آج کی طرح اسے معمول کے مطابق ایک بات سمجھی گئی اور بلاشبہ رہتی دنیا تک اس کو ایسا ہی سمجھا جاتا رہے گا۔ بلکہ تبدریج اور زیادہ جذبے اور عقیدت کے ساتھ۔

کسی یہودی، بدھ یا عیسائی نے اپنی زندگی میں کبھی اپنے مذہب کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہی اس معجزانہ تیزی کے ساتھ بڑھتے اور پھیلتے نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی اور دینی پیشوا کو اپنی زندگی میں کبھی اتنی بڑی کامیابی نصیب ہوئی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اللہ تعالیٰ پر زور طریقہ پر یہ جتانا چاہتا تھا کہ حضرت محمدؐ اس کے نبیوں میں آخری نبیؐ تھے اور اسلام اس کے اتارے ہوئے ادیان میں آخری دین تھا۔ اس کے بعد سے اب تک برگھم ینگ[1] BRIGHSM YOUNGM کے علاوہ کسی اور شخص نے کوئی نیا مذہب پھیلانے کی کوشش نہیں کی۔ چند جھوٹے نبی عرب میں ضرور پیدا ہوئے لیکن ان کے پیروکاروں کی تعداد کوئی زیادہ نہ تھی اور ان کی حکومت

---

[1] برگھم ینگ (۱۸۰۱ تا ۱۸۷۷ء) ریاست یوٹا امریکہ کے ایک مذہبی فرقے LATTER DAY SAINTS کا پیشوا جس میں تعدد ازدواج عام تھی۔ ینگ کی وفات پر اس کی سترہ بیویاں تھیں۔ (پیر زانسائیکلوپیڈیا ۱۹۶۳ء)

اور ان کا اقتدار تھوڑی دیر ہی رہا۔

ان جھوٹے نبیوں میں سے مسیلمہ[1] کو خطابت میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس کے پر اثر خطبوں اور تقاریر نے، جنہیں وہ الہامی کہتا تھا، اس کے مقلد پیدا کر دیئے اور جب اس نے شعبدے دکھا کر لوگوں کو اپنے نبی ہونے کا فریب دیا تو پیروکاروں کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے اپنا ایک علیٰحدہ قرآن بھی لکھا جس میں کوئی کام کی بات نہ تھی لیکن لوگوں کو بیوقوف بنانے اور حیرت زدہ کر دینے کا ملکہ ضرور رکھتا تھا۔ چنانچہ ایک دن ترنگ میں آ کر اس نے حضرت محمدؐ کے پاس اپنے ایک سفیر کو ایک خط دے کر بھیجا جس میں لکھا تھا۔

"مسیلمہ[2]، اللہ کے نبی کی طرف سے محمدؐ الرسول اللہ کے نام۔

"آیئے کیوں نہ ہم عرب کی دنیا کو آپس میں تقسیم کر لیں۔ نصف آپؐ کی اور نصف میری۔"

حضرت محمدؐ کا جواب[3] مختصر اور واضح تھا۔

محمدؐ الرسول اللہ کی طرف سے مسیلمہ کذّاب کے نام۔

"زمین خدا کی ہے۔ وہ اسے اپنے ایسے بندوں کو بخشتا ہے جن کو دینا چاہتا ہے۔"

اس جواب کے ساتھ ہی آپؐ نے اس معاملے کو اپنی طرف سے ختم کر دیا۔ البتہ مسیلمہ اب

---

[1] مسیلمہ کذّاب:۔ رسولؐ اللہ کے آخری زمانے میں بنو حنیفہ کے اس سردار نے نبوت کا دعویٰ کیا لیکن ساتھ ہی آنحضورؐ کو بھی نبی مانتا تھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد طاقت حاصل کر لی۔ اس نے اپنا ایک قرآن لکھا اپنے پیروؤں کو نماز معاف کر دی۔ شراب حلال کر دی اور اسی قسم کی اور فسق و فجور کی باتیں پھیلائیں۔ (طبری)
حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں حضرت خالدؓ بن ولید نے ایک خونریز لڑائی کے بعد اس کو شکست دی اور مسیلمہ اسی وحشی کے ہاتھوں مارا گیا جس نے اُحد میں حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا۔
مسیلمہ کا اصل نام مسلمہ بن حبیب تھا لیکن جب اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تو مسلمانوں نے تحقیر کے طور پر اس کو مسیلمہ کذّاب کہنا شروع کر دیا۔ عربی میں نام کے درمیان میں "ی" کے اضافے سے تحقیر پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی طرح سے طلحہ بن خویلد ایک اور مدعی نبوت کو طلیحہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (مترجم)

[2-3] خط کا مضمون اور اس کا جواب حیات محمدؐ (مترجمہ محمد وارث کامل) میں اسی طرح دیا گیا ہے۔

بھی ناامید نہ ہوا۔ اپنی دعوت جاری رکھی اور مقلدین میں اضافہ ہوتا رہا۔ آخر کار وہ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ کے لیے مصیبت بن گیا اور انہیں خالدؓ بن ولید کی سرکردگی میں اس کے خلاف ایک فوج بھیجنا پڑی۔ ایک سخت معرکے کے بعد مسیلمہ کو شکست ہو گئی اور وہ خود وحشیؓ[1] کے ہاتھوں، جو اب پکا مسلمان بن چکا تھا۔ اسی نیزے سے مارا گیا جس سے اس نے جنگ اُحد میں حضرت حمزہؓ کے جسم کو چھید کر انہیں شہید کر دیا تھا۔

جہاں تک رقابت اور نبی ہونے کے دعوے کا تعلق تھا یہ ناقابل ذکر واقعہ ہی سب سے زیادہ اہم تھا۔ آنے والی سات صدیوں میں مسلمانوں ہی کو فاتح اور غالب ہونا تھا اور اسلام کو ایسے ممالک میں لے جانا تھا جن کا نام تک بھی اس کے بانی (حضرت محمد صلعم) نے نہیں سنا تھا۔

اب تقاضائے عمری کے سبب حضرت محمدؐ نے تھکاوٹ محسوس کرنا شروع کر دی تھی۔ اپنی وفات کے قرب کا تو شاید آپؐ کو صحیح طور پر کوئی اندازہ نہ ہو لیکن آپؐ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ موت آپؐ کو اچانک آ لے۔ چنانچہ آپؐ نے بڑے تزک و احتشام سے حج کے لئے مکہ جانے کی تیاری کی۔ یہ حج "حج اکبر" اور "حج مفصل" ہونا تھا۔ اتنا بڑا کہ ہجرت کے بعد ایسا حج کبھی نہیں ادا کیا گیا تھا۔

مارچ[2] ۶۳۲ء کے شروع میں آپؐ نے سفید بے سلا حج کا لباس (احرام) پہنا اور لوگوں کو حج میں ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ چالیس ہزار افراد جمع ہو گئے۔ آپؐ کی نواز داج

---

[1] وحشی۔ ہند کا غلام جس نے جنگِ اُحد میں چھپ کر حضرت حمزہؓ کو برچھے سے شہید کر دیا تھا۔

[2] آنحضورؐ ۲۵ ذی قعد ۱۰ھ کو حج کے لئے روانہ ہوئے۔ بعض نے آپؐ کے ہمراہ حجاج کی تعداد ۹۰ ہزار اور بعض نے ایک لاکھ چودہ ہزار لکھی ہے۔ رسول اللہؐ نے ذوالحلیفہ پہنچ کر رات قیام کیا۔ اور دوسری صبح وہاں سے احرام باندھا اور حج کی نیت کر کے آگے روانہ ہوئے۔ ۴ ذی الحجہ کو یہ قافلہ مکہ جا پہنچا۔ (حیات محمد)

مطہرات بھی جو تاحال موجود تھیں اونٹوں پر کسے ہودجوں میں سوار ہمراہ تھیں۔ حضرت علی کرم کے سوا، جو اس وقت ایک مشن پر یمن[1] گئے ہوئے تھے۔ قدیم جاں نثاروں کا ہر فرد ہمرکاب تھا اور خود حضرت علی کرم بھی حج میں شرکت کے لئے وقت پر مکہ پہنچ گئے۔

اس بڑے قافلے نے صحرا کو چھوٹی چھوٹی منزلیں کر کے طے کیا۔ اب ہراول دستے آگے بھیجنے یا اسلحہ لے جانے کی ضرورت نہ تھی۔ چاروں طرف سینکڑوں میل تک کا علاقہ خالصتاً اسلامی تھا۔ جہاں پر کبھی خانہ بدوش لوگ پڑاؤ کرتے تھے وہاں اب مسجدیں[2] تعمیر ہو گئی تھیں۔ قافلے کے قریب سے جو چند چرواہے گزرتے وہ مسلمان ہی ہو سکتے تھے۔ کامیابی کی یہ معراج محنت اور بڑی ہمت سے ہی حاصل ہوئی تھی۔ ضعیفی کا اس وقت آپؐ پر کوئی اثر نہ تھا اور القصوہ بھی جو نو سال پہلے آپؐ کو ہجرت کے وقت مدینہ لائی تھی، خراماں خراماں چلی جا رہی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو کردار اس نے اس صحرا کے ڈرامے میں ادا کیا تھا وہ اسے خوب سمجھتی تھی۔

دسویں روز آپؐ سرف پہنچ گئے۔ جو مکہ سے باہر چند میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں حاجیوں نے غسل اور آرام کیا۔ دوسری صبح یہ جلوس ان خشک پہاڑیوں کی چٹانی ڈھلوانوں کے درمیان سے چکر کاٹتا ہوا روانہ ہوا، جو مقدس شہر کو احاطہ کئے ہوئے ہیں، اور جب سورج کی پہلی کرنیں کعبہ پر پڑیں تو حضرت محمدؐ باب بنی شیبہ سے گزرے، جس سے ہو کر آپؐ فاتح کی حیثیت سے پچھلی مرتبہ شہر میں داخل ہوئے تھے۔ جونہی کعبہ نظر کے سامنے آیا۔ آپؐ نے ہاتھ اٹھائے اور بلند آواز سے کہا۔

اے[3] اللہ۔ اس مقدس گھر کے مرتبے، شرف اور عظمت و بزرگی میں

---

[1] یہ وہی مہم ہے جو حضرت علی مرتضیٰ کی سرگردگی میں قبیلہ نخع کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے یمن بھیجی گئی تھی۔ اس مہم سے فارغ ہو کر جناب امیر سیدھے مکہ پہنچے اور آنحضورؐ کے ساتھ حج میں شریک ہو گئے

[2] فتح مکہ کے وقت آپ نے جن منازل میں نماز ادا کی تھی وہاں برکت کے خیال سے لوگوں نے مساجد بنائی تھیں (سیرۃ النبی۔ جلد دوم)

[3] زدہا اللہ شرفاً و تعظیماً ۵ ..... (طبقات ابن سعد۔ جزو ثانی)

اور زیادہ اضافہ کر۔ اور حج وعمرہ کرنے والوں کی عزت، مرتبے پارسائی اور نیکی میں اضافہ کر۔"

پیدل طواف نہ کر سکنے کے سبب آپؐ نے القصوہ پر سوار ہو کر کعبہ کے گرد سات دفعہ طواف کیا۔

بعد کے دنوں میں آپؐ نے حج کے وہ مناسک ادا کئے جو اس وقت سے انہی طریقوں سے ادا کئے جاتے رہے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جب بعض مجبوریوں کے سبب جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، حضرت محمدؐ نے بعض ارکان جلدی میں پورے کئے تو یہ تیزی اور عجلت ذہنوں میں محفوظ کر لی گئی[1] اور وہ ارکان آج تک اسی تیزی اور عجلت سے ادا کئے جاتے ہیں۔ حج کی ادائیگی کا طریقہ کہیں لکھا ہوا اور مقرر نہیں ہے۔ بس جو لوگ اس روز وہاں موجود تھے، انہوں نے آپؐ کے طریقہ ادائیگی کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا اور سینہ بہ سینہ دوسروں تک پہنچا دیا۔ چنانچہ جب ۱۸۵۳ء میں سر رچرڈ برٹن[2] کمال چالاکی سے غیر مسلموں کی مکہ جانے پر پابندی کو ختم کرنے اور حج کے ایام میں وہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو اس نے کم وبیش وہ ہی مناسک ادا کئے جو حضرت محمدؐ نے ۶۳۲ء میں ادا کئے تھے۔ بشمول ان تیز رویوں کے۔

---

[1] یہ مصنف کا اپنا خیال ہے۔

[2] سر رچرڈ برٹن RICHARD BURTON (۱۸۲۱ء تا ۱۸۹۰ء) ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک انگریز افسر جو صوبہ سندھ میں تعینات رہا۔ بعد ازاں ۱۸۵۳ء میں کمپنی کی طرف سے عرب کے مشرقی علاقے ربع الخالی کے حالات دریافت کرنے کی مہم پر روانہ ہوا۔ ایک عرب حاجی کے بھیس میں اور ایک فرضی نام سے اسکندریہ کی بندرگاہ پر اترا۔ مسلمانوں کے عادات و اطوار اور حج کے مناسک سیکھے اور اسی نام سے حاجیوں میں شامل ہو کر مکہ پہنچ کر حج کے مناسک ادا کئے اور وہاں کے حالات کا جائزہ لیا۔ بعد میں مدینہ بھی گیا ان واقعات کو اس نے اپنی ایک کتاب A PILGRIMAGE TO MECCA AND MEDINA میں لکھا ہے۔ بعد میں اس نے وسطی افریقہ کی سیاحت اور الف لیلہ کے انگریزی ترجمے کے سبب مزید شہرت حاصل کی۔ (مترجم)

حج کی ابتدائی رسومات کی ادائیگی کے لئے حاجیوں کو مکہ سے منیٰ[1] جانا پڑا۔ یہاں معمول کے مطابق حجاج نے عبادات کیں۔ اور رات کو وہاں پر ہی خیموں میں قیام کیا۔ دوسری صبح کو یہ جلوس، جس میں اب مکہ والوں کا بھی بڑا اضافہ ہو گیا تھا، عرفات گیا۔ جو مکہ سے تقریباً دس میل دور ہے۔

عرفات وہ جگہ ہے۔ جہاں روایت کے مطابق جنت سے نکالے جانے پر اور عرصہ تک جدا رہنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا ایک دوسرے سے دوبارہ ملے۔ عرفات کو صحیح معنوں میں پہاڑ نہیں کہنا چاہئے۔ بلکہ دوسری پہاڑیوں کے درمیان کنکریلے فرش پر دو سو فٹ اونچی سنگ خارا کی ایک عظیم الجثہ چٹان ابھر آئی ہے لیکن یہ کوئی عمودی چٹان نہیں ہے کیونکہ آپؐ کی اونٹنی القصوہ آنحضرت کو اس کی چوٹی پر لے گئی۔ اس بلند مقام سے آپؐ نے لوگوں کے منتظر ہجوم کو آگاہ کیا کہ عرفات اور اس کی وادی حج کے مقدس مقامات میں سے ہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے رسوماتی دعائیں پڑھیں اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر ختم کیں :۔

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا"[2]

"آج سے میں نے تمہارے واسطے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔ تم پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔"

حج کے اس مرحلے پر توقع سے زیادہ دیر لگ گئی اور دوسری منزل (مزدلفہ) تک پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ نتیجے کے طور پر حضرت محمدؐ کو عصر اور مغرب[3] کی نمازیں

---

[1] یہ مقام منیٰ کی طرف اشارہ ہے جو مکہ سے چند میل دور پہاڑیوں میں ہے۔ حاجی صاحبان حج کے ایام میں سب سے پہلے یہاں ہی قیام کرتے ہیں۔ پھر عرفات جاتے ہیں۔

[2] یہ مشہور آیت حجۃ الوداع کے خطبہ کے دوران نازل ہوئی۔ (سیرۃ النبی بحوالہ صحیح بخاری و صحیح مسلم)

[3] حقیقت یہ ہے کہ عرفات میں ظہر اور عصر کی نمازیں یکے بعد دیگرے دو اقامتوں کے ساتھ پڑھتے ہیں مغرب کے وقت عرفات سے روانگی ہوتی ہے، اس لئے مغرب وہاں نہیں پڑھتے بلکہ مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشاء کی نمازیں یکے بعد دیگرے پڑھی جاتی ہیں۔

جلدی جلدی اکھٹی پڑھنا پڑیں۔ آپؐ کو یہ بتانے کا خیال نہ رہا کہ حالات کے سبب آپؐ کو ایسا کرنا پڑا[1] اور نہ کافی وقت ہونے میں ایسا کرنے کی ضرورت نہ تھی حاجیوں نے اس تیزی اور جلدی کو بھی روحانی اشارے پر محمول کیا۔ چنانچہ بارہ سو سال بعد سر رچرڈ برٹن کو اس غیر منطقی رسم پر نکتہ چینی کرنے کا موقعہ مل گیا۔

دوسری صبح کو ہزارہا حاجیوں نے حضرت محمدؐ کے پیچھے مزدلفہ میں فجر کی نماز پڑھی۔ پھر وہاں سے یہ قافلہ منیٰ کو لوٹا۔ چلتے ہوئے آپؐ بلند آواز سے یہ تلبیہ کہتے جاتے تھے۔

"لَبَّیْکَ ۔ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ ۔ لَاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ ۔ اِنَّ الْحَمْدَ وَ النِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْكَ ۔ لَاشَرِیْکَ لَکَ ٥"

منیٰ پہنچ کر حضرت محمدؐ اور ان کے حاجیوں نے ایک ابھری ہوئی چٹان پر کنکریاں ماریں جسے شیطان[2] یا جمرہ کہتے ہیں۔ روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کو یہاں پر شیطان نے روک کر بہکایا تھا اور آپ نے اسے پتھر مار کر بھگایا تھا۔ کنکریاں مارنے سے فارغ ہو کر قربانی کے لئے لائے ہوئے اونٹ نحر کئے گئے۔ یہاں تک کہ وادی میں خون بہ نکلا۔ حج کی رسومات سر اور چہرے کا کچھ حصہ منڈانے اور ناخن ترشوانے پر ختم ہو گئیں۔ سر کے اترے ہوئے بال اور ناخنوں کو زمین میں دفن کرنے کا حکم دیا گیا۔ خیال غالب ہے کہ حضرت محمدؐ کے بال اور ناخن محفوظ کر لئے گئے ہوں گے۔ آج دنیا میں بہت سی ایسی مساجد ہیں جہاں حضرت محمدؐ کی صریح ہدایات کے خلاف ایک دو بال محفوظ رکھے ہوئے ہیں اور ان کی بڑی عزت و تکریم کی جاتی ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ بال وہی ہوں گے جو حج یا عمرے

---

[1] یہ مصنف کا قیاس ہے۔ اللہ کے نبی کا کوئی عمل جلد بازی میں نہیں ہوا۔ ہر اقدام کے پیچھے کوئی حکمت تھی۔

[2] جمرے یا شیطان تین ہیں۔ جمرہ عقبیٰ (مکہ کی طرف سب سے بڑا جمرہ) جمرہ وسطیٰ اور منیٰ کی جانب جمرہ صغریٰ۔ جمروں کے درمیان کوئی سو دو سو قدم کا فاصلہ ہے۔ کنکریاں مارنے کی رسم کو رمی جمار کہتے ہیں۔

کے مواقع پر آپؐ کے سر سے اترے[1] ہوں گے۔

ان تمام مقدس رسومات کی ادائیگی کے بعد حاجیوں کو احرام اتار کر اپنے عام لباس پہننے کی اجازت دے دی گئی۔ پھر حضرت علیؓ نے اعلان کیا کہ اب لوگ کھانا کھائیں اور آرام کریں۔ قربانی کا گوشت تقسیم کیا گیا۔ دو روز تک کے لئے ہر شخص سب کچھ بھول کر پچھلے دو ہفتوں کی پابندیوں اور امتناعات کے باعث کمی کو پورا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ تیسرے روز حضرت محمدؐ اونٹ پر سوار ہوئے اور وادی منیٰ کے وسط میں ایک مناسب مقام پر کھڑے ہو کر الوداعی خطبہ[2] دیا۔

"لوگو! میری بات سنو! کیونکہ میں نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ سال میں تم لوگوں کے درمیان یہاں پر ہوں گا یا نہیں۔"

---

[1] آپؐ کے صحابی پروانہ وار آپؐ کے گرد جمع رہتے تھے اور آپؐ کی ہر شے کے والا و شیدا تھے۔ مثلاً آپؐ کے وضو کا پانی۔ حج اور عمرے کے وقت آپؐ کے سر سے اترے بالوں کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ ابن سعد نے طبقات میں حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے حجۃ الوداع میں اپنا سر منڈایا تو حالت یہ تھی کہ حجام آپؐ کا سر مونڈ رہا تھا اور اصحاب آپؐ کے گرداگرد گھوم رہے تھے اور کوئی بال زمین میں نہ گرنے دیتے تھے۔

[2] حجۃ الوداع کے خطبہ کے مقام کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ حضرت جابرؓ اور حضرت عباسؓ کی ایک روایت میں یہ خطبہ عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو دیا گیا اور حضرت ابی بکرؓ اور حضرت ابن عباسؓ دوسری روایتوں میں یوم النحر (منیٰ) ۱۰ ذی الحجہ بتاتے ہیں۔ بعض روایتیں ایام التشریق (یعنی ۱۱-۱۳ ذی الحجہ) کے خطبہ کی بھی ہیں۔ بہر حال صحاح ستہ اور مسانید کی تمام روایات کو یکجا کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے اس حج میں تین دفعہ خطبہ دیا یعنی ۹ ذی الحجہ کو عرفات میں، ۱۰ ذی الحجہ یوم النحر کو منیٰ میں اور تیسرا خطبہ ایام التشریق میں ۱۱ یا ۱۲ ذی الحجہ کو (منیٰ میں) ان خطبوں میں بعض باتیں مشترک ہیں اور بعض مختص المقام۔ چونکہ مجمع بہت زیادہ تھا (کم و بیش ایک لاکھ مسلمان شریک حج تھے۔) اور پیغام نہایت اہم تھا۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ آنحضورؐ نے اپنی تقریر کے بعض فقرے بعد کے خطبوں میں دہرائے ہوں۔ خطبہ کے تمام جملے کسی حدیث میں یکجا نہیں ملتے۔ اصل یہ ہے کہ خطبہ بہت طویل تھا جس شخص کو جو فقرہ یاد رہ گیا اس نے اسی کی ہدایت کر دی البتہ ابن اسحٰق نے ان کو مسلسل خطبہ کے طور پر نقل کیا ہے۔

(سیرۃ النبی۔ جلد دوم)

"تمہاری جانیں اور تمہارے مال ایک دوسرے پر قیامت تک کے لئے اسی طرح حرام کر دیئے گئے ہیں جس طرح یہ دن اور یہ مہینہ سب کے لئے محترم ہے۔ اور یاد رکھو کہ تم سب کو ایک دن اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے جو تمہارے اعمال کا محاسبہ کرے گا"۔ ۔ ۔ ۔

"ایفائے عہد کرو اور گناہوں سے بچو!"

"لوگو! تمہارے حقوق تمہاری عورتوں پر ہیں اور اسی طرح تمہاری عورتوں کو تمہارے اوپر حقوق ہیں۔ اپنی بیویوں کے ساتھ مہربانی اور محبت کا سلوک کرو۔ کیونکہ اللہ کو ضامن بنا کر ہی تم نے ان کو اپنی بیوی بنایا ہے اور اسی کے احکام کے ساتھ ہی ان کو اپنے لئے حلال کیا ہے"۔۔

"سود حرام کر دیا گیا ہے۔ قرض دار صرف اصل رقم واپس کرے گا اور اس کا آغاز میرے چچا العباسؓ بن عبدالمطلب کے قرضوں سے ہوگا"۔

"آج کے بعد سے جاہلیت کے زمانے کے تمام خون (یعنی انتقام) ختم کئے جاتے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے عزیز ابن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا خون معاف کرتا ہوں"۔

"اور تمہارے غلام۔ ان کو وہی کھلاؤ جو خود کھاؤ اور وہی کپڑا پہننے کو دو جو خود پہنتے ہو۔ اور اگر ان میں سے کوئی ایسا قصور کرے جسے تم معاف کرنے کو تیار نہ ہو تو بہتر ہے کہ ان کو علیحدہ کر دو کیونکہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور ان سے سختی کا سلوک روا نہیں"۔ ۔ ۔ ۔

"اے لوگو! میری بات سنو اور اس کو اچھی طرح سمجھ لو۔ جان لو کہ

ل عباد سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ عرفہ پر کھڑے خطبہ دے رہے تھے تو ربیعہ بن امیہ بن خلف آپؐ کے جملوں کو بلند آواز سے دہراتے جاتے تھے۔ آپؐ ایک جملہ مکمل کرکے ٹھہر جاتے اور جب وہ دہرا لیا جاتا تو آگے بڑھتے۔ (طبری) (حیاۃ محمدؐ)

تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور تم سب آپس میں بھائی بھائی ہو جس چیز کا ایک بھائی مالک ہے دوسرے بھائی کا اس پر کوئی حق نہیں جب تک کہ وہ اُسے خوشی سے نہ دے۔ ناانصافی اور ظلم سے بچو۔"

پھر آپؐ نے اور بلند آواز سے کہا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ یہ کون سا مہینہ ہے؟ یہ کون سی سرزمین ہے؟ اور آج کیا دن ہے؟"

لوگوں نے جواب دیا "یہ حرمت کا مہینہ ہے۔ یہ ارضِ پاک ہے اور آج حج اکبر کا دن ہے۔"

ان کے ہر جواب پر آپؐ نے اضافہ کیا۔

"اللہ تعالیٰ نے بالکل اسی طرح تمہاری جان و مال بھی ایک دوسرے کے لئے قیامت تک کے لئے حرام کر دیئے ہیں۔"

"جو لوگ یہاں موجود ہیں انہیں چاہیئے کہ یہ باتیں ان تک پہنچا دیں جو یہاں نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو یہ باتیں بتائی جائیں وہ ان کو اُن لوگوں سے زیادہ بہتر طور پر یاد رکھیں۔ جنھوں نے یہاں پر ان کو سنا ہے۔"

یہ کہہ کر آپؐ نے کچھ توقف کیا۔ اس دور میں لوگ خاموش اور متوجہ رہے۔ پھر آپؐ نے مہینوں کی اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ ترتیب کے خلاف تیسرے[1] سال مہینوں میں ادل بدل یا اضافہ کر دینے کے طریقے کو ختم کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں

---

[1] زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ جب جی چاہتا اپنے مناسب حال حرمت والے مہینہ کو حلال اور حلال کو حرام کر لیتے۔ مثلاً رجب کا یا کوئی اور حرمت والا مہینہ آگے پیچھے کر لیتے۔ اس طرح کبھی خود کو جنگ کرنے سے بچا لیتے۔ کبھی حرام مہینہ کو بدل کر اس میں جنگ کر ڈالتے اور اس طرح مہینوں کی ترتیب میں ادل بدل کر لیتے جو اللہ کے احکام کے خلاف تھا۔ (حیاۃ محمدؐ)

کا سال قمری ہوگا۔ اس طریقے کے مطابق مسلمانوں کے تیوہار مختلف موسموں میں آتے رہتے ہیں۔ یہ طے کرنے کے بعد آپؐ نے اپنا خطبہ ان الفاظ پر ختم کیا۔

"آج کے دن زمانے نے اپنا ایک چکر پورا کر لیا ہے اور پھر پھرا کے اسی گھڑی پر واپس آگیا ہے جب اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین بنائے۔ اے لوگو! شیطان اس زمین میں اپنی پرستش سے ہمیشہ کے لئے ناامید ہو گیا ہے۔ لیکن تمہارے جو اور اعمال ہیں، جن کو تم معمولی سمجھتے ہو اگر ان کی ادائیگی میں سستی کروگے تو وہ تم کو بہکا سکتا ہے۔ اور اس کے لئے یہ عین خوشی ہوگی۔ اس لئے اس سے خبردار رہو۔"

"یقینی طور پر میں نے اللہ کے احکامات تمہیں پہنچا کر اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ میں تمہارے درمیان بڑے سیدھے اور صاف احکامات یعنی اللہ کی کتاب (قرآن) اور واضح ہدایات (سنت رسولؐ) چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم اس کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔"

ایک مرتبہ پھر آپؐ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے اور پھر اضطراری طور پر اور زیادہ جوش کے ساتھ آپؐ نے بلند آواز سے کہا:۔

"اے اللہ میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا اور اپنا مشن پورا کر دیا ہے۔"

اس پر ہزارہا حاجیوں نے بیک آواز جواب دیا۔

"بے شک۔ بے شک۔ آپؐ نے ایسا کر دیا ہے۔"

حضرت محمدؐ نے پھر ایک مرتبہ بلند آواز سے دہرایا "یا اللہ تو گواہ[۱] رہ کہ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔"

---

[۱] "اللّٰھم اشھد"۔ خطبہ کے مندرجہ بالا اقتباسات "حیات محمدؐ" اور "تاریخ طبری (جلد اول حصہ سوم) میں دی ہوئی تفصیلات سے مطابقت کرتے ہیں۔ یہ صرف چیدہ چیدہ احکامات ہیں۔ سارا خطبہ بہت طویل ہے۔

اس کے بعد حاجیوں کا مجمع منتشر ہو گیا اور خاموشی سے پتھریلی گھاٹیوں سے ہو کر مکّہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ جو یہاں سے پانچ میل تھا۔ حضرت محمدؐ کچھ دیر کے لئے آرام اور عبادت کے لئے ٹھہر گئے۔ پھر اپنے عملے اور ازواج کے ساتھ آپؐ بھی مکّہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

کعبۃ اللہ پہنچ کر آپؐ سیدھے چاہ زمزم پر گئے اور ایک پیالہ پانی پیا۔ پھر کعبہ کے اندر تشریف لے گئے۔ جہاں آپؐ نے تھوڑی دیر عبادت کی۔ بغیر روشن دان کے اس گھر میں گرمی تھی۔ چنانچہ حضرت محمدؐ پیاس کے سبب باہر آ گئے۔ آپؐ پہلے کھلے دروازے پر آ کر رک گئے اور پینے کے لئے پانی مانگا۔ کعبہ کے محافظ کے پاس جو کچھ اس وقت موجود تھا، وہ ایسا پانی تھا، جس میں حاجیوں کو تقسیم کرنے کے لئے کشمش اور کھجور دھوئی گئی تھیں۔ حضرت عباسؓ کے صاحبزادے الفضلؓ نے آپؐ سے درخواست کی کہ ان کے مکان پر تشریف لے چلیں جہاں کافی تازہ پانی اور دودھ موجود تھا۔ لیکن حضرت محمدؐ پیاس کی شدت کے سبب انتظار نہ کر سکتے تھے اور کھجوروں کے چورے سے گدلایا ہوا پانی پی لیا۔ کچھ حاجی یہ دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ آج تک بہت سے حاجی اس ملغوبے کا ایک پیالہ پینا حج کے ارکان میں شمار کرتے ہیں۔

مدینے سے آئے ہوئے لوگوں کو واپسی سے پہلے تھکاوٹ دور کرنے کے لئے تین دن دیئے گئے۔ ماحول بہت خوشگوار تھا۔ اور پچھلی مرتبہ یہاں آنے کے حالات سے بہت مختلف تھا۔ رشتہ دار آپس میں ایک دوسرے سے ملے، دوستوں نے دوستوں کو پہچانا۔ اب کسی کو کپڑوں کے نیچے چھپی تلواروں کا خطرہ نہ تھا۔ ضیافتیں ہوئیں اور حضرت محمدؐ کی قائم کی ہوئی اخوت پر عمل کیا گیا۔ گو اس ماحول میں وہ چہل پہل تو نہ تھی جو ابی لہب اور ابو جہل کے زمانے میں ہوتی تھی لیکن اس میں زیادہ خلوص تھا۔

حضرت محمدؐ خوش تھے اور بڑا اطمینان محسوس کر رہے تھے۔ آپؐ نے حج کی تکمیل کر دی تھی اور ایسی رسومات مقرر فرما دیں جو آپؐ جانتے تھے کہ ہمیشہ جاری رہیں گی۔ آپؐ حج کے تمام مناسک ادا کر چکے تھے لیکن اس سے پہلے کہ آپؐ پوری طرح مطمئن ہو کر مدینہ

واپس جائیں آپؐ کو اپنی ایک ذاتی رسم بھی ادا کرنی تھی۔

عشاء کی نماز کے بعد آپؐ لوگوں کے اُس ہجوم میں سے خاموشی سے علیحدہ ہو گئے جو کعبہ کے چوک کے باہر نکل کر منتشر ہو رہا تھا۔ خچر پر سوار ہو کر مکہ سے باہر شمال کی جانب جانے والی سڑک پر ہو لئے۔ چند لمحوں میں آپؐ مکہ مکرمہ کی ان تنگ گلیوں میں سے گزر کر آگے چلے گئے جہاں قہقہے گونج رہے تھے اور ضیافتیں اُڑ رہی تھیں۔ آپؐ اس ناہموار راستے سے بھی گزر گئے جس سے آپؐ ایک جوان سفری گماشتے کی حیثیت سے تجارتی مہمات سے واپسی پر بارہا گذر چکے تھے۔ جلدی ہی آپؐ کھلے میدان میں آ گئے۔ اب یہاں آپؐ کو جنگلی جھاڑیوں کے درمیان ہوا کی سائیں سائیں کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد آپؐ نے اپنے خچر کی باگ مغرب کی جانب موڑ لی۔ چند گز چلنے پر آپ دو کھردرے پتھروں کے پاس پہنچ گئے۔ جو ایک قبر کے سرہانے اور پائینتی کے نشان کے طور پر لگے ہوئے تھے۔ چند لمحے آپؐ نے توقف کیا اور قبر کی طرف دیکھا۔ پھر آپؐ اور آگے بڑھ گئے۔ حضرت ابو طالب اسلام قبول کئے بغیر ہی فوت ہو گئے تھے اس لئے اُن کا بھتیجا اُن کے لئے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ ان کو بڑے تشکر آمیز خیالات سے یاد کرے۔ اور اُن کے احسانات اور مہربانیوں کو نہ بھلائے۔

اب زمین اور زیادہ پتھریلی ہوتی جا رہی تھی۔ حقیقت میں یہاں پر کوئی راستہ نہ تھا۔ اندھیرے میں خچر ٹھوکریں کھاتا چل رہا تھا۔ تقریباً دو فرلانگ تک حضرت محمدؐ[1] اسے پتھروں اور جھاڑیوں میں چلاتے رہے۔ یہاں تک کہ آپؐ ایک قبر پر پہنچے جو حضرت ابو طالب کی قبر سے زیادہ بہتر نہ تھی۔ اس پر تین ناتراشیدہ پتھر نشان کے طور پر لگے ہوئے تھے۔ ایک سرہانے ایک پائینتی اور ایک درمیان میں۔ حضرت محمدؐ خچر سے اتر آئے اور قبر کے بازو میں بیٹھ گئے۔

---

[1] حضرات ابو طالب، عبدالمطلب اور عبد مناف کی قبریں جنت المعلاء کے بالائی حصہ میں ایک دوسرے سے قریب تا حال موجود ہیں۔ ان قبور سے تقریباً ایک فرلانگ نیچے وسطی حصہ میں دیوار کے ساتھ خاتون جنت اُم المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی کی قبر ہے جو درمیان سے بیٹھی ہوئی ہے۔ سرہانے نشان کا پتھر ہے۔ درمیان میں کوئی پتھر نہیں۔ قبر کافی قدیم اور اصل معلوم ہوتی ہے۔ سعودی عقائد کی بنا پر ان قبور کی کوئی مرمت وغیرہ نہیں ہوتی۔ حضرت خدیجہؓ کے بازو میں ساتھ ہی چھوٹی سی قبر آپؐ کے صاحبزادے حضرت قاسم کی ہے۔

اس سخت اور بنجر زمین کے نیچے آپؐ کی محبوب زوجہ حضرت خدیجہؓ مدفون تھیں۔ آپؐ پر سب سے پہلے ایمان لانے والی اور ایسی خاتون جنہیں آپؐ نے دل سے چاہا تھا۔

خاموشی سے آپؐ نے دعائیں پڑھیں۔ پھر آپؐ نے اپنی عبا اپنے گرد لپیٹ لی اور بے حس و حرکت ہو کر مراقبے میں چلے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپؐ اپنی زندگی کے مختلف دور اپنے سامنے تیزی سے گزرتے دیکھ رہے تھے۔ آپ کا بچپن جو صحرا نشینوں میں گزرا۔ آپؐ کا لڑکپن اور جوانی جو حضرت عبدالمطلب اور حضرت ابوطالب کے سایہ عاطفت میں گزرے۔ آپؐ کے پہلے دلچسپ سفر جو غیر ممالک میں ہوئے۔ آپؐ کی پہلی پہلی معلومات کہ صحرا کے علاوہ دوسری قسم کی سرزمینیں بھی دنیا میں ہیں اور یہ کہ ان قریش کے علاوہ اور قومیں بھی بستی ہیں۔ پھر وہ نہ بھلائے جانے والے دن جب حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو بلایا اور پھر اپنے کاروانوں اور پھر اپنے سارے تجارتی ادارے کا مہتمم بنا دیا۔ درحقیقت یہاں آپؐ کی بے فکری کی زندگی ختم ہو گئی تھی کیونکہ اس کے بعد تو شادی ہو جانے اور فارغ البالی اور فرصت میسر آجانے کے سبب آپؐ کو وہ خیالات پریشان کرنے لگے جو تجارتی مہمات کے دوران آپؐ کے ذہن میں جمع ہوتے رہتے تھے۔ اور آپؐ ان میں گم رہنے لگے۔ اور پھر آہستہ آہستہ ہر چیز بدل گئی۔

پھر آپؐ کے سامنے غارِ حرا کی تصویر ابھر آئی اور آپؐ نے حضرت جبرائیل کے خوف پیدا کرنے والے الفاظ سنے۔ پھر دیکھا کہ حضرت خدیجہؓ آپؐ کو تسلی دے رہی ہیں۔ پھر ورقہ کی باتیں سنیں۔ پھر علیؓ۔ ابوبکرؓ اور زیدؓ آپؐ پر ایمان لائے۔ پھر مکہ والوں کا تمسخر برداشت کیا اور ہتک آمیز باتیں سنیں۔ اس کے بعد آپؐ کو مار ڈالنے کی دھمکیاں دی گئیں اور آخرکار آپؐ کو جان بچا کر ہجرت کرنا پڑی۔ پھر مدینے کی تصویریں سامنے آگئیں اور ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئیں۔ یعنی مدینہ کی پہلی مسجد، آپؐ کا پہلا گھر، بدر، اُحد، خندق اور خیبر کی جنگیں، پھر آپؐ کی جمعیت میں اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ پھر مکہ آپؐ کے سامنے آگیا۔

جب تاریکی میں آپؐ کی اس حیران کن کامیابی کا نقشہ اُبھرا تو آپؐ نے آنکھیں بند کر لیں اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر یہ احسان کیا اور جو کچھ آپ کے لوگوں کے لئے کیا اس پر آپؐ جذبات

سے مغلوب ہو گئے اور آپ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ آپؐ مستقبل میں دیکھ رہے ہیں اور ہر جگہ کامیابی آپؐ کے قدم چومتی نظر آئی۔ آپؐ نے دیکھا کہ روشنی کی زبردست شعاعوں کی طرح مسلمان ہر رُکاوٹ کو پامال کرتے ہوئے شمال اور جنوب اور مشرق و مغرب کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان میں آپؐ نے بہت سے پرانے چہرے دیکھے اور باوفا ابوبکرؓ، تند مزاج عمرؓ اور خاموش طبع عثمانؓ یکے بعد دیگرے آپکی جگہ لیتے رہے۔ ان کے بعد دلیر اور بہادر علیؓ۔ خالدؓ بن ولید اور عمرو ابن العاص بھی آئے۔ یہ جہاں بھی گئے آپؐ کی تعلیمات کو ساتھ لے گئے۔ یہاں تک کہ فارس اور مصر اور عراق میں آپؐ کا نام روشن ہو گیا۔

پھر ان قدیم ساتھیوں کے چہرے ماند پڑ گئے اور نئے چہروں نے ان کی جگہ لے لی لیکن یہ سب بھی اسی مقصد اور نصب العین کو لے کر آگے بڑھ رہے تھے۔ عساکرِ اسلامی کے پرچم آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ شمالی افریقہ سے ہو کر بحرِ اوقیانوس کی طرف۔ پھر اس سے آگے شمال میں، اسپین میں سے ہو کر فرانس کے اندر تک۔ یہ لوگ مشرق کی طرف بھی گئے۔ پھر خلیج فارس کے پار اور مغربی افریقہ کے ممالک میں بھی آپؐ کی تعلیمات بڑی تیزی سے پھیلتی چلی گئیں۔

حضرت محمدؐ نے آنکھیں کھولیں تو آپؐ کو سانس لینا مشکل ہو گیا۔ آپؐ کو پوری توقع تھی کہ آپؐ کے خواب کی یہ تمام افواج آپؐ کے سامنے خود و زرہ بکتر پہنے آراستہ ہوں گی لیکن آپؐ نے خود کو اکیلا پایا۔ البتہ چند گز دور آپؐ کا سفید خچر کھڑا اونگھ رہا تھا۔ آسمان تاریک تھا جس میں چمکتے ہوئے تارے جڑے ہوئے تھے۔ صحرا کی تیز ہوا قبرستان کے پتھروں سے سر ٹکرا رہی تھی پھر آپؐ کے جسم کا تناؤ کچھ کم ہوا۔ آہستہ سے آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کی قبر کو چھوا۔ یہ جو کچھ ہوا سب انہی کی بدولت تھا اور آئندہ جو کامیابیاں ہوئی تھیں وہ بھی انہی کی مرہونِ منت ہوں گی۔ کافی دیر تک آپؐ ساکت و صامت کھڑے رہے۔ آپؐ وہاں سے نہ ہلے جب تک کہ آپؐ کو یہ یقین نہ ہو گیا کہ یہ خاتون جن سے آپؐ کو محبت تھی، اچھی طرح جانتی تھیں کہ خواہ حالات بظاہر کتنے ہی کیوں نہ بدل گئے ہوں صرف وہ ہی ایسی عورت تھیں، جن سے حضرت محمدؐ سچی محبت کرتے تھے۔

بائیسواں باب

وفات

۸ جون سنہ ۶۳۲ء[1]

سرد ممالک کے خلاف گرم آب و ہوا کے علاقوں میں موت زیادہ سکون سے آجاتی ہے۔ شمالی خطوں میں صحرائے عرب کی سی بلا تکلیف نزعی کیفیت تقریباً ناپید ہے۔

عرب لوگ بڑی وضعداری سے اور دوسروں کو کوئی تکلیف دیئے بغیر ہی موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ وہ بچوں کی سی جلائی ہوئی آگ کی طرح بہت جلد بجھ جاتے ہیں۔ وہ ضعیفی اور درماندگی کے مرحلوں پر پہنچ کر اپنے اس دنیا سے سفر کرنے کے پیشگی آثار کا اظہار نہیں کرتے اور نہ ہی مغربی قوموں میں ضعف سے نڈھال اور زمانے کے شاکی بوڑھوں کی طرح عرب لوگ اپنے گھر والوں کو طویل تیمارداری اور رنجر گیری سے پریشان کرتے ہیں۔ وہ خواہ کسی خانہ بدوش قبیلہ کا سردار ہو یا تاجر اسے مرتے وقت تک اپنے اہل خانہ اور دوستوں کا پورا پورا خیال رہتا ہے۔ (اور وہ ان کے لئے تکلیف کا باعث نہیں بنتا)۔

ایک عرب کی صحیح عمر کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کیونکہ وہ ساٹھ سال کا ہو یا اسی برس کا اس کے روزانہ کے معمول میں جوانی سے لے کر بڑھاپے تک کوئی فرق نہیں آتا۔ پھر ایک دن

---

[1] علامہ شبلی نے سیرۃ النبی (جلد دوم) میں مئی ۶۳۲ء لکھا ہے "حیاتِ محمدؐ" میں تاریخ وفات ۸ جون ۶۳۲ء بیان کی ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں اور جنرل گلب نے اپنی کتاب (THE GREAT ARAB CONQUESTS) میں ماہ جون ۶۳۲ء لکھا ہے لیکن اگر تاریخ وفات علامہ شبلی کے استدلال کے مطابق ۱۲ ربیع الاوّل کی بجائے یکم ربیع الاوّل مان لی جائے تو مطابقت میں مئی ۶۳۲ء کا ہی مہینہ آئے گا۔ (مترجم)

اچانک وہ کچھ تکلیف محسوس کرتا ہے۔ دوسرے روز وہ اپنے گھر یا خیمے سے باہر نہیں نکلتا۔ اور ایک ہفتہ بعد وہ خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ مرنے کے چند گھنٹے کے اندر اندر اسے شہر کے قبرستان میں یا صحرا میں پتھروں کے ڈھیر کے نیچے دفن کر دیتے ہیں ہر شخص اسے اچھے الفاظ میں یاد کرتا ہے اور اگلے جہان میں اس کی مغفرت کی دعا کرتا ہے۔ اس کے ورثا میں سے کوئی بھی اس اطمینان اور خوشی کا اظہار نہیں کرتا جو مغربی قوموں میں ایک پیر فرتوت کی آخری رسومات سے فارغ ہونے پر بکثرت دیکھنے میں آتا ہے۔

اس معقول رویے اور بلا وجہ کا ہنگامہ نہ ہونے کا بڑا سبب مسلمانوں کا موت سے نہ ڈرنا ہے۔ اس سے خوف کھانے کی بجائے وہ اسے دنیاوی زندگی کی تمام آفات اور تکالیف سے نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ حضرت محمدؐ کے ان الفاظ پر ایمان رکھتے ہیں۔

"یہ دنیا مسلمان کے لئے ایک قید خانہ اور تکلیف کی جگہ ہے اور جب وہ اسے چھوڑتا ہے تو گویا قید اور تکلیف دونوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔"

چنانچہ حضرت محمدؐ نے بھی اس دار فانی سے اسی روایت کے مطابق کوچ کیا۔ وفات سے چند گھنٹے پہلے تک آپؐ لوگوں کو وعظ و نصیحت کر رہے تھے۔۔۔۔

حج سے واپسی کے بعد جلد ہی آپؐ شام کے رومیوں کے خلاف ایک مہم بھیجنے کی تیاری میں لگ گئے۔ آپؐ موتہ پر مسلمانوں کی شکست کو نہ بھولے تھے اور اپنے دیرینہ رفیق اور ساتھی زیدؓ کی شہادت کے لئے ابھی تک آپؐ نے رومیوں کو معاف نہیں کیا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے فیصلہ کیا کہ اب انتقام[1] لینے کا وقت آ گیا ہے۔

اس مہم کو اور زیادہ موثر طور پر انتقامی بنانے کے لئے آپؐ نے زیدؓ کے صاحبزادے اسامہؓ کو اس لشکر کا سپہ سالار بنایا۔ اسامہؓ آپؐ کی حبشی دایہ برکہ (ام ایمن) کے بطن سے تھے جو حضرت زیدؓ کی پہلی بیوی تھیں۔ وہ ایک ہونہار نوجوان تھے اور بعد میں انہوں نے حضرت محمدؐ کے اس انتخاب کو صحیح بھی ثابت کر دیا لیکن آپ کی عمر اس وقت صرف بیس سال تھی۔ آپؐ کے اکابر صحابہ

---

[1] اس کے علاوہ آپ کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ رومی پھر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ (طبری)

نے اس تجویز کو پسند نہ کیا کہ تا حال طاقتور رومنوں پر حملہ کرنے کے لئے ایک ایسے لڑکے کو ان کا سالار بنایا جائے جسے جنگ کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ لیکن حضرت محمدؐ نے ان احتجاجوں کا کوئی اثر نہ لیا۔ آپؐ ایک ایسی نظیر قائم کر رہے تھے جس پر آج تک مسلمان عمل پیرا ہیں اور وہ یہ کہ ایک اچھے جنرل کے لئے عمر اور ذاتی مرتبہ لازمی نہیں۔ آپؐ ان لوگوں میں جمہوریت کا ایک ایسا اصول رائج کر رہے تھے جسے ان کو دنیا کے گوشے گوشے میں لے جانا تھا۔ ان کے تقرر کے متعلق کوئی مشورہ کئے بغیر آپؐ نے اسامہؓ کو مسجد میں بلایا اور انہیں اسلامی پرچم یہ کہہ کر عطا کیا کہ اس کے عزت و وقار کو سربلند کریں۔ حضرت اسامہؓ نے پرچم تھام لیا اور کسی بحث و تمحیص کے بغیر لشکر کی کمان سنبھال لی۔

۲۷ مئی ۶۳۲ء کو تیسرے پہر لشکر نے کوچ کیا اور اس رات مدینہ کے قریب ہی 'الجرف' میں پڑاؤ کیا۔ وہ اس شام یہاں تک ہی پہنچ سکے تھے۔ دوسری صبح کوچ کی تیاری سے پہلے ہی یہ اطلاع پہنچ گئی کہ حضرت محمدؐ سخت بیمار ہو گئے ہیں۔

کسی نے بھی صحیح طور پر یہ نہیں بتایا ہے کہ آنحضورؐ کی اس جان لیوا بیماری کا اصل سبب کیا تھا۔ آپؐ کے بعض پیروکار اس کا سبب وہ زہر خورانی بتاتے ہیں جو آپؐ کو خیبر میں دیا گیا تھا۔ لیکن یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ زہر دینے کی کوشش چار سال پہلے ہوئی تھی۔ دوسری یہ کہ آپؐ نے زہر آلود گوشت حلق سے نیچے نہیں اتارا تھا بلکہ زبان پر رکھتے ہی تھوک دیا تھا۔ تیسرے یہ کہ آپؐ کی صحت اس تمام عرصے میں بہت اچھی رہی تھی۔ یہاں تک کہ آپؐ نے تبوک جیسی پر مشقت اور جسم و دماغ کو تھکا کر چور کر دینے والی مہم کی قیادت بھی کی۔ آپؐ نے اس دوران میں بنو ہوازن کے خلاف حنین کی جنگ بھی لڑی اور طائف کا

لہ آنحضورؐ نے اسامہؓ کو بلایا اور فرمایا: "اپنے باپ کے مقتل کو جاؤ اور کفار کو کچل دو۔ اس لشکر پر تمہیں امیر بنا دیا ہے۔" اتنا تیز چلو کہ خبروں سے آگے ہو جاؤ۔ اس مہم میں حضرات ابوبکرؓ صدیق۔ عمر بن الخطابؓ ابوعبیدہؓ بن الجراح اور سعدؓ بن وقاص جیسے اصحاب کبار کو بھی اسامہؓ کی سرداری میں شرکت کرنا تھا۔ (ڈسپلن قائم کرنے کی یہ ایک مثال تھی) (طبقات ابن سعد۔ جزو ثانی)

محاصرہ بھی کیا اور مکہ بھی فتح کر لیا تھا ایک شخص جس کو زہر ہلاہل کا اثر آہستہ آہستہ کھائے جا رہا ہو ایسی پر مشقت مہمیں سر کرنے کے قابل کبھی نہیں ہو سکتا۔

بعض کا خیال ہے کہ آپؐ کو سخت قسم کا ملیریا ہو گیا تھا۔ یا پھر یہ کہ میعادی بخار تھا لیکن مشاہدے کے مطابق جو علامتیں بتائی گئی ہیں۔ وہ یہ تھیں:

بیماری کے دوران آپؐ کو شدید بخار رہا۔ آپؐ کی آنتوں اور کمر میں سخت تکلیف تھی۔ آپؐ کی بیماری اور وفات دونوں بہت تیزی سے آئیں۔ آپؐ ان تمام تکالیف اور مرحلوں سے گذرے جن سے لاکھوں مشرقی لوگ آنتوں کے ٹیکوں کی ایجاد سے پہلے گذرتے تھے۔ پھر یہ بھی کہ آپؐ کو ایسی بیماری لاحق ہو جانے کے اسباب ہر وقت موجود تھے۔

صحرا میں پانی کی قلت کے سبب عرب لوگ ہر بہم آ جانے والی شے کو پی لیتے ہیں۔ اور اکثر اوقات یہ انہیں نقصان بھی نہیں پہنچاتی۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ حضرت محمدؐ نے مکہ میں اس بالٹی کا پانی پی لیا تھا جس میں گندی کھجوریں دھوئی گئی تھیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مدینے میں مسجد کے نزدیک ایک کھلا حوض تھا جس سے پانی پیا جاتا تھا اور ہمیں اس بات کا بھی اعتراف کرنا ہو گا کہ آپؐ نے اپنی باسٹھ سال کی زندگی میں اپنے جیسے معمول کے مطابق چار صحت مند آدمیوں جتنا کام کیا تھا۔ ایک ایسا جسم جس نے بے شمار اذیتیں سہی ہوں اور جسے کبھی آرام نہ ملا ہو آخر کار رو بہ انحطاط ہونا شروع ہو گیا۔

بہر حال بیماری خواہ کچھ ہی تھی۔ حضرت محمدؐ اسامہؓ کو علم عطا کرنے کے بعد دوسری صبح اٹھے تو سر میں سخت درد تھا اور پیٹ میں بھی سخت درد تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ لیکن آپ نے کسی کو نہ بتایا کہ آپ کو اتنی شدید تکلیف تھی اور معمول کے مطابق اپنے فرائض انجام دیتے رہے اور باری باری اپنی ازواج کے ہاں بھی جاتے رہے۔ بایں ہمہ آپؐ کو احساس ہو گیا تھا کہ شاید یہ ہی آپؐ کا مرض الموت[1] ہو۔ حضرت فاطمہؓ کو راز داری

---

[1] واقدی کے بیان کے مطابق ماہ صفر سنہ ۱۱ھ ختم ہونے میں صرف دو راتیں باقی تھیں کہ آپؐ اس مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ فقہائے حجاز بھی اس پر متفق ہیں کہ آپؐ صفر کی آخری تاریخوں میں بیمار ہوئے۔ (طبری)

ہیں لے کر اتنا ضرور کہاکہ اب آپؐ کی زندگی تھوڑی ہی رہ گئی تھی اور یہ سن کر جب وہ رونے لگیں تو آپؐ نے ان کو تنبیہہ کی اور کہا:۔

"میری بیٹی! روتی کیوں ہو۔ اطمینان رکھو میرے خاندان والوں میں سب سے پہلے تم ہی میرے پاس آؤگی"۔

اور ہوا بھی یہی۔ حضرت فاطمہؓ آپؐ سے چھ ماہ بعد ہی انتقال کرگئیں۔

اپنی بیماری کی دوسری رات حضرت محمدؐ حضرت میمونہؓ کے حجرے سے نکلے، جہاں آپؐ کو وہ رات گذارنی تھی اور ایک غلام[1] کو ساتھ لے کر جنت البقیع (قبرستان) کی طرف چلے گئے۔ کچھ دیر آپؐ قبرستان میں ان لوگوں کے سرہانے مراقبے میں بیٹھے رہے جو مسلمان ہو کر مرے تھے۔ پھر جو لوگ آپؐ سے پہلے وفات پا گئے تھے ان کے لئے دعا کی:۔

"بیشک آپ[2] اور ہم ان نعمتوں سے سرفراز ہوئے۔ جن کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا۔ اے اہل قبور! آپ پر سلامتی ہو اور آپ کو مبارک ہو۔ آپ لوگ ان لوگوں سے بہتر ہیں جو پیچھے رہ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان آفات سے محفوظ کر دیا ہے جو بعد والوں کیلئے خطرہ بنی رہتی ہیں اور جو ایک کے بعد ایک اور پہلی سے زیادہ سخت ہوتی ہیں ...... یا اللہ ان لوگوں کی مغفرت کر جو یہاں مدفون ہیں"۔[3]

پھر غلام سے مخاطب ہو کر فرمایا: "مجھے پیشکش کی گئی ہے کہ یا تو میں اس دنیا میں حیاتِ جاودانی لے لوں اور بعد میں جنت میں جاؤں۔ یا اپنے مالک حقیقی کے پاس فوراً حاضر

آپؐ تیرہ دن بیمار رہے۔ شروع کے پانچ روز جب بیماری کم تھی آپؐ دوسری ازواج کے ہاں رہے۔ آخر کے آٹھ روز جب مرض شدید ہوگیا تو دوسری ازواج کی اجازت سے حضرت عائشہؓ کے ہاں گزارے اور وہیں انتقال کیا۔ (سیرت النبی۔ حصہ دوئم)

[1] ان کا نام ابو موہیبہ تھا اور یہ آنحضورؐ کے آزاد کردہ غلام تھے۔

[2] تاریخ طبری (جلد اول حصہ سوم) سیرۃ النبی (جلد دوم) کے مطابق آپؐ نے یہ دعا شہدائے اُحد کی قبروں پر پڑھی جو جنت البقیع میں ہیں۔

ہو جاؤں۔ میں نے اپنے رب سے جلد ملنے والی بات قبول کر لی ہے۔"

ایک مرتبہ آپؐ پھر اہل قبور سے مخاطب ہوئے۔

"السلام علیکم یا اھل القبور۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو معاف کرے۔ آپ لوگ ہم سے پہلے چلے گئے ہیں اور ہم بھی آپ کے پیچھے آنے والے ہیں۔"

پھر آپؐ حضرت میمونہؓ کے حجرے میں واپس تشریف لے گئے۔ دوسرے روز آپؐ کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ بخار تیز ہو گیا تھا اور آنتوں کی تکلیف آپؐ کو کاٹے ڈال رہی تھی۔ حضرت محمدؐ نے تیمارداری کی ضرورت محسوس کی اور یہ بھی طے کر لیا کہ حضرت میمونہؓ اتنی اچھی خبر گیری نہ کر سکیں گی۔ آپؐ حضرت عائشہؓ کے پاس جانا چاہتے تھے۔ اتفاق سے حضرت عباسؓ اس وقت وہاں موجود تھے۔ انہوں نے ٹالنا چاہا۔ اب یہ بات یقینی معلوم ہوتی تھی کہ آپؐ کی وفات نزدیک تھی۔ غالباً آپؐ کے چچا چاہتے تھے کہ آپؐ کا دمِ واپسیں آپؐ کی سالی (حضرت میمونہؓ) کے بازوؤں میں ہو تاکہ نتائج ان کے حق میں ہوں اور ایسا ہونا ممکن تھا۔ مسلمانوں میں ابھی تک آپؐ نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا تھا اور ایسے حالات میں آپؐ کی وفات ان کی (حضرت عباسؓ) ایک عزیزہ کے ہاں ہونے سے اس کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا اور یہی سمجھا جاتا کہ آپؐ کی مرضی اور منشا بھی یہی تھی۔ لیکن حضرت محمدؐ کی حالت ابھی اتنی خراب نہیں ہوئی تھی کہ کوئی شخص آپؐ کی مرضی اور منشاء کے خلاف کوئی کام کرا سکتا۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے چچاؓ اور حضرت علی کرم کا سہارا لیا اور حضرت عائشہؓ کی رہائش گاہ تک لے چلنے پر اصرار کیا۔

" اے مویہبہ! مجھے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ میں دنیا کے خزانوں، حیات جاودانی اور جنت میں سے کسی ایک کو پسند کر لوں۔ میں نے حیات جاودانی اور دنیا کے خزانوں کے مقابلے میں اپنے رب کی ملاقات اور جنت کو پسند کر لیا ہے۔" (حیات محمدؐ)

لے حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ حضرت فضلؓ بن عباس اور حضرت علی کرم کا سہارا لیتے ہوئے ان کے حجرے میں آئے (تاریخ طبری) سیرۃ النبی کے مطابق خود حضرت عباسؓ تھے۔

حضرت عائشہؓ ابھی صرف بیس[1] سال کی تھیں۔ آپ نے اس سے پہلے نہ تو کسی بیمار کی تیمارداری کی تھی اور نہ ہی کسی کا دم واپسیں دیکھا تھا۔ لیکن آپ نے خود کو اس کا اہل ثابت کیا اور اپنے قریب المرگ شوہر کی علالت کے آخری ایام میں اُن کی خبر گیری اور تیمارداری میں ہمہ تن مصروف ہو گئیں۔ آپؐ کی ان جواں سال بیوی کی محبت بھری توجہ سے آپؐ پر خوشگوار اثر پڑا۔ آپؐ کچھ سنبھل گئے اور آپؐ کا ذہن زیادہ صحیح طور پر کام کرنے لگا چنانچہ جب آپؐ نے سنا کہ اسامہؓ تا حال شام کے لئے روانہ نہیں ہوتے ہیں اور آپؐ کے اکابر کی جانب سے ان کی تقرری پر اختلافی تبصرے کے سبب ان کو روک لیا گیا ہے تو آپؐ کا پہلے کا سا جوش عود کر آیا۔ آپؐ نے پانی منگایا اور غسل کیا (تاکہ بخار کی شدت کچھ کم ہو) لباس پہنا اور مسجد میں تشریف لے آئے۔ نماز کے لئے لوگ ابھی ابھی جمع ہوئے تھے۔ معمول کے مطابق حضرت محمدؐ نے نماز پڑھائی اور لوگوں سے خطاب کیا۔

"اے لوگو[2]! یہ کیا ہے جو میں سن رہا ہوں کہ آپ میں سے کچھ لوگ میرے اسامہؓ کو شام کے لشکر کا امیر مقرر کرنے دینے پر معترض ہیں؟ اگر آپ لوگوں کو اس پر اعتراض ہے (تو کوئی تعجب نہیں) کیونکہ آپ اس سے پہلے اس کے والد زیدؓ کی تقرری پر بھی اعتراض کر چکے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ (زیدؓ) بھی اس کے اہل تھے اور ان کا بیٹا بھی اس عہدے کا اتنا ہی اہل ہے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اسامہؓ ان لوگوں میں سے ایک ہیں (جنہیں میں بہت زیادہ چاہتا ہوں) اور اسی طرح اس کے والد تھے۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں کیونکہ

---

[1] ایک روایت کے مطابق آپ نکاح کے وقت تیرہ سال کی تھیں اور رخصتی کے وقت ۱۰ سال کی۔ اس طرح آپؐ نبی کریم کے وصال کے وقت ۲۰ سال کی تھیں۔

[2] طبقات ابن سعد جزو ثانی

یہ واقعہ ۱۰ ربیع الاوّل یوم شنبہ (ہفتہ) کا ہے۔ (طبقات ابن سعد)

وہ آپ کے بہترین لوگوں میں سے ایک ہیں۔"

آپؐ نے مجمع پر ہر طرف نظریں ڈالیں۔ آپؐ کی آنکھوں میں ابھی تک اسی طرح تیزی اور چمک تھی اور نگاہوں میں وہی حاکمانہ رعب تھا کہ کسی کو آپؐ کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ تھی۔ آپؐ کے منطقی اور واضح دلائل میں ہمیشہ کی طرح وہی زور اور استدلال تھا۔ چنانچہ یہ اطمینان کر کے کہ لوگ اب معقول ہو گئے ہیں، آپؐ نے مزید فرمایا:-

"بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اس دنیا کی زندگی یا اپنی قربت میں سے ایک کو چن لینے کا موقع دیا ہے اور بندے نے اپنے مالک حقیقی کی قربت کو ہی ترجیح دی ہے۔"

غالباً اکیلے حضرت ابوبکرؓ ہی مسجد میں ایسے شخص تھے جو حضرت محمدؐ کے اس اشارے کو سمجھ گئے تھے چنانچہ جب انہوں نے اپنی سسکیوں کو ضبط کیا۔ تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ حضرت محمدؐ اپنے ان قدیم صحابی کی طرف متوجہ ہوئے اور جذبات سے متاثر ہو کر کہا:-

"یقینی[1] طور پر محبت اور وفاشعاری میں ابوبکرؓ تم میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں اور اگر مجھے ایک دلی دوست اور ساتھی چن لینے کی اجازت ہوتی تو وہ ابوبکرؓ ہی ہوتے لیکن اسلام نے اب ہم سب کو آپس میں اور زیادہ قریب کر دیا ہے یعنی بھائی بنا دیا ہے۔"

حاضرین میں سے اہل مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

"مدینہ[2] کے انصار کی عزت و احترام کرو۔ دوسرے مسلمانوں کی تعداد بڑھ سکتی ہے لیکن انصار اتنے ہی رہیں گے۔ وہ اب سب میرے عزیز ہیں۔ ان کے درمیان میں میں اپنے گھر کی طرح رہا ہوں۔

---

[1] تاریخ طبری۔ جلد اول۔ حصہ سوم

[2] حیات محمدؐ

تم ان سے دوستی رکھو، جن کے یہ دوست ہیں اور ان کے دشمنوں سے تم بھی قطع تعلق کر لو۔"

چند اور نصیحتیں کرنے اور مشورے دینے کے بعد آپؐ منبر پر سے اتر آئے اور حضرت عائشہ رضؓ کے پاس واپس چلے گئے۔

مسجد تک جانے آنے نے آپؐ کو تھکا دیا اور رات بے چینی میں گذری۔ صبح کو طبیعت اتنی خراب تھی کہ آپؐ نماز نہ پڑھا سکے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ[1] کو حکم دیا کہ وہ آپؐ کی بجائے نماز پڑھائیں۔ جانشینی کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ یہ تھا جو آپؐ نے کیا۔ بایں ہمہ یہ واضح تھا کہ آپؐ یہی چاہتے تھے۔ جب آپؐ موجود ہوتے تو آپؐ کے علاوہ کوئی اور نماز نہیں پڑھاتا تھا لیکن آپؐ کی غیر حاضری میں اوّل ایمان لانے والوں میں سے جو کوئی بھی موجود ہوتا امامت کرتا۔ آج آپؐ عمرؓ، عثمانؓ یا علیؑ کسی کو بھی اپنی نیابت کا حکم دے سکتے تھے لیکن اپنے معتمد صحابی کو خاص طور پر نامزد کرنا، حضرت عائشہ رضؓ کو اپنی تیمارداری کے لئے چننا اور ان کے حجرے میں ہی اپنی بیماری کے ایام گزارنے سے صاف ظاہر تھا کہ آپؐ خلافت اس شخص کو دینا چاہتے تھے جس نے آغاز اسلام سے ہی آپؐ کے ہر اچھے برے وقت میں آپ کا ساتھ دیا تھا۔

بعد کے چند دنوں میں بخار اتنا شدت اختیار کر گیا کہ رسول اللہ اپنے بستر سے نہ اٹھ سکے اور جب بخار کی تپش ناقابل برداشت ہو گئی تو آپؐ بار بار اپنا ہاتھ پاس رکھے ہوئے پانی کے پیالے میں ڈبوتے اور دعا کرتے۔

"بار الٰہا! اس جان کنی میں میری امداد فرما۔ یا اللہ میری مدد کر"——

---

[1] واقدی ابن ابی سبرہ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے سترہ نمازیں پڑھائیں۔ عکرمہؓ سے مروی ہے کہ ابوبکرؓ نے ہمیں تین دن نماز پڑھائی۔ (تاریخ طبری)

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ تین دن آنحضرت صلعم نے نماز نہیں پڑھائی اور حضرت ابوبکرؓ نے آپکی قائم مقامی کی۔ اس قائم مقامی کا آغاز شب جمعہ کی نماز عشاء سے ہے۔ (سیرۃ النبی۔ جلد دوم)

بعض اوقات آپؐ پر ہذیان کی سی کیفیت طاری ہو جاتی لیکن بحیثیت مجموعی آپؐ کو وہ تمام باتیں یاد رہتیں جو آپؐ کے آس پاس ہو رہی تھیں۔ آپؐ کوئی شکایت نہ کرتے تھے آپؐ اپنے صحابیوں کو بھی پہچانتے تھے، جو آپ کی عیادت کے لیئے آتے تھے۔ بلکہ آپؐ نے ہدایات بھی دیں کہ جو نقدی آپؐ کے پاس بچی ہوئی ہے۔ وہ فوراً ضرورت مندوں میں تقسیم کردی جائے۔ اور پھر بجھتی آگ کے آخری شعلے کی طرح آپؐ نے سنبھالا لیا۔ اور اپنے آپؐ کو کچھ بہتر محسوس کیا۔ ایک مرتبہ پھر وہی ناقابل تسخیر عزم اور حوصلہ جس نے ابھی تک آپؐ کا ساتھ نہ چھوڑا تھا، عود کر آیا۔

پانی اور صاف کپڑے طلب کیئے اور اچھی طرح غسل کر کے آپؐ حضرت علیؓ کرم اور حضرت عباسؓ کا سہارا لے کر مسجد میں تشریف لائے۔ آپؐ اس وقت پہنچے جب حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ خوشی اور حیرت کی دبی دبی آوازوں کو سن کر حضرت ابوبکرؓ پیچھے ہٹنے کے لئے مڑے اور نماز پڑھانا بند کر دیا لیکن حضرت محمدؐ نے آپؓ کو نماز جاری رکھنے کا اشارہ[1] کیا اور جب وہ نماز ختم کر چکے تو آپؐ منبر کی پہلی سیڑھی پر بیٹھ گئے اور ایک مرتبہ پھر لوگوں سے خطاب کیا۔
میں[2] نے سنا ہے کہ میری موت کی افواہ نے تم لوگوں کو پریشان کر دیا ہے لیکن میں پوچھتا

---

[1] آپ نے ابوبکرؓ کو نماز جاری رکھنے کا حکم دیا۔ خود حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں دائیں طرف بیٹھ کر اور ان کی امامت میں ہی نماز ادا کی (حیات محمدؐ) آپؐ حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ نماز آپ نے ہی پڑھائی۔ حضرت ابوبکرؓ آپ کی اقتدا کر رہے تھے اور باقی مقتدی حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا کر رہے تھے۔ یہ ظہر کا وقت تھا اور حضرت جندبؓ کی روایت کے مطابق وفات سے پانچ روز پہلے یعنی جمعرات کا واقعہ ہے۔ (سیرۃ النبی۔ جلد دوم)

[2] مصنف نے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ البتہ تاریخ طبری اور حیات محمدؐ کے بیان کے مطابق آنحضورؐ نے اس خطبہ میں یہ فرمایا تھا "اے لوگو! آگ بھڑک اٹھی ہے اور اندھیری رات کی طرح فتنے امڈے چلے آرہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کسی بات کی ذمہ داری مجھ پر عائد کرو کیونکہ میں نے تمہارے لئے صرف وہی چیزیں حلال کی ہیں جو قرآن نے حلال کی ہیں۔ اور وہی چیزیں حرام کی ہیں جنہیں قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس قوم پر جو اپنے انبیاء کی قبروں کی پرستش کرتی ہے۔ (تاریخ طبری۔ حیات محمدؐ)

ہوں کہ کیا میرے سے پہلے آنے والے پیغمبروں میں سے کوئی ہمیشہ زندہ رہا ہے۔ ہر بات اللہ کی مرضی اور حکم کے مطابق ہوتی ہے اور اس کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ نہ جلدی ہوتی ہے اور نہ دیر۔ مجھے اسی کے پاس واپس جانا ہے۔ جس نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ میری آخری وصیت آپ لوگوں کے لئے یہ ہے کہ سب متحد رہیں اور ایک دوسرے سے محبت اور ایک دوسرے کی عزت و تکریم کریں اور ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ ایک دوسرے کو دین اور ایمان اور نیکو کاری کی تلقین کرتے رہیں۔ یہ ہی انسانیت کی فلاح ہے۔ اس کے علاوہ باقی باتیں تباہی کی طرف لے جانے والی ہیں۔"

اب آپؐ زور لگا کر کھڑے ہو گئے اور قریب اپنی سابق بلند آواز ہی سے کہا:۔

"میں[1] آپ لوگوں کے سامنے ہی رخصت ہو جاؤں گا اور میرے بعد جلد ہی آپ کو بھی آنا ہے۔ موت ہم سب کی منتظر ہے۔ تو پھر میری موت کو ہی آپ کیسے روک سکتے ہیں۔ میں آپ لوگوں کی بھلائی کے لئے جیا اور بھلائی کے لئے مروں گا۔"

آپؐ چند لمحے لمبی لمبی عبائیں پہنے ان لوگوں کو بڑے اشتیاق سے دیکھتے رہے جو مسجد میں جمع ہو گئے تھے۔ پھر آپؐ ان کی خاموش صفوں کے درمیان سے حضرت علی کرمؓ کے سہارے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنے حجرے کی طرف لوٹ گئے۔ یہ آپؐ کی آخری تقریر تھی۔

حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچ جانے پر آپؐ اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔ حضرت عائشہؓ نے آپ کا لباس اتارا۔ کچھ دیر آرام کیا۔ حضرت عائشہؓ کا ہاتھ آپؐ کے ہاتھ میں تھا۔ بخار پھر بہت تیز ہو گیا تھا لیکن نہ تو آپؐ کراہے اور نہ ہی کسی تکلیف کی شکایت کی۔ جب حضرت عائشہؓ نے کپڑا پانی میں بھگو کر آپؐ کے چہرے پر پھیرا تو آپؐ مسکرائے اور آہستہ آہستہ لیکن مشکل سے یہ الفاظ آپؐ نے ادا کئے:۔

"یا اللہ۔ اس جان کنی کو میرے لئے آسان کر دے۔ اے جبرائیل میرے

---

[1] مصنف نے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔

قریب آجاؤ۔ میرے نزدیک آجاؤ"

یہ الفاظ آپؐ نے کئی مرتبہ دہرائے۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد آپؐ کے چہرے پر پھر کچھ بحالی آگئی۔ آپؐ نے آنکھیں کھولیں اور واضح الفاظ میں کہا۔

"اے مالک حقیقی۔ میری مغفرت کر اور مجھے اپنے جوار میں بلند جگہ عطا فرما" اپنے برگزیدہ اولیاء اور صالحین کے ساتھ (مع الذین انعم اللہ علیہم)۔

(آپؐ کی زبان پر بل الرفیق الاعلیٰ فی الجنۃ کے الفاظ جاری تھے)

پھر آپؐ کے اعضاء ڈھیلے پڑ گئے۔ آپؐ کا سر حضرت عائشہؓ کی گود میں ڈھلک گیا۔ بخار سے جلتے ہاتھ کی گرمی، جو حضرت عائشہ نے تھاما ہوا تھا، کم ہو گئی۔ ایک منٹ تک مکمل خاموشی رہی۔ پھر حضرت عائشہؓ نے آہستہ سے اپنے شوہر کا سر تکیے پر رکھ دیا۔ آپؐ کے کپڑے درست کئے اور آپؐ کی آنکھیں[لہ] بند کر دیں۔ وہ بڑے متفکرانہ لیکن پرامید نظروں سے آپؐ کے پیارے چہرے کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔ اس مکمل خاموشی سے آپؐ کو اتنا یقین تو ہو گیا تھا کہ یہ کسی وحی یا دورے کی کیفیت نہیں اور جو ہلکی سی مسکراہٹ آپؐ کے شوہر کے چہرے پر تھی وہ بھی ایک زندہ شخص کی سی تھی۔ چنانچہ آنسوؤں کو ضبط کیا اور جلدی سے اس ہستی کی پیشانی کا بوسہ لیا جو آپ کے لئے پہلے اور آخری مرد تھے جو آپؐ کی زندگی کے شریک تھے۔ آپؐ واحد شخص تھے جن سے آپ نے محبت کی۔ پھر آپ صحن میں چلی گئیں جہاں دوسری ازواج بڑی فکرمندی اور تشویش سے انتظار کر رہی تھیں۔

لہ ۸ جون ۶۳۲ء کو آنحضورؐ کا وصال ہوا۔ موسم سخت گرم تھا۔ (حیات محمدؐ) مصنف نے بھی یہی تاریخ لکھی ہے۔ (مترجم)

واقدی کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ دوشنبے (پیر) کے روز وفات پائی۔ اور دوسرے روز دن ڈھلے دفن کئے گئے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ربیع الاول کی دو تاریخ تھی اور دن پیر ہی کا تھا (طبری) سیرۃ النبی (جلد دوم) میں مولانا شبلی نے اجتہاد کیا ہے کہ ۱۲ ربیع الاوّل کو دوشنبہ (پیر) کا دن نہیں پڑتا۔ اس لئے وفات یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ دوشنبے کے روز ہوئی (مترجم)

حرم سے اٹھنے والی آہ و بکا کی آوازیں جلدی ہی مسجد کے پڑوس میں پھیل گئیں۔ خوف اور مایوسی کی ایک لہر ان لوگوں میں آگ کی طرح پھیل گئی، جنہوں نے اپنے پیشوا کو ابھی تھوڑی دیر پہلے زندہ دیکھا تھا۔ حضرت عمرؓ سمیت کوئی بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ رسول اللہؐ اس دنیا سے سفر کر گئے ہیں۔ حضرت عمرؓ تو واقعی طور پر اس ہجوم کے آگے راہ روک کر کھڑے ہو گئے جو رسول اللہؐ کی رہائش کے دروازے پر جمع ہوتا چلا جا رہا تھا اور اعلان کیا کہ حضرت محمدؐ پر صرف غشی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ آپ نے اپنا یہ بیان ایک مرتبہ پھر زیادہ بلند آواز سے اور زیادہ یقین کے ساتھ دہرایا۔

یہ ایک غیر معمولی منظر تھا اور بڑی ہی تشویشناک صورت حال تھی۔ حالانکہ حضرت محمدؐ نے نہ کبھی اپنے کسی فعل سے اور نہ ہی کبھی الفاظ میں ایسا کوئی تاثر دیا تھا کہ آپؐ اپنے پیروکاروں سے اپنی خلقت میں کسی طرح مختلف تھے۔ بلکہ ہمیشہ انہی کی طرح کا ایک فانی انسان ہونے کا دعویٰ اور تکرار کرتے رہے۔ لیکن لوگ اپنے لاشعور میں آپؐ کو عام انسانوں کے مقابلے میں ایک مافوق البشر مخلوق سمجھتے تھے اور جو کچھ آپؐ نے چند گھنٹے پہلے اپنے فانی ہونے کے متعلق مسجد میں کہا تھا اسے صرف ایک کلیہ سمجھ کر باور کیا تھا۔ وہ اپنے آقا اور مولیٰ کو ایسی مخلوق سمجھنے سے قاصر تھے جسے موت آسکتی ہو۔

یہ ایک فطری بات تھی۔ مکہ اور مدینہ کے لوگوں کو مفلسی اور اذیتوں کی زندگی سے نجات حاصل کر کے اب اتنا بلند مقام حاصل ہو گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو عرب کی تمام اقوام سے اعلیٰ و ارفع سمجھنے لگے تھے۔ بظاہر ناقابل عبور رکاوٹیں ان کے راستے میں کھڑی تھیں لیکن اپنے پیشواؐ کی کامیاب رہبری میں وہ ان سب کو عبور کر گئے تھے۔ دراصل وہ ایسا سوچنے میں حق بجانب بھی تھے کیونکہ جب بھی وہ کسی بڑی یا چھوٹی مشکلات سے دوچار ہوتے تو ان کا کام بس اتنا ہوتا تھا کہ وہ حضرت محمدؐ کے پاس چلے جاتے اور آپؐ ان کی مشکل حل کر دیتے تھے۔ چنانچہ ان کے لئے یہ قیاس کرنا کہ اب وہ دنیاوی مصائب کے طوفانوں کے خلاف اس برگزیدہ ہستی کی امداد سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں گے ایک ناقابل یقین اور خلاف فطرت بات معلوم ہوتی تھی۔

حضرت عمرؓ خود بھی مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہوئے تھے۔ وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر اسلام کے ایک سخت ترین دشمن سے اس کے ایک بڑے پرجوش حامی بن گئے تھے۔ ان کی نظر میں حضرت محمدؐ کا دنیا کے ہر انسان سے بہت زیادہ بلند مرتبہ تھا۔ اسی وجہ سے آپ نے حرم کی خواتین کو ڈانٹ دیا تھا اور انہیں رونے دھونے والی مخلوق کہا جو نہیں جانتی تھیں کہ ان کے شوہر کا مرتبہ کیا تھا۔ جب حضرت ابوبکرؓ پہنچے تو صورت حال بگڑتی جا رہی تھی۔

حضرت محمدؐ کے دوبارہ مسجد میں تشریف لے آنے سے حضرت ابوبکرؓ کو آپؐ کے صحت یاب ہو جانے کا اتنا یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنی ایک بیوی[1] سے ملنے چلے گئے۔ جو موسم گرما گذارنے کے لئے مدینہ کے مضافات میں چلی گئی تھیں۔ جونہی آنحضرتؐ کی وفات کی خبر انہیں پہنچی وہ فوراً اپنے خچر پر سوار ہوئے اور شہر واپس آ گئے۔ لوگوں کے اس ہجوم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جو آپ کو گھیر کر سینکڑوں سوالات کر رہا تھا حضرت ابوبکرؓ حرم میں داخل ہوئے اور سیدھے اس حجرے[2] میں چلے گئے جہاں آپؐ کا وصال ہوا تھا۔ آپ نے اپنی بیٹی عائشہؓ کو آنحضورؐ کے جسد مبارک کے پاس ہی بیٹھا پایا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ سے کوئی بات نہ کی۔ البتہ ان سے رسول اللہؐ پر پڑی ہوئی چادر کو اٹھانے کے لئے کہا۔ چند لمحے وہ بڑے رنج و غم میں اپنے دوست و آقا کے خوبصورت خد و خال کو دیکھتے رہے۔ پھر آپؐ کے بازو میں آ کر جھکے اور آپؐ کی چوڑی پیشانی پر بوسہ دیا اور آہستہ سے کہا:۔

"کیا ہی[3] بابرکت تھی آپؐ کی زندگی اور کتنی پاکیزہ ہے آپؐ کی موت"

پھر انہوں نے آپؐ کے لمبے بال چھوئے جو آپؐ کے بڑے سر کے پیچھے خم کھائے ہوئے تھے۔

"واقعی[4] آپ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں" انہوں نے کہا "اے میرے دوست۔ میرے محبوب آقا میرے ماں باپ آپؐ پر قربان۔ افسوس آپؐ کو بھی موت کا ذائقہ چکھنا پڑا"

---

[1] ان کا نام حبیبہ بنت خارجہ تھا اور وہ اس وقت مدینہ کے نواح میں موضع سنح میں اقامت گزین تھیں (حیات محمدؐ)

۲-۳-۴ حیات محمدؐ

ایک مرتبہ پھر آپ نے حضرت محمدؐ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور دوبارہ چادر ڈھانپ کر آہستہ آہستہ صحن کی طرف چلے گئے۔ جہاں ازواج مطہرات مسلسل رو رہی تھیں۔

اب آپ کو دیوار کے باہر شور و غل کا احساس ہوا چنانچہ جلدی سے اس طرف بڑھے۔ دیکھا کہ حضرت عمرؓ اپنی گرجدار آواز میں بار بار اعلان کر رہے ہیں کہ حضرت محمدؐ صرف بیہوش ہو گئے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو خاموش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اتنے جوش میں تھے کہ اس کی پرواہ نہ کی۔ ایک لمحہ تو آپ بھی پریشان ہو کر رہ گئے۔ یہ ایک نازک صورتحال تھی کہ جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ آخر کار آپ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا اور بولنا شروع کیا۔ لوگوں نے جب جانی پہچانی آواز سنی تو کچھ خاموش ہوئے۔ آپ بڑے تہدید آمیز لہجے میں مخاطب ہوئے۔ بڑی سختی سے اور واضح طور پر آپ نے کہا۔

"کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر یہ وحی نازل نہیں کی کہ "تمہیں[1] بھی موت آنی ہے اور سب لوگوں کو بھی مرنا ہے" اور پھر غزوہ احد کے بعد کیا یہ آیت نہیں اتری کہ محمدؐ بھی[2] ایک پیغمبر سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان سے پہلے آنے والے پیغمبر مر چکے ہیں۔ تو کیا اگر انہیں (حضرت محمدؐ) موت آ جائے یا وہ قتل ہو جائیں تو تم اپنے قدموں پر الٹے پھر جاؤ گے اور ان کا دین چھوڑ دو گے اس لئے کہ وہ

۱؎ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ .... (سورۃ زمر)

۲؎ یہ سورہ آل عمران کی اس آیت کے الفاظ ہیں۔

"وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل ۚ افائن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم ومن ینقلب علیٰ عقبیه فلن یضر الله شیئاً و سیجزی الله الشاکرین ۝"

محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گذر چکے ہیں پس اگر محمدؐ وفات پا جائیں یا شہید کر دیئے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل (کفر کی جانب) لوٹ جاؤ گے اور جو اپنے پاؤں پر لوٹ جائے گا وہ اللہ کو ذرا سا بھی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ عنقریب اللہ تعالیٰ شکر گزار بندوں کو نیک بدلہ دے گا۔

اس دنیا سے جا چکے ہیں۔"

یہ کہہ کر الفاظ کا تاثر دلوں میں بیٹھ جانے دیا۔ پھر پر زور طریقہ پر بات کو یوں ختم کیا۔

"جو لوگ حضرت محمدؐ کے پرستار تھے انہیں جان لینا چاہیئے کہ آپؐ یقینی طور پر فوت ہو چکے ہیں۔ لیکن جو اللہ کو معبود مانتے ہیں انہیں علم ہونا چاہیئے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اسے موت نہیں۔"[1]

اس تقریر کے بعد ایک دہشت ناک سناٹا چھا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی باتیں قرآن کے احکام پر مبنی تھیں۔ انہوں نے قرآن کی وہی آیتیں بیان کی تھیں جنہیں ان میں سے ہر ایک نے رسول اللہؐ کی زبانی بھی سنا تھا۔ حضرت محمدؐ کے ان سچے دوست کی صداقت پر شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ سن کر بعض نے حضرت عمرؓ کی طرف دیکھا کہ شاید وہ اس کی تردید کریں لیکن وہ بھی سر جھکائے کھڑے تھے۔ چنانچہ تمام مرد اور عورتیں جو چند لمحے پہلے جمع ہو کر اس خبر پر بڑے زور شور سے ہنگامہ کر رہے تھے، خاموشی سے منتشر ہو گئے اور اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد مسجد کے باہر چوک سے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ سب چلے گئے۔ پھر انہوں نے بھی اپنا اپنا راستہ لیا۔ غم و اندوہ کے سبب انہیں الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ اس مصیبت کی گھڑی میں وہ ایک دوسرے سے بات بھی کر سکیں۔

بہر حال اپنے ذاتی صدمے کے باوجود حضرت ابوبکرؓ نے اپنے حواس قائم رکھے۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام اس وقت سخت خطرے میں تھا۔ حضرت محمدؐ کی وفات بذاتِ خود ایک بڑا صدمہ تھا لیکن اس کے اثرات و نتائج اس سے بھی زیادہ ضرر رساں ہو سکتے تھے اور

---

[1] آپ کی تقریر کے الفاظ یہ تھے۔

ايها الناس من كان يَعبُدُ محمدًا فانّ محمّد اً قد مات ومن كان يَعبُدُ الله فانّ الله حيّ لا يموتُ۔

اے لوگو! تم میں سے جو شخص محمدؐ کی پرستش کرتا تھا وہ سن لے کہ محمدؐ فوت ہو گئے۔ لیکن جو اللہ کی عبادت کرتا ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ زندہ ہے۔ اس پر کبھی موت وارد نہیں ہو گی۔

اگر فوری طور پر کسی کو قیادت کے لئے نہیں چنا گیا تو کئی اختلافی[1] گروہ پیدا ہو جائیں گے۔ آپ اپنے اس خیال میں حق بجانب تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کی تقریر کے بعد انصار مدینہ جمع ہوئے اور یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر واقعی رسول اللہؐ کا وصال ہو چکا ہے تو اس کا کوئی جواز نہیں کہ اس کے بعد بھی مکی مہاجرین ان پر حکومت کریں۔ اب وقت اور موقعہ تھا کہ وہ اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیں۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس[2] تحریک کی سن گن مل گئی۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عمرؓ کو اپنے گھر سے لیا جہاں وہ اپنے آقا کی جدائی پر رو کر جی ہلکا کرنے چلے گئے تھے اور دونوں اس طرف چل دیئے جہاں اہل مدینہ جمع تھے۔ یہ دونوں حضرات عین اس وقت وہاں پہنچے جب سعدؓ بن عبادہ کو نیا پیشوا منتخب کر لیا گیا تھا۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے اسی عزم اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا جو حضرت محمدؐ کا خاصہ تھا۔

حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ اگرچہ وہ خود اہل مدینہ کی بے حد عزت کرتے ہیں لیکن عرب کے دوسرے قبائل ہرگز انہیں اپنا حاکم تسلیم نہیں کریں گے۔ صرف آنحضورؐ کے اپنے قبیلہ قریش[3] کے لوگ ہی شاید اس قابل ہوں کہ وہ سارے ملک کو متحد رکھ سکیں اگر وہ لوگ چاہتے

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ "حیات محمدؐ" کے مطابق مہاجرین حضرت ابوبکرؓ کے پاس جمع تھے اور بنی ہاشم، زبیرؓ بن العوام اور طلحہؓ حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کے گھر جا کر ایک گوشہ میں بیٹھ گئے تھے ادھر انصار مدینہ نے رسول اللہؐ کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے بعد فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس کے بعد مہاجرین کی حکومت برداشت نہ کریں گے اور عملی طور پر سعد بن عبادہ کو اپنا امیر منتخب کر لیا تھا۔ یہ حضرت ابوبکرؓ کی زیرکی اور فراست ہی تھی کہ اتنے مختلف گروہوں کو ایک فیصلہ پر متحد کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

[2] "حیات محمدؐ" کے مصنف کے بیان کے مطابق حضرت عمرؓ کو انصار کی اس کارروائی کا پہلے علم ہوا۔ اور وہ حضرت ابوبکرؓ کو لے کر سقیفہ بنی ساعدہ گئے۔ جہاں انصار مدینہ کا اجتماع تھا۔ بہر حال دونوں ساتھ تھے۔

[3] حضرت ابوبکرؓ نے سعد بن عبادہ کو رسول اللہؐ کے وہ الفاظ یاد دلائے جو ان کی موجودگی میں کہے گئے

ہیں کہ اسلام زندہ رہے تو اس بات کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ یہ بات کہہ کر وہ کچھ رُکے اور پھر کہا کہ وہ یہ تجویز اس لئے پیش نہیں کر رہے ہیں کہ وہ خود منتخب ہونا چاہتے ہیں۔ انہیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ کون چنا جائے لیکن یہ ضرور ہے کہ جانشین اہل قریش سے ہونا چاہئے۔

حضرت ابوبکرؓ بڑی روانی سے بول رہے تھے۔ آپ کا مقصد حضرت محمدؐ کی وفات سے ہرگز کوئی ناجائز فائدہ اٹھانا نہ تھا۔ انہوں نے تو یہ مسئلہ بالکل غیر جذباتی انداز میں اہل مدینہ کے سپرد کر دیا تھا کہ وہ خود فیصلہ کریں چنانچہ کچھ اختلافی بحث وتمحیص کے بعد ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور آپ کو پیغمبر اسلام کا خلیفہ یا جانشین منتخب کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے تائید کی اور دوسرے روز مسجد میں آپ کے تقرر کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ اس کی وضاحت کرنے کے بعد کہ آپ کو حضرت محمدؐ کی وفات کے متعلق غلط فہمی ہو گئی تھی اور یہ کہ تمام مسلمانوں کو ہمیشہ قرآن کے احکام ہی کی پیروی کرنی چاہئے حضرت عمرؓ نے کہا:۔

"اور اب اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کے معاملات ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دے دیئے ہیں۔ جو ہم میں سب سے زیادہ افضل ہیں جو اس کے رسولؐ کے صحابی ہیں اور ایسے صحابی کہ جب رسول اللہؐ غار میں تھے تو آپ کے ساتھ دوسرے شخص وہ ہی تھے۔ اٹھیں اور ان کی بیعت کریں۔"

متفقہ طور پر اٹھتی ہوئی موج کی طرح لوگ حضرت ابوبکرؓ کی طرف بڑھے۔ پھر ہر ایک نے باری باری اپنے دونوں ہاتھ اسلام کے پہلے خلیفہ کے ہاتھ میں دیئے اور بیعت کی۔

اس سے فارغ ہو کر حضرت ابوبکرؓ اسی منبر پر بیٹھے جہاں سے حضرت محمدؐ کے سوا کبھی کسی اور نے تقریر نہ کی تھی۔ یہ لمحہ تاریخ اسلام کا ہی اہم ترین اور اثر آفریں لمحہ نہ تھا بلکہ تاریخ عالم

تھے۔ یعنی خلافت کے وارث قریش ہی ہوں گے۔ نیک نیکوں کی اقتدا کریں گے اور بدکار بروں کی پیروی کریں گے۔ پھر انہوں نے کہا کہ انصار کی فضیلت ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن حکومت کا معاملہ ایسا ہے کہ سوائے قریش کے اور کسی کی حکومت کو عرب لوگ ہرگز گوارا نہیں کریں گے۔ سعد بن عبادہ کو حضورؐ کے یہ ارشادات یاد آگئے اور وہ فوراً مان گئے۔ (تاریخ طبری)

میں بھی بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اگر اس وقت حضرت ابوبکرؓ لوگوں کو موثر طور پر مطمئن نہ کر سکتے تو یہ مذہب جو ایک خاص نظریہ اور نصب العین پر قائم کیا گیا تھا، ویسا ہی محدود ہو کر رہ جاتا جیسا کہ ابتدا میں تھا۔ یعنی صرف ایک نظریہ۔

حضرت ابوبکرؓ میں اپنے دوست اور آقا حضرت محمدؐ کی سی شان اور دلربائی نہ تھی۔ وہ خود بوڑھے تھے اور مرنے کے قریب۔ البتہ یہ بزرگی اور عظمت حاصل کر لینے کے لئے ان میں دو خوبیاں تھیں۔ ایک ان کا اسلام میں غیر متزلزل یقین اور دوسری خوبی ان کا شک و شبہ سے بالاتر خلوص تھا اور ان ہی دو صفات کے سبب آپ نے اس یادگار صبح کو نمایاں کامیابی حاصل کی۔ حضرت محمدؐ کا ساخطیبانہ انداز نہ رکھتے ہوئے بھی آپ نے بڑی متانت سے وہ تمام باتیں کہہ دیں جو آپ کہنا چاہتے تھے:۔

"اے لوگو!" آپ نے بڑے خلوص سے کہا۔ "اے لوگو! بیشک[1] میں آپ کا امیر بن گیا ہوں لیکن میں آپ میں سے افضل ترین نہیں ہوں۔ اگر میں صحیح طور پر کام کروں تو میری تائید کرنا لیکن میں اگر غلطی کروں تو مجھے ٹوک دینا اور درستی کا راستہ دکھانا۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت۔ جان لو فسق و فجور کسی قوم میں نہیں پھلتا پھولتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اس قوم پر عذاب نازل کرتا ہے چنانچہ صرف اس وقت تک میری اطاعت کیجئے جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی پیروی کروں اور جب میں اس کی نافرمانی کروں تو آپ لوگوں پر میری اطاعت لازم نہ رہے گی۔ اب نماز کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا رحم و کرم کرے۔"

جس وقت یہاں یہ کچھ ہو رہا تھا۔ اس اثنا میں حضرت محمدؐ کے جسد مبارک کو غسل دے کر مشک و عنبر کی خوشبوؤں میں بسا دیا گیا تھا۔ آپؐ کے جسم کو تین چادروں میں لپیٹ کر حضرت عائشہؓ کے حجرے میں زیارت کے لئے رکھ دیا گیا۔ لوگوں کو ٹولیاں بنا کر باری باری

---

[1] تاریخ طبری۔ حیات محمدؐ۔

اندر آنے کی اجازت دے دی گئی۔ ایک جماعت آتی اور اپنے پیشوا کا چہرہ مبارک دیکھنے کے لئے کچھ دیر ٹھیرتی۔ پھر یہ چلے جاتے اور دوسرے لوگ آجاتے۔ سارا دن لوگ زیارت کرنے کے لئے آتے رہے۔ مردوں کے بعد عورتیں[1] آئیں اور عورتوں کے بعد بچے اور غلام۔

جب دفن کرنے کا مرحلہ آیا تو معلوم ہوا کہ کسی کو بھی یہ بات معلوم نہیں کہ آپؐ کو کہاں دفن کیا جائے گا۔ بعض چاہتے تھے کہ آپؐ کی قبر مسجد میں آپؐ کے منبر کے نیچے کھودی جائے۔ دوسروں نے خیال ظاہر کیا کہ وہ جگہ زیادہ مناسب رہے گی جہاں آپؐ نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوتے تھے۔ بعض نے کہا کہ آپ شاید مسلمانوں کے قبرستان میں اپنے لوگوں کے درمیان دفن ہونا پسند کرتے[2]۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے یہ اعلان کرکے اس مسئلہ کو حل کردیا کہ رسول اللہ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ایک نبی کو یقینی طور پر اسی جگہ دفن کرنا چاہئے جہاں اس کا دم آخر ہوا ہو۔ چونکہ کوئی اس کی تردید نہ کرسکا اس لئے اسی جگہ (یعنی حجرہ عائشہؓ) میں ہی قبر بنانے پر اتفاق ہوگیا۔

چنانچہ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں ایک گہری قبر تیار کی گئی۔ قبر کے فرش پر پہلے آپ کی سبز چادر بچھادی گئی۔ پھر کفن میں لپٹی میت کو حضرت علیؓ، اسامہ بن زیدؓ اور الفضل بن عباسؓ نے بڑی آہستگی سے قبر میں اتارا۔ کچی اینٹوں سے اصل قبر پر ایک قوسی چھت یا ڈاٹ بنادی گئی اور قبر کے باقی حصہ کو ریت اور بجری سے بھر دیا گیا۔

اس طرح منگل کے دن[3] ۹ جون ۶۳۲ء کو ہجرت کے گیارھویں سال میں حضرت محمدؐ

---

[1] اصل میں یہ بات آنحضورؐ کی نماز جنازہ کے متعلق ہے۔ کوئی باجماعت نماز نہیں ہوئی۔ بلکہ علیحدہ علیحدہ لوگ آتے گئے اور نماز پڑھتے گئے۔ پہلے مردوں نے پڑھی۔ پھر عورتوں نے، پھر بچوں نے اور پھر غلاموں نے۔ ان نمازوں میں کسی نے امامت نہیں کی۔ (تاریخ طبری)

[2] کچھ تجاویز اور بھی تھیں مثلاً آپ کو مکہ لے جاکر آبائی وطن میں دفن کرنا چاہئے۔ یا پھر بیت المقدس میں جہاں اور تمام انبیاءؑ مدفون ہیں۔ (حیاتِ محمدؐ)

[3] ۸ جون ۶۳۲ء کو آنحضورؐ کا وصال ہوا اور ۹ جون کو مدفون ہوئے (حیات محمدؐ) بعض کا کہنا

کو اپنی باسٹھ سال کی ہنگامہ خیز اور پر مشقت زندگی میں پہلی مرتبہ آرام وسکون کے لئے تنہا چھوڑ دیا گیا۔ آج تک آپؐ اسی روضہ مبارک میں آرام فرما ہیں۔ اب یہ لوگوں کی نظروں سے چھپا ہوا ہے کیونکہ کسی وقت کے حرم کے معمولی رہائشی حجروں کے چاروں طرف اب ایک نہایت خوبصورت اور زیب وزینت سے آراستہ مسجد بن گئی ہے۔ اس حجرے پر جس میں آپؐ کا اصل مزار ہے ایک نہایت شاندار گنبد بنا دیا گیا ہے۔ یہاں پر دنیا کے گوشے گوشے سے مرد اور عورتیں آتے ہیں اور اس جگہ کے بالکل نزدیک نمازیں پڑھتے اور دعائیں مانگتے ہیں جہاں پر ان کے پیشوا اور ہادی رہتے تھے اور جہاں ان کا وصال ہوا۔ ایسا کرنے میں وہ حضرت محمدؐ کے بار بار دہرائے جانے والے ان احکام کی نافرمانی[لہ] کرتے ہیں کہ آپؐ کے روضہ کی پرستش نہ کی جائے اور اسی طرح وہ اس عقیدے کو بھی مستحکم کرتے ہیں کہ آپؐ ایک روحانی مخلوق یا فرشتوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسا کر کے وہ آپؐ کی عظمت کم کرتے ہیں۔

مذہب کی تاریخ میں حضرت محمدؐ کی منفرد حیثیت کا بڑا سبب یہ ہے کہ آپؐ نے تمام دنیا کو ایک خدا کی بندگی کرنے کے لئے معقول کر دیا حالانکہ نہ تو آپؐ کوئی آسمانی مخلوق تھے اور نہ فرشتہ، اور نہ ہی ایسا کرنے کے لئے آپؐ کے پاس کوئی مافوق البشر صلاحیتیں تھیں۔ سوائے آپؐ کی عظیم شخصیت کے اور آپؐ میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو آپؐ کو دوسرے

ہے کہ وفات کے دوسرے دن (بروز منگل) دن ڈھلے دفن کیا گیا۔ لیکن حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ پیر کو وفات ہوئی اور منگل اور بدھ کی درمیانی شب کو تدفین ہوئی۔ (تاریخ طبری)

[لہ] مسجد نبوی میں لوگ روضہ مبارک کے چاروں طرف نزدیک سے نزدیک ہو کر سلام پڑھتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں اور ان جگہوں پر نفل ادا کرتے ہیں جہاں حضورؐ نے نمازیں پڑھیں یا پڑھنے کا حکم دیا۔ یہ تمام نمازیں اور بندگی اللہ کے لئے ہوتی ہیں اور مسجد میں قبلہ رخ ہوتی ہیں اس لئے یہ نافرمانی ہرگز نہیں۔ ہاں البتہ روضہ مبارک کی جالیوں اور دیواروں کو چومنا ضرور عقیدت کا اظہار ہے اور اس سے وہاں کے خدام ہر وقت منع کرتے رہتے ہیں۔

مسلمانوں سے ممیز کرتی یعنی نہ تو آپؐ کے پاس خطابات تھے اور نہ ہی دولت اور نہ ہی آپؐ کی بود و باش دوسروں سے ممتاز تھی۔ دمشق، فیض (مراکش) اور دہلی کی مساجد کی طرح مدینے کی مسجد بھی فنِ تعمیر کا ایسا ہی پسندیدہ اور اعلیٰ نمونہ ہے جیسے دنیا کی اور مشہور مذہبی عمارات لیکن ان میں ایک بھی ایسی بات نہیں جو حضرت عبداللہ و حضرت آمنہ کے بیٹے حضرت محمدؐ الرسول اللہ کے اسوہ حسنہ (سادگی اور حقیقت پسندی) سے مطابقت رکھتی ہو۔

کتابیات

(وہ کتابیں جن سے اس ترجمہ میں استفادہ کیا گیا)

نام کتاب	کیفیت
حیاتِ محمدؐ	مؤلفہ ڈاکٹر محمد حسین ہیکل۔ حواشی میں اس کتاب سے حوالے اور اقتباسات مولانا محمد کامل وارثی کے ترجمے "سیرۃ الرسولؐ" سے لئے گئے ہیں۔
تاریخ طبری (جلد اول۔ حصہ سوم)	مترجمہ مولوی سید محمد ابراہیم۔ رکن سر رشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ۔ حیدر آباد دکن۔ اشاعت ۱۹۴۶ء
طبقات ابنِ سعد (جزو اول و دوم)	ترجمہ مولانا عبداللہ العمادی۔ رکن سر رشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ۔ حیدر آباد دکن۔ مطبوعہ ۱۹۴۲ء
سیرۃ النبیؐ (حصہ اول و دوم)	علامہ شبلی نعمانی۔ مطبوعہ اعظم گڑھ طبع ششم ۱۳۶۴ھ
تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب و اسلام	مؤلفہ ابوالعلا شاہ محمد کبیر دانا پوری۔ مطبع نولکشور۔ لکھنؤ۔ ۱۹۴۰ء
کتاب مقدس (اردو) (انجیل۔ عہد نامہ ہائے عتیق و جدید و دیگر صحائف)	مطبوعہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی۔ انارکلی۔ لاہور۔ ۱۹۵۱ء
موضح القرآن	ترجمہ قرآن حکیم از شاہ عبدالقادر

THE GREAT ARAB CONQUESTS. لیفٹیننٹ جنرل سر جان گلب۔ مطبوعہ لندن۔ ۱۹۶۳ء

ENCYCLOPAEDIA BRITTANICA مختلف جلدیں۔ (پندرھواں ایڈیشن)

CHAMBERS ENCYCLOPAEDIA مختلف جلدیں (ایڈیشن ۱۹۵۰ء)

THE NEW CENTURY ENCYCLOPAD ENCYCLOPAEDIA OF NAMES جلد اوّل ودوم۔ مطبوعہ نیویارک۔ ایڈیشن ۱۹۵۴ء

PEAR'S ENCYCLOPAEDIA بہترواں ایڈیشن۔ مطبوعہ ۱۹۶۳ء

●●●

BIBLIOGRAPHY

(BOOKS CONSULTED BY THE AUTHOR)

The spirit of Islam - S. Ameer Ali.

The Life of Mohammed - Sir William Muir.

Islam and the Arabian Prophet - Dr. G.I.Kheirallah.

Mahomet and His Successors - Washington Irving.

History of the Arabs - Dr. Philip K. Hitti.

Essays on the Life of Mohammed - Ahmad Khan Bahadur.

Mohammed - Tor Andrae.

Mohammed and Mohammedanism - R. Bosworth Smith.

Mahomet - G.M.Draycott.

Mohammed - R.F. Dibble.

Aisha, Beloved of Mohammad - Nabia Abbott.

The Pilgrimage to Mecca and Medina -Sir Richard Burton

The Crescent and the Rose - S.C. Chew.

The Arab Heritage - P.K.Hitti,N.A. Faris,G.L.D.Vida, J. Oberman, J.L. La Monte.

The Origins of the Islamic State -Dr.Philip K.Hitti.

The Mystical Elements of Mohammed - J.C.Archer.

The Apostle of God - Edward Gibbon.

Life of Mohammed - George Bush.

Heroes and Hero Worship - Thomas Carlyle.

Men of Might - A.C.Benson and H.F.W.Tatham.

Sayings of Mohammed -Abdallah Al Mamun Al Suhrawardy.

Meet the Arab - John Van Ess.

The World of the Arabs - Edward J. Byng.

Life of Muhammad, Sufi M.R.Bengali.

Vie de Mahomet - Emile Dermenghem.

La Republique Marchande de la Mecque-Henri Lammens.

La Mecque,Ville Interdite, Jean Barois.

Mahomet - Etienne Dinet.

The Koran, translated by J.M. Rodwell.

The Koran, translated by Marmaduke Pickthall.

The Koran - Translated by George Sale.

●●●